مآثر الانبیاء والصدیقین
وآثار الشھداء والصلحین
ملقب بہ
اقوالِ سلف
پاسبانِ حق
مؤلفہ
شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم
مکتبہ دار المعارف
ادارہ معارف مصلح الامت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا (نساء:۶۹)

مَاٰثِرُ الۡاَنۡبِیَآءِ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَاٰثَارُ الشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ

ملقب بہ

اقوالِ سلفؒ

حصہ نہم

جس میں چودہویں صدی ہجری نصف ثانی یعنی سنہ ۱۳۵۴ھ سے سنہ ۱۳۸۶ھ تک
کے اولیاء کرام کے احوال واقوال مختصراً ذکر کئے گئے ہیں۔

مؤلفہ:

شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم

ناشران

مکتبہ دار المعارف الہ آباد

ادارہ معارف مصلح الامتؒ الہ آباد

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

کتاب سے متعلق ضروری معلومات

نام کتاب : **مَاثِرُ الْاَنْبِيَآءِ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَاٰثَارُ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْن**

ملقب به ''اقوال سلفؒ'' حصہ نہم

مرتب : شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم

تعداد صفحات : ۶۴۸ تعداد اشاعت : ۱۱۰۰

سن اشاعت : ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۰۲۰ء

باہتمام : مولوی محمد عبداللہ قمر الزمان قاسمی الہ آبادی

تصحیح وترتیب : مولوی محمد عبید اللہ قمر الزمان ندوی، مولوی فیروز عالم قاسمی

کمپوزنگ : مولوی رشید احمد، دار العلوم ماٹلی والا بھروچ۔ مولوی مسعود احمد قاسمی

ناشر : مکتبہ دار المعارف الہ آباد، ادارہ معارف مصلح الامتؒ الہ آباد

قیمت :

ملنے کے پتے:

(۱) مکتبہ دار المعارف الہ آباد، ۹۳۹؍۶ ربی وصی آباد، الہ آباد، یوپی، ۲۱۱۰۰۳

(۲) مکتبہ فیضان قمر ٹائم ٹو ٹائم دکان نمبر ۷ ایس ڈی چال، بہرام باغ روڈ، جوگیشوری، ممبئی

(۳) مکتبہ رحمانیہ، دار العلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ محمود نگر کنتھاریہ، بھروچ، گجرات

(۴) قاضی بکڈپو، بالمقابل بڑی مسجد (مرکز) رانی تلاؤ، سورت، گجرات ۳۹۵۰۰۳

(۵) مکتبہ النور دیوبند، یوپی ۲۴۷۵۵۴

(۶) مکتبہ صدیق دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

(۷) الفرقان بکڈپو، ۱۳؍۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ

فہرست

مَاثِرُ الْاَنْبِیآءِ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ آثَارُ الشُّھَدَآءِ وَ الصّٰلِحِین
ملقب بہ ''اقوال سلف'' حصہ نہم

اولیاء مقربین وعلماء ربانیین چودھویں صدی ہجری

عرض ناشر

''اقوال سلف جلد نہم'' آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس سلسلۃ الذہب کو آگے بڑھانے کی توفیق ارزانی فرمایا۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی دسویں وگیارہویں جلدیں بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آجائیں گی۔ بس آپ حضرات دعا کرتے رہیں۔

اس جلد میں چودہویں صدی ہجری کے نصف ثانی کے متعدد حضرات اکابر کے حالات وکمالات اور مفید ارشادات قلمبند کئے گئے ہیں۔

اقوال سلف محض تذکرہ نگاری اور سوانح عمری نہیں ہے بلکہ اہل علم واہل دل کے دینی، علمی، فکری، اصلاحی، تعلیمی وتربیتی اور تجدیدی کارناموں اور ان کی متنوع خصوصیات وامتیازات کا بہترین وثیقہ ہے۔

ماشاء اللہ مکتبہ دارالمعارف الہ آباد مختلف موضوعات پر متعدد اصلاحی وعرفانی، علمی وعملی کتابیں اور مختلف تراجم وسیر اردو، انگریزی اور گجراتی زبان میں منظر عام پر لانے کا شرف حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی چند اہم کتابیں زیر ترتیب ہیں یا زیر کتابت بلکہ بعض کتابیں کمپوز شدہ مکتبہ کے پاس موجود ہیں جن کو منصۂ شہود پر لانا ضروری ہے۔ مثلاً مجدد دیار مصر علامہ محفوظ مصریؒ کی معرکۃ الآراء کتاب **''هداية المرشدين الى طريق الوعظ والخطابة''** کا بہترین سلیس اور سہل اردو ترجمہ کمپوز شدہ موجود ہے جو نہایت مفید کتاب ہے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشفق المکرم والد ماجد صاحب دامت برکاتہم کی عمر صحت وعافیت کے ساتھ دراز فرمائے، اور مکتبہ کے جملہ معاونین کو صحت وعافیت عطا فرمائے تاکہ اس طرح کے بیش قیمت مضامین آپ لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچانے کا شرف ہم خدام مکتبہ حاصل کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے توفیق عطا فرمائے، اور قبول فرمائے۔ آمین

محمد عبداللہ قمر الزمان قاسمی

جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ

جنوری ۲۰۲۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمدللہ حمدا یبلغ رضاہ، وصلی اللہ علی اشرف من اجتباہ وعلی من صاحبہ ووالاہ وسلم تسلیما لایدرک منتھاہ۔ امابعد!

قال اللہ تعالیٰ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا۔ یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا۔ (سورۂ احزاب: ۷۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (یعنی ہر امر میں اس کی اطاعت کرو) اور (بالخصوص کلام کرنے میں اس کی بہت رعایت رکھو کہ جب بات کروتو) راستی کی بات کہو (جس میں عدل واعتدال سے تجاوز نہ ہو) اللہ تعالیٰ (اس کے صلہ میں) تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا (کچھ ان اعمال کی برکت سے کچھ توبہ کی برکت سے جو تقویٰ اور قول سدید میں داخل ہے) اور (یہ ثمرات اطاعت کے ہیں اور اطاعت ایسی چیز ہے کہ) جو شخص اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہونچے گا۔ (بیان القرآن)

اب ہم مزید توضیح کے لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر ''معارف القرآن'' سے مندرجہ بالا آیات کی تفسیر درج کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

زبان کی اصلاح باقی سب اعضاء واعمال کی اصلاح میں مؤثر ذریعہ ہے:

اس آیت میں اصل حکم سب مسلمانوں کو یہ دیا گیا ہے کہ **''اِتَّقُوا اللّٰہَ''** یعنی تقویٰ

اختیار کرو جس کی حقیقت تمام احکام الٰہیہ کی مکمل اطاعت ہے، کہ تمام اوامر کی تعمیل کرے اور تمام منہیات ومکروہات سے اجتناب کرے، اور ظاہر ہے کہ یہ کام انسان کے لئے آسان نہیں، اس لئے ''اتقوا اللہ'' کے بعد ایک خاص عمل کی ہدایت ہے، یعنی اپنے کلام کی درستی اور اصلاح، یہ بھی اگر چہ تقویٰ کا ہی جزء ہے مگر ایسا جزء ہے کہ اس پر قابو پالیا جائے تو باقی اجزاء تقویٰ خود بخود حاصل ہوتے چلے جائیں گے جیسا کہ خود آیت مذکورہ میں قول سدید اختیار کرنے کے نتیجہ میں ''**يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ**'' کا وعدہ ہے، یعنی اگر تم نے اپنی زبان کو غلطی سے روک لیا اور کلام درست اور بات سیدھی کہنے کے خوگر ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی اصلاح فرمائیں گے، اور سب کو درست کر دیں گے۔ اور آخر آیت میں یہ وعدہ فرمایا کہ ''**يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ**'' یعنی جس شخص نے اپنی زبان پر قابو پالیا، راست گوئی اور سیدھی بات کا عادی بن گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے باقی اعمال کی بھی اصلاح فرمادیں گے اور جو لغزشیں اس سے ہوئی ہیں ان کو معاف فرمادیں گے۔

قرآنی احکام میں تسہیل کا خاص اہتمام: قرآن کریم کے عام اسلوب میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کوئی حکم ایسا دیا گیا جس کی تعمیل میں کچھ مشقت ودشواری ہو تو ساتھ ہی اس کے آسان کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیا گیا ہے، اور چونکہ سارے دین کا خلاصہ تقویٰ ہے اور اس میں پورا اترنا بڑی مشقت ہے، اس لئے عموماً جہاں ''**اتقوا اللہ**'' کا حکم دیا گیا ہے تو اس کے بعد ہی کوئی ایک عمل ایسا بتلا دیا ہے جس کے اختیار کرنے سے تقویٰ کے باقی ارکان پر

عمل منجانب اللہ آسان کردیا جاتا ہے، اس کی ایک نظیر اس آیت میں اتقوا اللہ کے بعد "**قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا**" کی تلقین ہے، اور اس سے پہلی آیت "اتقوا اللہ" کے بعد "**وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى**" فرما کر اس بات کی طرف ہدایت فرمادی کہ تقویٰ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندوں کو ایذاء دینا ہے اسے چھوڑ دو تو تقویٰ آسان ہوجائے گا۔

ایک آیت میں ارشاد فرمایا "**اِتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ**" [1] اس میں تقویٰ کو آسان کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی صحبت ومجالست کی تلقین فرمائی جو بات کے سچے ہوں اور عمل کے بھی سچے ہوں، جس کا حاصل ولی اللہ ہونا ہے، اور دوسری آیت میں اتقوا اللہ کے ساتھ "**وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ**" بڑھادیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کو اس کی فکر چاہئے کہ اس نے کل یعنی روز محشر کے لئے کیا سامان بھیجا ہے۔ جس کا خلاصہ فکر آخرت ہے، اور یہ فکر تقویٰ کے تمام ارکان واعمال کو آسان کردینے والی چیز ہے۔ (معارف القرآن شفیعی: ج ۷ ص ۲۴۲)

"**وقولوا للناس حسناً**" اور لوگوں کو اچھی بات کہو۔ لوگوں کی بات چیت کی بابت یہ ایک عمومی شرعی بنیاد اور ضابطہ ہے۔ ایک دوسرے کی بات چیت

---

[1] اس آیت کا ترجمہ وتشریح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس طرح فرماتے ہیں:

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو (یعنی جو نیت اور بات میں سچے ہیں ان کی راہ چلو کہ تم بھی صدق اختیار کرو)

اور حاشیہ میں یوں تحریر فرماتے ہیں: "بعض نے معیت کی تفسیر مخالطت اور مقارنت سے کی ہے کذا فی الروح، بس اس میں ترغیب ہے صحبت صالحین کی" (بیان القرآن)

کی بابت لفظاً بھی اور معنیً بھی، اسلوب میں بھی اور مضمون میں بھی۔ اگر لوگ اس ضابطہ کی اتباع کرلیں تو دنیا و آخرت دونوں جگہ اس کی برکتیں ان کے لئے سامان راحت بن جائیں۔ آپ جتنی مرتبہ آیتِ کریمہ کے اس لفظ پر اختصار کے باوجود غور کریں گے، اتنی مرتبہ اس کے لطائف کے ایک یا زیادہ پہلو اجاگر ہوں گے۔ مثلاً اس کے عموم وشمول پر، اس کے حسن و جمال پر، اس کی بابت عدل وانصاف کے ساتھ معاملہ کرنے پر، فضل وکرم کے ساتھ معاملہ کرنے پر اور اس قاعدہ کے نفاذ کے نتائج وغیرہ وغیرہ پر غور کیجئے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں ''**وَمَنۡ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا**'' (سورۂ احزاب:۷۱)

جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔ (بیان القرآن)

حضرت العلامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے تحت یوں رقمطراز ہیں:

یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈر کر درست اور سیدھی بات کہنے والے کو بہترین اور مقبول اعمال کی توفیق ملتی ہے اور تقصیرات معاف کی جاتی ہیں، حقیقت میں اللہ ورسول کی اطاعت ہی میں حقیقی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس نے یہ راستہ اختیار کیا مراد کو پہنچ گیا۔

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحبؒ اس آیت کے فوائد کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں ''لوگوں میں کامیابی کے بہت سے معیار معروف ہیں، کوئی شخص مال زیادہ ہونے کو کامیابی سمجھتا ہے اور کوئی شخص بادشاہ بن جانے کو، کوئی شخص وزارت مل جانے کو اور کوئی شخص جائیداد بنالینے کو اور کوئی شخص زیادہ پیسوں

والی ملازمت مل جانے کو کامیابی سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کامیابی کا معیار بتادیا کہ کامیاب وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور یہی بڑی کامیابی ہے"۔ (تفسیر انوارالبیان: ج ر ۴ ص ر ۴۵۱)

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات میں بندوں کو تقویٰ اور راست گوئی کا حکم دیا ہے اور جزا کے طور پر بقیہ اعمال کی اصلاح اور گناہوں کی معافی مقدر فرمائی اور اللہ ورسول کی اطاعت کاملہ پر مزید فوز عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ مگر افسوس کہ امت کے عوام تو عوام خواص بھی ان اعمال کے اپنانے کا کام نہیں کرتے۔

پس ہم سب خوب سمجھ لیں کہ دین ودنیا کی فوز و کامرانی اگر آپ چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت اور اکابر امت کی سیرت کو ملحوظ رکھیں۔ اس کے بغیر فوز و کامرانی کے حصول کے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

مزید دلی تقاضا ہے کہ آپ حضرات کی خدمت میں قرآن پاک کی ایک نہایت جامع سورہ "والعصر" کا ترجمہ اور تفسیر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر "بیان القرآن" سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ اور وہ یہ ہے۔

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

ترجمہ وتشریح: قسم ہے زمانہ کی (جس میں رنج وخسران واقع ہوتا ہے کہ) انسان (اپنی عمر ضائع کرنے کی وجہ سے) بڑے خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے (جو اپنے نفس کا کمال ہے) اور ایک

دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال کی) پابندی کی فہمائش کرتے رہے (جو دوسروں کی بھی تکمیل ہے تو جو لوگ خود بھی یہ کمال حاصل کریں اور دوسروں کی بھی تکمیل کریں یہ لوگ البتہ خسارے میں نہیں بلکہ نفع میں ہیں)۔ (بیان القرآن)

سورۂ عصر کی خاص فضیلت: حضرت عبید اللہ بن حصن فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ آپس میں ملتے تھے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک ان میں سے ایک دوسرے کے سامنے سورۂ والعصر نہ پڑھ لے۔ (رواہ الطبرانی)

اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر لوگ صرف اسی سورت میں تدبر کر لیتے تو یہی ان کے لئے کافی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر)

پس جب اس سورت کی اس قدر اہمیت ہے تو ہم سب مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اس سورہ کے مضامین کو پیش نظر رکھیں۔ لہذا تمام مسلمان مردوں، عورتوں اور خاص طور سے اپنے جملہ احباب، ابناء و بنات نسلاً بعد نسلٍ کے لئے دل سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جملہ اسلاف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور دینی و دنیوی فوز و کامرانی سے ہمکنار فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

محمد قمر الزمان الہ آبادی

۷؍ ربیع الاول ۱۴۴۱ھ مطابق ۵؍ نومبر ۲۰۱۹ء

بیت الاذکار وصی آباد، الہ آباد

تعارف

حضرت مولانا نظام الدین صاحب اسیرادروی زید مجدہٗ

(مدیر رسالہ ترجمان الاسلام بنارس)

دین تو آسان ہے لیکن دین کے سانچے میں ڈھل جانا ضرور مشکل ہے، علم کتابوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے، تقریروں اور وعظوں سے بھی دینی معلومات حاصل ہوتی ہے، اہل علم سے گفت وشنید سے شک وشبہات سے نجات حاصل ہوسکتی ہے، لیکن ان وسائل و ذرائع کے باوجود انسان کا دل دنیا سے بے نیاز ہوجائے اللہ اور رسول کی مرضیات پر چلنے کا دل میں ایک طاقتور داعیہ پیدا ہوجائے، یہ کوئی ضروری نہیں لیکن کسی ایسے اللہ والے کی صحبت نصیب ہوجائے جس کا ظاہر و باطن آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہو، اس کی ہر ہر ادا ہر نقل وحرکت دین کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو، اس کی نگاہ توجہ حاصل ہوگئی تو یقیناً اس کو صحیح راہ مل گئی، اور اس کے منزلِ مقصود تک پہونچنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، ہم مشاہدہ کی آنکھوں سے ایسے ایمان افروز نظارے دیکھتے رہتے ہیں کہ جب کسی نے صدق دلی سے کسی شیخ کا دامن پکڑا تو اس کی کایا پلٹ گئی اور بتدریج اس کی زندگی دین کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔

اہل دل اللہ والوں کے احوال واقوال، ملفوظات اور ان کے حکیمانہ کلمات اسی لئے مطالعہ میں رکھے جاتے ہیں کہ ان سے زندگی کے سنورنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ اقوال سلف کے مرتب حضرت مولانا قمر الزماں صاحب دامت برکاتہم کو خدا نے ایسا ذوق سلیم اور اسلاف کے دینی کاموں سے ایسا شغف پیدا کیا

ہے کہ آپ نے برسوں سے بزرگان دین اور مشائخ کرام کے اقوال وملفوظات کے جواہرات کو جمع کر کے اقوال سلف کی جلدوں کو ایک خزانۂ عامرہ بنا دیا ہے، میں نے اس کی بعض جلدیں پہلے بھی پڑھی ہیں، نویں جلد تو میرے سامنے ہی ہے، مجھے ہر جگہ اخلاص کی آب وتاب اور انتخاب اقوال اور ترتیب حالات میں خلوص کی وہ شیرینی ملی ہے کہ دل اس کے مطالعہ میں ایک لذت محسوس کرتا ہے، اس طرح کی کتابوں میں کہیں کہیں یک رُخا پن یا کہیں کہیں مطالعہ کرتے ہوئے دل کو ذہنی تحفظات کے احساس کا شاک لگ جاتا ہے لیکن یہ مصنف کے کمال خلوص کی دلیل ہے کہ اس کتاب کی کسی جلد میں مطالعہ کرتے ہوئے کہیں بھی ذہن کو یہ شاک نہیں لگتا ہے ۔ میں اسی لئے اقوال سلف کی ساری جلدوں کو علم دین کا خزانۂ عامرہ تصور کرتا ہوں ۔

اقوال سلف کی یہ نویں جلد ہے، اس میں اسی سے زائد اللہ کے نیک اور مخلص بندوں کے مختصر مگر جامع حالاتِ زندگی دئے گئے ہیں اور ان کی دینی وعلمی خدمات سے روشناس کرایا گیا ہے اور ان کی تحریروں سے ایسے جواہر پارے منتخب کر دیئے گئے ہیں جو اپنے اندر بڑی معنویت رکھتے ہیں، اور مطالعہ کرنے والوں کے ذہن کو متأثر کر سکتے ہیں، ان اقوال میں انسانی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کے رموز واسرار پوشیدہ ہیں، مصنف نے جس نیک مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ سلسلۂ تصنیف شروع کیا تھا وہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے کامیاب ہیں، خدا کی ذات سے امید ہے کہ یہ کتاب ان کے لئے زاد آخرت ثابت ہوگی بزرگان دین کی پُرخلوص دعائیں یقیناً ان کو حاصل ہونگی اور اس فانی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے ۔

اسیر ادروی جامعہ اسلامیہ بنارس رجب ۱۸ ۱۴ھ

مکتوب

عزیزم مولانا محمد ارشد صاحب بنارسی سلمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی مخدومی حضرت اقدس استاذی المکرم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رحمت الٰہی سے پوری امید ہے کہ مزاج گرامی بہ خیر ہوگا، اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کو صحت وعافیت اور سلامتی کے ساتھ رکھے، برادر عزیز مولانا الحاج احمد نصر صاحب سلمہ کے ذریعہ دو کتابیں مواعظ القرآن جلد اول، اقوال سلف جلد ہفتم دستیاب ہوکر باعث مسرت وفرحت بنی، یادفرمائی پر جو سرور پیدا ہوا یہ عاجز اسے بیان واظہار میں نہیں لاسکتا، کریم مولیٰ نے حضرت اقدس کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی ہے، خوب دینی کام لے رہا ہے، اصلاحی پیغام عام وتام ہوتا جارہا ہے، الحمد للہ ثم الحمد للہ اللہ رب العزت ان روشن جواہرات سے بندہ اور اس کے احباب کو منتفع ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بندہ کے مشفق ومخدوم نے اقوال سلف پر تاثرات قلم بند کرنے کا حکم فرمایا ہے، الامر فوق الادب کے تحت خادم ہمت کررہا ہے، دعا ہے کہ یہ چند سطریں حضرت اقدس کو پسند آجائیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوجائیں۔ حضرت نے اخلاص میں ڈوبا ہوا جو عظیم الشان اور بہترین کارنامہ انجام دیا ہے جس کی روشنی بحمد اللہ خوب پھیل رہی ہے، درحقیقت یہ عملی تفسیر وتشریح ہے جو ''معارف القرآن''

میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے سورۃ الفاتحہ میں تحریر فرمائی ہے کہ ''انسان کی صلاح وفلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکامات موجود ہیں، دوسرے رجال اللہ یعنی اللہ والے'' اقوال سلف میں علمائے حقانی، مشائخ طریقت، خاصان خدا کے اقوال واحوال بڑی خوبی سے مندرج ہیں، اس شہرۂ آفاق تصنیف لطیف کو حسن انتخاب، جامعیت، نافعیت اور اہمیت وانفرادیت نے اثر آفریں بنادیا ہے، بلاشبہ ان جواہر پاروں میں بڑی نورانیت پائی جاتی ہے کہ کتاب ''ایشاں پسندیدہ حق بسند'' کے کردار وعمل کی آئینہ دار ہے، ایک بہت ہی بڑی خوبی اور کمال وجوہر جو آشکارا ہے کہ حضرت استاذی المکرم کو حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف وفرمودات کا کامل استحضار نصیب ہے وہ اقوال سلف کے بیشتر مقامات پر روشن نگینہ بن کر تابانی بخش رہا ہے اور استاذی المکرم کی تشریح وتوضیح نے سہل وآسان تر بنادیا ہے۔ اقوال سلف میں ''رجال اللہ'' پر جولاثانی اور لافانی کارنامہ انجام پایا ہے وہ یقیناً مشعل راہ ہے جس کی درخشندگی اور تابندگی سے طالبین وشائقین کو روشن راہ انشاء اللہ ملتی رہے گی۔

کتاب کے مطالعہ ہی سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان ضخیم جلدوں اور اس کے مضامین کی تیاری میں کتنی جدوجہد سے کام لیا ہے، شبانہ وروز کی کوشش وکاوش کے بعد یہ لعل وگہر صفحات قرطاس کی زینت بنے ہیں، ہر جلد میں مستند ومعتبر حوالوں کا طویل سلسلہ ہے، بیشک حضرت الاستاذ نے سعی بے پایاں سے علمی دنیا کو بہت بڑی اور گراں بہا دولت دیدی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان قیمتی ہدایات کو ہم

سب کو اپنے اندر جذب کرنے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے اور اس سدابہار گلدستہ سے فیضان نصیب فرمائے۔ آمین

مخدوم مکرم کے حکم کی تعمیل میں یہ تحریر حاضر خدمت ہے، طبیعت ناساز ہونے کے باوجود اس مختصر تاثرات کا تحریر میں آجانا حضرت کی برکت اور دعاؤں کا اثر ہے۔

بندہ سوچ رہا تھا کہ اس کا کچھ لکھنا، بہترین وعمدہ حریر وریشم کے ساتھ ٹاٹ کا پیوند ہوگا مگر چونکہ واسطہ برادر عزیز مولانا احمد نصر صاحب ہیں اس لئے امید ہے کہ حضرت اقدس ان کے توسط سے پسند فرمائیں گے اور دعاؤں سے نوازیں گے۔

والسلام

محمد ارشد عفی اللہ عنہ

مسجد اودھ پوری کالونی بنارس

۱۱/ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ

تاثر

مکرم پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب فاروقی الہ آبادی

ہندوستان میں صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی آمد کی تاریخ بہت پرانی ہے، سولھویں صدی کے مؤرخ زین الدین معبری نے اپنی کتاب ''تحفۃ المجاہدین'' میں لکھا ہے کہ مالابار کے راجہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ شق القمر کو دیکھ کر اسلام قبول کیا اور اس کے بعد حجاز کا سفر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، زین الدین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حجاز سے سفر واپسی میں راجہ کا ظوفار کی بندرگاہ میں (ایک دوسری روایت کے مطابق شہر کی بندرگاہ میں) انتقال ہو گیا جہاں اس کی قبر آج بھی موجود ہے۔ سترھویں صدی کے مؤرخ محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ نے اپنی کتاب ''تاریخ فرشتہ'' میں اس روایت کی حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ راجہ کے انتقال کے بعد اس کے عرب ساتھیوں نے (جن میں مشہور صحابی مالک بن دینار اور ان کے بھتیجے مالک بن حبیب بھی شامل تھے) راجہ کی آخری خواہش کے مطابق مالابار کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر اسلام کی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس بات کے بھی ثبوت ملتے ہیں کہ ہندوستان میں پہلی مسجد کی تعمیر انھیں لوگوں نے کروائی تھی۔ اس واقعہ کے بعد سے ہندوستان میں صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

تیرھویں صدی کے آغاز میں شمالی ہند میں مسلم حکومت (دہلی سلطنت) کے قائم ہونے کے بعد مختلف ممالک کے صوفیاء بڑی تعداد میں یہاں تشریف لائے اور دین

اسلام کی تبلیغ اور ترویج کا کام وسیع پیمانے پر شروع ہوا۔ حالانکہ اس بات کے بھی شواہد اور ثبوت ملتے ہیں کہ دہلی سلطنت کے قائم ہونے سے پہلے بھی شمالی ہند میں صوفیاء نے اپنے مرکز قائم کر لئے تھے۔ چنانچہ تیرھویں صدی کے آغاز میں حضرت نظام الدین اولیاء کے دادا کے بخارا سے ہجرت کر کے بدایوں میں بسنے کے شواہد ملتے ہیں۔ بدایوں میں ہی حضرت کی پیدائش ۶۴۸ھ میں ہوئی تھی۔ بدایوں کے علاوہ اس خطہ کے دیگر علاقوں مثلاً بلگرام میں بھی صوفیاء کی موجودگی کے ثبوت ملتے ہیں۔ ابوالفضل نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''آئین اکبری'' میں ہندوستان میں مروج چودہ صوفی خانوادوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سولہویں صدی کے ظہور تک برصغیر کے مختلف شہروں اور علاقوں میں مختلف ممالک کے صوفیائے کرام سرگرم تھے۔

ان خانوادوں میں چشتی، سہروردی، قادری اور نقشبندی سلسلہ کے صوفیاء نے شمالی ہندوستان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان بزرگان دین کی زندگی اور ان کی تعلیمات پر نہ صرف قدیم بلکہ جدید دانشوروں اور علماء نے بیش بہا کتابیں اور مضامین قلم بند کئے ہیں، ان میں پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کی تاریخ مشائخ چشت جو دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے قابل ذکر ہے۔ زیر نظر کتاب ''اقوال سلف'' جس کو حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں بارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں کارفرما صوفیائے کرام کی زندگی کے حالات اور ان کی تعلیمات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف اس سے پہلے اس سلسلے کی پانچ اور جلدیں شائع کر چکے ہیں جن میں انھوں نے بارہویں صدی کے پہلے صوفیاء کی حالات زندگی قلمبند کی ہیں۔

اقوال سلف کے زیر نظر حصہ نہم میں چودہویں صدی کے ۸۴ صوفیائے کرام کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موصوف نے بے شمار ماخذ سے استفادہ حاصل کرکے بہت محنت اور دیدہ ریزی سے ان بزرگان دین کی زندگی اور دین اسلام کی ترویج اور ترقی میں ان کے کارہائے نمایاں کو قلمبند کیا ہے۔ صاحب تصنیف نے نہایت سلیس اور عمدہ زبان کا استعمال کرکے کتاب کو عام فہم بنانے کی خاص کوشش کی ہے اور اس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ بزرگان دین کی طرز زندگی اور ان کی تعلیمات پر مبنی اس سے بہتر کتاب تحریر نہیں کی جاسکتی ہے۔

میری ناقص رائے میں بزرگان دین کے تذکرہ میں ان کے سلسلہ جن سے ان کا تعلق تھا کی تشریح بھی کردی جاتی تو ان کی تعلیمات کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ مثال کے طور پر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور مرزا مظہر جان جاناں کے تذکرہ میں اگر یہ بتادیا جاتا کہ ان کا تعلق نقشبندی سلسلہ سے تھا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کتاب کے اخیر میں بارہویں صدی ہجری کے چند مغل حکمرانوں کے مختصر حالات زندگی بھی قلمبند کئے گئے ہیں جو تاریخ کے طالبعلموں کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ مولانا محترم کو ان کی دیگر کتابوں کی طرح شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوگا۔

نعیم الرحمٰن فاروقی

اشوک نگر، الہ آباد

مکتوب

محب مکرم مولانا سید احتشام احمد ندوی زید مجدہم

حضرت مولانا قمر الزمان صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امابعد! آنجناب کا تحفہ ’’اقوال سلف‘‘ ملا، باقی جلدیں میں نے خرید لی تھیں۔ آپ قابل مبارک باد ہیں کہ آپ نے تذکرہ علمائے اسلام کر کے ایک بڑا کام کیا۔ ’’نزہۃ الخواطر‘‘ کے بعد یہ دوسرا مفصل تذکرہ علمائے اسلام کا ہے جس پر آپ نے عمر صرف کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر طرف اس کتاب کی برکات کا فیض عام کردے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے اس امت کی حقیقی خدمت کی ہے، اردو میں اقوال سلف کی کوئی نظیر موجود نہیں۔

ایک طالب علم دہلی یونیورسٹی میں رسرچ کررہا ہے علمائے اسلام پر، میں نے اس کو دو آخری حصے دیئے ہیں۔ آپ کی کتاب مفصل ہے اور تذکرہ میں استیعاب کیا گیا ہے، اور انداز دعوتی ہے، خلوص کی چاندنی پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہے اور تصوف کی برکات سے بھی پوری کتاب روشن ہے، اس تحفہ کے لئے شکر گذار ہوں۔ آپ سے ملاقاتیں ندوہ کی مجلس شوریٰ میں ہوتی ہیں۔

فقط والسلام

نیازمند احتشام احمد ندوی

۱۴ر نومبر ۲۰۱۸ء

تبصرہ

حضرت مولانا شمس الحق صاحب ندوی

استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اس کتاب میں چودھویں صدی کے جو اہم بزرگ و اہل اللہ گزرے ہیں ان میں سے متعدد حضرات کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے اقوال زریں آئے ہیں جو اہل علم و معرفت اور طالبین حق کے لئے بے بہا تحفہ ہیں۔ یہ کتاب چودھویں صدی ہجری کی علمی و دعوتی تاریخ کا انمول موتی ہے۔ چونکہ دردمندان اسلام اور اہل اللہ کے احوال وکوائف کے ساتھ ان کے گرانقدر ملفوظات بھی کتاب میں شامل ہیں اس لئے قاری کو اس کے پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ چونکہ قاری دوران مطالعہ بہاروں کے ایک چمن سے دوسرے چمن میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور نئے نئے گل بوٹوں سے لطف اندوز وسیراب ہوتا ہے اس لئے کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کئے بغیر اس کو چین نہیں آتا۔ اور جب کتاب ختم ہوتی ہے تو اس طرح کہ آتش شوق بھڑک چکی ہوتی ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ یہ ملکوتی صفات رکھنے والے حضرات ہماری ہی طرح کے انسان تھے۔ دنیا کے یہ سارے جھمیلے جو ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں ان کے ساتھ بھی لگے تھے، پھر انھوں نے کس طرح دنیا کی دلفریبیوں سے دامن بچا کر اپنا مومنانہ و داعیانہ کردار ادا کیا۔ اور اسلاف کے ہم اخلاف کس راہ پر چل رہے ہیں۔ ان بزرگوں کے حالات زندگی کی تصویر کا صحیح خدوخال اقبالؔ کے اس شعر میں آجاتا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کی آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

کتاب کے تبصرہ میں احوال وکوائف اور گرانقدر ملفوظات کے کچھ نمونے بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔لیکن ہم تبصرہ کو زیادہ طول نہ دے کر یہی کہیں گے کہ کتاب ہاتھ میں لیجئے اور اپنے ذوق طلب کو شوق کے پانی سے غسل دے کر پڑھنا شروع کردیجئے۔پھر دیکھئے کیا ملتا ہے۔

از مجلہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ: ۲۷

۲۴/ ذوالحجہ ۱۴۱۵ھ ۲۵/مئی ۱۹۹۵ء

مکتوب

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی زید مجدہ

مدیر رسالہ ''دارالعلوم'' دیوبند

محترم المقام زید مجدکم　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔کل آپ کا گرانمایہ متبرک ہدیہ باصرہ نواز ہوا۔ چونکہ اختتام سال کی بناء پر اسباق بند ہو گئے ہیں اس لئے اسی وقت سے پڑھنا شروع کر دیا اور اب تک تقریباً دو چوتھائی کا مطالعہ کر لیا ہے۔آنجناب نے جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اسلاف کے احوال واقوال کو جمع فرمایا ہے وہ لائق تحسین تو ہے ہی، ان بزرگوں سے آپ کے غایت تعلق کی بھی واضح دلیل ہے۔

آج جب کہ مادیت اور لادینیت کے اثرات سے عوام کا تو ذکر کیا خواص بھی متاثر ہو رہے ہیں ''اقوال سلف'' مینارۂ ہدایت اور چراغ راہ کا کام دے گی انشاءاللہ۔ مجھے اپنے اس تاثر کے اظہار میں کوئی باک نہیں ہے کہ ''اقوال سلف'' نہایت مناسب اور صحیح وقت پر ایک انتہائی موزوں کارآمد تصنیف ہے، ضرورت ہے کہ اس کی خوب اشاعت کی جائے اور مسلم گھرانوں بالخصوص نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔اس کے بقیہ حصوں کی دید سے محروم ہوں۔اگر مناسب خیال فرمائیں تو انھیں بھی کسی ذریعہ سے بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔فقط والسلام

حبیب الرحمٰن قاسمی

۲۱؍رجب ۱۴۱۵ھ

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

مجدد الملت، حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی فاروقی تھانویؒ م ۱۳۶۲ھ

نام ونسب: والدِ محترم کا اسمِ گرامی شیخ "عبدالحق" صاحب تھا، جو نہایت رئیس اور کشادہ دست انسان تھے، میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختارِ عام تھے، ذہنی اعتبار سے بڑے ہی صاحبِ فراست تھے، چنانچہ آپ حضرت حکیم الامتؒ کی ظاہری و باطنی صلاحیت کو تاڑ گئے تھے اس لئے آپ کی بچپن ہی سے بڑی قدر کرتے تھے، حضرت حکیم الامتؒ کی والدہ ماجدہ بھی ایک صاحبِ نسبت بی بی تھیں اور آپ کے ماموں پیر جی امداد علی صاحبؒ ایک زبردست صاحبِ حال بزرگ تھے، اور آپ کے نانا میر نجابت علی اعلیٰ درجہ کے فارسی داں، انشاء پرداز اور حاضر جواب شخص تھے، جو مولانا شاہ نیاز احمد بریلویؒ کے خلیفۂ خاص کے مرید تھے۔

حضرت حکیم الامتؒ کے زیادہ تر حالات "بیس بڑے مسلمان" مؤلفہ مولانا عبدالرشید ارشد صاحب سے اقتباس کر کے لکھے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے۔ اور ملفوظات "الافاضات الیومیہ" وغیرہ سے منتخب کر کے درج کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ناظرین کے لئے نافع بنائے۔ آمین (مرتب)

خاندان: حضرت اقدس کے جد اعلیٰ سلطان شہاب الدین ''فرخ شاہ'' کابلی تھے، ان کی اولاد میں شیوخِ تھانہ بھون کے علاوہ حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اور شیخ فرید الدین گنج شکرؒ جیسے مشائخ کاملین ہوئے ہیں۔

ولادت وتربیت: مجدد الملت ۵؍ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ چہارشنبہ کے دن صبح صادق کے طلوع کے ساتھ جلوہ نما ہوئے، ابھی حضرت کی عمر شاید پانچ ہی برس کی ہوئی تھی کہ سایہ مادری سر سے اٹھ گیا، مگر والد ماجد نے شفقت پدری کے ساتھ محبت مادری کو ضم کر کے گوہر اشرف کی تربیت بڑے ہی پیار سے کی بلکہ نہایت احتیاط سے کی، چنانچہ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر جب مٹھائی بٹتی تو اس میں ہرگز شریک نہ ہونے دیتے بلکہ اس وقت خود بازار سے مٹھائی لاکر اپنے فرزند کو چکھا دیتے اور فرماتے کہ مسجد کی مٹھائی لینا بے غیرتی کی بات ہے۔

ف: مگر افسوس کہ اب عموماً ایسی باتوں سے احتراز نہیں کیا جاتا۔ (مرتب)

ابھی ۱۲، ۱۳ سال ہی کی عمر رہی ہوگی کہ آپ ''آہ سحر گاہی'' کی لذت سے آشنا ہو گئے چنانچہ اخیر شب میں اٹھ بیٹھتے اور نماز تہجد ادا کرتے اور مناجات فرماتے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی، فارسی کی کتابیں یہیں پڑھیں اور حافظ حسین علی صاحب دہلوی سے کلام پاک حفظ کیا، پھر تھانہ بھون آ کر حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ سے عربی کی ابتدائی کتابیں اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں چنانچہ آپ نے فارسی اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ''زیر و بم'' لکھی جس سے آپ کی فارسی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، اس وقت آپ کی عمر ۱۸؍سال سے زیادہ نہ تھی۔

دار العلوم دیوبند میں داخلہ: آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں مدرسہ دار العلوم

دیوبند میں داخل ہوئے اور پانچ سال یہاں تعلیم میں مشغول رہ کر ۱۳۰۱ھ میں فراغت حاصل کی۔

زمانہ طالب علمی میں عام طلبہ سے الگ تھلگ رہتے ، اگر کتابوں کے پڑھنے اور مطالعہ سے فرصت ملتی تو اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرس دار العلوم دیوبند، کی خدمت بابرکت میں جا بیٹھتے۔

آپ کو معقولات سے بھی خاصی مناسبت تھی مگر اس کو منقولات یعنی علوم دینیہ کے لئے علوم آلیہ کا درجہ دیتے تھے چنانچہ آپ کی ہر تحریر و تقریر میں یہ خصوصی جوہر نمایاں نظر آتا ہے۔

غایت تواضع و انکسار: باوجود علوم عقلیہ ونقلیہ میں کمال ومہارت کے اپنی نااہلی کا اس قدر استحضار تھا کہ جب خبر ملی کہ دستار بندی کا جلسہ ہونے والا ہے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے مقدس ہاتھوں سے یہ رسم ادا کی جائے گی تو اپنے ہم سبقوں کو جمع کر کے اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں پہونچے اور عرض کیا: حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی ہوگی اور سند فراغت دی جائے گی، حالانکہ ہم لوگ ہرگز اس کے اہل نہیں ہیں، اس لئے یہ تجویز منسوخ فرمادی جائے تو اچھا ہے، ورنہ اس سے مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی ہے، یہ سن کر صاحبِ بصیرت روشن ضمیر استاذ کو جوش آیا اور فرمانے لگے: تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔

یہاں چونکہ تمہارے استاذ موجود ہیں اس لئے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہئے مگر جب یہاں سے باہر جاؤ گے تو تمہیں

اپنی قدر ہوگی، ان شاء اللہ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم رہو گے، باقی سارا میدان صاف ہے۔

ف: یہ ملفوظ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اس وقت یاد آیا تھا جب کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ کے عظیم الشان جلسۂ تقریب میں شریک تھا، وہاں از صبح تا شام مولاناؒ کے کمالات علمیہ وعملیہ کا ذکر علماء یکے بعد دیگرے کر رہے تھے، اس حقیر کو غالباً ساڑھے نو بجے بیان کے لئے دعوت دی گئی، بندہ حاضر ہوا، چند باتیں بیان کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

مزید ایک حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے عرض کیا کہ ماشاء اللہ اب تک حضرت مولانا کے کمالات علمیہ وعملیہ کا بیان ہو رہا تھا جس کا میں خود معترف ہوں اور بیان کرتا رہتا ہوں۔

لہذا اب اپنے چھوٹے اور بڑے بھائیوں کو نصیحت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اب تک ہم نے یہ شعر سنا ہے ؎

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

مگر میرے عزیز! ہم کو اس سے کچھ زیادہ نفع نہ ہوگا۔ ہاں اگر ان اکابر کرام کے کمالات کو محنت وجانفشانی سے خود اپنے اندر پیدا کرو گے تو یہ ہمارے لئے موجب فخر وشرف ہوسکتا ہے اور خود اپنے اساتذہ اور مشائخ سے بزبان قال یا حال بطور احسان وامتنان عوام وخواص کے سامنے اس شعر کو سنیں تو یقیناً موجب سعادت ہے ؎

اولئک ابنائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا عزیز المجامع

یعنی یہ ہمارے باکمال شاگرد ہیں، لہذا اے مخاطب ایسے باکمال

شاگردوں کو پیش کر سکتے ہو تو کرو۔

اب حضرت حکیم الامتؒ کے ملفوظ کو بغور پڑھیں کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنے باکمال شاگرد کی کیسی تعریف فرمائی جو نقش قلوب کئے جانے کے لائق ہے۔ (مرتب)

افتاء: حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے آپ کی طالب علمی ہی کے زمانہ سے فتویٰ نویسی کا کام بھی سپرد فرمایا تھا، چنانچہ اللہ تعالی نے آپ کو افتاء کے کام میں کافی مہارت عطا فرمائی جیسا کہ امداد الفتاوی کی جلدیں اس پر شاہد ہیں۔

تجوید: فن قرأت میں بھی آپکو کمال حاصل تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالی نے حسن صوت سے بھی نوازا تھا جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا، آپ نے قرأت کی مشق قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے بمقام مکہ مکرمہ فرمائی تھی، آپ نے فن تجوید میں جمال القرآن جیسی عمدہ اور مفید کتاب تصنیف فرمائی۔

درس وتدریس: تعلیم کے مکمل کرنے کے بعد اب وقت آیا کہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند سے جو علم اور فیض حاصل کیا تھا اسے عام کریں، چنانچہ کانپور کے ایک مدرسہ جو "فیضِ عام" کے نام سے مشہور تھا وہاں سے آپ کو صدر مدرس کے لئے بلایا گیا تو آپ اپنے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور والد ماجد کی اجازت سے صفر ۱۳۰۱ھ میں ۲۵ر روپیہ ماہوار وظیفہ پر کانپور تشریف لائے، ابھی نوجوان ہی تھے مگر بہت جلد وہاں کے سارے مدرسین میں آپ کے علم وفضل کا شہرہ ہو گیا، ادھر درس وتدریس سے طلباء وعلما متاثر ہوئے تو ادھر آپ کے موثر مواعظ نے سارے کانپور والوں کو فریفتہ بنا دیا، اور یہ سب باتیں محض تین چار مہینے میں ہوئیں۔

مگر افسوس کہ اراکین مدرسہ نے حضرت اقدس کی مقبولیت سے مدرسہ کا مالی فائدہ حاصل کرنا چاہا اور وعظوں میں مدرسہ کے لئے چندہ کی اپیل کرنے کی خواہش ظاہر کی، مگر چونکہ حضرت حکیم الامتؒ اس قسم کے چندہ کے لئے اپیل کرنے کو علماء کی شان کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے آپ نے اس سے معذرت فرمادی، تو پھر کیا تھا، اراکین میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، آخر حضرتؒ کو بھی اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ملازمت سے استعفیٰ پیش کردیا پھر باوجود خوشامد اور اصرار کے اس مدرسہ میں رہنا گوارا نہ فرمایا بلکہ واپسیٔ وطن کا ارادہ فرمالیا مگر واپسیٔ وطن سے پہلے خیال فرمایا کہ قطبِ زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی زیارت کرلیں تو مناسب ہے اس لئے کہ مبادا پھر ادھر کا سفر ہو یا نہ ہو، چنانچہ حضرت والاؒ حضرت مولانا گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے، ادھر اہلِ کانپور کو حضرت کی تشریف بری سے جو خسارہ ونقصان ہوگا اس کا احساس ہوا، تو انہوں نے باہم مشورہ کرکے گنج مرادآباد سے واپسی پر حضرت حکیم الامتؒ کو باصرار روک لیا، چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ جامع مسجد پٹکا پور میں درس دینے لگے، اس طرح ایک نئے مدرسہ کی بنیاد پڑگئی، جس کا نام حضرتؒ نے جامع مسجد کی مناسبت سے ''جامع العلوم'' رکھا، اور چودہ سال تک یہاں درس وتدریس کی خدمت انجام دی اور سنہ ۱۳۱۵ھ میں یہاں سے تعلق ختم کرکے ''خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون'' کو رونق بخشی، اس سے حضرت الشیخ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ بہت خوش ہوئے اور تحریر فرمایا کہ:

''بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے، امید ہے کہ خلائق کثیر کو آپ

سے فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں گے، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں۔" (مکتوبات امدادیہ)

بزرگانِ دین سے عقیدت: حضرت حکیم الامت حضرات اہل اللہ سے خاص عقیدت و محبت رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں بالیدگی اور قلب میں نور پیدا ہوتا ہے، اس لئے حضرت اقدس اپنے وقت کے قریب قریب سارے ہی بزرگوں سے ملے اور ہر ایک کی دعا و توجہ اور لطف و کرم سے مستفیض ہوئے۔

تمتع زہر گوشۂ یافتم   زہر خرمنے خوشۂ یافتم

(ہر گوشہ سے ہم نے نفع حاصل کیا اور ہر کھلیان سے بالیاں چنیں۔)

ف: یقیناً طالب حق کی یہی شان ہوتی ہے کہ جس کوچہ سے بھی اس کی مشام جان میں بوئے محبت و نسبت محسوس ہوتی ہے وہ وہاں دیوانہ وار جاتا ہے اس میں نہ وہ شخصیت کو حائل ہونے دیتا ہے اور نہ عصبیت کو، بلکہ حضرت حکیم الامت نے کہیں فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے ہزار در پر بھی جانا ہوگا تو جاؤں گا عار نہ کروں گا، سبحان اللہ! یہ تھے حکیم الامت، جو پوری امت کے لئے اسوہ ہیں خصوصاً ان کے منتسبین کے لئے **واللہ یہدی الی سواء السبیل**۔ (مرتب)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے تعلق: حضرت حکیم الامت ابھی دارالعلوم دیوبند میں زیرِ تعلیم ہی تھے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کسی ضرورت سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، آپ کو دیکھ کر حضرت حکیم الامت اس قدر متاثر ہوئے کہ بیعت کی درخواست کر دی مگر حضرت مولانا گنگوہی نے دوران

تعلیم میں بیعت کرنے کو مناسب نہ سمجھا اور عذر فرمایا لیکن خاطر اشرف میں یہ خیال برابر پرورش پاتا رہا، آخر ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا گنگوہیؒ عازم حج ہوئے تو انہیں کے ہاتھ حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں عریضہ ارسال فرمایا اور لکھا کہ "آپ مولانا سے فرمادیں کہ مجھ کو بیعت کرلیں" نہ معلوم ان دونوں بزرگوں میں کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کے جواب میں خود تحریراً بیعت فرمالیا، اور حضرت حکیم الامتؒ کے والد ماجد کو کہلا بھیجا کہ "تم حج کو آؤ اور جب آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو لیتے آؤ۔"

حج بیت اللہ: شوال ۱۳۰۱ھ میں جب کہ حکیم الامتؒ طالب علمی کی زندگی گزار کر کانپور میں اشاعتِ علوم میں مصروف تھے، سفرِ حج کے اسباب پیدا ہوگئے اور اپنے والد ماجد کی معیت میں زیارت حرمین کے لئے روانہ ہوگئے اور نہایت جذبہ اور کیف و حال کے ساتھ مکہ معظمہ حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پہونچ کر نیاز حاصل کیا، جس سے حاجی صاحبؒ بیحد مسرور ہوئے اور دست بدست بیعت کی نعمت سے مشرف فرمایا اور خاص توجہ و عنایت فرمائی۔

حج ثانی: مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا، اندر ہی اندر آتش محبت بھڑک رہی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳۰۷ھ سے زندگی نے دوسرا رخ اختیار کیا اور باطنی اشغال سے دلچسپی بڑھی اور سارے تعلقات سے دل سرد پڑ گیا، حضرت شیخ سے ترکِ ملازمت کا مشورہ لیا مگر آپ نے اس کا مشورہ نہ دیا اس لئے حسبِ ارشاد درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، مگر ۱۳۱۰ھ میں شوق و اضطراب نے مجبور کیا اور مکہ معظمہ کے لئے رختِ

سفر باندھا اور روانہ ہو گئے، اور حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں چھ ماہ قیام کے ارادہ سے پہونچے، حضرت حاجی صاحبؒ نے بھی خاص عنایت فرمائی پس ادھر تو قوتِ افاضہ کا یہ حال، اُدھر قوتِ استفاضہ کا یہ کمال، اس کا یہ اثر ہوا کہ کچھ دنوں میں شاگرد و استاذ، مرید و پیر ہم رنگ ہو گئے، خود حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ ''بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو'' اور جب بھی حضرت حکیم الامتؒ کی کوئی تحریر آپ کی نظر اطہر سے گذرتی یا کوئی تقریر سنتے تو بے اختیار کہہ اٹھتے: جزاکم اللہ، تم نے میرے سینے کی شرح کر دی۔ اگر کوئی علوم و معارف کے متعلق پوچھتا تو آپ کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ''ان سے پوچھ لو یہ خوب سمجھ گئے ہیں''۔ مگر اس قدر حضرت حاجی صاحبؒ کی توجہ و عنایت دیکھ کر بعض حضرات کو حضرت حکیم الامتؒ سے رشک ہو گیا، اس لئے چھ مہینہ سے ایک آدھ ہفتہ پہلے ہی واپسیٔ وطن کا ارادہ فرمالیا۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو اجازت دیدی اور بوقت رخصت دو وصیتیں بطور خاص فرمائیں۔

(۱) دیکھو میاں اشرف، ہندوستان پہونچ کر تم کو ایک حالت پیش آئیگی عجلت نہ کرنا۔

(۲) کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا، توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔

(گویا ۱۳۰۸ھ میں جس ترک تعلق سے منع فرمایا تھا بعد حصول ''تمکین'' کے خود اس کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں) ان وصیتوں اور باطنی نسبت کو لے کر ۱۳۱۱ھ میں ہندوستان واپس آئے اور حسب سابق مدرسہ جامع العلوم میں

درس وتدریس کے شغل میں مصروف ہو گئے۔

مگر کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ کیفیت ''شوقیہ الٰہیہ'' نہایت جوش وخروش سے وارد ہوئی، اس زمانہ میں بقول حضرت حکیم الامت ؒ یہ حال تھا کہ جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذاکر وشاغل اور ولی بنادوں، لیکن یہ کیفیت بھی عارضی نکلی یعنی جب مقامات میں رسوخ بڑھتا گیا تو اس شوق نے دوسرا ہی رنگ اختیار کیا یعنی متوقع مقامات کی اضطرابی طلب رونما ہوئی، یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیشین گوئی حضرت شیخؒ نے اپنی پہلی وصیت میں فرمائی تھی، چنانچہ سارے مشاغل سے دل اُچاٹ ہوگیا، درس وتدریس سے دلچسپی ختم ہوگئی، وعظ کہنا چھوڑ دیا اور خلوت ویکسوئی اختیار فرمالی، اور اپنے شیخ کی وصیت یاد فرمائی اور اپنے قائم کردہ مدرسہ سے تعلق ترک کر کے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں قیام پذیر ہو گئے، حضرت حاجی صاحب ؒ کو اس سے بہت خوشی ہوئی اور دعادی، جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

مستقل قیام تھانہ بھون: ۱۳۱۵ھ سے آپ کا مستقل قیام خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ہوگیا اور اخیر تک رہا، آپ کے قیام سے خانقاہ امدادیہ کی رونق میں چار چاند لگ گئے اور اسی جگہ سے تجدیدی کارنامہ انجام دیا۔

جب آپ خانقاہ میں قیام پذیر ہوئے تو ابتداء میں آپ کا حال ہی کچھ اور تھا، خود سراپا سوز وگداز تھے اس لئے جو بھی آتا سوختہ وگداختہ ہوجاتا، مگر اللہ تعالی کو منظور ہوا کہ اپنے بندے کو اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرے اور اس راہ کی دشواریوں سے واقف کرائے تاکہ اس کے بندے کو رہبری میں سہولت ہو، چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ پر کسی ایسے حال کا غلبہ ہوا کہ اس کی وجہ سے اپنی زندگی ہی سے

بیزار ہو گئے، خودکشی تک کہ وسوسے آنے لگے، آخر اس حال سے اپنے شیخ کو مطلع کیا تو شیخ کامل نے مرید صادق کو ایسا تسلی بخش مضمون ارقام فرمایا کہ زخم پر پھایا رکھ دیا اور تسلی ہوگئی، اور راس دشوار گذار گھاٹی سے بسلامت پار ہو گئے، فللہ الحمد والمنۃ۔

اور اب مکمل طور پر مسند ارشاد پر جلوہ فرما ہو گئے اور تربیتِ سالکین اور اصلاح مسلمین کے کام میں ہمہ تن مشغول ہو گئے، اور راخیر دم تک اصلاح اخلاق، تزکیہ نفوس کے اہم بلکہ اصل کار میں لگے رہے، اور انبیاء علیہم السلام کے مقاصدِ بعثت میں جو اہم مقصد ہے اس کی خدمت میں اپنے ایک ایک لمحۂ حیات کو صرف فرمایا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ارشادات حکیمانہ

فرمایا: اگر نفس کے ضروری حقوق میں یا عیال کے حقوق میں کسی قسم کی بھی کوتاہی کا احتمال ہو تو اس حالت میں یہاں (یعنی خانقاہ میں) قیام کرنا نافع نہیں۔ (رسالہ المبلّغ حصہ چہارم)

ف: سبحان اللہ! آپ کے یہاں حدود شرع کی کیسی کچھ رعایت تھی وہ اظہر من الشمس ہے اسی کو توسط واعتدال کہتے ہیں جو اس امت کا طغرائے امتیاز ہے۔ (مرتب)

فرمایا: مجھ کو ایسی پارٹی بندی پسند نہیں کہ ایک ہی خیال ومشرب کے ہو کر نسبتوں سے فرق ظاہر کریں جیسے ایک صاحب نے اپنے نام کے ساتھ اشرفی لکھا تھا، بلاضرورت ایسی نسبتیں متضمن مفاسد ہیں۔ (حوالہ بالا)

ف: یہ بھی حضرت کی حقانیت اور للہیت کی بات ہے کہ اپنی طرف نسبت کو بھی

گوارا نہ فرمایا، مگر افسوس کہ اب ہم لوگوں کا یہ حال نہیں ہے۔ (مرتب)

فرمایا: میں اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں اور خود بھی اس پر عامل ہوں کہ حق تعالیٰ سے اپنی بہبود اور فلاح کے لئے دعا کریں، یہ بڑا عمل ہے اور اس سے بڑا عمل یہ ہے کہ خدا کے راضی کرنے کی فکر میں لگ جائیں، اگر مسلمان ایسا کریں تو چند روز میں ان شاء اللہ کایا پلٹ ہو جائے، حقیقی مالک تو حق تعالیٰ ہی ہیں اس لئے انہیں سے مانگو۔

ف: یقیناً فلاح و بہبود حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے جو حضرت حکیم الامتؒ نے ارشاد فرمایا، کاش کہ ہم مسلمان اس پر عمل پیرا ہو جاتے تو پھر کام بن جاتا۔ (مرتب)

فرمایا: روزی کا مدار عقل پر نہیں، محض عطائے حق پر ہے ایسے لاکھوں ہزاروں ہیں کہ بیوقوف ہیں مگر ان کو رزق عقل والوں سے ہزاروں درجہ زائد مل رہا ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **اِنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ** اللہ تعالیٰ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے۔

اس لئے اس کا ملنا غیر اختیاری ہے چنانچہ بعض لوگ ساری عمر افلاس میں گذار جاتے ہیں، پس اگر کسی کو وسعتِ رزق میسّر ہو جائے تو اس کی قدر کرنی چاہئے اور اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ کفرانِ نعمت نہ ہونے پائے۔

ف: یہ نصیحت ہر صاحب دولت و نعمت کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے تاکہ شکر نعمت ادا ہو۔ و باللہ التوفیق۔ (مرتب)

فرمایا: میری رائے ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ بلا توسط کسی تفسیر کے مثل

دوسرے متونِ کتاب کے محقق استاذ سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہئے، ایسا نہ ہونے سے طلبہ کو قرآن مجید سے مناسبت نہیں ہوتی، یہ خود ایک مستقل مقصود ہے اس لئے اہل مدارس کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ (حوالۂ بالا)

فرمایا: مجھ کو یہ بات بہت ہی ناپسند ہے کہ لوگ دوسروں کو بہکا بہکا کر مرید کرانے کے لئے لاتے ہیں، یہ بڑی غیرت کی بات ہے۔

ف: سبحان اللہ! کیسی عمدہ بات ارشاد فرمائی جو نقشِ قلوب کئے جانے کے لائق ہے، خصوصاً حضرت حکیم الامت ؒ کے منتسبین کے لئے، اور یہ بات تو عقلاً بھی قبیح معلوم ہوتی ہے اسلئے کہ جب طالب کے اندر مطلوبیت کی شان پیدا ہو جائیگی تو بھلا اس کو شیخ سے کیا نفع ہوگا؟ (مرتب)

فرمایا کہ روپیہ کو حفاظتِ دین کا ذریعہ بنانا اسکی اعلیٰ درجہ کی قدردانی ہے، مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس قدر قدر کرو کہ دین کی بے قدری ہونے لگے، اگر دونوں کو جمع نہ کرسکو تو پھر دنیا کو دین پر نثار کردو اور اگر جمع کرسکو تو کرو مگر اس کی شرط یہی ہے کہ دین محفوظ رہے حقوق واجبہ ادا ہوتے رہیں، ورنہ وہ مال وبالِ جان بلکہ وبالِ ایمان ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نعمت کی قدر ہونی چاہئے مگر نہ اتنی کہ منعم کی بے قدری ہونے لگے۔ ہمارے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں، عاشق ذاتی وصفاتی نہیں، اسلئے کہ جب تک آرام سے رہتے ہیں کچھ محبت رہتی ہے اور تکلیف میں کچھ بھی نہیں رہتی۔

نعمتِ مال کے بے قدری کی دو صورتیں ہیں: ایک اسراف، دوسرے

بخل ،اسی لئے اسراف اور بخل دونوں کی ممانعت ہے ،یعنی اگر مال غیر مستحق کو دیا تو یہ اسراف ہوگیا اور اگر مستحق کو بھی نہ دیا تو یہ بخل ہے،اور یہ دونوں ہی صورتیں نعمتِ الٰہی کی بے قدری کی ہیں ۔

پھر بخل اور اسراف میں بھی فرق ہے یعنی دونوں ہی بُرے ہیں مگر اسراف بخل سے زیادہ برا ہے،اس لئے کہ اسراف بعض اوقات افلاس کا سبب ہو جاتا ہے اور افلاس کفر کا، رہا بخل تو اس سے کفر نہیں ہوتا۔

اس لئے میں عوام کے خیال کے خلاف اسراف کو زیادہ برا سمجھتا ہوں جس کی وجہ ظاہر ہے کہ بخیل کو حاجات میں پریشانی نہیں ہوتی اور مسرِف کو پریشانی ہو جاتی ہے اور اس پریشانی میں اپنا دین تک چھوڑ دیتا ہے۔

(رسالہ المبلغ، جمادی الاول ۱۳۵۸ھ)

ف: حضرت حکیم الامت ؒ کا یہ ملفوظ نہایت جامع اور بصیرت افروز ہے لہٰذا اس کا مطالعہ بغور کریں اور اس کے مطابق کاربند ہوں۔(مرتب)

فرمایا کہ سرکشی ،تمرد دربارِ الٰہی میں بیحد ناپسند ہے ،ان کے دربار میں تو عاجزی،عبدیت،انکساری، بندگی،تواضع،خضوع جیسی صفات پسندیدہ ہیں۔

ف: یہی انبیاء علیہم السلام کا طریق رہا ہے اور اسی پر چل کر اولیاء کامیاب ہوئے ہیں لہٰذا اس کو پیشِ نظر رکھنا ان کے منتسبین کے لئے لازم ہے۔(مرتب)

فرمایا: اصلاح کا باب نہایت ہی نازک ہے ہر شخص اصلاح نہیں کرسکتا، جیسے ہر شخص طبیب نہیں بن سکتا اور علاج نہیں کرسکتا،چنانچہ صالح بننا سہل ہے مگر مصلح بننا مشکل ہے جیسے تندرست ہونا آسان مگر معالج بننا مشکل ہے۔

ف: سبحان اللہ! کیا ہی حکمت و دانائی کی باتیں ہیں جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ (مرتب)

فرمایا کہ محض محبتِ طبعی سے کام نہیں چلتا بلکہ محبتِ عقلی کی ضرورت ہے خواجہ ابوطالب کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ طبعی محبت تھی مگر عقلی نہ تھی اس لئے وہ کچھ بھی کام نہ آئی، اگر ان کو عقلی محبت ہوتی تو سب سے پہلے وہی ایمان لاتے۔

ف: بہت ہی نکتہ کی بات ارشاد فرمائی جس سے خواجہ ابوطالب کے ایمان نہ لانے کا مسئلہ بخوبی حل ہوگیا۔ (مرتب)

فرمایا: سلامتی اس میں ہے کہ شغل سے خالی نہ رہے خواہ وہ دنیا ہی کے کسی جائز کام میں مشغولی ہو، ہر حال میں شغل بے شغلی سے اچھا ہے، تجربہ ہے کہ جب انسان بالکل خالی ہوتا ہے اس پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔

ف: اسی لئے حضرت عمرؓ فرماتے تھے: **اِنِّی لَاَکْرَہُ اَنْ اَرٰی اَحَدَکُمْ سَبَهْلَلاً لَا فِیْ عَمَلِ الدُّنْیَا وَلَا فِیْ عَمَلِ الْآخِرَۃِ**" میں ایسا آدمی پسند نہیں کرتا جو بیکار ہو، نہ دین کا کام کرے اور نہ دنیا کا۔ (مرتب)

فرمایا: آفت آج کل یہ ہے کہ کام شروع کرتے ہی ثمرات کے طالب ہو جاتے ہیں، ارے میاں! کیا ثمرات لئے پھرتے ہو یہی کیا تھوڑا ہے کہ کام میں لگ جانے کی توفیق عطا فرمادی گئی ہے؟

ف: سبحان اللہ! کتنی معرفت کی بات فرمائی، اسی لئے تو آپ کو حکیم الامت کہا جاتا ہے۔ (مرتب)

فرمایا: قربِ الٰہی کیلئے ظاہر و باطن دونوں کی تکمیل اور درستی کی ضرورت

ہے، یہ افراط او رتفریط ہے کہ بعض نے ظاہر سے انکار کر دیا اور بعض نے باطن سے۔

(رسالہ المبلّغ جمادی الاولی: ۱۳۵۸ھ)

فرمایا: مجھ کو کسی اور بات کا اتنا اہتمام نہیں جس قدر تہذیب اخلاق و دیانت کا ہے کیونکہ درس وتدریس کا اہتمام تو ہر جگہ ہوتا ہے لیکن اخلاق کی طرف کسی کو خیال بھی نہیں ہے۔ (بصائر: ۵۴ ر مؤلفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحبؒ)

ف: اصلاح اخلاق ہی کے نہ ہونے کی وجہ سے تو درس وتدریس کی جگہوں میں بھی فساد رونما ہے جبکہ اس کی ضرورت ہر فرد اور ہر جماعت کو ہے بلکہ فرض ہے مگر عوام تو عوام اکثر خواص کو بھی اس کی طرف توجہ نہیں ہے، العیاذ باللہ تعالی۔ (مرتب)

فرمایا: دین صرف چند ظاہری اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کا نام نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑھ کر تو عقائد کا درجہ ہے جس پر نجات کا دارومدار ہے۔ اور ایک درجہ اخلاقِ حمیدہ مثلاً اخلاص، صبر، شکر اور تواضع وغیرہ کا ہے، یہ بھی محققین کے نزدیک نماز روزہ ہی کی طرح فرض ہے اگر کوئی چند اعمال ظاہری کو پورا کرلے مگر نہ عقائد درست ہوں اور نہ اخلاق درست ہوں تو ایسی صورت میں اس کو پورا مسلمان نہ کہا جائے گا۔ (بصائر: ۱۲۸، از انفاس عیسیٰ)

ف: ماشاء اللہ! کیا ہی خوب توضیح فرمادی جو قابل استحضار ہے۔ اور یقیناً لائحہ عمل بنانے کے لائق ہے۔ (مرتب)

فرمایا: کامل وہ ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کا پورا متبع ہو، طریق سنت میں اعتدال ہے، افراط وتفریط نہیں ہوتی۔

(حکیم الامتؒ: ص ر ۹۹ مؤلفہ سید محمود حسن صاحب)

ف: اس سے طریق سنت کی کیسی اہمیت معلوم ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی شاہراہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ بغیر اس راہ پر چلے کوئی اللہ تک پہونچ ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید　　که هرگز بمنزل نخواهد رسید

یعنی جس نے حضور اقدس ﷺ کے طریق کے خلاف راہ اختیار کی تو وہ ہرگز منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتا۔

فرمایا: اصلی شیخ وہی ہے جس سے غم وغصہ، رنج وراحت وغیرہ کے تمام احوال میں سبق حاصل ہو۔ (حکیم الامت: ص/۹۹ مؤلفہ سید محمود حسن صاحب)

ف: اس لئے کہ شیخ اگر آرام وراحت میں تو صراط مستقیم پر رہے اور غم وغصہ میں ازخود رفتہ ہو جائے تو بھلا مرید اس سے کیا نصیحت حاصل کرے گا، وہ تو خود ہی ناقص اور لائق اصلاح ہے۔ ع

او خویشتن گم ست کرا رہبری کند

یعنی وہ خود ہی گمراہ ہے تو دوسروں کی کیا رہبری کرے گا؟! (مرتب)

فرمایا: مجھے محبت تو سب احباب و متعلقین سے ہے لیکن ایسا تعلق کسی سے نہیں کہ دل اٹکا رہے، یہ تعلق تو بس اللہ ہی سے رکھا جائے اگر توفیق ہو۔

(حکیم الامتؒ: ص/۱۷۸)

ف: سبحان اللہ! کیسی جامعیت تھی کہ دونوں قسم کے حقوق کی رعایت فرمائی اور اپنے قلب کی حفاظت کا کیسا اہتمام فرمایا کہ سوا اللہ تعالیٰ کے کسی غیر سے دل متعلق نہ رہا۔ (مرتب)

فرمایا: موحد کو ایسا اطمینان ہوتا ہے جیسا کہ بچہ کو ماں کی گود میں اطمینان ہوتا ہے، بچہ ماں کی گود میں جا کر بالکل بے فکر ہو جاتا ہے کہ بس اب کسی کا خوف نہیں۔ (حوالۂ بالا)

فرمایا: کامل یکسوئی کا انتظار فضول ہے، یہ تو دنیا میں پھنس کر ہو ہی نہیں سکتا، اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ اسی پریشانی کی حالت میں تعلق مع اللہ کا سلسلہ بھی شروع کر دو، پھر رفتہ رفتہ اطمینان بھی نصیب ہو جائے گا ورنہ عمر یونہی ختم ہو جائے گی اور یکسوئی نصیب نہ ہوگی۔

ف: بڑی ہی حکمت اور دانائی کی بات فرمائی جو ہم جیسے لوگوں کے مرض کا بہترین علاج ہے، یہ حضرت حکیم الامتؒ کی خصوصی باتیں ہیں جو ارشاد وتربیت کے باب میں آپ کی مہارت پر دال ہیں۔ (مرتب)

فرمایا: بندہ کا کام تو ہر حال میں بندگی ہے، کتنی ہی بدمزگی ہو اور کسی قدر بے لطفی ہو، پریشان مت ہو، برابر کام کئے جاؤ، دھن لگائے رکھو، اگر عمل میں اخلاص نہ ہو تاہم عمل نہ چھوڑو کہ بھی عمل کرتے کرتے اس کی برکت سے بھی اخلاص پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ ان دونوں میں تجاذب ہے۔ (یعنی ایک دوسرے کی طرف کشش ہے)

ف: سبحان اللہ! کیسی تسلی کی باتیں ہیں جو سالکین راہ کے لئے مینارۂ نور اور اللہ تعالیٰ کے طالبین کے لئے آب زلال (شیریں) سے کم نہیں۔ (مرتب)

فرمایا: اصل مقصود احکام کی پابندی ہے، لذت مقصود نہیں پس اگر کوئی شخص احکام کو پابندی سے بجالاتا ہو، گو لذت اور مزہ نہ ہو تو مقصود سے کامیاب ہے۔

ف: حضرت حکیم الامتؒ کا یہ ارشاد سلوک وتصوف کی روح ہے بلکہ اصل دین ہے جس کو نہ سمجھنے سے طالبین پریشان رہتے ہیں جبکہ وہ احکام الٰہیہ کی پابندی بھی کرتے ہیں مگر کیف ولذّت کے عدم حصول سے یاس وناامیدی تک کے شکار ہوجاتے ہیں جو شرعاً قباحت سے خالی نہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصل طریق کو سمجھنے کی توفیق مرحمت فرمائے، اور مقصود میں تمیز کی فہم عطا فرمائے۔ (مرتب)

فرمایا: مسلمان کے لئے یہی ایک (کارآمد) چیز ہے کہ خدا کے راضی کرنے کی سعی میں لگا رہے، اگر وہ راضی ہیں تو اس نے سب کچھ پالیا اور حاصل کرلیا ورنہ تو اگر اس کو دنیا ومافیہا بھی مل جائے تو مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔

ف: حدیث شریف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی وقعت مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتے، کاش کہ ہم سب مسلمان اس بات کو سمجھتے تو اپنے دین وایمان کی قدر کرتے اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر ہزار شکر بجالاتے۔ (مرتب)

فرمایا: حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے، انسان کا کام صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہوسکے کرتا رہے، اللہ تعالیٰ طلب کو دیکھتے ہیں اگر ادھر سے طلب ہے تو اُدھر علم ہے اور قدرت بھی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب کچھ عطا ہوکر رہیگا۔

فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں کسی غزوہ سے بے شمار مال ودولت لائی گئی تو آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا، آپ کا ارشاد ہے: **زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ**

خوش نما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے چاندی کے۔

اے پروردگار! جب آپ نے خود ہی کسی مصلحت سے ان چیزوں کی محبت کو مزین کر دیا ہے تو یہ درخواست کرنا کہ ہمارے دل میں اس کی محبت ہی نہ ہو خلافِ ادب ہے، اس لئے ہم اس کی درخواست نہیں کرتے بلکہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس کی محبت کو اپنی رضا کا ذریعہ بنا دیجئے۔ (اصلاح المسلمین: ص ر ۹۹)

ف: سبحان اللہ! حضرت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیسی معرفت کی بات ارشاد فرمائی جو ہم سب کے لئے شمعِ رہنما ہے۔ (مرتب)

ارشاد فرمایا: ہر قوم کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے، بدون اس کے کام نہیں چل سکتا، پس مطالبِ قرآن وحدیث اور احکام دین تو لیڈروں کو علماء سے پوچھنا چاہئے، اور ترقی قومی کے اسباب ووسائل لیڈروں کو سوچنا چاہئے۔

(اصلاح المسلمین: ص ر ۱۷۰)

ف: کاش ہمارے لیڈران قوم حضرت حکیم الامتؒ کی اس نصیحت پر عمل کرتے تو ان کی لیڈری میں چار چاند لگ جاتے اور ان کا شمار عند اللہ خدام دین میں ہو جاتا، اور عند اللہ مقبول وماجور قرار پاتے، اس لئے کہ اگر کسی کی سعی سے احکام اسلام میں تبدیلی رک جائے اور مساجد ومدارس کی حفاظت ہو جائے نیز عام مسلمانوں کے سرکاری اور دیگر امور انجام پائیں تو کیا یہ خدمت دین نہیں ہے؟ میرے نزدیک تو یہ عظیم کارِ خیر اور اہم خدمتِ دین ہے۔ (مرتب)

رذائل فطری چیزیں ہیں: فرمایا: نفس کی ساخت ہی ایسی رکھی گئی ہے کہ

رذائل سے خالی نہ ہو، چنانچہ کم وبیش رذائل سب میں موجود ہیں الاماشاءاللہ تعالیٰ لیکن جب تک وہ رذائل قوت سے عمل میں نہ لائے جائیں اوران کاظہور بذریعۂ صدورِ اعمال نہ ہوکوئی مواخذہ نہیں جیسے دیاسلائی میں سب مادے جل اٹھنے، بھڑک اٹھنے کے موجود ہیں لیکن اس کو اگر رگڑا نہ جائے تو چاہے جیب میں لئے پھرئے کوئی اندیشہ نہیں، ہاں اس کی ہروقت سخت احتیاط رکھنی ضروری ہے کہ رگڑ نہ لگنے پائے۔ (بصائر: ص ر ۳۹۸، مؤلفہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحبؒ، از انفاسِ عیسیٰ)

ف: ماشاءاللہ تعالیٰ! اتنے اہم مسئلہ کو دیاسلائی کی مثال سے اس قدر واضح فرمادیا کہ اس سے حضرت حکیم الامتؒ کی شانِ تجدید نمایاں ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

اخلاقِ ذمیمہ کا امالہ: فرمایا کہ ریاضت سے اخلاقِ ذمیمہ کے اُصول کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی تہذیب ہوجاتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ان اُصولوں کے آثار کا امالہ ہوجاتا ہے یعنی ان اخلاق کا مصرف بدل جاتا ہے مثلاً کسی شخص میں منجملہ اخلاقِ رذیلہ کے بخل اور غضب موجود ہوتو ریاضت سے ان کی جڑ نہیں جاتی کہ غضب وبخل ہی نہ رہے بلکہ تہذیب اس طرح ہوجاتی ہے کہ پہلے مواقع خیر میں بخل کرتا تھا اور بندگانِ نیک پر غصہ کرتا تھا اب نامشروع جگہ بخل کرے گا اور مغضوبانِ الٰہی اور اپنے نفس پر غصہ کرے گا تو اسباب بعد اس طرح اسباب قرب بن گئے۔

ھکذا قال مرشدی (یعنی مرشدی حضرت حاجی صاحبؒ نے ایسا ہی فرمایا ہے۔)

اس سے اس اختلاف کا فیصلہ ہوگیا کہ ریاضت سے تبدیل اخلاق ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس سے معلوم ہوگیا کہ تبدیل اصول تو نہیں ہوسکتی، حدیث میں ہے ''**اِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ زَالَ مِنْ جِبِلَّتِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ**'' (یعنی جب کسی آدمی

کے متعلق سنو کہ کسی عادت سے نجات پا گیا تو اس کی تصدیق نہ کرو) مگر تبدیل آثار ومصارف ہو سکتی ہے اس لئے حکم ہے مجاہدہ وریاضت کا۔

(بصائر: ص/۳۹۸، التکشف: ص/۸۹، اشرف المسائل)

اخلاق ذمیمہ کا علاج: اخلاق ذمیمہ کے دوعلاج ہیں، ایک جزئی یعنی خاص، وہ یہ کہ ہر ہر خلق کا جدا جدا علاج کیا جائے جیسا کہ احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے، اس کو طریق سلوک کہتے ہیں، دوسرا کلی یعنی عام، وہ یہ کہ ذکر وشغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے، حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا کی جائے، جب اس کا غلبہ ہوگا تو اپنی ہستی وخودی مضمحل ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاق ذمیمہ کہ اس خودی ودعوائے ہستی سے پیدا ہوتے ہیں ختم ہوجائیں گے، اس کو طریق جذب کہتے ہیں اور طریق اول گو بے خطر ہے مگر طویل ہے اور طریق ثانی گو خطرناک ہے مگر قریب ہے اور ہر شیخ کا مذاق مختلف ہوتا ہے۔

(بصائر: ص ۳۹۸، التکشف: ص/۷۵، اشرف المسائل)

ف: اس لئے جس شیخ کا جو مذاق ہو اس کے مطابق علاج کرے، ہاں طالب کے مزاج کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے اس لئے کہ طالبین کی استعداد وصلاحیت کے مطابق جب اصلاح وتربیت ہوگی تو وہ مفید ثابت ہوگی۔ (مرتب)

اختیاری وغیر اختیاری کا مسئلہ: تعلیم وتربیت باطنی کے سلسلہ میں اختیاری اور غیر اختیاری کا مسئلہ حضرت حکیم الامتؒ نے اتنا واضح فرمایا ہے کہ صدیوں سے اس کا ایسا عام فہم بیان نہ ہوا تھا اور اس سے اتنا کام لیا ہے کہ ہزاروں مشکلات طریق اس کے ذریعہ سے حل فرمادیا، چنانچہ جب کوئی طالب اصلاح اپنے کسی رذیلہ کا علاج

پوچھتا تو حضرتؒ سب سے پہلے یہی سوال فرماتے کہ یہ اختیاری ہے یا غیر اختیاری؟ اگر وہ کہتا کہ اختیاری ہے تو فرماتے کہ جس بات کا فعل اختیاری ہے اس کا ترک بھی اختیاری ہے، ہمت کر کے اختیار کو عمل میں لاؤ اور چھوڑ دو، اگر وہ کہتا کہ غیر اختیاری ہے تو اگر وہ دراصل غیر اختیاری ہوتا تو فرماتے کہ غیر اختیاری کا آدمی مکلف ہی نہیں، پھر اس میں دینی ضرر ہی کیا ہوا جو اس کا علاج پوچھا جاتا ہے؟ اگر وہ کہتا کہ ہے تو غیر اختیاری مگر اس کی وجہ سے تکلیف و پریشانی تو ہے، اور یہ تو قابل علاج ہے تو جواب ارشاد فرماتے کہ تکلیف و پریشانی کا علاج میرے ذمہ نہیں۔

حضرتؒ فرماتے کہ یہ اختیاری اور غیر اختیاری کا مسئلہ گویا نصف سلوک ہے، بلکہ قریب قریب سارا سلوک ہے، حقیقت یہ ہے کہ جتنے بھی ظاہری و باطنی اعمال ہیں جن کا تعلق اوامر ونواہی سے ہے سب اختیاری ہیں اور فرض وواجب ہیں، ہر شخص اس کا مکلف ہے لیکن ان اعمال کے جتنے تاثرات وانفعالات ہیں خواہ خواطر ووساوس ہوں یا قبض وبسط یا وجدانیات وکیفیات ہوں سب غیر اختیاری ہیں، اس لئے وہ نہ مضر ہیں اور نہ ان پر کوئی مواخذہ ہے۔ (بصائر: ص/۵۸)

ف: حضرت حکیم الامتؒ کی اس اختیاری وغیر اختیاری بحث وتحقیق کو حضرت مصلح الامت مرشدی مولانا شاہ وصی اللہؒ اکثر بیان کرتے اور فرماتے کہ یہ حضرت حکیم الامتؒ کا تجدیدی کام ہے۔ (مرتب)

فرمایا کہ مجھے ڈاک کا بڑا اہتمام ہے کہ روز کے روز فارغ ہو جاؤں، اس میں طرفین کو راحت ہے ادھر تو میں فارغ، مجھے راحت، اُدھر خط کا جواب پہونچ جانے سے اس کو راحت۔

ف: سبحان اللہ! اپنی تو اپنی غیروں کی راحت کا کس قدر خیال کہ انتظار جواب کی کلفت وزحمت برداشت نہ کرنا پڑے، پس اس سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا چاہئے، خصوصاً ان کے منتسبین کو۔ (مرتب)

قابل قدر نصیحت: آپ لوگ اگر اپنی پوری اصلاح نہ کرسکیں تو کم از کم دو باتوں کا اہتمام کریں۔ (۱) ایک یہ کہ اپنے عقائد صحیح کرلیں۔ (۲) دوسرے جو ناجائز اعمال کرتے ہیں ان کو حرام سمجھ کر کریں، کھینچ تان کر ان کے جائز کرنے کی کوشش نہ کریں۔ (ص:۱۰۷، اصلاح المسلمین)

ف: بہت عمدہ نصیحت ہے جسے ہم سب لوگوں کو بھی مستحضر رکھنا چاہئے۔ (مرتب)

زندگی کا مدار: فرمایا کہ میری زندگی کا مدار تو استحضار ثواب پر ہے ورنہ اس قدر طبیعت کمزور واقع ہوئی ہے کہ اگر ثواب کا استحضار نہ ہو تو بعض حوادث کا تحمل ہرگز نہ کرسکتا تھا، پس یہ اعتقاد میری زندگی ہے کہ جہاں کوئی تکلیف پہونچی فوراً یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں ثواب ہے اس سے وہ کلفت جاتی رہتی ہے، اگر ثواب کا اعتقاد نہ ہوتا تو میں ختم ہی ہوجاتا، یہ امید ثواب ایسی قوت کی چیز ہے کہ بڑی سے بڑی کلفت اور رنج سہل کردیتی ہے اور افسوس ہے کہ اس کو آج کل معمولی چیز خیال کررکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ کوئی چیز نہیں۔ نعوذ باللہ استغفر اللہ۔ (الافاضات: ص/۴۶، ج/۲ ق ۱)

ف: سبحان اللہ! اس سے حکیم الامتؒ کا کس قدر ثواب کی طلب وحرص کا سراغ لگتا ہے جو سنت نبوی علیہ السلام کی اتباع اور آپ کے قوت ایمانی پر بین ثبوت ہے۔ (مرتب)

سب سے بڑا کمال: فرمایا کہ لوگ خاص خاص چیزوں کو کمال سمجھتے ہیں، کوئی عبادت کو، کوئی تقویٰ کو، مگر محققین سب سے بڑا کمال اس کو سمجھتے ہیں کہ بندہ

اپنے نقائص کو پیش نظر رکھے۔(حوالۂ بالا :ص ر ۲۱۵)

فرمایا کہ آج کل یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ ظالم کی طرفداری کی جاتی ہے اور مظلوم کا کوئی پرسان حال نہیں، عوام ہوں یا خواص تقریباً سب کے اندر یہ مرض عام ہوگیا ہے۔(حوالۂ بالا:ص ر ۳۱۹)

ف: سبحان اللہ! کیا خوب تجربہ کی بات لکھی جس کا ہم جیسے لوگوں کو بھی تجربہ ہو رہا ہے اور زیادہ تعجب اس زمانہ کے خواص سے ہے کہ اندھا دھن اپنی ذاتی مصلحت یا خالص عصبیت کی بناء پر ظالم کی کھلے عام طرفداری کی جارہی ہے جبکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ جو شخص خانۂ کعبہ میں رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان ستّر سال عبادت کئے ہوئے ہو مگر کسی ظالم سے محبت رکھتا ہو تو اللہ تعالی اس کو قیامت کے دن اسی ظالم کے ساتھ محشور فرمائیگا۔ العیاذ باللہ تعالی۔

(اقوال سلف: ج ر ۱،ص ر ۷۷، از اعیان الحجاج: ج ر ۱)

ادارہ کا مفید کام: فرمایا کہ دوسرے اداروں میں تو مالی ذخائر ہیں اور یہاں ان کی نسبت بے سروسامانی ہے مگر اللہ کا فضل ہے کہ جس قدر مفید کام یہاں ہو رہا ہے دوسری جگہ نہیں ہو رہا ہے، یہاں پر درس وتدریس کا کام تو معمولی ہے لیکن تصنیف کا کام نیز طالبین کی تربیت واصلاح کا کام خاص اہتمام سے ہو رہا ہے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، یہ کوئی فخر کی راہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایک نعمتِ حق سمجھ کر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر یہ عرض کر رہا ہوں اور اس میں فخر ہی کی کون سی بات ہے، سب اپنے بزرگوں کی دعاؤں کی برکت اور خداوند جل جلالہ کی رحمت ہے۔

(افاضات: ج ر ۴،قسط ر ۴،ص ر ۳۴۶)

ف: سبحان اللہ! حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے ادارہ کی کیسی خصوصیت فرمائی جو نقش قلوب کئے جانے کے لائق ہے۔ اللہ ہمیں بھی اس نعمت سے نوازے۔ آمین (مرتب)

فرمایا کہ تربیت واصلاح کا کام بڑا ہی نازک ہے اس میں بڑے ماہر فن کی ضرورت ہے، اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شیخ کا ولی ہونا بزرگ ہونا قطب ہونا غوث ہونا ضروری نہیں ماہر فن ہونا ضروری ہے، بدون اس کے اصلاح وتربیت نہیں کرسکتا۔ (حوالہ بالا: ج ر ۴ ص ر ۳۵۶)

ف: بہت ہی خوب بات ارشاد فرمائی اس لئے اپنی اصلاح کے لئے ایسے مرشد کو تجویز کرنا چاہئے جو اصلاح وتربیت کے معاملہ میں ماہر ہو۔ (مرتب)

تصانیف

کسی بزرگ کی تصانیف بھی ان کی وفات کے بعد انکی خلیفہ ہی ہوا کرتی ہیں یعنی ان سے ان کا فیض روحانی رواں دواں رہتا ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ حضرت حکیم الامتؒ کی صدہا تصانیف سے علمی وروحانی کس قدر فیض پہنچ رہا ہے جو بیان سے باہر ہے، حضرت حکیم الامتؒ خود اپنی تصانیف کے متعلق یوں ارشاد فرمارہے ہیں: ''اگر مناسبت ہوجائے تو انہی کتابوں کو لیکر بیٹھ جائے، عمر بھر کی رہبری کے واسطے کافی ہیں مثلاً ''قصد السبیل، تعلیم الدین، تربیت السالک وغیرہ''۔

(ملفوظ: ۲۸ ر شوال المکرم: ۱۳۴۴ھ)

خاص طور سے ''حیوٰۃ المسلمین'' کے متعلق تو یہاں تک ارشاد فرمایا کہ ''مجھ کو اپنی کسی تصنیف کے متعلق خیال نہیں ہے کہ یہ میرا سرمایۂ نجات ہے، البتہ ''حیوٰۃ المسلمین'' کے متعلق میرا غالب خیال قلب پر ہے کہ اس سے میری نجات ہوجائے

گی اس میں اپنی ساری عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں۔" (تالیفات اشرفیہ: ص/۴)

حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے مواعظ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ:

"لوگ مواعظ نہیں دیکھتے، حالانکہ ان میں سب کچھ ہے، گو چَھپے ہیں، مگر چُھپے ہوئے ہیں، ان میں وہی باتیں ہیں جو علماء و صلحاء کی کتابوں میں ہیں، کوئی جدید بات نہیں ہے، صرف زمانہ کا لحاظ ہے، جو شیخ الرئیس کے نسخے ہیں وہ بعینہٖ محمود خاں کے زمانہ میں کام نہیں آتے، وہاں قدح بھر دوائیں ہوتی تھی، یہاں مختصر سے کام لیا جانے لگا۔" (ملفوظ: ۶/ ذوالقعدہ ۱۳۴۴ھ)

ف: معلوم ہوا کہ شیخ وقت کو حالات زمانہ سے واقف ہونا چاہئے اور اہل زمانہ کے مزاج و عقل سے آگاہ ہونا چاہئے اور اسی کے مطابق کلام کرنا چاہئے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے: **کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ** (یعنی لوگوں سے انکی عقلوں کے موافق بات کرو۔) (مرتب)

اب ہم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ترجمہ کردہ کتاب سے مفید اقتباسات نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

تمہید

مجھے اس وقت بہت ہی مسرت ہوئی جب مولانا شیر محمد صاحب مکرانی نے ایک نہایت اہم کتاب مؤلفہ شیخ ابن عطاء اسکندری قدس اللہ سرہ مسمّٰی بہ "التنویر فی اسقاط التدبیر" اس حقیر کو عنایت فرمائی تو **"الکلمۃ ضالۃ المومن"** کے طور پر بہت خوشی ہوئی۔

اس کتاب کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جب شیخ العلماء حضرت

حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت اقدس میں حضرت حکیم الامت برائے استفادہ موجود تھے تو حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ ”التنویر فی اسقاط التدبیر“ کا ترجمہ اردو میں ہو جاتا تو امت کے لئے بیحد مفید ہوتا۔

چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ نے اس کو قبول فرمالیا۔ اور خود حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں:

خدا در انتظار حمدِ ما نیست　　محمد چشم بر راہِ ثنا نیست

خدا مدح آفریں مصطفیٰؐ بس　　محمد حامدِ حمد خدا بس

مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد　　بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد

محمدؐ از تو می خواہم خدا را　　الٰہی از تو حبِ مصطفیٰ را

ایک روز پرنور ممدوح الذکر دام ظلہم کی محفل قدس و مجلس انس میں کہ منبع فیوض و انوار و معدن برکات و اسرار ہے، منجملہ افادات اس مضمون کا بھی تذکرہ ہوا از انجا کہ مقبولانِ الٰہی، مظہر اتم صفتِ رحمت کے ہوتے ہیں حضور ممدوح دام ظلہم کو براہ شفقت و دل سوزی خیال ہوا کہ ان غریقان بحر غفلت کو ساحل ہدایت پر لانے کی کوئی صورت نکالی جاوے۔ ارشاد فرمایا کہ کتاب **”التنویر فی اسقاط التدبیر“** تصنیف حجۃ الاولیاء ابن عطاء، صاحب حکم قدس سرہ اس مبحث میں خوب ہے۔ جس کا ہر مضمون مدلل بدلائل عقلیہ و نقلیہ و کشفیہ ہونے کے سبب سے مقبول و مرغوب ہے، اگر اردو زبان میں اس کا ترجمہ ہو جاوے تو نفع اس کا عام اور فیض اس کا تام ہو۔ اور عجب نہیں کہ مدعیان مذکور بھی بشرط فہم و انصاف و ترک تعصب و اعتساف راہ راست پر آویں، ورنہ اور سادے مسلمان تو اس اعتقاد فاسد اور خیالِ

کاسد سے محفوظ رہیں گے اور کسی کے دام میں نہ پھنسیں گے، اور نیز اس سے طلباء کو علم اور علماء کو عمل اور عابدوں کو معرفت اور عارفوں کو حال اور اہل حال کو مقام اور اہل مقام کو کمال اور اہل کمال کو دولت بے زوال نصیب ہوگی۔ اور اس نادان ناکارہ کو جو خاص واسطے استفادۂ معانی و برکات کے حضور میں ہند سے چند ماہ کا آیا ہوا تھا اور اس وقت حاضرِ محفل فیض منزل تھا ترجمے کے لئے فرمان ہوا جس پر میں باوجود اپنی نااہلیت کے امتثالاً للامر مستعد بدل و جان ہوا، روزانہ تھوڑا تھوڑا لکھتا اور حضور میں سنا دیتا، یہاں تک کہ بہت تھوڑی مدت میں بحمد اللہ اتمام کو پہنچا اور **"الاکسیر فی اثبات التقدیر"** نام رکھا گیا، میری بد استعدادی و کاہلی پر اس امر کا سرانجام ہونا محض حضور دام ظلہم کا فیضان ہے ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

بعض مواقع پر تفصیل اجمال یا توضیح اغلاق کے لئے ترجمے سے زائد متن میں کچھ بڑھایا گیا اس کے شروع پر حرف ف اور اس کے ختم پر حرف ت لکھ دیا گیا، اور کہیں کہیں حاشئے پر حضور دام ظلہم کے بعض ارشادات جو وقت استماعِ ترجمہ فرماتے جاتے تھے لکھ کر ختم پر لفظ "ملفوظ" لکھ دیا، اور بعض جگہ جو ازخود کچھ لکھا اس کے بعد مترجم لکھ دیا۔ اور اس ترجمے میں حضرات اخوان الطریقت وخلان الحقیقت جناب مولوی محب الدین پشاوری، و جناب سید حمزہ صاحب دہلوی، و جناب مولوی ابو احمد صاحب بمبئی و جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب سنبھلی **سلمھم اللہ تعالیٰ و کرمھم و نعمھم** سے بہت مدد ملی، خصوصاً جناب مولوی سید حمزہ صاحب نے سب سے زیادہ مدد فرمائی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

پھر یہ ترجمہ حضرت تاج الادباء، سراج الفضلاء مولانا ذوالفقار علی صاحب رئیس دیوبند ضلع سہارنپور مدظلہ العالی کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیج دیا گیا، مولانا ممدوح کے نظر فرمانے کے بعد اب یہ ترجمہ ان شاء اللہ تعالیٰ قابل اطمینان ہے، پھر بھی اگر کہیں کوئی لغزش پائی جاوے وہ اس نادان کی طرف منسوب سمجھنا چاہئے۔ اور ناظرین سے امید ہے کہ جب اس کا مطالعہ فرماویں تو بزرگان مسبوق الذکر کو اور اس احقر کو دعائے خیر سے یاد فرماویں۔ یا الٰہی اس ترجمے کو مقبول فرما کر ذریعۂ ہدایت بنا اور ہم کو بھی توفیق عطا فرما۔

عرض ضروری: چونکہ تفصیل بعد الاجمال خوب دلنشین اور ذہن میں جاگزیں ہوتی ہے، اس لئے کتاب ہذا کا خلاصہ مضمون اجمالاً اول لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل فہم تکرار سے محظوظ ہوں گے اور کم فہم غلط فہمی سے محفوظ رہیں گے۔ وہو ہذا۔

جاننا چاہئے کہ تقدیر کے آگے تدبیر نہیں چلتی، مگر پھر بھی بہت سی مصلحتوں اور حکمتوں سے کہ بعض ان میں متعلق باسرار و حقائق ہیں تدبیر مشروع ہوئی، مگر چند شرائط کے ساتھ مشروط کی گئی کہ اصول ان کے سات امر ہیں:

(اول) وہ تدبیر شریعت کے خلاف نہ ہو۔ (دوم) تدبیر پر بھروسہ نہ ہو، بلکہ مسبب الاسباب پر نظر رہے۔ (سوم) اگر دنیا کی تدبیر کرے اس میں آخرت مقصود ہو۔ (چہارم) تدبیرِ دنیا میں اس قدر غرق نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے احکام سے غفلت ہو جاوے۔ (پنجم) صلحاء وعلماء کی صحبت ترک نہ کرے، تاکہ کدورت اسباب اثر نہ کرے۔ (ششم) حقوق شرعی ادا کرتا رہے۔ (ہفتم) ہر شخص اپنی حالت کے اعتبار سے ضرورت سے زائد جمع نہ کرے۔

یہ تو ہم نے درخت شمار کرادیئے، اب بسم اللہ کر کے باغ میں چلو اور علوم وحِکَم کے پھل نوش جان کرو۔ آگے ترجمہ شروع ہوتا ہے۔

واللہ الموفق، وهو الهادی الی صراط مستقیم۔

(اقتباسات از: الاکسیر فی اثبات التقدیر:۹)

مومنین کے قلوب کو مضبوط کرنے کی آیات

میں نے اپنے شیخ ابو العباسؒ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

"اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا" یعنی شیطان تمہارا دشمن ہے تم اس کو دشمن سمجھو۔

پس بعض لوگ تو اس خطاب سے یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے شیطان کے ساتھ عداوت کرنا مطلوب ہے انھوں نے اپنی تمام ہمتیں اس میں مصروف کر دیں، اس نے ان کو محبوب کی محبت سے غافل کر دیا، اور بعض لوگ یوں سمجھے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، یعنی میں دوست ہوں۔

ف: لان الاشیاء تعرف باضدادها۔ (ت)

وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت میں لگ گئے، اللہ تعالیٰ ان کو سب سے کافی ہو گیا۔ بعد اس کے اس عارف کی حکایت بیان فرمائی، یہ لوگ اگر شیطان سے پناہ مانگتے ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، نہ اس واسطے کہ یہ لوگ غیر اللہ کے لئے کچھ تصرف دیکھتے ہوں اور وہ لوگ غیر اللہ کے لئے کیسے تصرف دیکھ سکتے ہیں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ کو کہتے ہوئے سنتے ہیں:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ یعنی کسی کی نہیں چلتی سوائے اللہ تعالیٰ کے، اس نے فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پوجا مت کرو۔

اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

"**اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا**" یعنی شیطان کا داؤ بالکل بودا ہے۔

اور فرمایا:

"**اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ**" یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا قابو نہ چلے گا۔

اور فرمایا:

"**اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ**" یعنی شیطان کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو یقین رکھتے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اور فرمایا:

"**وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ**" یعنی جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے وہ اس کو کفایت کرتا ہے۔

اور فرمایا:

"**اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ**" یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست ہے نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے طرف نور کے۔

اور فرمایا:

"وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ" یعنی ہمارے ذمے پر ہے حمایت کرنا ایمان والوں کی۔

پس ان آیتوں نے اور جو ایسے مضمون کی ہیں مومنین کے قلوب مضبوط کر دیئے اور ان کی کھلی مدد کی۔ پس اگر شیطان سے پناہ مانگتے ہیں تو صرف اس کے فرمانے سے اور اگر نورِ ایمان سے اس پر غالب ہوتے ہیں تو اس کی حمایت سے اور اگر اس کے فریب سے سالم رہتے ہیں تو اس کی تائید و احسان سے۔

لاحول ولاقوۃ الاباللہ کی نافعیت: شیخ ابوالحسنؒ نے فرمایا کہ حالت سیاحی میں میری ایک شخص سے ملاقات ہوئی اس نے مجھ کو وصیت کی اور کہا کہ توفیق اعمال کے لئے ''**لاحول ولاقوۃ الاباللہ**'' سے بڑھ کر کوئی گفتار نہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگنے اور اس کی پناہ لینے سے بڑھ کر کوئی کردار نہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتا ہے وہ سیدھی راہ چلا جاتا ہے، پھر کہا: ''بسم اللہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کے نام سے مدد چاہتا ہوں۔ **"فررت الی اللہ"** یعنی بھاگا میں اللہ تعالیٰ کی طرف۔ **"واعتصمت باللہ"** یعنی میں نے اللہ تعالیٰ کی پناہ لی۔ ''**لاحول ولاقوۃ الاباللہ**'' یعنی گناہ سے بچنا اور عبادت پر قوت ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے ہے۔

"ومن یغفر الذنوب الا اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا گناہ کو کون بخش سکتا ہے۔

بسم اللہ زبان کا قول ہے جو قلب سے صادر ہوا۔ **فررت الی اللہ** وصف روح اور سر کا ہے۔ **واعتصمت باللہ** وصف عقل اور نفس کا ہے۔ **لاحول ولاقوۃ**

الا باللہ وصف ملکوت اور عالم امر کا ہے۔ **"ومن یغفر الذنوب الا اللہ"**۔

ف: اس کلام میں اشارہ ہے طرف لطائف اور ان کے آثار کے۔ت

یارب! شیطان کے عمل سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بے شک شیطان کھلا بہکانے والا دشمن ہے، پھر شیطان سے خطاب کر کے کہا: اللہ تعالیٰ کا علم تیرے حق میں یہی ہے کہ تو عدو مضل مبین ہے اور میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہوں اور اس پے توکل کرتا ہوں اور تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں اور اگر اس کا حکم نہ ہوتا تو میں تجھ سے پناہ نہ چاہتا تیری حقیقت ہی کیا ہے جو تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہوں۔

ف: یعنی اللہ تعالیٰ تو بڑا غالب قدرت والا ہے کسی سخت چیز سے اس کی پناہ مانگیں تو ہوسکتا ہے، تو بے چارہ کیا چیز ہے۔ (ت)

پس تو نے سمجھ لیا اللہ تعالیٰ کی تجھ پر مہر ہو کہ شیطان کی ان کے دلوں میں اتنی بھی قدر نہیں کہ اس کی طرف قدرت وارادے کو منسوب کریں۔

(الاکسیر فی اثبات التقدیر: ٦٥)

تنبیہ واعلام

جاننا چاہئے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کو نور رضا سے منبسط کر دیا تھا اور ان کو روح استسلام عطا فرمائی تھی اور ان کے قلب کو نظر الی الخلق سے محفوظ رکھا تھا، پس آگ اسی واسطے ان پر سرد وسلامتی ہوگئی کہ ان کا قلب اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوگیا تھا، پس استسلام سے رہے سلامت اور باطن مقام کے ٹھیک کرنے سے ہوئی یہ عزت وکرامت۔ پس یہاں سے مومن کو سمجھنا چاہئے کہ جو مواقع امتحان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت

اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ خار کو گل اور خوف کو امان کر دیتا ہے، پس جب شیطان تجھ کو منجنیقِ امتحان میں پھینکنا چاہے اور کائنات تیرے روبرو آ کر دریافت کریں کہ تجھ کو کچھ حاجت ہے؟ یہی جواب دینا کہ تم سے تو کچھ حاجت نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ سے ہے، اگر کائنات یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرے، اس کا جواب دینا کہ اس کا علم میرے سوال سے کفایت کرتا ہے، اگر تو ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ آتش دنیا کو سرد و سلامتی کر دے گا اور منت اور کرامت تجھ کو عطا فرمادے گا، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انبیاء اور مرسلین کے ذریعہ سے ہدایت کے رستے کشادہ کئے ہیں، پس اہل ایمان ان کی راہ چلے اور اہل یقین نے ان کی پیروی کو لازم جانا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ (یوسف:۱۰۸)

کہہ دو اے محمد! یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف، میں بھی سوجھ بوجھ والا ہوں اور میری اتباع کرنے والے بھی۔

اور یونس علیہ السلام کی شان میں فرمایا:

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (الانبیاء:۸۸)

ہم نے ان کی دعا قبول کی اور غم سے نجات دی اور اہل ایمان کو ہم یوں ہی نجات دیا کرتے ہیں۔

یعنی جو اہل ایمان قدم بقدم حضرت یونس علیہ السلام کے چلتے ہیں اور ان کے انوار کے مشتاق ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ذلت واحتیاج کے ساتھ مانگتے ہیں اور مسکنت اور انکسار کا لباس پہنتے ہیں ہم ان کو اسی طرح نجات دیا کرتے ہیں۔

رجوع بمطلب اصلی: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصے میں بیان ہے عبرت والوں کو اور ہدایت ہے بصیرت والوں کو۔ اور وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی تدبیر سے نکلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے بخوبی تدبیر کر دیتا ہے۔ دیکھو! ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ اپنی ذات کے لئے تدبیر و اہتمام نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے اس پر توکل کیا انجام اس اطاعت کا سلامتی اور عزت اور تعریف کا باقی رہنا مدت گزر جانے پر ہوا، اور ہم کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ان کی ملت سے خارج نہ ہوں اور ان کے نام رکھنے کا لحاظ رکھیں، جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرٰهِيمَ ۚ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۙ مِنْ قَبْلُ۔ ملت اختیار کرو اپنے باپ ابراہیمؑ کی انھوں نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا ہے پہلے سے۔

پس جو شخص ابراہیمی ہو اس کو سزاوار ہے کہ اپنے لئے تدبیر کرنے سے بری ہو اور اعتراض سے خالی ہو اور ملت ابراہیم سے وہی اعراض کرے گا جو سفیہ ہے، اور ان کی ملت کو لازم ہے تفویض الی اللہ اور اطاعت فی احکام اللہ۔ اور جاننا چاہئے کہ مقصود اعظم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی مراد باقی نہ رہے۔ (ص:۵۷)

تنبیہ واعلام: جاننا چاہئے کہ تدبیر کی دو قسم ہے۔

ایک تدبیر محمود، دوسری تدبیر مذموم۔

تدبیر مذموم تو وہ تدبیر ہے جس کا حظ تیری طرف لوٹ کر آوے، ادائے حق اللہ کے لئے نہ ہو، جیسے تدبیر کرنا کسی گناہ کی تحصیل میں یا کسی حظ نفسانی میں غفلت کے ساتھ یا کسی طاعت میں نمائش اور شہرت کے ساتھ اور مثل اس کے، یہ تمام تر مذموم ہے یا تو اس وجہ سے کہ اس سے استحقاق عذاب ہوتا ہے یا اس لئے کہ اس

سے وقوع حجاب ہوتا ہے، اور جو شخص نعمت عقل کو پہچانے گا وہ اس کو ایسی چیز کی تدبیر میں صرف کرتے ہوئے شرمائے گا جو اس کو قرب الٰہی تک نہ پہنچائے اور اس کی محبت کا سبب نہ بن جائے اور جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنی منت سے بندوں کو عطا فرمائی ہیں، عقل ان سب میں افضل ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کر کے ان پر دو چیزوں سے فضل فرمایا: ایک ایجاد دوسرا دوام امداد۔

ف: یعنی اول وجود عطا فرمانا پھر اس کو بقا دینا۔ت۔ اور ہر مخلوق کے لئے ان دو نعمتوں کا ہونا ضرور ہے، نعمت ایجاد و نعمت امداد، اور اس تقریر سے اللہ تعالیٰ کے معنی بھی سمجھ میں آسکتے ہیں:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔ میری رحمت سب چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (الاعراف:۱۵٦)

ف: یہ وہی رحمت ہے جو مذکور ہوئی۔ت۔

لیکن چونکہ ان دو نعمتوں میں تمام مخلوق شریک تھی اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ایک کو دوسری سے امتیاز دے، تا کہ تعلقاتِ ارادہ ومشیت کی وسعت ظاہر ہو جاوے، پس بعض موجودات کو تو صفتِ نمو سے ممتاز کیا جیسے نباتات وحیوانات وانسان۔ پس بنسبت موجوداتِ غیر نامیہ (یعنی جن میں نمو نہیں) ان تینوں میں قدرت کا زیادہ ظہور ہے۔

ف: کیونکہ ان میں ایک وصف یعنی نمو زیادہ ہے۔ت۔ (ص ر ۷۷)

پھر چونکہ یہ تینوں وصف نمو میں شریک تھے، حیوانات اور انسان کو حیات دے کر نباتات سے امتیاز دیا، اب اس وصف میں حیوان اور انسان شریک رہے تو

بنسبت نباتات کے ان دونوں میں ظہور قدرت زیادہ ہوا، اب یہ منظور ہوا کہ آدمی کو حیوان سے ممیز کرے، پس اس کو عقل عنایت فرمائی اور اس کی وجہ سے تمام حیوانات پر بزرگی بخشی اور اس کی بدولت اپنی نعمت انسان پر کامل فرمائی اور عقل ہی کی افزونی اور روشنی سے دونوں جہاں میں کام بنتے ہیں۔ پھر اس نعمت عقل کا تدبیر دنیا میں صرف کرنا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بالکل بے قدر ہے اس نعمت کی بڑی ناشکری ہے، اور معاد کے اہتمام واصلاح میں اس کا لگا دینا واسطے ادائے حق محسن کے، جس سے اس نور کا فیضان ہوا نہایت مناسب ہے، پس اپنی عقل کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنی منت سے دی ہے تدبیر دنیا میں مت صرف کر، جس کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **"الدنيا جيفة قذرة"** یعنی دنیا مردار گندی ہے۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضحاک سے: تمہاری غذا کیا ہے؟ عرض کیا: گوشت اور دودھ یارسول اللہ! فرمایا: پھر وہ کیا ہوجاتا ہے؟ عرض کیا یارسول اللہ! جو ہوجاتا ہے آپ جانتے ہیں، فرمایا: آدمی سے جو نجاست نکلتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مثال بنایا ہے۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر دنیا کی قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی ہوتی جتنا مچھر کا پر تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ پلاتا۔ اور جس شخص نے اپنی عقل کو دنیا میں جو ایسی گندی ناپاک ہے صرف کیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ نے کسی کو بڑی عظمت وشان کی ایک تلوار دی جو اور رعایا کو دینا گوارا نہیں کرتا اور اس واسطے دی کہ اپنے دشمنوں کو قتل کرے اور اس کو باندھ کر آراستہ اور مزین ہو، یہ تلوار لینے والا مردار لاشوں کی طرف چلا اور اس تلوار سے ان کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ اس کی چمک بے آب

ہوگئی اور دھار کند ہوگئی اور اس کی خوبی اور رونق جاتی رہی، جب بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگی، نہایت زیبا ہے کہ اس سے تلوار چھین لے اور اس کی بدکرداری پر سخت سزا دے اور اپنی توجہ وعنایت سے اس کو محروم کردے۔ (ص ر ۷۷)

اس سے معلوم ہوا کہ تدبیر دو قسم پر ہے: ایک محمود، دوسری مذموم۔ تدبیر محمود وہ ہے جو تجھ کو اللہ تعالیٰ سے نزدیک کرے، جیسے یہ تدبیر کرنا کہ مخلوق کے حقوق سے بری ہو جاؤں، یا تو حقوق ادا کر کے یا معاف کرا کر، اور توبہ کرنا اللہ تعالیٰ سے۔ اور ان چیزوں کی فکر کرنا جو ہوائے نفسانی کا قلع قمع کردیں جن سے انسان ہلاک ہو جاتا ہے اور شیطان سے بچنے کی فکر کرنا جو لوگوں کو بہکاتا ہے اور یہ سب محمود، اس میں کوئی شک نہیں۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ساعت کی فکر ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔ اور دنیاوی تدبیر بھی دو طرح کی ہے، ایک تو دنیا کی تدبیر کرنا دنیا کے لئے، دوسری دنیا کی تدبیر کرنا اخریٰ کے لئے۔ اور دنیا کی تدبیر کرنا دنیا کے لئے تو یہ ہے کہ اس کے اسباب وسامان جمع کرنے کی تدبیر کرے واسطے افتخار اور دولت بڑھانے کے اور جس قدر اس میں افزائش ہوتی جاتی ہے غفلت اور دھوکا بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ بجا آوری احکام سے غافل کردے اور نافرمانی کا باعث ہو جاوے۔ اور دنیا کی تدبیر آخرت کے لئے یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص تجارت اور پیشہ اور زراعت کی تدبیر اس نیت سے کرتا ہے کہ حلال روزی کھاؤں گا اور فاقے والوں کو اس میں سے دوں گا اور اپنی آبرو لوگوں سے بچاؤں گا۔ اور جو شخص دنیا کو اللہ تعالیٰ کے لئے طلب کرتا ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ زیادہ حاصل نہ کرے اور اندوختہ نہ

رکھے۔ لوگوں کے کام اس میں سے نکالتا رہے، اہل حاجت کو اپنے پر مقدم رکھے۔ اور زاہد کی دو علامتیں ہیں: ایک علامت دنیا نہ ملنے کے وقت، دوسری ملنے کے وقت۔ دنیا ملنے کے وقت تو زہد کی پہچان یہ ہے کہ محتاجوں پر ایثار کرے، اور نہ ملنے کے وقت یہ ہے کہ بے چینی نہ ہو۔ پس ایثار تو نعمت وجدان کا شکر ہے اور راحت نعمت فقدان کا شکر ہے اور یہ ثمرہ فہم وعرفان کا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کا جیسا دنیا کے ملنے میں انعام ہے اسی طرح نہ دینے میں بھی، بلکہ یہ نعمت زیادہ کامل ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں دنیا کی مجھ سے دور رکھیں اس میں زیادہ نعمت بنسبت اس کے کہ مجھ کو عطا کیں۔ شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں: میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا، ارشاد فرمایا کچھ خبر ہے دنیا کی محبت قلب سے خارج ہونے کی کیا پہچان ہے؟ میں نے عرض کیا: مجھ کو معلوم نہیں، فرمایا: دنیا کی محبت قلب سے خارج ہونے کی پہچان یہ ہے کہ ہونے میں خرچ کرے اور نہ ہونے میں چین سے بیٹھا رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر طالب دنیا مذموم نہیں، بلکہ مذموم وہ ہے جو اپنے واسطے طلب کرے نہ رب کے واسطے، اور دنیا کے لئے طلب کرے، نہ آخرت کے واسطے۔ پس دو قسم کے لوگ ہوئے: ایک وہ شخص جو دنیا کو دنیا کے لئے طلب کرے، دوسرا وہ جو دنیا کو آخرت کے لئے طلب کرے۔

ف: کسی مبتدی صوفی نے کسی کامل صوفی دولت مند سے کہا تھا:

نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد

انھوں نے جواب میں فرمایا:

اگر دارد برائے دوست دارد

میں نے اپنے شیخ ابوالعباسؒ سے سنا، فرماتے تھے: عارف دنیا نہیں رکھتا، کیونکہ اس کی دنیا آخرت کے لئے ہوتی ہے اور آخرت رب کے لئے۔ اسی پر محمول کئے جاویں گے احوال صحابہ اور سلف صالحین کے، جب کبھی وہ لوگ اسباب دنیا میں داخل ہوئے اس سے ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب مقصود تھا اور اس کی رضا کے اسباب پیدا کرتے تھے، دنیا اور اس کی زینت اور لذت مقصود نہ تھی، حق تعالیٰ نے بھی ان کا یہی وصف بیان فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ (الفتح: ۲۹)

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھی کفار کے مقابلے میں سخت ہیں، آپس میں مہربان ہیں، دیکھے گا تو ان کو رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، ڈھونڈھ رہے ہیں اللہ کے فضل اور رضامندی کو، ان کی نشانی ان کے چہروں میں ہے سجدے کے اثر سے۔

اور دوسری آیت میں فرمایا:

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔ (سورۃ النور: ۳۷،۳۶)

یعنی اللہ تعالیٰ کا نور ان گھروں میں ہے کہ اللہ نے حکم فرمایا ہے کہ وہ گھر

اونچے کئے جاویں اور ان گھروں میں اس کا نام پاک ذکر کیا جاوے، اس میں اللہ کی تسبیح صبح وشام ایسے لوگ کرتے ہیں کہ غافل نہیں کرتی ان کو سوداگری اور سودا اللہ کی یاد سے اور نماز کے قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے، ڈرتے ہیں وہ لوگ ایسے دن سے کہ بدل جائیں گے اس میں قلوب اور نگاہیں۔

اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ (سورۃ الاحزاب:۲۳)

یعنی ایسے لوگ کہ سچ کر دکھلایا انھوں نے جو کچھ اللہ سے عہد کیا تھا، پس بعضے تو ان میں وہ ہیں جنہوں نے اپنی منت پوری کر دی اور بعض انتظار میں ہیں اور انھوں نے عہد کو بالکل نہیں بدلا۔

اور اس مضمون کی بہت آیتیں ہیں اور ایسے لوگوں پر گمان ہو سکتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی صحبت اور مخاطبِ قرآن بنانے کے لئے پسند کیا، پس قیامت تک کوئی مسلمان نہیں جس کی گردن پر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بے شمار اور یاد رکھنے کے قابل احسان نہ ہوں، کیونکہ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے حکمت اور احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچایا اور حلال اور حرام کو بیان کیا اور خاص و عام کو سمجھایا اور اقالیم اور شہر فتح کئے اور مشرکین اور معاندین کو زیر کیا اور سچ ہے جو ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم"** یعنی میرے سب یار مثل ستاروں کے ہیں جس کے پیچھے لگ لوگے راہ مل جاوے گی۔ اور اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں

''**مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ**'' ان کے بہت سے اوصاف ذکر فرمائے، یہاں تک کہ فرمایا ''**یَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا**'' یعنی وہ لوگ اللہ کے فضل ورضا کو ڈھونڈھتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ جو ان کے اسرار پر مطلع ہے اور ان کے باطن اور ظاہر کو جانتا ہے وہ خبر دے رہا ہے کہ ان کو اپنے مقاصد میں دنیا مطلوب نہیں اور بجز رضا وفضل خداوندی کے دوسرا مقصود نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے حق میں فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔(الکهف:۲۸)

یعنی جم کر بیٹھا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام، چاہتے ہیں اس کی رضامندی۔

پس اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتلادی کہ سوا اللہ تعالیٰ کے کچھ ان کی مراد نہیں اور اس کے سوا ان کا کچھ مقصود نہیں۔ اور دوسری آیت میں یوں فرماتا ہے کہ پاکی بیان کرتے ہیں اللہ کی ان گھروں میں صبح وشام۔ ایسے لوگ کہ غافل نہیں کرتی ان کو تجارت اور نہ خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے قلوب پاک ہو گئے ہیں اور ان کے انوار کامل ہو گئے، اسی واسطے دنیا ان کے قلوب کو نہیں پکڑ سکتی اور ان کے چہرۂ ایمان پر خراش نہیں کر سکتی اور دنیا ایسے قلوب میں کیونکر جا سکتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت سے بھر دیا ہو اور اپنے قرب کے انوار اس میں روشن کر دئے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔(سورة الحجر:۴۲)

یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا کچھ قابو نہ چلے گا۔

پس اگر دنیا کا زور ان کے دلوں پر چلتا تو شیطان کا بھی بس چلتا، کیونکہ شیطان کی رسائی ان قلوب تک نہیں جن کے انوارِ زہد روشن ہوں اور حُبِّ دنیا کے میل سے پاک وصاف ہو گئے ہوں۔ پس مطلب ''**اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ**'' کا یہ ہے کہ نہ تیرا اور نہ اور کسی مخلوق کا قابو چل سکتا ہے، کیونکہ میری عظمت کا غلبہ جو ان کے قلوب پر ہے وہ میرے سوا کسی کا غلبہ وہاں تک آنے نہیں دیتا، پس آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ تجارت اور بیع ان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی اور یہ نہیں فرمایا کہ وہ تجارت اور بیع نہیں کرتے، بلکہ اس آیت کے مضمون میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ بیع اور تجارت جائز ہے۔ تم نے کیا یہ قول نہیں سنا ''**وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ**'' پس اگر غنا سے منع فرمانا منظور ہوتا تو سبب غنا سے بھی کہ بیع وتجارت ہے منع فرماتے۔ دیکھو! ''**اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ**'' میں جب زکوٰۃ کو واجب فرمایا، اس سے صاف واضح ہوا کہ جن لوگوں کے یہ اوصاف مذکور ہیں ان میں بعض غنی بھی ہوتے ہیں اور پھر بھی تعریف کے قابل رہتے ہیں جب کہ اپنے مولیٰ کے حقوق ادا کرتے رہیں۔

حال بعضے اغنیائے صحابہ رضی اللہ عنہم

عبداللہ بن عتبہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس روز شہید ہوئے ہیں ان کے خزانچی کے پاس ڈیڑھ لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم تھے اور اریس وخیبر اور وادی القریٰ کے درمیان میں کچھ زمینیں تھیں، جن کی قیمت دو لاکھ دینار تھی۔ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے ترکہ کا آٹھواں حصہ پچاس ہزار دینار تھے۔

ف: اور پورا اتر کہ چار لاکھ دینار ہوئے۔ت۔

اور ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار غلام چھوڑے تھے۔اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے تین لاکھ دینار چھوڑے۔اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا غنی ہونا اتنا مشہور ہے کہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔اور دنیا ان حضرات کے ہاتھوں میں تھی دلوں میں نہ تھی۔ جب نہ ملی تھی صبر کیا، جب ملی شکر کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ابتدائے امر میں ان کو فاقے میں مبتلا فرمایا، یہاں تک کہ ان کے انوار کمال کو پہنچ گئے اور اسرار پاک ہو گئے، پھر ان کو دنیا دی، کیونکہ اگر پہلے ہی مل جاتی تو شاید ان پر اثر کرتی، چونکہ بعد تمکین اور رسوخِ یقین کے ملی اس میں اس طرح تصرف کیا جیسا امانت دار خزانچی تصرف کرتا ہے اور اس ارشاد کو پورا بجالائے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ۔(سورۃ الحدید:۷)

یعنی خرچ کرو اس چیز سے جس میں تم کو خلیفہ کیا۔

ف: حاصل یہ کہ مالکانہ تصرف نہ کرتے تھے بلکہ چاکرانہ کرتے تھے۔ت۔

اسی مقام سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اول امر میں جہاد کرنے سے اس ارشاد میں کیوں ممانعت فرمادی تھی:

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔(سورۃ البقرہ:۱۰۹)

یعنی معاف کرو اور درگذر کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجے۔

وجہ یہ ہے کہ اگر ابتدائے اسلام میں جہاد کی اجازت ہوتی تو شاید بعض نومسلموں کو جو اجازت ملتی تو اپنا ذاتی بدلہ لینے لگتے اور خرابی نیت کی خبر بھی نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کوئی ضرب لگاتے تھے

(وار کرتے تھے) تو اس کے ٹھنڈے ہونے تک ٹھہرے رہتے تھے، پھر دوسری ضرب لگاتے تھے اس اندیشے سے کہ شاید اس کے پیچھے معاً ماروں تو کہیں نفس کی آمیزش نہ ہو جاوے۔ اس کا باعث یہ تھا کہ آپ نفس کے چھپے دھوکوں کو پہچانتے تھے۔ اور بڑی حفاظت صحابہ کو دلوں کی تھی اور اپنے اعمال کو خالص کرنے کی اور اندیشہ ناک رہتے تھے کہ ان کے عمل میں ایسی چیز نہ مل جاوے جس سے رضائے مولیٰ مقصود نہ ہو، پس دنیا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھ میں تھی، نہ کہ دلوں میں، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ صحابہ دنیا سے علیحدہ رہتے تھے اور دوسروں کو اپنے نفس پر مقدم رکھتے تھے۔ حق تعالیٰ ان کی شان میں فرماتے ہیں:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (سورۃ الحشر: ۹)

یعنی اوروں کو اپنی ذات پر مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود ان کو فاقہ ہو۔

یہاں تک کہ کسی صحابی کے پاس ایک بکری کی سری ہدیہ آئی، فرمایا: فلاں شخص مجھ سے زیادہ مستحق ہے، ان بزرگ نے اور کسی کا نام بتلادیا: انھوں نے اور کا نام لے لیا، یوں ہی ایک دوسرے کے پاس بھیجتے رہے، یہاں تک کہ سات آٹھ آدمیوں میں گھوم گھام کر پھر پہلے صحابی کے پاس لوٹ آئی۔ اور اس کی کافی دلیل ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نصف مال سے علیحدہ ہو جانا، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کل مال سے علیحدہ ہو جانا، اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا سات سو اونٹ لدے لدائے دے دینا، اور حضرت عثمانؓ کا جیش تبوک کے لئے سامان کر دینا اور بہت سے عمدہ کام اور اچھے حالات ان کے منقول ہیں۔

اور دوسری آیت جو ہے:

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے پوشیدہ صدق کی خبر دی ہے، جس پر سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی مطلع نہیں ہوسکتا اور یہ بہت بڑی تعریف اور فخر کی بات ہے، کیونکہ ظاہر افعال میں باعتبار علم مخلوق کے کبھی حالات مشتبہ ہوسکتے ہیں، ان آیات سے ان کے ظاہر اور باطن کا تزکیہ ہوتا ہے اور ان کے محامد اور مفاخر ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تدبیر دینا دو قسم پر ہے: ایک تدبیر دنیا کی واسطے دنیا کے، جیسا دور افتادہ اہل غفلت کا حال ہے۔ دوسری تدبیر دنیا کی واسطے آخرت کے جیسا صحابہ کرام اور سلف صالحین کا حال تھا، اور اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ نماز میں اپنے لشکر کا سامان درست کرتا ہوں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تدبیر معائنہ اور حضوری کی حالت میں تھی، سو وہ تدبیر اللہ کے واسطے تھی اسی لئے نہ نماز فاسد ہوئی نہ کمال میں نقصان آیا۔

سوال و جواب: اگر کوئی اعتراض کرے کہ تمہارا تو یہ دعویٰ ہے کہ ان میں سے کوئی دنیا کا طالب نہ تھا، حالانکہ یوم احد میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو یوں فرمایا کہ بعض تم میں سے دنیا چاہتے تھے اور بعض آخرت کے طالب تھے۔ یہاں تک کہ بعض صحابہ کا قول ہے کہ ہم نہیں سمجھتے تھے کہ ہم میں کوئی دنیا کا طالب ہے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی:

مِنْكُمْ مَنْ يُرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ۔ (آل عمران: ۱۵۲)

اب اس کا جواب سمجھ لو! اللہ تم کو سمجھنے کی توفیق دے اور اپنے کلام کے سننے کے لائق کردے کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ صحابہ کے ساتھ نیک گمان رکھے اور

ان کی بزرگی کا معتقد رہے اور ان کے جمیع اقوال وافعال واحوال کو خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے ہوں یا بعد کے، اچھے وجوہ پر محمول کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کی پاکی بیان فرمائی تو کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں کیا، ایسی ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **"اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم"** میں مطلق ارشاد فرمایا۔ اور اس آیت کے دو جواب ہیں:

جواب اول: اس آیت کا یہ ہے کہ بعضے تم میں سے دنیا چاہتے تھے یعنی آخرت کے واسطے، جیسے وہ لوگ جنھوں نے غنیمت لینا چاہا تھا کہ اس میں سے خرچ وایثار کر کے اللہ تعالیٰ سے نیک معاملہ کریں، اور بعضوں کا یہ مقصود نہ تھا صرف فضیلتِ جہاد ہی حاصل کرنا مطلوب تھا، انھوں نے غنیمت کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا، نہ اس کی طرف التفات کیا، پس صحابہ رضی اللہ عنہم میں بعض فاضل وکامل تھے، بعضے افضل واکمل، ناقص کوئی نہ تھا۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ آقا اپنے خاص غلام کو جو چاہے کہے، ہم کو اس غلام کے ساتھ ادب لازم ہے، کیونکہ اس کو آقا سے نسبت خاص ہے، یہ نہیں کہ آقا اپنے غلام کو جو کہے ہم بھی وہی نسبت کریں یا اس کو خطاب کرنے لگیں، کیونکہ آقا تو غلام کو اس واسطے جو چاہے کہہ لیتا ہے کہ اس کو خدمت کی رغبت پیدا ہو اور اس کی ہمت وعزم کو ترقی ہو اور ہم کو حدود ادب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اور اگر قرآن مجید میں تلاش کیا جاوے تو بہت سے ایسے مضامین نکلیں گے، مثلاً ایک سورۂ عبس ہی ہے، یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ اگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم وحی میں سے کوئی چیز چھپاتے تو اس سورت کو ضرور چھپا لیتے۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ اسقاطِ تدبیر جو ممدوح ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ اسباب دنیا اور فکر مصالح میں بقصد طاعت مولیٰ وکارِ آخرت کے بھی داخل نہ ہو، بلکہ تدبیر ممنوع وہ ہے کہ دنیا کی تدبیر دنیا ہی کے لئے کرے، اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ذریعۂ نافرمانی بن جاوے اور حلال وحرام سے اس کو سمیٹنا شروع کرے۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ اشیاء کا مذموم ومحمود ہونا ان کے نتائج کے اعتبار سے ہے، پس تدبیر مذموم وہ ہے جو اللہ سے غافل اور ادائے خدمتِ مولیٰ سے معطل کردے اور اس کے معاملے سے باز رکھے۔ اور تدبیر محمود وہ ہے جس کی یہ شان نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب بخشے اور اس کی رضا تک پہنچاوے۔ اسی طرح دنیا علی الاطلاق نہ مذموم ہے نہ محمود۔ بلکہ مذموم وہ ہے جو مولیٰ سے غافل کرے اور آخرت کے لئے سامان کرنے سے باز رکھے، جیسے بعض عارفین کا قول ہے: جو چیز تجھ کو اللہ تعالیٰ سے غافل کرے خواہ بیوی ہو، یا مال ہو، یا اولاد ہو، وہ تیرے حق میں منحوس ہے۔ اور دنیائے ممدوح وہ ہے جو طاعت الٰہی میں معین ہو اور خدمت مولیٰ میں سرگرم اور مستعد کردے۔

الحاصل جو اچھے کاموں کا ذریعہ ہے وہ ممدوح ہے، جو برے کاموں کا ذریعہ ہے وہ مذموم ہے۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ دنیا مردار گندی سڑیل ہے۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: دنیا ملعون ہے اور جو اس میں ہے وہ ملعون ہے، مگر اللہ کا ذکر اور جو چیز اس کے متعلق ہو اور عالم اور طالبعلم۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: آدمی میں سے نجاست نکلتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا کی مثال بنایا ہے۔ ان احادیث کا مقتضا یہ ہے کہ وہ مذموم

ہو اور لوگ اس سے نفرت کریں، اور یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا ہے کہ دنیا کو برا مت کہو کہ ایماندار کے لئے خوب سواری ہے۔ اسی پر سوار ہو کر خیر حاصل کر سکتا ہے اور شر سے بچ سکتا ہے۔ پس جس دنیا پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے وہ دنیا، وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے، اسی واسطے آپ نے حدیث میں استثنا فرمایا کہ **"الاذکر اللہ"** یعنی مگر ذکر اللہ کا اور اس کے متعلق ہو اور عالم اور طالب علم۔ تو آپ نے بیان فرما دیا کہ یہ چیزیں دنیا میں داخل نہیں اور جس دنیا کی نسبت فرمایا کہ برا مت کہو یہ وہ دنیا ہے جو تم کو طاعت الٰہی تک پہنچا دے۔

اسی واسطے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ایمان والے کے لئے خوب سواری ہے، سو سواری ہونے کے اعتبار سے اس کی مدح فرمائی، نہ اس حیثیت سے کہ وہ دھوکہ اور گناہوں کا مقام ہے، پس تیری سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ترکِ تدبیر کے یہ معنی نہیں کہ بالکل اسباب سے کنارہ اختیار کرے، یہاں تک کہ انسان ضائع ہونے لگے، پھر لوگوں پر بار ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت جو اثباتِ اسباب اور ارتباط وسائط میں ہے اس سے جاہل بن جاوے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے کہ کسی عابد پر آپ کا گذر ہوا اس سے دریافت کیا کہ کہاں سے کھاتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ میرا بھائی مجھے کھانے کو دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تیرا بھائی تجھ سے زیادہ عابد ہے، یعنی تیرا بھائی اگرچہ بازار میں رہتا ہے، مگر تجھ سے زیادہ عبادت کرتا ہے، کیونکہ وہی تو طاعت میں تیرا معین ہے اور تجھ کو عبادت کے لئے فارغ کر رکھا ہے۔ اور اسباب میں قدم رکھنے کا کیسے

انکار ہوسکتا ہے، جب کہ یہ آیتیں آ چکیں:

وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (سورۃ البقرہ:۲۷۵)

یعنی خرید وفروخت اللہ نے حلال کیا اور سود کو حرام کیا۔

وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ۔ (سورۃ البقرہ:۲۸۲)

یعنی گواہ کرلیا کرو جب بیع وشرا کرو۔

اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: زیادہ حلال روزی جس کو آدمی کھاوے وہ ہے جو اپنے ہاتھ کی کمائی ہو، اور داؤد علیہ السلام دستکاری سے کھاتے تھے۔ اور فرمایا ہے: سب سے اچھی کمائی دستکاری ہے جب دغا فریب نہ کرے۔ اور فرمایا ہے: جو سوداگر امانت دار سچا مسلمان ہو وہ قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ ان آیات اور احادیث کے بعد کیسے ہوسکتا ہے کہ اسباب کی مطلقاً مذمت کی جاوے۔ لیکن جو اللہ تعالیٰ سے غافل کردے اور اس کے معاملے سے باز رکھے وہ بے شک مذموم ہے۔ اور اگر تو یہ اسباب چھوڑ کر تجرید اختیار کرے، مگر اللہ تعالیٰ سے غفلت ہو، تب بھی مذموم ہے۔

(الاکسیر فی اثبات التقدیر: ۷۴ تا ۸۸)

تلخیص از ”آداب المعاشرت“

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد وصلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ اس وقت دین کے پانچ اجزاء میں سے عوام نے تو صرف دو ہی جزء کو داخل دین سمجھا، یعنی عقائد وعبادات کو اور علماء ظاہر نے تیسرے جزء کو بھی دین اختیار کیا، یعنی معاملات کو اور مشائخ نے چوتھے جزء

کو بھی دین قرار دیا، یعنی اخلاق باطنی کی اصلاح کو۔ لیکن ایک پانچویں جزءکو کہ وہ ادب معاشرت ہے۔ قریب قریب ان تینوں طبقوں نے الا ماشاء اللہ اکثر نے تو اعتقاداً دین سے خارج اور بے تعلق قرار دے رکھا ہے۔ (اور اسی وجہ سے اور اجزاء کی تو کم وبیش خاص طور پر یا عام طور پر یعنی وعظ میں کچھ تعلیم وتلقین بھی ہے لیکن اس جز کا کبھی زبان پر نام تک نہیں آتا۔ اسی لئے علماً وعملاً یہ جزء بالکلیہ نسیاً منسیاً ہو چلا ہے اور میرے نزدیک باہمی الفت واتفاق میں (جس کی شریعت نے سخت تاکید کی ہے اور اس وقت عقلاً بھی بہت چیخ وپکار کررہے ہیں) جو کمی ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہ سوء معاشرت بھی ہے کیونکہ اس سے ایک کو دوسرے سے تکدر وانقباض ہوتا ہے اور وہ رافع ومانع ہے انبساط وانشراح کا جو اعظم مدار ہے الفت باہم دگر کا۔ حالانکہ خود اس خیال کو کہ اس کو دین سے کوئی مس نہیں، آیات واحادیث واقوال حکمائے دین کے رد کرتے ہیں چنانچہ ان میں سے بعض بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ فراخ کردو تو جگہ کو فراخ کردیا کرو۔ اور جب تم سے کہا جائے کہ کھڑے ہوجاؤ، تو کھڑے ہوجایا کرو۔

اور ارشاد ہے کہ:

دوسرے کے گھر میں (گو وہ مردانہ ہو مگر خاص خلوت گاہ ہو) بے اجازت لئے مت جایا کرو۔

ادب ۱: جب کسی کے پاس ملنے یا کچھ کہنے جاؤ اور اس کو کسی شغل کی وجہ سے فرصت نہ ہو، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے یا وظیفہ پڑھ رہا ہے یا قصداً مقام خلوت میں بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے یا سونے کے لئے آمادہ ہے، یا قرائن سے اور کوئی ایسی حالت معلوم ہو جس سے غالباً اس شخص کی طرف متوجہ ہونے سے اس کا حرج ہوگا یا اس کو گرانی و پریشانی ہوگی، ایسے وقت میں اس سے کلام وسلام مت کرو بلکہ یا تو چلے جاؤ اور اگر بہت ہی ضرورت کی بات ہو تو مخاطب سے پہلے پوچھ لو کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، پھر اجازت کے بعد کہہ دے۔ اس سے تنگی نہیں ہوتی اور یا فرصت کا انتظار کرو، جب اس کو فارغ دیکھو مل لو۔

ادب ۲: جب کسی کے انتظار میں بیٹھنا ہو تو ایسے مواقع پر اور اس طور سے مت بیٹھو کہ اس شخص کو یہ معلوم ہو کہ تم اس کا انتظار کر رہے ہو، اس سے خواہ مخواہ اس کا دل مشوش ہو جاتا ہے اور اس کی یکسوئی میں خلل پڑتا ہے۔ بلکہ اس سے دور اور نگاہ سے پوشیدہ ہو کر بیٹھو۔

ادب ۳: مصافحہ ایسے وقت مت کرو کہ دوسرے کے ہاتھ ایسے شغل میں رکے ہوں کہ ہاتھ خالی کرنے میں اس کو خلجان ہو، بلکہ سلام پر کفایت کرو اور اسی طرح مشغولی کے وقت میں بیٹھنے کے لئے منتظر اجازت مت رہو بلکہ خود بیٹھ جاؤ۔

ادب ۴: بعضے آدمی صاف بات نہیں کہتے، تکلف کے کنایات کے استعمال کو ادب سمجھتے ہیں اس سے بعض اوقات مخاطب نہیں سمجھتا یا غلط سمجھتا ہے جس سے فی الحال یا فی المآل پریشانی ہوتی ہے، بات بہت واضح کہنا چاہئے۔

ادب ۵: بعضے آدمی بلاضرورت دوسرے شخص کی پشت کے پیچھے بیٹھ

جاتے ہیں اس سے دل الجھتا ہے یا پشت کے پیچھے نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں، سو اگر وہ اپنی جگہ سے اٹھنا چاہے تو پیچھے والے کی وجہ سے اٹھ نہیں سکتا اور محبوس ہو جاتا ہے اور اس سے تنگی ہوتی ہے۔

ادب ۶: بعضے آدمی مسجد میں ایسی جگہ نیت باندھتے ہیں کہ گزرنے والوں کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ مثلاً در کے سامنے یا دیوار شرقی سے بالکل مل کر نہ پشت کی طرف سے نکلنے کی گنجائش رہے اور نہ سامنے سے بوجہ گناہ کے گزر سکے، سو ایسا نہ کرے بلکہ دیوار قبلہ کے قریب ایک گوشہ میں نماز پڑھے۔

ادب ۷: کسی کے پاس جاؤ تو سلام یا کلام سے یا روبرو بیٹھنے سے غرض کسی طرح اس کو اپنے آنے کی خبر دو اور بدون اطلاع کے، آڑ میں ایسی جگہ مت بیٹھو کہ اس کو تمہارے آنے کی خبر نہ ہو، کیونکہ شاید وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہے جس پر تم کو مطلع نہ کرنا چاہے تو بدون اس کی رضا کے اس کے راز پر مطلع ہونا بری بات ہے، بلکہ اگر کسی بات کے وقت یہ احتمال ہو کہ بے خبری کے گمان میں وہ ہو رہی ہے تو تم فوراً وہاں سے جدا ہو جاؤ یا اگر تم کو سوتا سمجھ کر ایسی بات کرنے لگے تو فوراً بیدار ہونا ظاہر کر دو۔ البتہ اگر تمہارے یا کسی اور مسلمان کی ضرر رسائی کی کوئی بات ہوتی ہو تو اس کو ہر طرح سن لینا درست ہے تاکہ حفاظت ضرر سے ممکن ہو۔

ادب ۸: کسی ایسے شخص سے کوئی چیز مت مانگو کہ قرائن سے یقین ہو کہ وہ باوجود گرانی کے بھی انکار نہ کر سکے گا۔ اگرچہ یہ مانگنا بطور قرض یا عاریت ہی کے ہو، البتہ اگر یہ یقین ہو کہ اس کو گرانی ہی نہ ہوگی یا اگر گرانی ہوئی تو یہ آزادی سے عذر کر دے گا تو مضائقہ نہیں اور یہی تفصیل ہے کسی کام بتلانے میں، کوئی فرمائش کرنے

میں، کسی سے کسی کی سفارش کرنے میں، اس میں آج کل بہت ہی تساہل ہے۔

ادب ۹: اگر کسی بزرگ کا جوتا اٹھانا چاہو تو جس وقت وہ پاؤں سے نکال رہے ہوں اس وقت ہاتھ میں مت لو۔ اس سے بعض اوقات دوسرا آدمی گر پڑتا ہے۔

ادب ۱۰: بعض اوقات بعض خدمت دوسرے سے لینا پسند نہیں ہوتا سو ایسی خدمت پر اصرار نہ کرنا چاہئے کہ خود مخدوم کو تکلیف ہوتی ہے اور یہ بات اس مخدوم کی صریح ممانعت یا قرائن سے معلوم ہوتی ہے۔

ادب ۱۱: کسی کے پاس بیٹھنا ہو تو نہ اس قدر مل کر بیٹھو کہ اس کا دل گھبرادے اور نہ اس قدر فاصلے سے بیٹھو کہ بات چیت کرنے میں تکلیف ہو۔

ادب ۱۲: مشغول آدمی کے پاس بیٹھ کر اس کو مت تکو کہ اس سے دل بٹتا ہے اور دل پر بوجھ معلوم ہوتا ہے بلکہ خود اس کی طرف متوجہ ہو کر بھی مت بیٹھو۔ (اصلاحی نصاب: ۸۷۴)

سجادہ نشینی پر نکیر

اقتباس از تحفۃ الشیوخ: حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے رسالہ ''تحفۃ الشیوخ'' میں نااہل کی جانشینی وسجادہ نشینی پر نکیر کرتے ہوئے اس کے بیس مفاسد شمار فرمائے ہیں اس کے بعد یوں رقمطراز ہیں کہ:

کسی اہل کو جانشین بنانا بھی خرابی سے خالی نہیں

۔۔۔۔۔۔ البتہ تیسری صورت میں بعید الوقوع نہیں کہ خود پیر نے کسی اہل کو اپنا جانشین کر دیا، بہر حال اہلیت کی حالت میں بظاہر سجادہ نشینی یا جانشینی میں کوئی

خرابی نہیں معلوم ہوتی لیکن اگر دیدۂ غائر پر انجام بینی کی عینک لگا کر اس سے دیکھا جاوے تو یہ بھی خرابی سے خالی نہیں، وہ یہ کہ طبعاً اس جگہ پر بیٹھنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عموماً مریدین اس جانشین کو بالکل اس شیخ کی جگہ سمجھتے ہیں، اور اس شیخ کے تمام خلفاء پر گو وہ اہلیت میں اس سے زیادہ ہوں، اس جانشین کو ترجیح دیتے ہیں، اور معتقدین تمام طالبین کو جس طرح بن پڑتا ہے گھیر گھار اس کی طرف لاتے ہیں اور صرف اس جگہ پر بیٹھنے کو سب مرجح قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ اگر اس کی اہلیت بھی کسی عارض سے مفقود یا مبدّل ہو جاوے تب بھی اس کو ترک کرنے کو اس جگہ کی بے حرمتی اور اس کے واسطے سے اس شیخ گزشتہ کی اہانت سمجھتے ہیں، اور جس طرح ہو سکتا ہے اسی کو نباہتے ہیں، تو انجام اس کا پھر وہی رسم پرستی ہو گئی، یہ خرابی تو فی الحال ہے، دوسری خرابی جو آئندہ چل کر مآل میں ہوتی ہے کہ پھر اس جگہ کو آباد رکھنا مقصود بالذات ہو جاتا ہے اور کبھی خود اس اہل ہی کو اور کبھی دوسروں کو اس کی فکر ہوتی ہے کہ اس کے بعد کسی اور کو تجویز کیا جائے، پھر بعد چندے اہل، نااہل کسی کی تمیز نہیں رہتی اور مثل ترکہ مالیہ کے اس میں بھی میراث جاری ہونے لگتی ہے، اور مورث و وارث کے تفاوت سے یہ مضمون صادق آنے لگتا ہے ؎

آدمیاں گم شدند، ملکِ خدا خر گرفت — زشتیٔ اعمال ما صورت نادر گرفت

دیگر ؏ پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز (تحفۃ الشیوخ: ص ر ۳۳)

ف: اس مضمون میں حضرت حکیم الامت مجدد الملت ؒ کی شان تجدیدی نمایاں ہے اور پورا مضمون نہیں بلکہ پورا رسالہ ''تحفۃ الشیوخ'' مشائخ کے لئے قابل مطالعہ ہی نہیں بلکہ حرز جان بنانے کے لائق ہے، اگر ایسا کر لیا جائے تو ان شاء اللہ

بہت سے مفسدوں کیلئے سد باب ثابت ہوگا۔ مگر افسوس کہ حضرت حکیم الامتؒ کے منتسبین سے بھی اس باب میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ (مرتب)

تلخیص از ''قصد السبیل''

ہدایت اول: سلوک جس کو عرف میں تصوف کہتے ہیں اس کی حقیقت یہ ہے ''تعمیر الظاہر والباطن'' یعنی اپنے ظاہر و باطن کو آراستہ و معمور کرنا، ظاہر کو اعمال جوارح ضروریہ سے اور باطن کو عقائد حقہ و اخلاق باطنہ مثل اخلاص و شکر و صبر و زہد و تواضع وغیرہا سے اس کا ایک مرتبہ تو یہ ہے۔ اور دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اولیٰ کے ساتھ ظاہر کو طاعات غیر ضروریہ میں اور باطن کو دوام ذکر میں بھی مشغول کرنا، مرتبۂ اولیٰ کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض عین ہے اور اس کے لئے دو چیزوں کی حاجت ہوگی اس لئے اس کا اہتمام بھی ضرور ہوگا۔

ایک بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنا خواہ پڑھ کر خواہ علماء سے پوچھ پوچھ کر، اور پڑھنا بھی خواہ عربی میں ہو یا فارسی میں خواہ اردو میں۔ احقر نے ایک بہشتی زیور شائع کرایا ہے وہ اور رسالۂ صفائی معاملات اور تیسرا باب مفتاح الجنہ کا یہ ضروریات روزمرہ کے لئے کافی ہیں، دوسرے علم پر عمل کرنے کی ہمت قوی رکھنا کہ تقاضائے نفس یا ملامت خلق سنگ راہ نہ ہو یہ تو مرتبۂ اولیٰ کا بیان ہوا۔ اور دوسرا مرتبہ مندوب ہے اور اکثر عرف میں آج کل اسی کو تصوف اور درویشی کہتے ہیں لیکن اگر دوسرے مرتبہ میں مشغول ہونے سے کوئی ضروری طاعت مرتبۂ اولیٰ کی فوت یا خلل پذیر ہو جاوے تو پھر اس میں مشغول ہونا ممنوع و غیر مشروع ہو جاوے گا جیسا کہ بعضے نادان کرتے ہیں کہ بیوی بچوں کو بھوکا ننگا چھوڑ کر

درویشی کا دم بھرتے ہیں۔

ہدایت دوم: صحیح ترتیب وسلوک مرتبۂ دوم کی یہ ہے کہ اول گناہوں سے توبۂ خالصہ کرے اور اگر کچھ عبادات واجبہ نماز وغیرہ اس کی فوت ہوئی ہوں تو ان کو قضا کرنا شروع کردے، اور اگر اس کے ذمہ کچھ حقوق العباد ہوں تو ان کے ادا کرنے کے بندوبست میں لگ جاوے یا اہل حقوق سے معاف کرالے کیونکہ بدون اس کے کہ ان سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کرے اگر عمر بھر بھی ریاضت ومجاہدہ کرے گا ہرگز مقصود حقیقی تک رسائی نصیب نہ ہوگی۔ اور توبہ کے ساتھ آئندہ کے لئے بھی قوی عزم رکھے کہ اللہ ورسول کی اطاعت میں گو نفس کو کتنی ہی ناگواری ہو اور گو مال یا جان کا کتنا ہی بڑا ضرر ہو۔ اور کوئی نفسانی دنیوی مصلحت کیسی ہی فوت ہوتی ہو اور گو خلق کتنی ہی ملامت کرے سب برداشت کریں گے، اور اللہ ورسول کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو وہ طالب حق نہیں ہے۔ (اصلاحی نصاب:۵۲۸)

باب اصلاح میں حضرت حکیم الامتؒ کی حکمت وفراست

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اصلاح خلق میں ''حسن تدبیر'' کے صدہا واقعات میں سے چند واقعات ''مجالس حکیم الامتؒ'' میں تحریر کئے ہیں انھیں میں سے جگر مرادآبادی شاعر مرحوم کی شراب سے توبہ کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے اسے نقل کررہا ہوں۔

جگر مرادآبادی شاعر مرحوم کی شراب سے توبہ کا واقعہ: شاعرانہ آزادی کے زمانہ میں مرحوم کو اس بلاء کی عادت پڑگئی تھی مگر قدرت نے دل میں بزرگوں کی

محبت وعقیدت رکھ دی تھی اسی نے دستگیری کی اوراس دنیاوآخرت کے عذاب سے مکمل نجات حاصل ہوئی ،واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک روز حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی مجلس میں احقر بھی حاضر تھا، ہمارے محترم بزرگ خواجہ عزیز الحسن صاحب نے یہ ذکر کیا کہ جگر مرادآبادی سے ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی تووہ کہنے لگے کہ تھانہ بھون جانے اورحضرت کی زیارت کرنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں کہ شراب کونہیں چھوڑسکتا اس لئے مجبورہوں کہ کیا منہ لے کروہاں جاؤں۔

حضرت نے پوچھا کہ پھرآپ نے کیا جواب دیا؟ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ میں نے کہہ دیا: ہاں یہ بات توصحیح ہے ایسی حالت میں بزرگوں کے پاس جانا کیسے مناسب ہوسکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا: واہ خواجہ صاحب، ہم توسمجھتے تھے کہ اب آپ طریق کوسمجھ گئے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ہمارا یہ خیال غلط تھا، خواجہ صاحب نے تعجب کے ساتھ سوال کیا کہ حضرت! اگرمیں یہ جواب نہ دیتا توپھر کیا کہتا؟ حکیم الامت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ آپ یہ کہہ دیتے کہ جس حال میں ہواسی حال میں چلے جاؤ، ممکن ہے کہ یہ زیارت وملاقات ہی اس بلاء سے نجات کاذریعہ بن جائے، حضرتؒ درحقیقت حکیم الامت اورامراض نفسانی کے طبیب حاذق تھے آپ نے جگر صاحب کے طرز کلام، اپنے فعل پرندامت اوربزرگوں کی محبت کے داعیہ سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ یہ آئیں گے توان کی اصلاح ہوجائے گی اس لئے مذکورہ جواب دیا۔

خواجہ صاحب یہاں سے واپس گئے توپھر اتفاقاً جگر صاحب سے ملاقات ہوگئی ،اوریہ سارا واقعہ جگر صاحب کوسنادیا،ان کی ہدایت واصلاح کاوقت آگیا تھا،

حضرت کے یہ کلمات سنتے ہی زارزار رونا شروع کیا اور بالآخر یہ عہد کرلیا کہ اب مَر بھی جاؤں تو اس خبیث چیز کے پاس نہ جاؤں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ شراب کے چھوڑنے سے بیمار پڑ گئے، حالت نازک ہوگئی، اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ کی اس حالت میں بقدرِ ضرورت پینے کی تو شریعت بھی اجازت دے گی، آپ خود حضرت حکیم الامت سے مسئلہ دریافت کرلیجئے۔

مگر وہ جگر والے آدمی تھے عزم پختہ کرچکے تھے، سب کے جواب میں کہا کہ اب تو چھوڑ چکا ہوں اگر میری زندگی مقدر ہے تو ان شاء اللہ اس کو چھوڑ کر ہی زندہ رہوں گا اور اگر اللہ کے نزدیک وقت مقدر آگیا ہے تو آخر وقت میں اس ناپاک ام الخبائث سے اپنے منہ اور زبان کو کیوں ناپاک کروں۔

اللہ تعالیٰ اہل عزم وہمت کی مدد فرماتے ہیں، اس وقت بھی حق تعالیٰ کی مدد اور قدرت کاملہ سے چند روز کے بعد شفاء کامل حاصل ہوئی، اب ظاہری وباطنی مرض سے شفاء حاصل کرنے کے بعد تھانہ بھون کا قصد کیا، جس روز وہ تشریف لائے اتفاقاً احقر اس روز بھی تھانہ بھون میں حاضر تھا، حضرت نے بڑے احترام اور محبت کا معاملہ فرمایا اور دیر تک معارف وحقائق کا بیان ہوتا رہا، جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت نے ان سے فرمایا کہ مجھے آپ کا ایک شعر بہت ہی پسند ہے بار بار پڑھا کرتا ہوں، اگر میں کسی شاعر کو شعر پر انعام دیتا تو اس شعر پر آپ کو بہت بڑا انعام دیتا وہ شعر یہ ہے:

میری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں

اب یہ یاد نہیں کہ خود جگر صاحب نے درخواست کی کہ میں اپنی کوئی غزل سنادوں یا حاضرین مجلس میں سے کسی نے درخواست کی جس پر حضرت نے اجازت دے دی[1] اس وقت جگر صاحب مرحوم نے اپنی چند غزلیں مجلس میں سنائیں، ایک غزل کے تین یہ شعر مجھے یاد رہ گئے۔

بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں — پھیکی شب مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

ساقی نے دیا تھا جو بصد عرض تمنا — وہ جرعہ بھی زہرآب ہے معلوم نہیں کیوں

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن — کشتی سے تہ آب ہے معلوم نہیں کیوں

پہلی ملاقات کی باتیں تھی اس کے بعد تو آمد و رفت اور خط وکتابت کا سلسلہ چل پڑا جس میں بعض خطوط غالباً شائع بھی ہو چکے ہیں۔ (مجالس حکیم الامت: ص ۶۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''حکیم الامت'' میں جگر مرادآبادی کے ایک آخری خط اور اس میں مرقوم عجیب وغریب حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے جواب کا تذکرہ کیا ہے اس کو نقل کرتا ہوں، حضرت تھانوی کے مرض وفات اور وقت آخر کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

سورج اب ڈوبنے کو تھا شفق پھول چلی تھی، عین اسی زمانہ میں اردو کے مشہور شاعر جگر مرادآبادی نے ایک فارسی غزل پانچ شعروں کی ''زتشنہ لبی خوشم''، ''بوالعجبی خوشم'' کی زمین میں لکھ کر اور پانچوں شعر رنگین و پر بہار حضرت کی خدمت میں نذرانہ کے طور پر بھیجی، حضرت باضابطہ شاعر پہلے بھی نہ تھے، اور اس وقت

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ تنشیط طبع کے لئے اشعار پڑھنے اور سننے میں جب کہ اس میں عبرت وموعظت کا سامان بھی ہو کچھ حرج نہیں ہے۔ (مرتب)

توضعف وانحطاط نے جسم ودماغ پر بالکل ہی قابو پالیا تھا اس پر بھی جوشعر جواب میں لکھ کر بھیجا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔وہ درج ذیل ہیں:

نہ بہ نثر ناثر بے بدل ،نہ بہ نظم شاعر خوش غزل
بہ غلامئ شہہ عزّوجل وبہ عاشقئ نبی خوشم
بہ سرِ تو ساقئ مستِ من بہ سرور بے طلبی خوشم
اگرم شراب نمی دہی بہ خمارِ تشنہ لبی خوشم
چہ خوش است ذوق محبتم چہ بلا است لذتِ فرقتم
کہ بہ یادِ زلف سیاہ تو بہ ہجوم تیرہ شبی خوشم
چہ مقام عشق و چہ منزلے کہ دریں زماں من بیدلے
نہ بہ شاہدے نہ بہ مطربے نہ بہ حاصل علبی خوشم
ز نگاہے عشوہ طراز تو چہ گذشت بر دل من کہ من
نہ بہ نالۂ سحری خوشم نہ بہ آہ نیم شبی خوشم
نہ جفائے حسن تمام تو نہ حکایتے نہ شکایتے
چہ حکایتے چہ شکایتے کہ بہ ترک بے ادبی خوشم

ف: حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے حالات وارشادات پڑھ کر بین طور پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ جس طرح تدین وتقویٰ سے متصف تھے اسی طرح اللہ رب العزت نے آپ کو تیقظ و بیداری،نورفراست وحسن سیاست سے بھی نوازا تھا۔

حالات وفات

اشرف السوانح جلد چہارم کے عنوان ''حالات یوم وفات'' کے ضمن میں بہت سی باتیں حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ نے نقل فرمائی ہیں، ہم ان میں سے حضرت کے آداب حسنہ واخلاق عظیمہ سے مناسب احوال درج کررہے ہیں۔

دواؤں کے استعمال سے بھی تکلیف

دوا اور پرہیز کے سختی کے متعلق ایک بار جھنجھلا کر فرمایا کہ اگر میں طبیب ہوتا تو خصوصیت مزاج کی بنا پر اجتہاد کرتا اور سہولتیں پیدا کرتا۔ چنانچہ جس فن کو میں جانتا ہوں (یعنی تصوف) اس میں آپ جانتے ہیں کہ میں نے خصوصیات طبائع کے لحاظ سے کیسی کیسی سہولتیں اپنے اجتہاد سے پیدا کردی ہیں اور وہ کس قدر نافع ثابت ہوئی ہیں۔

ف: یقیناً حکیم الامتؒ نے ایسا ہی فرمایا ہے جو امت پر احسان عظیم ہے۔ جزاہم اللہ عنی وعن سائر المومنین۔ (مرتب)

عرض حال: صبح سے حضرت اقدس یہ فرمارہے تھے کہ آج تو ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ایک روز پہلے بائیں پاؤں کے نیچے ورم تحلیل ہوجانے کے بعد سخت ٹیسیں ہونے لگی تھیں، پھر ظہر کے بعد سوء نفس پیدا ہوگیا کیونکہ اس قسم کی شکایت پہلے بھی کئی بار ہوچکی تھی، احقر نے سمجھا کہ ویسے ہی شکایت ہے جو جاتی رہے گی، یہ خبر نہ تھی کہ یہ دم اکھڑ گیا ہے اور یہ پیش خیمہ ہے سفر آخرت کا۔ حضرت نے بھی احقر کے عرض کرنے پر کہ اس قسم کی شکایت پہلے بھی ہوچکی ہے، انشاء اللہ جاتی رہے گی۔ فرمایا کہ اتنی شدید تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی، اور

بجائے کراہنے کے لفظ اللہ اس انداز سے کہا کہ مجھے سخت تشویش ہوگئی کہ بہت تکلیف ہے۔ گو بظاہر گھبراہٹ کے آثار نہیں پائے جاتے تھے، اور اسی وقت کیا تمام بیماری میں آخر تک سراسیمگی یا بے تابی کسی وقت طاری نہیں ہوئی، ہر حال میں کوہ استقلال بنے رہے، صرف زبان سے بضرورت علاج تکلیفوں کا اظہار فرماتے رہے، اتنی شدید و مدید علالت کی ساری تکالیف کو مردانہ وار نہایت صبر وسکون سے برداشت فرماتے رہے۔ نیز کبھی آرام کا پہلو اختیار نہ فرمایا۔ عمر بھر طالب علمانہ انداز پر سارا سامان راحت ہوتے ہوئے بھی مشقت کی زندگی بسر فرمائی۔ جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نازک مزاج تو ہوں لیکن الحمد للہ نازک بدن نہیں۔

چنانچہ اگر آپ سے آرام کے طریقے اختیار فرمانے کے لئے عرض کیا جاتا تو فرماتے کہ مشقت ہی کی عادت اچھی ہوتی ہے، زیادہ آرام کی عادت ٹھیک نہیں ہے ورنہ بعد کو تکلیف ہوتی ہے۔

الغرض ہمیشہ طالبعلمانہ زندگی بسر فرمائی اور برابر کام ہی میں مشغول رہے، جب دیکھا کسی نہ کسی کام میں مشغول دیکھا، گویا زبان حال سے یہ کہتے تھے۔

ع　　من از برائے محنت و محنت برائے من

پھر علاوہ دماغی اور جسمانی مشقت کے طبعی کوفت بھی ہمیشہ ہی رہی کیونکہ بوجہ لطافت طبع رات دن لوگوں کی حرکتوں سے سخت سخت ایذائیں ہی پہنچتی رہیں، جن کے متعلق ایک بار فرمایا کہ علاوہ مرض کے ان غموم و ہموم نے بھی مجھے بیمار بنا رکھا ہے، اللہ تعالیٰ اب راحت کاملہ دائمہ نصیب فرمائے۔ آمین

باوجود اس طبعی کوفت کے روحی انشراح میں کبھی فرق نہ آیا بلکہ ایک بار کسی ناگوار بات پر غصہ آیا اور احقر نے ضعف ومرض کی بنا پر اظہار تردد کیا تو بطور تسلی کے فرمایا کہ نہیں اس قسم کی باتوں سے کسل دور ہو کر کند طبیعت تیز ہو جاتی ہے اور اس میں جودت پیدا ہو کر انشراح ہو جاتا ہے۔ انشراح تو آخر وقت تک محسوس ہوتا رہا گو ہنسی اور مزاح آخر میں بالکل موقوف ہو گیا تھا لیکن طبیعت میں جودت ویسے ہی تھی۔

انشراح کی یہ کیفیت آخر تک رہی، جیسا کہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی بڑے میاں کہہ دیتا ہے تو برا معلوم ہوتا ہے کہ میں ابھی بوڑھا کہاں ہوا ہوں، میں ابھی اپنے کو بالکل جوان محسوس کرتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ بیچارہ سچ تو کہتا ہے، اگر اس عمر میں بھی بوڑھا نہ ہوں گا تو اور کب ہوں گا، ابھی تک کیا جوان ہی دھرا ہوں۔ واقعی حضرت والا میں دینی جوش وخروش آخری وقت تک بوجہ قوت روحانی ویسا ہی رہا بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ بفحوائے

خود قوی تر می شود خمر کہن

خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

حضرت کی نیستی وفنائیت: ایک بار وفات سے کچھ روز پہلے ایک طالب کو جو امتیازی خصوصیت کے خواہاں تھے بواسطۂ احقر تنبیہ فرمائی کہ اپنے کو بالکل مٹا کر رکھنا چاہئے پھر فرمایا کہ گو اپنی مثال دینا برا ہے لیکن کیا کروں بضرورت کہتا ہوں کہ آپ مجھ کو نہیں دیکھتے کہ میری کسی بھی حالت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مجھے درویشی سے بھی کچھ تعلق ہے، حالانکہ جو اتنے لوگ میری طرف رجوع کرتے ہیں تو آخر وہ کچھ تو مجھے سمجھتے ہی ہوں گے، بس دیکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ یہ

خیال ہوسکتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا، ایک عاقل، ایک مدبر، ایک منتظم، ایک فلسفی شخص ہے، درویشی کا دور کا تعلق بھی دیکھنے والوں کو نہیں معلوم ہوتا ہے۔ بس اسی طرح کیوں نہ رہا جائے۔

ایک مرتبہ عرصہ ہوا احقر سے بھی یہ فرمایا تھا کہ طریق میں داخل ہوکر اپنے حالات میں تغیر کرنا ضروری ہے لیکن رفتہ رفتہ اور اس طور پر کہ کسی کو پتہ نہ چلے، کوئی ایسی امتیازی صورت اختیار نہ کرے کہ لوگوں کی خواہ مخواہ نظریں اٹھنے لگیں، اور خواہ مخواہ بزرگ سمجھنے لگیں۔

حضور دائم : حضرت کو حضور دائم کی ہر وقت کیفیت حاصل رہتی ہے، اور جب بضرورت تبلیغ مخلوق کی جانب متوجہ ہونا پڑتا ہے تو اس وقت بھی ان کی نظر بواسطۂ تبلیغ حق تعالیٰ ہی کی طرف رہتی ہے اور توجہ الی المخلوق توجہ الی الخالق کی مانع نہیں ہوتی، جیسے آئینہ میں محبوب کی شکل نظر آ رہی ہو تو گو آئینہ کا شیشہ اور چوکھٹا بھی پیش نظر ہوتا ہے لیکن عاشق کی ٹکٹکی محبوب کی عکس ہی پر بندھی رہتی ہے۔ نیز کاملوں کی نظر زیادہ تر قلب کی نگاہ داشت کی طرف رہتی ہے کہ وہ غافل نہ ہونے پائے۔ غرض کاملین کا پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے، اور بالخصوص ایسے وارث الانبیاء بزرگ کا پہچاننا تو بہت ہی مشکل ہے جو سچا وارث ہو اس سرور انبیاء کا جس کی شان میں لوگ یہ کہتے تھے ”**وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ**“ جو اس کا نمونہ ہو ”**لاتلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله**“ اور جو اس کا مصداق ہو ”**واذكر ربك فى نفسك تضرعا وخيفة ودون الجهر من القول بالغدو والاصال**“ جس کی یہ حالت ہو ”دل

بیار دست بکار'' جو باہمہ بھی ہو بے ہمہ بھی، جس کو ہر وقت باطن میں مقام شہود حاصل ہو اور ظاہری اشغال مانع نہ ہوں۔ ؎

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو

کہ بینی خندہ بر لبہا و آتش پارہ در دلہا

جس نے ہزاروں کو تو ذاکر و شاغل اور عابد و زاہد بنا دیا۔ لیکن خود قلندرانہ مشرب رکھا ہو یعنی بظاہر نہ زیادہ ذکر کرتا نظر آتا ہو، نہ زیادہ عبادت بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی شغل ظاہری میں منہمک دکھائی دیتا ہو۔

سب سے اعلیٰ عمل فنا و عبدیت ہے: سب سے اعلیٰ اور سب سے ارفع عمل باطنی تو کیفیت فنا و عبدیت تھی جو ہر وقت حضرت پر نہایت شدت کے ساتھ طاری رہتی تھی۔ اور جس کے اثر سے متاثر ہو کر حضرت بار بار یہاں تک فرمادیا کرتے تھے کہ میں تو اپنے کو کتوں اور سوروں سے بھی بدتر سمجھتا ہوں، اگر کسی کو یقین نہ ہو تو میں اس پر حلف اٹھا سکتا ہوں۔

حقیقی تواضع: اللہ اکبر کیا ٹھکانہ ہے تواضع کا، حقیقی تواضع اس کو کہتے ہیں جس پر حق تعالیٰ کی عظمت کا انکشاف ہو چکا ہو اس کی یہ کیفیت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ چنانچہ ایک بار ایک صاحب نے اپنے خط میں کسی مضمون کے ضمن میں یہ مصرع لکھ دیا۔ ع او بنازے عجبے من بنیازے عجبے

اس پر تحریر فرمایا کہ اس مصرعہ نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا دیا، کیا مجھے یہ پوری غزل مل سکتی ہے۔

اسی واقعہ سے اندازہ کر لیا جائے کہ حضرت اقدسؒ پر حق تعالیٰ کی عظمت

اور اپنی عبدیت کا کس درجہ انکشاف تھا۔ جبھی تو اس مصرعہ نے

''او بناز ے عجبے من بنیاز ے عجبے'' پر اس درجہ اثر کیا۔

اور لیجئے اس سے بڑھ کر واقعہ اس کے ثبوت میں سنئے۔ ایک بار احقر سے بطور راز کے فرمایا اور اس اہتمام اخفا کے ساتھ فرمایا کہ گو اپنا حال ظاہر کرنا مناسب نہیں لیکن آپ سے کیا پردہ، اس شرط سے کہتا ہوں کہ میری حیات میں کسی سے ظاہر نہ کیا جائے، وہ یہ کہ پہلے الحمدللہ شرعاً تو اطمینان تھا لیکن وجداناً یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود انکشاف عظمت خداوندی کے اور انکشاف امور آخرت کے اور انتہا درجہ ہیبت وخشیت کے پھر بھی اپنے اصحاب میں ہنس بول کیسے لیتے تھے۔ لیٹ کیسے لیتے تھے۔ مگر اب الحمدللہ وجداناً بھی سمجھ میں آنے لگا ہے کہ ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔ یعنی دونوں باتیں جمع ہوسکتی ہیں۔

اس حال خاص الخاص کا ارفع سے ارفع ہونا ظاہر ہے۔ جب صوبہ بہار میں زلزلہ سے نہایت دردناک حوادث رونما ہوئے تو ان کے حالات سن سن کے حضرت اقدسؒ جو ایک نہایت حساس اور رقیق وشفیق قلب پہلو میں رکھتے تھے بہت ہی کڑھتے تھے مگر ساتھ ہی فرماتے کہ زیادہ کڑھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں رضا بالقضاء میں فرق نہ آجائے۔ اگر دل نہ کڑھے تو مخلوق کے حقوق کے خلاف ہے، اگر زیادہ کڑھے تو خالق کے خلاف ہے۔ غرض بڑے کشاکش کا موقع ہوتا ہے کہ نہ مخلوق کی حق تلفی ہونے پائے، نہ خالق کی۔ واقعی صراط مستقیم پر جو طریق اعتدال ہے اور پل صراط کو اسی کی صورت مثالی کہا ہے، اپنے کو قائم رکھنا اور چلانا بہت ہی دشوار ہے۔ لیکن جب بندہ اس کا اپنی طرف سے اہتمام کرتا

ہے تو حق تعالیٰ اس کی ہر موقع پر اعانت فرماتے ہیں اور بڑی بڑی مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ (بیشک) (اشرف السوانح جلد چہارم ر ۵۳)

ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر میں لکڑی غلہ تجارت کرتا تو کیا یہ باتیں ذہن میں آتیں، لکڑی غلہ ہی دماغ میں بسا رہتا۔ ایسے مضامین کی آمد کے لئے تو اسی کی ضرورت ہے کہ قلب و دماغ کو دنیا کے سب قصوں سے فارغ رکھا جائے۔ ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند　　از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

ایک بار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا مراقبہ دل میں ڈال دیا ہے کہ ظاہری یا باطنی کیسی ہی پریشانی لاحق ہو مجھے ایسی پریشانی نہیں ہوتی کہ جس سے از جا رفتہ اور بے چین ہو جاؤں وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی، حاکم ہونے کی حیثیت سے تو انہیں ہمارے ظاہر و باطن میں ہر طرح تصرف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مجال دم زدن نہیں، اور حکیم ہونے کی حیثیت سے اطمینان ہے کہ وہ تصرف حاکم جابر کا سا نہ ہوگا بلکہ حکمت پر مبنی ہوگا چاہے وہ حکمت ہماری سمجھ میں آوے یا نہ آوے۔

سبحان اللہ یہ بھی رضا بالقضاء کی کتنی مکمل فرد ہے۔ اور کتنے اعلیٰ درجہ کا مستمر اور نافع عمل باطنی ہے۔ دنیا سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ یہ کئی بار فرمایا کہ میں اپنے کو تمام عالم میں تنہا پاتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ بس دنیا میں اللہ تعالیٰ ہیں اور میں ہوں اور کوئی نہیں ہے۔

یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے محبت تو اپنے سب احباب و متعلقین سے ہے لیکن ایسا تعلق کسی سے نہیں کہ دل اٹکا رہے، یہ تو بس اللہ تعالیٰ ہی سے رکھا

جائے اگر توفیق ہو۔

چنانچہ جب رمضان کے بعد ہجوم طالبین کم ہو جاتا، تو بہت سکون محسوس فرماتے اور فرماتے کہ ہجوم سے طبیعت پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ ہاں یہ تو مجھے مرض ہے کہ دو چار اپنے ہم خیال احباب پاس رہیں۔ بالکل تنہائی کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اور یہ تو بارہا فرمایا کرتے تھے کہ بس کام کے سامنے آتے ہی اس کی فکر سوار ہو جاتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے جلد فراغت ہو جائے۔ کیونکہ میں اپنے قلب کو فارغ رکھنا چاہتا ہوں اگر توفیق ہو تو قلب اللہ تعالیٰ کی یاد کے لئے آمادہ رہے، اور آسانی سے متوجہ ہو سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی الجھن ہوئی یا کوئی فضول بات کرتا ہے تو مجھے سخت جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔

حضرت اقدسؒ کسی کام سے فارغ ہوتے ہی فوراً تسبیح سنبھالتے تھے۔ اور بعض اوقات مزاحاً فرماتے کہ میں نے اس کا نام جال رکھا ہے کیونکہ اسی سے لوگ پھنستے ہیں۔ غرض کسی وقت فارغ بیٹھنا تو حضرت اقدسؒ کو گوارا ہی نہ تھا بلکہ اوروں کے لئے بھی یہی پسند فرماتے تھے کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہیں۔ چاہے وہ دنیا ہی کے ہوں۔ مگر فضول وقت ضائع نہ کریں۔ ایک صاحب علم اور صاحب ذوق کا تو یہ وجدان ہے کہ حضرت پر چونکہ ہیبت کا بہت غلبہ تھا۔ اور طبیعت بے حد حساس تھی اس لئے اپنے کو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھ کر اس کیفیت ہیبت کو معتدل بنائے رکھتے تھے۔ اور یہ مستبعد بھی نہیں کیونکہ حضرت اقدسؒ پر جو شباب میں ایک خاص کیفیت ہیبت کی طاری ہوئی تھی۔ جس سے خودکشی تک کے خیالات پیدا ہونے لگے تھے۔ اس سے نیز دیگر حالات سے

جو تجربہ حاصل ہوا اس کی بناء پر فرمایا کرتے تھے کہ سالک کو تارک محض نہ ہونا چاہئے۔ کچھ اشغال مباحہ بھی رکھنے چاہئیں ورنہ قلب کے بالکل خالی کردینے کی صورت میں شیطان کو تصرف کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ جس سے بعض اوقات اندیشناک حالت ہوجاتی ہے، ہیبت کے متعلق انہیں صاحب ذوق اہل علم سے حضرت کا یہ ملفوظ بھی سنا کہ نہ یہ خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دیں گے نہ یہ خیال ہوتا ہے کہ نجات ہوجائے گی۔ ایک عجیب حیرانی کی سی کیفیت ہے جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر خود حضرت کا ایک شعر یاد آگیا۔ ؎

اندریں رہ آنچہ می آید بدست　　　حیرت اندر حیرت اندر حیرت است

ایک اور ملفوظ بھی یاد آیا، فرمایا کہ: قطع نظر صفت قہر کے ایک ہیبت عظمت ذات حق کی ہوتی ہے۔ جیسے بلاتشبیہ کوئی شیر کٹہرے میں بند ہو۔ پھر بھی اس کی ذات میں جو ہیبت ہے اس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ گو اس کا پورا اطمینان ہوتا ہے کہ وہ ایسی حالت میں حملہ آور نہیں ہوسکتا۔ نہ کچھ نقصان پہنچا سکتا ہے، اسی قسم کی ہیبت اللہ تعالیٰ کی انبیاء علیہم السلام کو ہوتی ہے کیونہ وہ عذاب سے تو بالکل مامون ہوتے ہی ہیں۔

ایک اور ملفوظ یاد آیا فرمایا: جب کوئی متقی مرتا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ نہ معلوم کس بات میں گرفت ہوجائے اور جب کوئی غیر متقی مرتا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ نہ جانے کس بات پر مغفرت ہوجائے۔ ایک صاحب نے تنہائی کی شکایت لکھی تو فرمایا **"انا جلیس من ذکرنی"** کے ہوتے ہوئے تنہائی کہاں؟۔

ایک مرتبہ احقر نے بوقت رخصت ہراس ظاہر کیا۔ تو فرمایا: پریشانی کی کیا

بات ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ سرمایۂ تسلی ہر وقت پاس موجود ہے۔

ایک بار فرمایا کہ مبتدی کی توجہ نماز میں الفاظ کی جانب ہوتی ہے اور ہونی چاہئے اور متوسط کی معانی کی طرف۔ لیکن منتہی کی توجہ نہ الفاظ کی طرف ہوتی ہے، نہ معانی کی طرف۔ احقر نے عرض کیا کہ معانی کی طرف توجہ تو بہر حال مقصود معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا کہ ذات حق کے مقابلہ میں نہیں، جیسے دربار شاہی میں حاضری کے وقت خاص آداب والقاب مقرر ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کے مواجہ میں اس کی عظمت شان کی طرف ہمہ تن توجہ ہوتی ہے نہ کہ ان الفاظ اور ان کے معانی کی طرف، خیال بھی نہیں ہوتا کہ کیا منہ سے نکل رہا ہے۔ اور اگر منتہی الفاظ یا معانی کی طرف متوجہ ہو تو اس کو تو سخت الجھن ہونے لگے۔

بارہا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ ایسا ہے جیسے ہر موقع پر یہ فرماتے جاتے ہوں کہ دیکھ ہم نے تیرے ساتھ یہ احسان کیا، دیکھ ہم نے تیرے اوپر یہ رحمت کی، ہم نے تجھ کو یہ نعمت دی۔ پس آواز تو آتی نہیں باقی ہوتے سب معاملات ایسے ہی ہیں جیسے ساتھ کے ساتھ جتاتے بھی جا رہے ہوں۔

سبحان اللہ کیا راز و نیاز ہیں۔ احقر نے اسی کو یوں نظم کیا ہے ؎

تم سا کوئی ہمدم کوئی دمساز نہیں ہے
ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے

ان واقعات عجیبہ اور حالات رفیعہ سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت اقدسؒ ہر وقت اپنے قلب کی اور اپنے جذبات کی کس قدر نگرانی فرماتے رہتے تھے اور ان کو کس اہتمام سے جادۂ اعتدال پر رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ ارشاد نقل کیا جا چکا ہے

کہ الحمدللہ میں کبھی اپنی طبیعت کو عقل پر اور عقل کو شریعت پر غالب نہیں آنے دیتا۔ بالکل آخر میں جب سر کنے کی بھی سکت نہ رہی تو لیٹے لیٹے تیمم سے اور اشاروں سے نماز ادا فرمانے لگے۔ غرض کیسی ہی معذوری کی حالت اور کتنی ہی تکلیف اور زحمت بوجہ بار بار کے دستوں کے اور نجاست کے بار بار دور کرانے کے ہوئی، لیکن نماز بعون اللہ تعالیٰ آخر دم تک کوئی قضا نہ ہونے دی۔ نظافت کا یہ اہتمام تھا کہ اگر ذرا سی نجاست بھی لگ جاتی یا سیاہی یا دوا وغیرہ کا دھبہ پڑ جاتا یا پینے کے وقت چائے وغیرہ گر جاتی، یا غذا وغیرہ ہاتھ یا ریش مبارک میں لگ جاتی تو فوراً پانی منگوا کر اسی وقت سب کام چھوڑ کر خود صفائی فرما لیتے اور یہ ہمیشہ معمول رہا، یہاں تک کہ بالکل آخری دن چونکہ دست مسلسل ہو رہے تھے کپڑے تہ کر کے نیچے بچھا دیئے گئے تھے انہیں پر لیٹے لیٹے اجابت ہوتی تھی اور کپڑے ہر مرتبہ بدل دیئے جاتے تھے اور نمازوں کے وقت دونوں پیرانی صاحبہ طہارت کرا دیتی تھیں۔ احقر نے ظہر کے وقت طہارت کے دوران بوجہ پردہ باہر بیٹھے بیٹھے سنا کہ حضرت بڑی پیرانی صاحبہ سے جو طہارت کرا رہی تھیں فرما رہے تھے کہ کچھ کمر کے اوپر مجھے نجاست معلوم ہو رہی ہے۔ غالباً حضرت پیرانی صاحبہ کے اس فرمانے پر کہ نہیں کوئی نجاست نہیں۔ فرمایا کہ کپڑا بھگو کر مجھے دیدو میں صاف کر لوں۔ غالباً حضرت کو محض شبہ تھا نجاست نہ تھی۔

دو چیزوں کا خیال: غرض نماز کا آخر دم تک بیحد اہتمام رہا۔ یہاں تک کہ وفات سے دو چار روز قبل احقر سے خاص طور سے فرمایا کہ مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے نماز کا اور حقوق کا۔ احقر اطمینان دلانے کے لئے عرض کیا کہ حضرت

نمازیں تو غایت ضعف کی وجہ سے سخت تعب ہونے کے باوجود بھی ادا فرمارہے ہیں۔ اب تک بفضلہٖ تعالیٰ کوئی قضا نہیں ہونے پائی۔ رہے حقوق سو ان کے متعلق تو حضرت نے کبھی کوئی حالت منتظرہ باقی رکھی ہی نہیں۔ ان کو وقت کے وقت مدوار تھیلیوں میں مع پرچہ جات حساب رکھ دیا۔ اور اگر کسی ایسی مد کی رقم ہوئی جس کا حساب دوسرے کے متعلق ہے۔ اس کو آتے ہی اس کے پاس پہنچا دیا۔ غرض ساری رقوم متمیز ہیں۔ احقر کی اس تقریر کو سن کر عجیب بے بسی کے لہجے میں فرمایا کہ کیسے سمجھاؤں۔

نہ معلوم ان دونوں چیزوں کا کون سا درجہ نظر میں ہوگا۔ جب مجھ سے حضرتؒ کے اس ارشاد کو کہ دو چیزوں کا مجھ کو بہت خیال ہے نماز اور حقوق کا، اہل علم حضرات نے سنا، تو انھوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی بعض روایات پر آخر کلمات یہ تھے۔ **"الصلوٰۃ وماملکت ایمانکم"** نماز اور حقوق کا انتہا درجہ خیال۔ واقعی آخری وقت تک رکھا۔ چنانچہ نماز تو آخری وقت تک پڑھی۔ اور کوئی نماز قضا نہ ہونے دی۔ اور حقوق کی ادائیگی تو حضرت کا آخری ہی عمل تھا۔

روزوں کا اہتمام: روزوں کا اتنا اہتمام تھا کہ باوجود ضعف ومرض کے گذشتہ رمضان شریف کے پورے روزے رکھے۔ پھر اس سے پہلے رمضان کے روزے جو لکھنؤ کے دوران علاج میں سوائے ایک کے سب کے سب قضا ہوئے تھے وہ اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ناغہ کر کے سب رکھ ڈالے۔ اور ان کی ادائیگی کا اتنا خیال تھا کہ باربار بہت پہلے سے بہت ہی آرزومندانہ لہجہ میں ہم خدام سے فرمایا کرتے تھے کہ دعا کیجئے اس وقت مجھے اتنی قوت آجائے کہ ایک

سلسلہ میں دونوں مہینوں کے روزے رکھنے کی ہمت ہو جائے۔ چنانچہ اس میں بعون اللہ تعالیٰ کامیاب ہو گئے اور اس کی یہ حکمت ظہور پذیر ہوئی کہ اگر اس وقت نہ ادا کر چکے ہوتے تو پھر ان کی ادائیگی کی نوبت ہی نہ آتی۔ اور سب روزے ذمہ رہ جاتے۔ غرض بعون اللہ تعالیٰ باوجود انتہائی ضعف و مرض کے نہ ایک نماز اپنے ذمہ چھوڑی نہ ایک روزہ۔ **وذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

خدمات مالیہ: خدمات مالیہ کا تو یہ حال تھا کہ شروع ہی سے برابر اپنے فتوحات مالیہ میں سے چوتھائی حصہ علاوہ زکوٰۃ کے صدقات نافلہ میں صرف فرماتے رہے۔ اور اس سے زائد بھی۔ چنانچہ اس مد کی کاپی الگ تھی جس میں بعض خاص ضرورت کے مواقع پر بڑی بڑی رقوم اس مد میں پیشگی خرچ فرمادیتے۔ پھر مجرا ہوتا رہتا۔ اس طرح ربع آمدنی کے حساب سے اپنی عمر میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ صدقات میں صرف فرماڈالے بلکہ ترکہ کا ربع حصہ کارہائے خیر میں صرف کئے جانے کی وصیت فرماگئے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل وصیت ہے اور جس کے صرف کا انتظام اب کیا جارہا ہے۔

اس کے علاوہ ہزار ہا روپیہ لوگ حضرت اقدس کو اعلیٰ درجہ کا امین و مصارف خیر کا بہترین جاننے والا اور مواقع شناس سمجھ کر اپنی طرف سے امور خیر میں صرف کرنے کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔ ان کا ثواب حضرت اقدسؒ کو الگ ملتا تھا۔ کوئی سائل خالی نہ جاتا۔ حسب گنجائش و مصلحت ضرور کچھ نہ کچھ خدمت فرماتے۔ بشرطیکہ خود کوئی گڑبڑ نہ کرے اور اصول صحیحہ جو بتائے جائیں ان پر عمل کرے۔

اہل خانقاہ، اہل قصبہ، متعلقین وغیر متعلقین، مقامی، بیرونی سب حاجتمندوں کی ضروریات پر جہاں تک علم ہوسکتا نظر رکھتے اور حسب مواقع اعانت فرماتے رہتے۔ بعض خاص خاص مواقع پر بالخصوص اہل علم اور شرفا کے اہل حاجت متعلقین کو بڑی بڑی رقمیں بھی عطا فرمائی گئیں اور متعدد اہل حاجت کو ماہوار رقمیں بھی دی جاتیں۔ بڑے بڑے چندے بھی کار خیر میں دیتے رہتے تھے۔ اکثر دیکھا کہ کبھی کپڑے مساکین کو تقسیم کئے جارہے ہیں کبھی نقد کبھی طعام، خیرات بھی بڑے انتظام سے کرتے جیسا کہ ہر چھوٹے بڑے کام میں معمول تھا۔

غرض حضرت اقدسؒ کی ذات ستودہ صفات گویا سراپا جود وعطا تھی۔ بعض اہل حاجت کو حضرت اقدسؒ کے بعد خود احقر نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اور پریشان ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت کے ہوتے ہوئے بڑی تقویت اور بےفکری تھی اور بڑا سہارا اور اطمینان تھا، اب سخت پریشانی ہے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔

قرض دینے کا معمول: قرض دینے کی بھی الگ مد تھی۔ محض اعتماد کے مواقع پر بلا رقعہ وغیرہ بڑی بڑی رقمیں ہزار ہزار سے بھی متجاوز بے تامل بطور قرض عطا فرمادیتے تھے۔ اپنے جراح کو قرض مانگنے پر دو سو روپیہ فوراً عطا فرمادیئے اور فرمایا جب سہل ہوادا کردینا اور نہ ہوسکے نہ ادا کرنا۔ مگر اس نے جلد ادا کردیئے۔ بعض نے ادائیگی قرض میں بہت لیت و لعل کیا اور پریشان کیا تو اس الجھن سے بچنے کے لئے ان سے فرمایا کہ بھائی اس سے تو صاف کہہ دو کہ دے سکتے ہو یا نہیں۔ چنانچہ بعض کے عذر کردینے پر کافی کافی رقمیں چھوڑ بھی دیں۔ فرمایا کرتے

تھے کہ باوجود اتنی شرائط وقیود ہدیہ کے بھی اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا عطا فرمایا کہ بعض بعض مہینوں میں ایک ایک ہزار بھی ملا۔ آمدنی کے تین حصے فرمالیا کرتے تھے۔ دو حصے دونوں گھروں میں دے دیتے۔ ایک حصہ اپنے لئے رکھ لیتے۔ مگر فرماتے کہ میرے پاس زیادہ روپیہ جمع ہوجاتا ہے تو مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ اس لئے جب معتد بہ رقم جمع ہوجاتی ہے تو اس کو بھی دونوں گھروں میں تقسیم کردیتا ہوں۔ جب کسی کی رقم بوجہ فقدان شرائط ہدیہ واپس فرماتے اور یہ آئے دن ہوتا ہی رہتا تھا تو اکثر فرماتے کہ واپس کرتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہوجائیں کہ نالائق ہم تو تیرے پاس بھجوادیتے ہیں۔ اور تو نخرے کرتا ہے۔ اور بھجوانا ہی بند فرمادیں تو یہ سارا استغناء دھرا رہ جائے۔ یہ استغناء بھی اسی وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ اور ہمیشہ دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ اکثر دیکھا کہ جب کوئی رقم واپس کی تو فوراً اس کا نعم البدل حق تعالیٰ نے دوسروں سے بھجوادیا۔ مگر کیا کروں خلاف اصول لینے سے حیرت مانع ہوتی ہے۔ میں حریص بھی ہوں۔ متقی بھی نہیں۔ مگر غیور ضرور ہوں۔

عالم ربانی کی خاص علامت: عالم ربانی کی خاص علامت یہ ہے کہ وہ تحصیل علم میں بھی حریص ہوتا ہے۔ اور تبلیغ واشاعت علم میں بھی۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا ایک ارشاد حضرت امیر شاہ خاں صاحب نقل فرمایا کرتے تھے کہ وہ شخص جس کو تبلیغ دین کا جذبہ اس درجہ تک نہ پہنچ جائے جیسے ضروریات بشریہ، کھانا پینا وغیرہ ہیں۔ اس وقت تک وہ دین کی پوری خدمت نہیں کرسکتا۔ حضرت والاؒ کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ بحمد اللہ آپ کی ہمیشہ سے یہی شان تھی۔ علم وحکمت کی

بات کسی بچہ یا ان پڑھ جاہل سے بھی سن لی ہے تو بڑی قدر کے ساتھ اس کو محفوظ رکھا۔ اور مجلسوں میں اسی کے حوالہ سے نقل فرمایا اسی طرح اشاعت علم ودین کا وہ قوی جذبہ حق تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک میں ودیعت فرمایا تھا کہ ہر وقت اس کے لئے بے چین تھے اور کاموں سے کبھی کبھی تکان محسوس ہوتا تھا، لیکن علمی خدمات سے باوجود ضعف کے بھی تکان محسوس نہ فرماتے تھے۔ (حوالہ بالا/ ۶۳)

ایک مرتبہ حضرت کے خلفاء میں سے ایک اہل علم نے اپنا ایک نوتصنیف رسالہ حضرت کی خدمت میں بھیجا اور یہ لکھا کہ حضرت کے ضعف کی وجہ سے رسالہ پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن اس کی بھی جرأت نہیں ہوئی کہ میرا کوئی رسالہ شائع ہو اور وہ کسی درجہ میں بھی حضرت کی نظر سے نہ گذرے۔ اس لئے میری درخواست صرف اتنی ہے کہ کہیں سے چند سطریں ملاحظہ فرمالیں اور موضوع رسالہ ابتداء رسالہ میں ملاحظہ فرمالیں۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں نے رسالہ بالاستیعاب دیکھا کیونکہ اس کے دیکھنے سے نشاط بڑھ گیا۔ تکان محسوس نہیں ہوا۔ اشاعت دین وعلم دین کے اسی والہانہ جذبہ کا نتیجہ ہے جو تقریباً ایک ہزار تصانیف ومواعظ وملفوظات کی صورت میں بحمد اللہ آج بھی ہزاروں مسلمانوں کی رہبری کا کفیل بنا ہوا ہے، اتنی تصانیف اپنے قلم سے کرنے کے باوجود ہر پیش آنے والی اسلامی ضرورت کے لئے تصنیف کا سلسلہ جاری رہنے کا خاص اہتمام قلب اقدس میں تھا اور حسن اتفاق سے حق تعالیٰ نے حضرت کے خدام میں علماء ماہرین کا ایک اچھا خاصہ مجمع جمع فرمادیا ہے۔ اکثر اوقات ان علماء کو مختلف قسم کی تصانیف کا مشورہ دیتے اور ان کی تصنیف میں امداد واعانت کا خاصہ حصہ لیتے

تھے۔ چنانچہ ایسی تصانیف کا ایک اچھا کافی سلسلہ ہے جو حضرت والا کے مشورہ اور ارشاد کے موافق دوسرے علماء نے کیں۔ اس سلسلہ میں چند تصانیف ایسی بھی ہیں جو خود حضرت والا نے بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے اپنے خاص اہتمام سے کرائیں۔ جن میں سب سے بڑی تصنیف اعلاء السنن کی ہے۔ جس میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کے پورے فقہ کے دلائل وشواہد احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے نہایت تنقید وتحقیق اور عدل وانصاف کے ساتھ جمع کئے گئے۔ یہ وہ بے نظیر تصنیف ہے کہ اگر چہ اس موضوع پر متعدد علماء نے کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اتنی مکمل ومفصل آج تک نہیں ہوئی تھی۔ اس تصنیف کا اکثر حصہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ کے قلم سے ہے۔ حضرت کا ملاحظہ اور مشورہ بھی اکثر حصہ میں شامل رہا ہے۔ تقریباً پچیس تیس سال تک مسلسل اس کی تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ اور تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ اس کی تصنیف واشاعت میں صرف ہوا اور بالآخر حضرت والا کی حیات وصحت ہی کے زمانہ میں بحمد اللہ یہ تصنیف مکمل ہو گئی۔ اور گیارہ جلدیں شائع بھی ہو گئیں۔ چار پانچ جلدوں کی اشاعت باقی ہے جو اس وقت کاغذ کی شدید گرانی کے سبب ملتوی ہے۔ اور ان شاء اللہ کاغذ میں کچھ سہولت پیدا ہو جانے پر ان کی اشاعت بھی جلد ہو جانے کی توقع ہے۔ (حوالہ بالا: ٦٤)

ف: الحمد للہ اب مکمل طباعت ہو گئی۔ (مرتب)

مزید تصانیف کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہو تو اصل کتاب کی مراجعت کریں۔ (مرتب)

حکیم الامتؒ کا امام محمدؒ کے قول پر عمل: الغرض علم دین کے متعلق

حضرت امام محمدؒ کا یہ ارشاد کہ **"ان صناعتنا ھذہ من المھد الی اللحد"** یعنی ہمارا فن بچپن کے گھوارہ سے شروع ہوتا ہے اور گور کے دروازہ تک رہتا ہے۔ حضرت والا نے عملاً دکھادیا۔ طاقت نے بالکل جواب دے دیا تھا، لیکن پھر بھی افادات کے شوق کا وہ عالم تھا جس کو کسی نے شراب و مینا کے عنوان سے ادا کیا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

حضرت اقدس قدس سرہ العزیز نے اپنی ساری عمر اور عمر بھی ماشاء اللہ اتنی طویل ایک دھن میں بلکہ ایک ہی کی دھن میں بسر فرمادی بفحوائے

ع یکے دان و یکے بیں و یکے گو

فجزاہ اللہ فی الآخرۃ احسن الجزاء واعطاہ اللہ الدرجات العلیٰ ورزقہ مرافقۃ الانبیاء ان ساری تفصیلات اعمال باطنہ وظاہرہ کا جو اوپر عرض کی گئیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت اقدس کی حالت بفضلہٖ تعالیٰ وبعونہ وہ تھی جو اس دعائے منصوص میں طلب فرمائی گئی ہے۔ **"اللھم اجعل سریرتی خیرا من علانیتی واجعل علانیتی صالحۃ"** (ترجمہ: یا اللہ کردے میرے باطن کو بہتر میرے ظاہر سے اور کر میرے ظاہر کو اچھا۔) اور اس دعا میں بھی **"اللھم اجعل وساوس قلبی خشیتک وذکرک واجعل ھمتی وھوائی فیما تحب وترضیٰ اللھم وما ابتلیتنی بہ من رخاء وشدۃ فمسکنی بسنۃ الحق وشریعۃ الاسلام"** (ترجمہ: یا اللہ کردے میرے دل کے خیالات کو اپنا خوف اور اپنی یاد اور کردے میری ہمت اور خواہش میری اس چیز میں جسے تو اچھا سمجھے

اور پسند کرے۔ یا اللہ اور جس بات میں امتحان کرے میرا خواہ آسانی ہو یا سختی تو جمائے رکھ مجھے طریق حق اور شریعت اسلام پر۔ (اشرف السوانح چہارم:۶۹)

تاریخ وفات: بہرکیف وہ چراغ جو کئی برس کے مرض کے تند و تیز جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر سہ شنبہ یعنی ۱۶، ۱۷/ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹، ۲۰/ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی رات ۸۲/ سال، ۳/ ماہ، ۱۱/ دن کی عمر پا کر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔

اس سانحۂ عظیم کی اطلاع ہوا کی طرح پھیلی چنانچہ دہلی اور دوسرے شہروں سے اسپیشل ٹرینیں آئیں ، اور ہزاروں شیدائیوں کے ساتھ مجدد الملت کا جنازہ نکلا۔ ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

عیدگاہ میں نماز پڑھائی گئی اور پھر آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ میں جس کا تاریخی نام (قبرستان عشق بازاں) تھا جسم مبارک کو پیوند خاک کیا گیا۔ نَوَّرَ اللّٰہُ مرقدہٗ

تعزیتی مضمون: حضرت العلامہ سید سلیمان ندویؒ نے حضرت حکیم الامتؒ کی وفات پر جو نہایت معتقدانہ و مبصرانہ مضمون ارقام فرمایا ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے بعض حصہ کو نقل کرنے کی سعادت حاصل کروں۔

محفلِ دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ۸۲/ سال ۳/ ماہ ، ۱۱/ روز ، جل کر ۱۷/ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ ؎

داغ فراق، صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم الامت ، مجدد طریقت ، شیخ الکل ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

نے مرض ضعف واسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹؍اور ۲۰؍جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو، ۱۰ بجے نماز عشا کے وقت اس دار فانی کو الوداع کہا اور اپنے لاکھوں معتقدوں، مریدوں اور مستفیدوں کو غمگین ومہجور چھوڑا۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔**

اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا، جو حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کی یادگار تھا، اور جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد بریلویؒ کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق وعشق اور مجددی سکون ومحبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت وطریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقر وتصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا ،اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالی کے فضل وتوفیق سے اپنی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر وتقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمتِ ربانی کو برملا فاش کیا تھا، اور اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرفِ زمانہ کے لئے یہ خطاب عین حقیقت تھا۔ (یادرفتگان: ص؍۲۳۸)

پسماندگان: حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی وفات کے بعد دو زوجات صالحات چھوڑیں، آپ کے اگرچہ کوئی صلبی اولاد نہ تھی مگر آپ نے ہزاروں تصانیف اور ہزارہا ہزار مریدین اور سیکڑوں خلفاء ومجازین چھوڑے جن میں سے ہر ایک تدین وتقویٰ میں کمال اور تعلیم وتربیت میں اعلیٰ صلاحیت رکھتا تھا، بلکہ آپ کے مریدین میں اچھی خاصی ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو اپنے علم وعمل اور صفائی

معاملات کے لحاظ سے قابل اجازت وخلافت تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ نے ایک مرتبہ دائرہ شاہ علم اللہ ؒ میں میرے سامنے حضرت حکیم الامت ؒ کی تعریف کے ضمن میں فرمایا کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس زمانہ کے جتنے باصلاحیت لوگ تھے سب کو حضرت مولانا تھانوی ؒ کے گرد جمع فرمادیا تھا۔''

اختتام: یہ حقیر مزید عرض کرتا ہے کہ جس طرح حضرت فاروق اعظم ؓ **اشدھم فی امر اللہ عمر** کی رو سے دین کے معاملہ میں تصلب اور پختگی سے متصف تھے اسی کے ساتھ ساتھ غایت درجہ تیقظ، معاملہ فہمی اور سیاسی بیداری سے بھی بہرہ ور تھے، جسکو سیاسی مبصرین نے بھی تسلیم کیا ہے، اس کے مطابق حضرت حکیم الامت ؒ اپنے جدامجد حضرت عمر فاروق ؓ کے نقش قدم پر تھے یعنی آپ کو اللہ تعالی نے آں حضرت ﷺ کے ارشاد پاک ''**اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله**'' (یعنی مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) اور دوسرے ارشاد ''**لا يلدغ المؤمن من جحر واحد مرتين**'' (یعنی مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا) اور خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول ''**لَا نَخْدَعُ وَلَا نُخْدَعُ**'' (یعنی ہم نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہ کسی سے دھوکہ کھاتے ہیں) کا کامل نمونہ بنایا تھا۔

حضرت حکیم الامت ؒ کے ارشادات حکایت اور اصابت رائے کے واقعات شاہد ہیں کہ آپ کی ذات میں مذکورہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں، ایسے ہی شخص کیلئے بجا طور پر ''حکیم الامت، مجدد الملت'' جیسے القاب زیب دیتے ہیں، جو محض فیض الہی اور عطیہ خداوندی سے نصیب ہوتے ہیں۔ **ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ**۔ (مرتب)

فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد[1] صاحبؒ المتوفی ۱۳۴۷ھ

مہتمم خامس دار العلوم دیوبند

نام ونسب: فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ بانی دار العلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے صاحبزادے اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے والد ماجد ہیں۔

ولادت: آپ کی ولادت نانوتہ ضلع سہارنپور میں ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے گھر ہوئی، یہ نور نظر بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل ہوا تھا، آپ کے والد ماجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ہیں، آپ کی والدہ ماجدہ دیوبند کے مشہور رئیس شیخ کرامت حسین عثمانی کی بڑی صاحبزادی تھیں، بڑی صابرہ وشاکرہ خاتون تھیں۔

تعلیم: حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی عمر جب مکتب نشینی کے قابل ہوئی تو قصبہ رامپور میں جید حافظ قرآن جناب نور محمد صاحبؒ کے سامنے بٹھا دیا، بچے کی ذہانت وفطانت اور مشفق استاد کی توجہ نے جلد ہی رنگ دکھایا اور اس خوشخبری نے حضرت نانوتویؒ کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں کہ ''احمد میاں'' نو سال میں حافظ قرآن بن چکے ہیں۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب جب حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تو ابتدائی تعلیم کے لئے انہیں گلاؤٹھی بھیجا، حضرت نے ابتدائی تعلیم گلاؤٹھی میں حاصل کی۔

---

[1] مرقومہ: مولانا محمد شکیب صاحب قاسمی زید مجدہ

حضرت نانوتویؒ نے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد اپنے نورنظر کو مدرسہ قاسم العلوم مسجد شاہی (جو آج دارالعلوم شاہی مرادآباد کے نام سے دنیا میں مشہور ہے) بھیجا۔ یہ مدرسہ بھی حضرت ہی نے قائم فرمایا تھا: اس مدرسہ میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے شاگرد رشید اور آپ کے علوم ومعارف کے امین حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ حضرت نانوتویؒ کے حکم سے تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے پوری تندہی اور یکسوئی کے ساتھ مرادآباد میں علوم وفنون کی مختلف کتابیں پڑھیں۔

دارالعلوم دیوبند میں: اسی دوران حضرت نانوتویؒ نے اپنے نورنظر کو خاص انداز سے پڑھانے کا ارادہ فرمایا اور حضرت محمد احمد صاحب کو مرادآباد سے دیوبند بلالیا۔ حضرت نانوتویؒ کی تمنا یہ تھی کہ اب اپنی توجہ سے مولانا محمد احمدؒ کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے اور اسی لئے مرادآباد سے دیوبند بلالیا، مگر حضرت نانوتویؒ کی وفات کا زمانہ قریب آچکا تھا، سفر حج کی تیاریاں تھیں اور اسی سفر میں مرض موت شروع ہوگیا، اس لئے جس خصوصی تعلیم کے لئے صاحبزادہ محترم کو بلایا تھا وہ خود نہیں دے سکے، البتہ مولانا محمد احمد صاحب نے اپنی بقیہ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پوری کی، متعدد کتابیں بالخصوص معقولات اور عربی زبان وادب کی اونچی کتابیں حضرت شیخ الہندؒ نے پوری محنت وتوجہ سے اس سونے کو کندن بنایا، اور علمی وفکری اور انتظامی طور پر ایسی توانائی بخشی کہ آنے والے دنوں میں کوئی شورش، کوئی طوفان حضرت کے قدم کو ڈگمگا نہیں سکے، آپ نے دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۰۰ھ میں فراغت حاصل کی، اس وقت آپ کی عمر تقریباً اکیس سال تھی۔ مولانا محمد احمد صاحبؒ نے

تکمیل حدیث کے لئے ’’گنگوہ‘‘ کا سفر کیا، ایک دیرینہ رفیق اور ہمدم ودمساز کے فراق کے بعد اس کی یادگار اور لائق فرزند کو دیکھ کر، حضرت گنگوہیؒ کے دل میں جو جذبات موجزن ہوئے ہوں گے کون ہے جو اس کا صحیح اندازہ لگا سکے، حضرت گنگوہیؒ نے بڑی شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا اور اجازت حدیث دی۔ آپ کے مشہور اساتذہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، سید العلماء حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی۔

مسند تدریس پر: فراغت کے بعد آپ نے تدریس کو ترجیح دی، سب سے پہلے مدرسہ تھانہ بھون پہونچے، جو حضرت نانوتویؒ کا ہی قائم کیا ہوا تھا، آپ نے وہاں بڑی تندہی سے تدریسی خدمات انجام دی، تھانہ بھون میں آپ تقریباً تین سال خدمات انجام دیتے رہے، ۱۳۰۳ھ میں وہاں سے دیوبند بلائے گئے، دارالعلوم دیوبند میں مدرس ششم مقرر کئے گئے، تمام فنون کی کتابیں آپ سے متعلق تھیں، لیکن خصوصیت سے مشکوٰۃ شریف، مختصر المعانی، جلالین شریف، میر زاہد وغیرہ کتابوں کا درس بہت مشہور تھا۔

آپ کا درس بہت مقبول تھا، آپ کے درس میں طلبہ کا رجوع بہت زیادہ ہوتا تھا، آپ انتہائی کامیاب مدرس تھے اور کامیاب مدرس کی تمام خوبیوں سے آراستہ، علوم قاسمی پر عبور اور گہری نظر نے آپ کے اندر شرح صدر کی کیفیت پیدا کردی تھی۔

حضرت فخر الاسلام کے چند مشہور تلامذہ: حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ،

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندیؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفتیٔ اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ، حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمگڈھی ثم الہ آبادیؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحبؒ۔

دارالعلوم دیوبند کے منصب اہتمام پر: جمادی الثانیہ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ابن حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم بنائے گئے، آپ کا عہد سابقہ تمام عہدوں سے زیادہ طویل اور انتہائی پرشوکت دور گذرا ہے، یہ دور چالیس برس تک ممتد رہا، اور اس چالیس سالہ مدت میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی، حضرت فخر الاسلام کا دور اہتمام دارالعلوم میں علمی ترقیات کے لحاظ سے دارالعلوم کا سب سے سنہرا دور ہے، بانیان دارالعلوم نے تاسیس دارالعلوم کے وقت اسلامی علوم کی نشاۃ ثانیہ اور غیر معمولی ترقی کا جوخواب دیکھا تھا وہ اسی دور میں شرمندہ تعبیر ہوا، اس دور کی علمی ترقیات کا دراصل راز دارالعلوم کے مختلف شعبوں میں اصحاب فضل وکمال کا حسین اجتماع اور جھرمٹ تھا، دارالعلوم کی سرپرستی قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرمارہے تھے، جو ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کوشش کرنے والے علماء واکابرین میں سرفہرست رہے، اور جنہیں بے پناہ تفقہ فی الدین کی بناء پر حضرت نانوتویؒ نے ''ابوحنیفۂ عصر'' کا لقب عطا فرمایا تھا۔ اس دور اہتمام

میں حسن انتظام اور غیر معمولی تعلیمی وتربیتی ترقیات کی وجہ سے پورے ملک میں دار العلوم کا شاندار تعارف ہوا، ہندوستان کے مسلمانوں کا دار العلوم پر اعتماد بڑھ گیا اور اس کے مفید نتائج سامنے آئے، آپ ایک باوقار اور بارعب عالم دین، صاحب فراست اور دقیقہ سنج منتظم اور صاحب دل بزرگ تھے، آپ ہی کے دور میں دار العلوم کو عظیم مرکزیت حاصل ہوئی، اس کے افکار وخیالات نے امت مسلمہ میں مقبولیت حاصل کی اور فضلائے دار العلوم کے علوم وتحقیقات کو اعتبار اور قدر کی نگاہ سے دنیا میں دیکھا جانے لگا۔

ریاست دکن کی عدالت عالیہ کے منصب پر: دار العلوم جوں جوں ترقی اور شہرت کے منازل طے کرتا گیا، منتظمین اور اساتذہ دار العلوم بالخصوص حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا، آپ کے علمی قابلیت، ملک گیر شہرت اور بے نظیر انتظامی صلاحیت کو دیکھ کر نظام دکن نے ریاست دکن کی عدالت عالیہ میں آپ کی خدمات حاصل کرنی چاہی۔

نظام دکن سے مراد آصف جاہ سابع امیر عثمان علی خان بہادر ہیں، امیر عثمان علی خان ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۸ء تک حیدر آباد کے حاکم رہے۔

آپ بڑے علم دوست اور علماء نواز تھے، آپ کی توجہات عالیہ کی برکت سے دائرۃ المعارف العثمانیہ سے اسلامی تہذیب وثقافت کے بارے میں اساس کا درجہ رکھنے والی کتابیں تحقیق وتخریج کے زیور سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں۔

امیر عثمان علی خان کی بڑی خواہش تھی کہ عدالت عالیہ کے عہدۂ قضاء پر ایسی شخصیت کو بحال کیا جائے جو علوم شرعیہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ زمانے کی

نزاکتوں سے خوب واقف ہو، اور ایک اچھے قاضی کے تمام اوصاف کا حامل ہو،
نظام دکن کی نظر حضرت فخر الاسلام علیہ الرحمہ پر پڑی اور اکابر کے مشورے سے یہی
طے پایا کہ یہ درخواست مسترد نہ کی جائے اور اس کی سب سے بڑی وجہ ریاست
دکن اور دار العلوم کے دیرینہ تعلقات تھے، حاکم دکن امیر عثمان علی خان بہادر نے
سنہ ۱۳۴۰ھ میں بڑی عزت واحترام سے آپ کو دکن آنے کی دعوت دی، نظام دکن
نے آپ کے ساتھ بڑی عزت واحترام کا معاملہ فرمایا، ایک ہزار روپیہ آپ کی تنخواہ
مقرر کی، ڈھائی سو روپیہ پہلے ہی سے آپ کا سرکاری وظیفہ جاری تھا، اور ساڑھے
سات سو روپئے تنخواہ مقرر کی، نظام دکن کا اصول یہ تھا کہ وظیفہ خوار شخص کو جب وہ
سرکاری عہدہ پر مقرر فرماتے تو وظیفہ بند کردیتے مگر فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد
صاحبؒ کو انھوں نے اس اصول سے مستثنیٰ رکھا، آپ کی رہائش کے لئے ایک عمدہ
مکان اور سواری کے لئے دو گھوڑے عطا فرمائے، تمام درباروں اور نذر وغیرہ کی
پیشکش سے آپ کو الگ رکھا، عدالت عالیہ کے اجلاس میں شرکت کو بھی ضروری
قرار نہیں دیا بلکہ قیام گاہ پر ہی اجلاس کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

دکن میں فضلائے دیوبند کا رجوع: قیام دکن کے زمانے میں آپ کی
ذات دکن کے فضلائے دار العلوم دیوبند کے لئے مرکز بن گئی، ہر وقت فضلائے
دار العلوم کا اجتماع رہتا، آپ کی مہمانداری وہاں بھی اسی شان کے ساتھ قائم
رہی، جس آب وتاب کے ساتھ دیوبند میں ہوا کرتی تھی۔

دکن میں آپ کی خدمات: میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع نے
دراصل آپ کو دکن کی دینی اور علمی ترقیات کی خاطر ہی دکن آنے کی زحمت دی

تھی، ریاست دکن میں علمی اور دینی اعتبار سے دو ادارے بڑے حساس تھے، ایک صدارت العدالۃ العالیہ یعنی مفتئ اعظم کا عہدۂ بلند اور دوسرا جامعہ نظامیہ، میر عثمان خان بہادر نے یہ دونوں ذمہ داریاں بیک وقت آپ کو سونپ دیں۔

چنانچہ آپ ایک طرف مفتئ اعظم کی حیثیت سے لوگوں کے سوالات کے شرعی جوابات دیتے تھے، تو دوسری طرف جامعہ نظامیہ کی تعلیمی اور انتظامی نگرانی فرماتے تھے، جامعہ نظامیہ کو آپ نے حیات تازہ بخشی، جامعہ کے اصول وضوابط مقرر فرمائے، اور ان میں ایسی دفعات رکھیں جو جامعہ کی فکری سلامتی اور عملی اسپرٹ کی ضامن تھیں۔

جامعہ نظامیہ کی نظامت: نظام دکن نے آپ کو جامعہ نظامیہ کا ناظم مقرر کیا، حضرت فخر الاسلام کا دور نظامت جامعہ نظامیہ کی تاریخ کا روشن اور زریں دور ہے، آپ کے زمانے میں اس جامعہ نے کافی ترقیاں کیں، بڑے نامور فضلاء اور علماء روزگار پیدا ہوئے، ریاست دکن میں جو اس وقت رسوم ورواج اور بدعات وخرافات سے پوری طرح آلودہ تھی، سنت کی روشنی پھیلانے اور فکر صحیح کی چنگاری کو عام کرنے میں جامعہ نظامیہ کا جو مرکزی کردار رہا ہے اسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

قیام حیدر آباد کے دوران دار العلوم دیوبند سے تعلق: قیام حیدر آباد کے زمانے میں بھی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا تعلق دار العلوم کے ساتھ بدستور قائم رہا، آپ وہاں رہ کر بھی تمام اہم کاموں کو بہت گہرائی سے دیکھا کرتے تھے، دار العلوم آپ کی حیات کا مرکزی محور بن چکا تھا، یہ ممکن ہی نہیں تھا

کہ آپ دار العلوم کے امور سے غافل ہوجاتے ،صدارت اہتمام کا ایک عہدہ قائم کر کے آپ کو بحیثیت صدر مہتمم دکن بھیجا گیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم دار العلوم کو مہتمم بنایا گیا اس صورت سے تمام بنیادی اور اہم امور کے فیصلے آپ دکن ہی میں کرتے تھے، اور برابر اہم معاملات میں تحریر ومشورے کے ذریعے سے دار العلوم کی خدمات میں حصہ لیتے رہے۔

واقعہ یہ کہ دکن کے قیام کی منظوری کے پیش نظر بھی دار العلوم ہی کی خدمت تھی ،حضرت مہتمم صاحب کو جو قیع تنخواہ نظام دکن کی طرف سے ملا کرتی تھی وہ پوری کی پوری آپ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے، اس میں سے نوے روپئے وہ اماں بی (اہلیہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ) کو دے دیا کرتے اور باقی دار العلوم پر صرف کیا کرتے تھے، اس کے علاوہ آپ ہر سال دو تین ماہ کے لئے دیو بند تشریف لاکر دار العلوم کی خدمت اصالتہً بھی انجام دیتے تھے، تین سالہ مدت کے اختتام پر شاہی فرمان کے ذریعے اس مدت میں ایک سال کی مزید توسیع کی گئی۔

علالت اور مناصب سے استعفٰی: لیکن زمانۂ توسیع میں صحت خراب ہوگئی، جب علالت کا سلسلہ زیادہ بڑھا تو آپ قبل از وقت مستعفی ہوکر اوائل ربیع الآخر ۱۳۴۷ھ میں دیو بند تشریف لے آئے، حیدر آباد سے رخصت کی تقریب باغ عامہ میں نظام دکن نے بنفس نفیس شرکت فرما کر حضرت ممدوح کی خدمات جلیلہ کی نہایت شاندار الفاظ میں تعریف وتحسین فرمائی، اور حسن خدمات کے صلہ میں پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ کے اجراء کا فرمان صادر ہوا، حضرت ممدوح کا استعفٰی منظور

کرتے ہوئے نظام دکن نے فرمایا تھا کہ ہم آپ کی جگہ پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا تقرر کرنا چاہتے ہیں، آپ ان سے دریافت کرکے جواب دیں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے امتثال اوامر کے طور پر یہ تعلق منظور فرمالیا اور ۲۲؍جمادی الاولیٰ کو حیدرآباد تشریف لے گئے، لیکن جب حضرت مہتمم صاحب کی علالت نے طول کھینچا تو مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا کو واپس بلالیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لئے نظام کی بارگاہ میں مجلس کی جانب سے ایک معروضہ ارسال کیا گیا جس میں دارالعلوم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کے پیش نظر استدعا کی گئی تھی کہ حضرت مولانا کو مراجعت دیوبند کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، چنانچہ حضرت ممدوح حیدرآباد سے رخصت ہوکر ۱۲؍ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو دیوبند تشریف لے آئے۔

آپ کا آخری سفر حیدرآباد: نظام دکن نے فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ سے اس وقت جب حیدرآباد میں افتاء کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے ایک مرتبہ دارالعلوم کے دیکھنے کا شوق ظاہر فرمایا تھا، اس سال کے اوائل میں ارباب حل وعقد کی رائے ہوئی کہ فخر الاسلام صاحب خود حیدرآباد تشریف لے جاکر نظام دکن کو ان کا وعدہ یاد دلائیں اور دارالعلوم کی طرف سے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیں، حضرت ممدوح نے باوجود پیرانہ سالی اور غیر معمولی ضعف ونقاہت کے جماعت کی خواہش کو منظور فرمالیا اور دکن کے طویل سفر کے لئے تیار ہوگئے، ۲۸؍ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ کو روانگی عمل میں آئی، حیدرآباد پہونچنے پر نظام سے ٹیلی فون پر گفتگو کے بعد ملاقات کا وقت مقرر ہوگیا، لیکن تقدیر الٰہی کو

کچھ اور ہی منظور تھا، ملاقات کے دن اچانک بواسیر کا (جس کا مدت سے عارضہ تھا) ایسا شدید درد ہوا کہ قوائے جسمانی نے جواب دینا شروع کر دیا، مرض کی شدت مایوس کن حالت تک پہنچ گئی، جب ملاقات کے لئے جانے کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو یہ رائے قرار پائی کہ آپ کو بعجلت ممکنہ دیوبند لے جایا جائے، سکنڈ کلاس کا ایک پورا کمرہ ریزرو کرایا گیا۔

وفات: آپ اپنے رفقائے سفر کی معیت میں ۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ کی صبح کو حیدرآباد سے دیوبند کے لئے روانہ ہوگئے، جب ٹرین نظام آباد کے اسٹیشن کے قریب پہنچی تو زبان پر ذکر اللہ جاری تھا۔ ۲۹/ کے عدد پر عقد انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نظام آباد اسٹیشن پر نعش اتاری گئی شہر میں خبر پہنچتے ہی لوگوں کا ہجوم ہوگیا اور جنازہ تیار کیا گیا، متعلقین اور نظام کو تار کے ذریعے اطلاع دی گئی، نظام کا جواب آیا کہ حافظ صاحب کا جنازہ حیدرآباد لایا جائے، چنانچہ جنازہ حیدرآباد لے جایا گیا، نظام آباد اور حیدرآباد میں متعدد جگہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اگلے روز ۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ کو قبیل عصر نظام کی تجویز کے مطابق حیدرآباد کے مخصوص قبرستان میں جو خطۂ صالحین کے نام سے خود نظام نے اکابر و معظمین کے لئے بنایا تھا، موت غربت کے اس شہید کو شاہانہ اعزاز کے ساتھ سپرد زمین کر دیا گیا، اس طرح علم ودانش، فقہ وفتاویٰ اورع ملت اسلامیہ کی قیادت کا ایک نیر تاباں دکن کے افق پر ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ونور اللہ مرقدہ۔

حضرت مولانا شاہ بدر علی[۱] صاحبؒ المتوفی ۱۳۵۴ھ

ولادت ووطن: حضرت مولانا شاہ بدر علی صاحبؒ کا آبائی وطن میرپور ضلع الہ آباد ہے، نانہال موضع موئی متصل قصبہ جائس ضلع رائے بریلی ہے، آپ کی ولادت ماہ شوال ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء یا ۱۸۲۳ء کو ہوئی۔

تعلیم وتربیت: بچپن آپ کا کیسے گذرا، تعلیم وتربیت کیسے ہوئی، اس کی تفصیلی معلومات حاصل نہ ہوسکیں، آپ کی مجلس میں دنیاوی گفتگو یا کچھ سوال کرنے کا موقع میسر نہیں ہوتا تھا، مسلسل قرآن وحدیث کی آیات وروایات بیان فرماتے رہتے تھے، مزید ہیبت حق اتنی غالب ہوتی تھی کہ کسی کو کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی لہذا بچپن کے حالات معرض خفا میں رہ گئے۔

حضرت مولانا فضل رحمنؒ کی کرامت وبشارت: آپ کو تپ دق ہوگئی تھی، بالکل تیسرے درجے میں پہونچ چکی تھی جو لاعلاج سمجھی جاتی ہے، لہذا جسم ضعف کی وجہ سے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا، حضرت مولانا فضل رحمن مجددی گنج مرادآبادیؒ سیاحی کرتے ہوئے وہاں پہونچ گئے، آپ کا قیام جائس

---

[۱] حضرت مولانا بدر علی صاحبؒ کی سوانح حضرت مولانا سید عبدالغفار صاحب ندوی نے ''ضیاء البدر'' کے نام سے لکھی ہے جو حضرت مولانا کے خلیفہ ومجاز بھی ہیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ بھی ہیں اسی سے کچھ حالات نقل کرتا ہوں اور کچھ حضرت مرشدی مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ سے سنے ہوئے ارشادات بھی پیش خدمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین (مرتب)

کے قریب موضع موئی میں تھا، آپ کی والدہ نے عرض کیا: حضرت شہر میں قیام فرمائیں، یہاں میری حالت بڑی بے بسی کی ہے، فرمایا: میں اسی غرض سے آیا ہوں، تمہارا لڑکا صحت یاب ہوکر عرصہ دراز تک زندہ رہے گا۔

قاہرہ کا سفر: غرض آپ صحت یاب ہوکر حضرت مولانا گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں جاکر شرف بیعت سے مشرف ہوئے اور تحصیل علم کے لئے قاہرہ مصر جانے کی اجازت طلب کی، حضرت مولانا نے فرمایا: جاؤ، لیکن جیسے جاتے ہو ویسے ہی واپس آجانا یعنی وہاں شادی نہ کرلینا۔

چنانچہ آپ قاہرہ تشریف لے گئے اور ۱۷؍سال کے بعد جامعہ ازہر سے فارغ ہوکر ۱۸۶۹ء میں واپس آئے، اسی سال نہر سویز کھودی گئی تھی۔

مگر اس قدر تعلیم کے بعد بھی دیہاتی بولی بولتے تھے چنانچہ آپ کی وضع قطع دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، آپ نام ونمود سے کوسوں دور تھے۔

تکرارِ بیعت واجازت: ہندوستان آکر حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکے مشرف بہ بیعت ہوئے، اور حضرت مولانا گنج مرادآبادی کی طرف سے اجازت بیعت یعنی خلافت سے نوازے گئے، پھر ۱۳۱۳ھ میں حضرت مولانا گنج مرادآبادیؒ نے اپنی وفات سے پہلے دوبارہ خلافت واجازت مرحمت فرمائی۔ (ضیاء البدر: ص؍۱۵)

پتھونہ میں مطب: آپ نے جامعہ ازہر مصر میں طب جالینوس کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، آپ نے عرصہ تک چھتری ٹھاکروں کی ایک ریاست پتھونہ ضلع رائے بریلی میں مطب بھی کیا ہے، پتھونہ میں آپ نے علوم دینیہ کا درس بھی دیا ہے۔

تدریس قرآن: راقم السطور نے رائے بریلی میں درس قرآن دیتے ہوئے دیکھا ہے، نماز عشا کے بعد ایک صاحب آپ کو مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کا ترجمہ قرآن سناتے تھے اور آپ معارف وحقائق ارشاد فرماتے تھے۔

ذریعہ معاش کھیتی: آپ نے ضلع رائے بریلی کے تین مواضعات شیخن گاؤں بھوا، سدھونہ میں سکونت اختیار فرمائی، آپ کی مکمل زندگی اتباع سنت تھی، اس لئے آپ نے اکل حلال کے لئے ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کھیتی کی ہے، قرب وجوار کے رؤساء بیحد معتقد تھے، انہوں نے بطور جاگیر کثیر رقبہ کی زمین نذر کرنی چاہی مگر آپ نے قبول نہیں کیا، لگان پر تھوڑی سی زمین لے لی تھی اس کو خود بوتے تھے، اور تھوڑی سی زمین میں بہت برکت ہوتی تھی، چنانچہ ایک قانون گو صاحب فرماتے تھے کہ بھوا جہاں حضرت مقیم تھے ایک بیگھہ زمین تھی، آپ کے یہاں مرغیاں، بکریاں اور بھینسیں بھی تھیں، میں جب دورہ پر جاتا تو دیکھتا کہ وہ سب اسی کھیت میں چرا کرتی تھیں، میں عرض کرتا: اس میں کیا پیدا ہوگا؟ تو آپ فرماتے کہ اس کی تقدیر اسی میں ہے، ایک سال عام قحط پڑ گیا: میں نے اپنے حلقے کا سروے کیا تو کہیں کچھ پیدا نہ ہوا تھا، میں نے آپ سے پوچھا تو فرمایا: نہیں بھیا! اللہ تعالی نے فرمایا یہ فقیر بھوکوں مرجائے گا، مجھ کو ۱۸ من گیہوں دیئے ہیں۔

آپ کی قناعت: جو لباس زیب تن ہوتا اس کے علاوہ کوئی دوسرا جوڑا تہ کر کے نہ رکھتے تھے، اکثر یہ ہوتا کہ کوئی مخلص مرید یا معتقد کوئی جوڑا پیش کرتا اس کو پہن لیتے اور پہنا ہوا لباس اس کو دیدیتے تھے۔ ہمیشہ سامنے کے سالن سے کھاتے کبھی دو سالن دسترخوان پر جمع نہ ہونے دیتے، اکثر مزاج شناس مریدین سامنے کے سالن کو ہٹا کر دوسرا سالن رکھ دیتے تھے۔

ملفوظات

(۱) آپ نے فرمایا: سورہ فاتحہ کے ستر اسماء ہیں ان میں سے ایک نام ''شفاء'' ہے، اس کو سات مرتبہ پڑھ کر دم کر دیا کرو۔

(۲) فرمایا ہر نماز کے بعد **اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْآخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اَللّٰھُمَّ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَاءِ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَۃً مِّنْکَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّازِقِیْنَ۔** پڑھ لیا کرو اللہ تعالیٰ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے گا۔ (ضیاء البدر: ص ر ۱۱۰)

(۳) فرمایا: کبائر کی نشانی قرآن مجید میں یہ ہے کہ جن جن مقامات میں ''عذاب شدید، عذاب الیم، عذاب عظیم'' وغیرہ الفاظِ وعیدہ وارد ہوئے ہیں وہ سب داخلِ کبائر ہیں۔

آپ کی شرکت جہاد: ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ مجھے جہاد میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، ۱۹۱۰ء کے جہاد طرابلس میں میں شریک تھا، ایک رال کا گولا میرے ہاتھ پر گرا تھا اس کا نشان اب تک موجود ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے تین مرتبہ دانت نکلے ہیں، اب جو دانت ہیں وہ تیسری مرتبہ کے نکلے ہوئے ہیں۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ جب میں تہجد کے لئے بیٹھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے، میں نے عرض کیا: مجھ کو اور میرے تمام مریدین ومعتقدین کو بخش دیجئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے میری دعا قبول فرمائی۔ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِعِزَّتِہٖ وَجَلَالِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ۔** (ضیاء البدر)

اب چند باتیں حضرت مرشدی مولانا محمد احمد صاحبؒ خلیفہ حضرت مولانا شاہ بدرعلی صاحبؒ سے سنی ہوئی نقل کرتا ہوں، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ قابل اعتماد اور موجب اطمینان اور کون سی باتیں ہوسکتی ہیں۔

فرماتے کہ حضرت مولانا شاہ بدرعلی صاحبؒ عجیب وغریب نسبت کے حامل تھے، بخاری شریف پوری یاد تھی، مگر بود و باش، وضع قطع ایسی اختیار فرمائی تھی کہ کوئی آدمی دیکھ کر بظاہر عالم بھی نہیں سمجھتا تھا، بولی دیہاتی بولتے تھے، مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا: دیکھو! اگر مجھ سے کوئی بات خلاف سنت سرزد ہوتو بتلا دینا۔

نیز فرماتے تھے کہ اس طریق میں نہ طمع ہے نہ منع ہے اور نہ جمع ہے۔

ف: طمع سے مراد تو ظاہر ہی ہے، منع کا مطلب یہ ہے کہ اگر اصول وخلوص سے کوئی ہدیہ دے تو اسے رَد نہ کرے بلکہ قبول کرلے، نیز یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اس سے کوئی چیز مانگے تو منع نہ کرے یعنی رَد نہ کرے، اور جمع کا معنی بھی واضح ہے کہ ضرورت سے زیادہ جمع نہ کرے۔ (مرتب)

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ خود اپنا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرتؒ کی خدمت میں مقیم رہا، چند روز کے بعد مکان رخصت ہونے کی اجازت طلب کی تو حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ ابھی رُکئے، میں رک گیا، عصر کی نماز کے بعد حضرتؒ برائے تفریح میدان کی طرف نکلے، میں پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور میں کھلی آنکھوں دیکھ رہا تھا کہ حضرتؒ کے دست مبارک میں کوئی کتاب نہیں ہے، یکایک دیکھا کہ ابوداود کے دو نسخے آپ کے ہاتھ میں موجود ہیں، میں متحیر ہوگیا کہ یہ کہاں سے کتاب آگئی؟ تو خود ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب ابوداود

شریف یہاں نہیں ملتی، آپ کے بھائی جن کو روپیہ دے کر لاہور بھیجا تھا وہ لے کر ابھی آیا ہے، اس لئے آپ ایک نسخہ لے لیں، نیز ارشاد فرمایا کہ اسلئے آپ کو روکا تھا، اب آپ جا سکتے ہیں، الحمدللہ وہ ابوداود کا نسخہ مکان پر موجود ہے۔

نیز دوسرا واقعہ یہ بیان فرماتے تھے کہ ایک دفعہ حضرت مولانا شاہ بدر علی صاحبؒ کی خدمت میں جا رہا تھا، راستہ میں دو بڑے بڑے سانپ لڑتے ہوئے ملے ان کو دیکھ کر اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ سے حضرتؒ کی خدمت میں پہونچا، تو دیکھا کہ حضرتؒ دروازے کے باہر ایک ڈنڈا لئے کھڑے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انتظار ہی فرما رہے ہیں، چنانچہ جیسے ہی پہونچا اور سلام کیا تو مجھ کو دیکھ کر اس انداز سے مسکرائے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ راستہ کا واقعہ حضرتؒ پر منکشف ہو گیا ہے اور فرمانے لگے کہ آپ تو ہاتھ میں کوئی چھڑی وغیرہ بھی نہیں رکھتے، راستہ میں سانپ وغیرہ بھی ملتے ہیں، چنانچہ وہ چھڑی مجھے عنایت فرمائی جو آج بھی میرے پاس موجود ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے کشف وکرامات کے بہت سے واقعات حضرت مولانا سید عبدالغفار صاحب نے ضیاء البدر میں نقل فرمائے ہیں جس کو دیکھنا ہو اصل کتاب کا مطالعہ کرے۔

وفات وتدفین: ۲۳؍شعبان المعظم ۱۳۵۷ھ بروز جمعرات ۲؍بجے آپ نے فرمایا: تیمّم کراؤ، ظہر کی نماز پڑھ لوں، چنانچہ تیمم کرایا گیا، اور لیٹے لیٹے نماز ظہر ادا کی اور بائیں طرف سلام پھیرتے ہی واصل بحق ہو گئے۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔ اور سدھونہ میں مدفون ہوئے، نوراللہ مرقدہ، اس حقیر کو مزار کی زیارت رجب ۱۴۱۴ھ میں نصیب ہوئی فللہ الحمد۔

حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب فتح پوریؒ[۱] المتوفی: ۱۳۵۸ھ

حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ علماء اعظم گڈھ کے زمرہ میں جامع المعقولات والمنقولات عالم تھے، ان کا آبائی وطن فتحپور تال نرجا ہے، پہلے یہ موضع ضلع اعظم گڈھ میں تھا، اب نئے ضلع مئو میں آگیا ہے جو قصبہ گھوسی سے جانب جنوب تقریبا سات کیلومیٹر پر واقع ہے۔

ولادت وتعلیم: آپ کی ولادت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں ہوئی، والد کا نام مکرم محمد شریف خاں تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد جونپور جا کر حافظ محمد جعفر صاحبؒ کی خدمت میں حفظ قرآن کیا، اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے خاندانی روایت کے مطابق فیض آباد پولیس میں بھرتی ہوئے، حسن اتفاق سے ایک مشہور بزرگ شاہ عبداللطیف صاحب نامی سے ملاقات ہوگئی جنہوں نے مولانا کو دیکھتے ہی فرمایا کہ تمہاری پیشانی پر نور علم چمک رہا ہے، شاہ عبداللطیف کے اس جملہ نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، ملازمت سے دل سرد پڑ گیا اور پولیس سے مستعفی ہو کر تحصیل علم کی غرض سے کانپور چلے گئے، اور جامع العلوم کانپور میں داخلہ لے لیا، جہاں اس وقت مولانا محمد اسحاق بردوانی،

---

[۱] آپ کا تذکرہ مولانا سلطان الہدیٰ ندویؒ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے (جو حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے چچا زاد بھائی منشی محمد عباس صاحب کے پوتے ہیں، مولانا کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون) لکھکر بھیجا اسی کو سامنے رکھ کر ان کا لکھ رہا ہوں۔

مولانا محمد رشید کانپوری اور مفتی سید مقبول حسین وغیرہم تدریسی خدمت پر مامور تھے، مولانا عثمان خاں نے انہیں اساتذہ سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد منتہی تعلیم کیلئے اپنے اساتذہ کے مشورہ سے دیوبند کا علمی سفر کیا اور دارالعلوم میں داخل ہو کر مولانا سہول احمد بھاگلپوری سے منطق وفلسفہ، مولانا حافظ احمد مہتمم دارالعلوم سے ہدایہ اور مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ سے بقیہ علوم متداولہ کی تحصیل کر کے حضرت شیخ الہندؒ سے بخاری وترمذی پڑھ کر سنہ ۱۳۲۹ھ میں سند فراغت حاصل کی۔

تدریسی خدمات: تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم کانپور میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سے علیحدہ ہو گئے، اور اپنے استاذ سید مقبول حسین کے قائم کردہ مدرسہ ریاست گوالیار میں استاذ مقرر ہوئے، آخر میں یہاں سے بھی الگ ہو کر کانپور چلے آئے اور مسجد شیخ للن واقع محلہ قلی بازار کانپور میں مدرسہ اشرف العلوم کی بنیاد رکھی، ماشاء اللہ تعالی اس مدرسہ سے سیکڑوں علماء وفضلاء فیضیاب ہو کر نکلے، آج بھی یہ مدرسہ کسی نہ کسی حد تک جاری ہے، اللہ تعالی مولاناؒ کی یادگار کو باقی رکھے، اور ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔۔۔۔

مولانا محمد عثمان صاحب مرحوم کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی چوبیس سالہ تدریسی زندگی میں کبھی معاوضہ نہیں لیا، اور تاحیات لوجہ اللہ علمی ودینی خدمت کرتے رہے۔

مولانا جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بالخصوص فقہ میں آپ کو درجہ اختصاص حاصل تھا۔

سیاسی زندگی: حضرت مولانا عثمان صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال کے ایک اہم رکن تھے اور دو مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ کے پیغامات لے کر افغانستان تشریف لے گئے، اتفاق سے ایک بار سرحد پر گرفتار ہو گئے، اور جیل بھیج دیئے گئے، بڑی جدّ و جہد کے بعد رہا ہوئے، اس گرفتاری کے ایک سال بعد پھر حضرت شیخ الہندؒ کا ایک خط جو حبیب اللہ خاں والیٔ کابل کے نام تھا، جوتا کے اندر سلا کر چوڑی فروش کا روپ بنا کر چمن کے راستہ سے کابل روانہ ہوئے اور بچتے بچاتے سرحد پار ہو گئے، مولانا نے خود اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: رات کو سفر کرتا اور دن کو کہیں چھپ جاتا، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ خطرے کی وجہ سے جانوروں کی طرح ہاتھ اور پیروں کے بل میلوں کا راستہ قطع کرنا پڑا، سرحد پار اسلامی سپاہیوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے خفیہ سمجھ کر ان کے تمام سامان چھین لئے، لیکن فوج کے کرنل نے سب اسباب انہیں واپس کر دیئے، فوجیوں نے تحقیق حال کے لئے مولانا سے بہت سے سوالات بھی کئے جن کی تفصیل یہ ہے:

سپاہی : آپ کون ہیں؟

مولانا : میں مسلمان ہوں۔

سپاہی : آپ سکھ معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا : میں کلمہ پڑھتا ہوں تو سکھ کیوں کر ہوں گا؟

سپاہی : کلمہ سکھ بھی پڑھ سکتے ہیں۔

مولانا : میں حافظ قرآن بھی ہوں۔

جس وقت مولانا وہاں پہونچے تھے، رمضان کا مہینہ تھا، انہوں نے خود

بیان کیا کہ فوجی بہت جلد تراویح پڑھ کر فارغ ہو جاتے تھے،لیکن میں بہت دیر تک پڑھتا رہتا تھا جس سے فوجی بہت متاثر ہوئے ، حاصل کلام اس بار مولانا اپنے سفر میں کامیاب ہو گئے،اور حبیب اللہ خاں والی کابل کے دربار میں پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ کے والانامہ کو پیش کیااور زبانی مولانا کے منصوبے کی تفصیل بیان فرمائی، لیکن امیر کابل اس سے متفق نہیں ہوا، اس لئے مولانا عثمان صاحب وہاں سے واپس چلے آئے۔

مولانا محمد عثمان صاحبؒ نے پچپن ۵۵ برس کی عمر میں ۱۴رمحرم الحرام ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۶ء کو اپنے آبائی وطن فتحپور تال نرجا میں وفات پائی اور اپنے پدری قبرستان میں مدفون ہوئے۔ نوراللہ مرقدہٗ

سعادت: خوشی کی بات ہے کہ مولانا موصوف ہماری برادری ہی کے نہیں بلکہ رشتہ داروں میں سے تھے ،جنہوں نے برادری کے لوگوں کو علم دین کی تحصیل کی طرف رغبت دلائی ،اور کانپور لے گئے، چنانچہ برادری کے متعدد حضرات عالم دین ہو گئے، مثلا حضرت مصلح الامتؒ ،مولانا حکیم ظہیر الدین صاحب (ندوہ سرائے) حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب فتحپوری ،ان کے علاوہ بہت سے شاگرد ہیں ،مثلا مولانا اسلام الحق کوپا گنجی ،حضرت مولانا ظفیر الدین صاحب مئوآئمہ ،استاذ مدرسہ اشرف العلوم کانپوراور مولانا ریاست علی صاحب کوٹی وغیرہم۔جزاہم اللہ تعالی۔

حضرت مولانا محمد بشارت کریم[1] صاحب گڑھول (بہار) م:۱۳۵۴ھ

نام ونسب وولادت: آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی عبدالرحیم تھا، آپ کی ولادت غالباً ۱۲۹۴ھ میں بمقام بازید پور گڑھول شریف ضلع مظفر پور صوبہ بہار میں ہوئی، تقریباً چھ سال کے تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا، اور تقریباً دس سال کے ہوئے تو والد بزرگوار کے سایہ شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔

تعلیم وتربیت: اس کے بعد آپ اپنے بہنوئی کی تربیت میں آئے، فرماتے تھے کہ پہلے مجھے انگریزی کی فرسٹ بک شروع کرائی گئی، مگر وہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہا پھر عربی کی تعلیم حاصل کی۔

بچپن ہی سے مزاج میں ایسی سجیدگی اور متانت تھی کہ عام طور پر بچوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

مولاناؒ خود فرماتے تھے کہ بچپن میں میری والدہ میرا ہاتھ پکڑ لیتیں اور کہتیں کہ یہ بیٹا مجھ کو جنت میں لے جائے گا۔

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

جب کچھ بڑے ہوئے تو حکیم مولانا علی حسن صاحب چھپروی سے دربھنگہ میں

---

[1] آپ کی سوانح آپ کے صاحبزادے مولانا محمد ادریس صاحب نے ''جنۃ الانوار'' کے نام سے لکھی ہے جو محب مکرم مولانا شمیم احمد صاحب مدرس مدرسہ رحمانیہ سپول سے دستیاب ہوئی، اسی کو سامنے رکھکر مختصر حالات اور چند ارشادات نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ (مرتب)

فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر وہاں سے مدرسہ جامع العلوم مظفرپور پہونچے اس وقت جامع العلوم کی نئی بنیاد پڑی تھی، جناب حافظ رحمت اللہ صاحب مرحوم مدرسہ کے مہتمم تھے اور مولانا عبدالواسع صاحب سعدی پوری مولف منظوم مناجات مقبول (مولفہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ) مدرس اول تھے، حافظ رحمت اللہ صاحب مرحوم اس وقت کی روئداد میں لکھتے ہیں: حافظ محمد بشارت کریم جنہوں نے اس سال حفظ ختم کیا ہے، ان کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ شرح جامی وغیرہ بھی پڑھتے تھے اور حفظ بھی کرتے تھے، اس لئے جب ماہ رمضان المبارک میں آپ تراویح میں پورا قرآن سنا چکے تو ان کی دستار بندی ہوئی، حضرت والد ماجد علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ حافظ صاحب مرحوم نے اس جلسۂ دستار بندی میں اتنی خوشی منائی اور جشن کیا جیسے کوئی باپ بڑے شوق وتمنا سے اپنے لڑکے کی کوئی تقریب انجام دے۔ (جنۃ الانوار: ص ر ٦)

تکمیل تعلیم: پوری سوانح دیکھنے سے آپ کی تعلیم کی تفصیل کا سراغ نہیں ملتا ہے، بس اتنا ملتا ہے جو درج ذیل ہے۔ آپ نے مکمل پچیس سال کی عمر تک اپنے استاذ حضرت استاذ العلماء مولانا احمد حسین پنجابی ثم کانپوری کی خدمت میں رہ کر درسیات کی تکمیل کی تھی۔ (جنۃ الانوار: ص ر ٣٨٧)

سفر حج اور تلاش مرشد: تحصیل علم سے فراغت کے بعد تقریباً چھبیس سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، وہاں دو سال قیام پذیر رہے، اثناء قیام میں بڑے بڑے اہل اللہ کی زیارت ہوئی اور معلوم نہیں کتنے مجذوبوں سے ملاقاتیں ہوئیں، خیال ہوا کہ اس مقام مقدس میں پوری زندگی گذار دوں مگر

وہاں ایک بزرگ مولانا محب الدین ؒ جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ کے خلیفہ خاص تھے ان کی معیت وصحبت حاصل ہوگئی ، وہ بڑے صاحب کشف بزرگ تھے ، انہوں نے فرمایا کہ آپ ہندوستان تشریف لے جائیں ، وہاں آپ سے بہت خیر کا صدور میں دیکھ رہا ہوں ، غرض ان کے حکم اور مشورے سے دوسال قیام کر کے ہندوستان واپس ہوئے ، واپسی کے بعد اس فکر میں ہوئے کہ کسی بزرگ کی خدمت میں رہ کر علوم باطنی حاصل کریں ، چنانچہ آپ مولانا غلام حسین صاحب ؒ سے (جبکہ وہ آپ کے ساتھی تھے) نہایت خلوص کے ساتھ بیعت ہو گئے اور مقامات سلوک طے کئے ، اور ان سے اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے ۔ فالحمد للہ تعالیٰ ۔

ارشادات

فرمایا کہ اولیاء اللہ کی تعداد کثرت سے ملتان میں ہوئی ہے ، اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ نے اپنے اکمل واجل خلیفہ حضرت زکریا ملتانی کو ملتان روانہ فرمایا ، وہ اولیاء عظام میں سے تھے جس وقت آپ ملتان تشریف لائے وہاں کے تمام مشائخ جو بکثرت وہاں موجود تھے سبھوں نے ایک کٹورہ میں بھر کر دودھ بھیجا جس سے اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ یہاں مثل کاسۂ لبریز کے مشائخ بھرے ہیں ، آپ کے رہنے کی جگہ نہیں ، آپ نے دودھ بھرے پیالے پر ایک گلاب کا پھول رکھ دیا جس سے اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ میں مثل اس پھول کے رہوں گا ۔

ف : اس واقعہ کو حضرت مصلح الامت مرشدی مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ؒ برابر سناتے تھے کہ حضرت شیخ زکریا ؒ نے مشائخ ملتان کے مقصد کو خوب سمجھا اور انہوں نے جواب بھی خوب سے خوب تر دیا ، چنانچہ مشائخ نے شیخ زکریا ؒ کے لطافت جواب کو بہت پسند فرمایا ۔ (مرتب)

ایک بار حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ نستہ کے ایک شخص آئے، اور انہوں نے دو سوال کئے، اول یہ کہ آپ پیلو کا مسواک کیوں کرتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ سنتیں مسجد میں ہی کیوں ادا کرتے ہیں؟ جب کہ حضرت ﷺ حجرے میں ادا فرماتے تھے، حضرت نے فرمایا کہ انکے پہلے سوال کا جواب تو یہ دیا کہ پیلو کی مسواک کرنا سنت ہے، حدیث میں اس کا نام آیا ہے، پھر یہ کہ طب میں اسے دانتوں کے لئے مفید لکھا ہے لیکن دوسرے سوال کا جواب ان کے فہم سے بالاتر تھا اس لئے ان کو جواب نہیں دیا، تم کو بتاتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ کا حجرہ مبارکہ کہاں تھا؟ وہ بھی تو مسجد ہی کا حصہ تھا، پھر فرمایا کہ سنت اگر کوئی مسجد میں نہ پڑھے، ظاہری اتباع سنت کے خیال سے گھر میں پڑھے تو یہ بھی سنت ہے، مگر ایک لطیف بات یہ ہے کہ سنت مکمل ہے فرض کی، اب ایک شخص گھر سے سنت پڑھ کر جارہا ہے یا مسجد سے فرض پڑھ کر گھر آرہا ہے تو جو کیفیت (فرض کی ادائیگی سے) پیدا ہوئی ہے وہ لوگوں کے اور دنیا کے آویزش سے ختم ہوجائے گی، کیوں کہ اس سے طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، لہٰذا مسجد ہی میں سنت ادا کی جائے تو بہتر ہے، رسول اکرم ﷺ گھر میں پڑھتے تھے تو ان کا حجرہ گویا مسجد ہی میں تھا پھر یہ کہ آپ ﷺ کی کیفیت ختم نہ ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ عام لوگوں کا یہ حال نہ ہوگا۔ (جنۃ الانوار: ص ر ۳۹۲)

ف: سبحان اللہ! کیا ہی خوب تطبیق دی، فجزاہم اللہ تعالیٰ، انہی کے خلیفہ مولانا صدیق احمد صاحب برئی پوروالے تھے، جن کا تذکرہ مستقلاً حصہ ہشتم میں آچکا ہے۔ (مرتب)

وفات: آپ کی وفات ۲۰ رمحرم الحرام ۱۳۵۴؁ھ کی شب میں ہوئی **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔ اور موضع بازید پور گڑھول بہار میں مدفون ہوئے۔

نور اللہ مرقدہ۔

حضرت مولانا غلام محمد صاحب دین پوری پنجاب المتوفی ۱۳۵۴ھ

نام ونسب وولادت: مولانا ابوالسراج غلام محمد بن سردار حاجی نور محمد خان بن سردار محمد چراغ خان ضلع جھنگ کے اکیانہ بلوچ قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں موضع عالمے خان شرقی ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔

سردار حاجی نور محمد خان ایک دیندار اور درویش صفت انسان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں تمام کاروبار اپنے بڑے صاحبزادے سردار محمد اسماعیل کے سپرد کر دیا تھا اور خود اہل اللہ کی محفلوں میں وقت گزارتے تھے۔ اس مقصد کیلئے اُنہوں نے دور دراز کے سفر بھی کئے۔ فریضۂ حج کی بجا آوری کے بعد مستقل طور پر ارضِ حجاز میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں افرادِ کنبہ کو لے کر بارادۂ ہجرت چل پڑے۔ راستے میں بستی ''بٹی کورائیاں'' پہنچے تو اچانک بیمار ہو گئے اور چند دن بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ۔**

خاندان کے سربراہ سردار حاجی نور محمد خان کی اچانک وفات کے سبب یہ خاندان ''بٹی کورائیاں'' میں رہ پڑا۔ مولانا غلام محمد کی والدہ ماجدہ نے محنت مزدوری کر کے یتیم بچوں کی پرورش کی۔

تعلیم: مولانا غلام محمد صاحب نے بستی مولویاں ضلع رحیم یار خان میں ابتدائی

تعلیم حاصل کی۔مولانا فقیر اللہ کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کیا اور شرح جامی تک کتبِ درسیہ پڑھیں۔اس کے بعد ذاتی مطالعے سے قرآن وسنّت میں مہارت حاصل کی۔

مولانا غلام محمد ''بٹ کورائیاں'' میں مقیم تھے کہ انہوں نے اپنی بڑی بہن کا رشتہ بلوچ قبیلے سے باہر ایک کمہار سے کردیا۔بٹ کورائیاں کے بلوچوں نے اسے اپنی ہتک خیال کیا اور موقع پا کر کمہار مذکور کو قتل کردیا۔اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کمہار مذکور کے شیر خوار بچے (مولانا غلام محمد کے بھانجے) کو بھی بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالا۔اس سانحہ کے بعد مولانا غلام محمد نے بٹ کورائیاں کی سکونت ترک کردی اور بستی گھوٹیہ (علاقہ خانپور) آ گئے۔آخر میں ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ کے لگ بھگ ''دین پور'' آ گئے جو اُن کے دم قدم سے نہ صرف آباد ہوا بلکہ اسمِ بامسمّٰی ہو گیا۔

بیعت و خلافت: مولانا غلام محمد نے سلسلہ قادریہ میں مولانا محمد صدیق بھرچونڈویؒ (م ۱۳۰۸ھ) سے بیعت کی تھی۔تقریباً ۲۸ سال ان کی صحبت میں رہے اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔مولانا غلام محمد عابدو زاہد بزرگ تھے اور حلقۂ صوفیاء میں مقام بلند رکھتے تھے۔خواجہ غلام فریدؒ کو اُن سے تعلقِ خاطر تھا۔مولانا غلام محمدؒ کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ:

''اکثر چاچڑاں شریف سے باہر جاتے ہوئے دین پور شریف سے متصل سڑک سے آپ (خواجہ غلام فریدؒ) کا گزر ہوتا۔آپ پالکی پر سوار ہوتے لیکن جوں ہی دین پور شریف کی حدود کے قریب آتے۔سواری سے اتر جاتے اور

تھوڑی دور پیدل چل کر آگے جا کر سوار ہو جاتے۔"

علماء دیوبند سے لگاؤ: مولانا غلام محمد کو علماء دیوبند سے خصوصی لگاؤ تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے دین پور میں ابتدائی تعلیم پائی تھی۔

سنہ ۱۹۱۱ء مطابق سنہ ۱۳۲۹ھ میں دار العلوم دیوبند سے تعارف کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (م سنہ ۱۳۶۲ھ) حافظ محمد احمد صاحب (م سنہ ۱۳۴۰ھ) اور مولانا عبد اللہ سندھی نے سندھ کا دورہ کیا۔ یہ دفد دورانِ سفر میں دین پور میں ٹھہرا۔ واپسی پر مولانا غلام محمد دین پوری دفد کے ساتھ کراچی تک گئے۔ اپریل سنہ ۱۹۱۲ء مطابق سنہ ۱۳۳۰ھ میں انہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی خصوصی دعوت پر دار العلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کی۔ اس موقع پر اُنہوں نے اکابر دیوبند سے خصوصی ملاقاتیں کی دیوبند سے واپسی پر فرمایا کرتے تھے:

"ہم پہلے دیوبند کو مولویوں کا ایک مرکز خیال کرتے تھے مگر وہاں جا کر ہم نے بے شمار عام لوگوں پر انوارِ الٰہی کی بارش برستے دیکھی ہے۔ خواص کی تو کچھ بات ہی نہیں"۔

حضرت مولانا غلام محمدؒ نے "تحریک ریشمی رومال" میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔ مولانا عبد القادر دین پوری کی ہمراہ جالندھر میں چھ ماہ نظر بند رہے۔

ف: سبحان اللہ اپنے بزرگوں کا یہی اخلاق تھا کہ ایک دوسرے سے محبت و عقیدت کا معاملہ فرماتے تھے، جس کی وجہ سے درجہ کمال تک پہونچے، اللہ تعالی اکابر کے اسوہ پر چلنے کی توفیق دے آمین (مرتب)

قیام مدرسہ: مولانا غلام محمد نے سنہ ۱۹۲۲ء مطابق سنہ ۱۳۴۱ھ میں اپنے مرشد

حافظ محمد صدیق بھر چونڈوی اور سیّد محمد راشدؒ (مرشد حافظ محمد صدیق بھر چونڈوی) کے نام پر دین پور میں ''مدرسہ صدیقیہ راشدیہ'' قائم کیا جو آج تک علمی و دینی خدمات میں سرگرم ہے۔ اس مدرسہ میں مولانا عبدالقادر دین پوری، مولانا عبداللہ لغاری (شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی) مولانا غلام صدیق حاجی پوری، مولانا عبدالرزاق اور مولانا عبداللہ درخواستی جیسے علماء و مدرسین نے تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی ہے۔ **فللہ الحمد والمنہ۔**

وفات: ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۱ھ میں فریضہ حج ادا کیا۔ مولانا غلام محمدؒ نے وجع المفاصل کے عارضے میں ۳۰/ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۴/ مارچ ۱۹۳۶ء کو وفات پائی۔ مولانا غلام محمد گھوٹوی شیخ الجامعہ جامعہ عباسیہ بہاولپور نے نماز جنازہ پڑھائی اور دین پور میں تدفین ہوئی۔ نور اللہ مرقدہ۔

مولانا سیّد محمد زمان نیازیؔ ہمدانی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔ جس کے آخری دو شعر یہ ہیں ع

ہر کہ رفت از دارِ دُنیا باز ناید ہیچ گاہ!
بے اثر است گرچہ نالد ہر کسے صبح و مسا
اے نیازیؔ! طبعِ من از بہر تا ریخش بگفت
قبلہ اربابِ معنیٰ'' پیشوائے القیاء''
۱۳۵۴

(تذکرہ علماء پنجاب صفحہ ۴۸۲)

حضرت العلامہ بدرالدین حسنی دمشقی[1] المتوفی ۱۳۵۴ھ

نام ونسب وولادت: علامہ بدرالدین حسنی دمشقیؒ۔ اپنے وقت کے عظیم فاضل، شیخ اور مصنف گزرے ہیں۔ حدیث، فقہ اور تصوف وغیرہ میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ اللہ نے علامہ دمشقیؒ کو شخصی وجاہت ووقار اور غیر معمولی رعب وتمکنت سے نوازا تھا۔ آپ کی ولادت ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی، تاریخ سے شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ صدیوں میں ایسی شخصیات پیدا ہوتی ہیں، جن کے فیوض خاص دائرے اور دارالعلوموں میں محدود نہیں رہتے، بلکہ ان سے عوام وخواص یکساں طور پر مستفید ہوتے رہتے ہیں اور ایسی شخصیات سب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ حضرت مولانا مفتی عتیق احمد بستوی قاسمی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ''چند اصحاب عزیمت'' میں لکھتے ہیں:

خدمت خلق: جنگ عظیم اول (۲۸؍جولائی ۱۹۱۴ء تا ۱۱؍نومبر ۱۹۱۸ء) کے زمانہ میں دولت عثمانیہ پر چاروں طرف سے دشمنوں کی یلغار تھی، اس لئے جنگ کے قابل ہر مسلمان پر فوجی خدمت لازم کردی گئی۔ فرمان سلطانی تھا کہ فوجی خدمت سے گریز یا پہلوتہی کرنے والے کو پھانسی دے دی جائے۔ دمشق کی ایک بڑھیا کا اکلوتا لڑکا اور چند دوسرے فوجی خدمت سے گریز کرنے کے جرم میں اس قانون کے زد میں آگئے۔ فوجی عدالت نے ان سب کی پھانسی کا حکم سنادیا۔

---

[1] مولانا رضی الدین صاحب قاسمی نے مولانا حکیم محمد ساجد قاسمی کے افادات کو مرتب کیا ہے اسی کا نام کشکول نوادر رکھا ہے اسی سے یہ مضمون ماخوذ ہے (مرتب)

بڑھیا نے حکم بدلوانے کی بڑی کوشش کی، لیکن ناکام رہی، آخر مایوس ہوکر آہ وزاری کرتی ہوئی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنی دکھ بھری داستان کہہ سنائی، شیخ اسی وقت گورنر شام کے بنگلہ پر پہنچے۔ باہر ہی کھڑے ہوکر گورنر جمال پاشا صغیر کو بلوایا۔ جمال پاشا نے بنگلہ کے اندر تشریف لانے کی درخواست کی۔ شیخ نے معذرت کی اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ جمال پاشا صغیر نے اپنی جیب سے فرمان سلطانی نکال کر شیخ کی طرف بڑھا دیا، جس میں درج تھا کہ ''جو شخص فوجی خدمت سے گریز یا پہلوتہی کرے، اسے فوراً پھانسی دے دی جائے''۔ اس فرمان پر وزیر جنگ انور پاشا کے دستخط تھے۔ شیخ نے فرمان پڑھ کر فرمایا: ''میری طرف سے انور پاشا کو لکھئے کہ بدرالدین حسنی فلاں آدمی کی سفارش کر رہا ہے''۔

جمال پاشا صغیر نے ارشاد کے مطابق تار کے ذریعہ پورا قضیہ انور پاشا کی خدمت میں پیش کیا۔ انور پاشا کا جواب آیا: چونکہ تم نے شیخ بدرالدین کا پرتپاک استقبال کیا اور ان کی سفارش کے احترام میں پھانسی کا حکم نافذ کرنے کی عجلت نہیں کی اس لئے تمہیں ترقی دی جاتی ہے، اور اس دن جتنے مجرم گرفتار کئے گئے سب کو شیخ بدرالدین کے اعزاز میں معاف کر دیا گیا۔

شیخ کی زندگی میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ انہوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر مظلومین کو رہائی دلائی اور اپنے اثر ورسوخ کے ذریعہ بے سہاروں کا سہارا بنے۔ اس میں وہ مذہب وملت کے امتیاز کے بھی قائل نہیں تھے۔ ہر قوم ومذہب کے مظلومین کی حفاظت واعانت اپنا فریضہ تصور کرتے

تھے۔

صبر کا اعلیٰ مقام: ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں شیخ بدرالدین کے جوان صاحبزادے عصام الدین سخت بیمار پڑ گئے ۔مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ شیخ بدرالدین ایک مشفق باپ کی طرح ان کے علاج معالجہ کا اہتمام کرتے رہے۔ ایک دن علامہ بدالدین حسب معمول مدرسہ میں اسباق پڑھا رہے تھے، اسی دوران ان کے جوان سال فرزند مرض کی تاب نہ لاکر جان بحق ہو گئے۔ مدرسہ کے باہر تعزیت کرنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ شیخ برابر درس میں مصروف تھے۔ ان کی رعب وجلال کی وجہ سے کسی کو ہمت نہیں ہورہی تھی کہ اندر جاکر انہیں حادثہ جانکاہ کی خبر دے۔لوگ باہم مشورہ کرنے لگے کہ کیا کیا جائے ، اسی دوران شام ومصروحجاز کے گورنر اور چوتھی عثمانی فوج کے کمانڈر جنرل جمال پاشا حکومت کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ تعزیت کرنے حاضر ہوئے۔ جمال پاشا نے دیکھا کہ حاضرین میں سے کوئی اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کررہا، تو انہوں نے کہا، میں اندر جاکر شیخ سے گفتگو کرتا ہوں وہ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ شیخ مطالعہ میں مصروف ہیں، اس لئے گفتگو کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ خاموش کھڑے رہے۔تھوڑی دیر میں شیخ نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پوچھا، کیا وفات ہوگئی؟ جمال پاشا نے اشارہ سے، اثبات میں جواب دیا۔ شیخ کی نگاہیں اشک آلود ہو گئیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھ کر خاموش ہوگئے، اور جمال پاشا کے سہارے باہر تشریف لائے۔ باہر بے پناہ مجمع ان کے انتظار میں تھا۔ بڑے صبر وسکون اور خاموشی کے ساتھ مجمع جنازہ لیکر قبرستان کی طرف بڑھا۔ شیخ بدرالدین

اور جمال پاشا ایک ساتھ سواری پر سوار تھے۔ اس گنج گرانمایہ کو سپرد خاک کر کے واپس آ گئے۔ غالباً دمشق نے ایسا پروقار اور باہیبت جنازہ کم دیکھا ہوگا''۔

شانِ استغناء: مفتی عتیق احمد قاسمی بستوی حضرت شیخ بدرالدین حسنی کی مزاجی خصوصیت اور شانِ استغناء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ بدرالدین حسنی کو اللہ جل شانہ نے بے پناہ مقبولیت اور شہرت سے نوازا تھا۔ ان کا تذکرہ غریبوں اور جھوپڑیوں سے لیکر سلاطین و امراء کے ایوانوں تک یکساں محبت وعزت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ زندگی بھر وہ اہل علم وفقراء کے ساتھ رہے اور ہمیشہ فقراء و مساکین کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ سلاطین وحکام سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ سلاطین کی دعوت و اصرار پر بھی حتی الامکان ان کے یہاں جانے سے کتراتے تھے۔ اگر کبھی گئے تو کسی مظلوم یا ضرورت مند کی سفارش کرنے یا مسلمانوں کی کسی قومی مصلحت کی بناء پر۔

سلطان عبدالحمید ثانی نے انہیں قسطنطنیہ تشریف لانے کی دعوت دی اور ایک اہم سرکاری عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا لیکن شیخ نے معذرت کردی۔

اسی طرح شہنشاہ روس نے ۱۹۱۳ء میں عالمی پیمانے پر ایک بڑا جشن منایا، اور دنیا کے مختلف ممالک کے سربراہوں اور بڑے مذہبی پیشواؤں کو اس میں مدعو کیا، شیخ کے یہاں بھی شہنشاہ روس کا قاصد آیا اور اس نے عرض کیا کہ اگر جناب والا شرکت منظور فرمالیں تو روس کا مخصوص بحری جہاز آپ کو بیروت کے بندرگاہ سے لے جانے کے لئے بھیج دیا جائے۔ شیخ نے معذرت کردی۔

علامہ بدرالدین حسنیؒ نے جب آخری سفرِ حج کیا تو اس وقت حجاز میں شاہ

حسین کی حکومت تھی۔شاہ حسین نے ان کے استقبال کرنے کے لئے مکہ سے دو فرسخ دور اپنے چاروں شہزادوں علی، عبداللہ، فیصل اور زید کو بھیجا اور کہلوادیا کہ حضرت والا کے قیام کے لئے قصر شاہی کا ایک حصہ خالی کردیا گیا، اگر آپ وہاں قیام منظور فرمائیں تو زہے سعادت، اور مکہ مکرمہ پہونچنے پر شاہ حسین نے خود شیخ کا پُرتپاک استقبال کیا۔شیخ نے شریف حسین کے قصر میں قیام فرمانا منظور نہیں کیا اور اپنے پرانے خاندانی میزبانوں کے یہاں ٹھہرے۔

ف: سبحان اللہ! کیسی مسکنت وفنائیت ہمارے علماء ربانیین میں تھی جو ہم سب کے لئے اسوہ حسنہ ہے واللہ الموفق۔آمین (مرتب)

جنگ عظیم اول کے دوران جب انور پاشا دولت عثمانیہ کے وزیر جنگ تھے اور سارے عالم اسلام میں ان کی شجاعت و جواں مردی کے چرچے تھے، ان کی شہرت وعزت ومحبوبیت کا ستارہ پورے عروج پر تھا، انہوں نے شام وحجاز کا دورہ کیا اور ہر مقام پر مسلمانوں کی طرف سے ان کا بے مثال استقبال کیا گیا۔ اسی سفر میں وہ دمشق بھی آئے۔انہوں نے مدرسہ دارالحدیث الاشرفیہ کے لئے قرآن پاک کا ایک نفیس نسخہ اور شیخ بدرالدین کے لئے ایک عمدہ تسبیح ہدیۃً پیش کی۔انور پاشا جب شیخ بدرالدین کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت شیخ بیٹھے ہوئے تھے، تعظیم کے لئے کھڑے نہیں ہوئے۔انور پاشا نے خود جھک کر شیخ کے گھٹنہ کو بوسہ دیا اور آبدیدہ ہوگئے۔شیخ نے ان کے لئے دعا کی اور مظلوموں کے ساتھ انصاف کرنے اور رعایا کی خبر گیری کی نصیحت فرمائی''۔

شیخ بدرالدین حسنی کی شخصیت میں خصوصیت سے علماء ومشائخ کے لئے

بہت کچھ سامان سبق عبرت ہے۔ایسی قابل تقلید ہستی کی زندگی ہمہ جہت گوشے حد درجہ حیرت انگیز اور سبق آموز ہے۔

محترم مفتی عتیق احمد بستوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو) لکھتے ہیں۔

اخلاق فاضلہ: ''علامہ بدرالدینؒ اپنی ذات میں انتہائی متواضع اور منکسر المزاج تھے، اہل علم ودین اور عامۃ المسلمین کا بڑا اعزاز واکرام کرتے تھے۔ علماء وصلحاء کے استقبال کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔لیکن ان کے ساتھ بڑے وقار اور خود دار بھی تھے۔طبعیت میں غیر معمولی شان استغناء تھی،اس لئے بڑے سے بڑے ظالم و جابر کے سامنے گردن نہیں جھکائی اور علم دین کی آن بان میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیا۔کوئی کتنا ہی بڑا بادشاہ،امیر اور حاکم آجائے وہ ان اہل دنیا کے تعظیم کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے''۔

اوپر کے اقتباسات سے حضرت شیخ بدرالدین حسنیؒ کی شخصیت اور مقام ومرتبہ خوب ظاہر ہے۔آپ کی بافیض ذات سے استفادہ کرنے والوں میں طلبہ، علماء اور مشائخ وقت کے ساتھ عوام،خواص،امراء اور سلاطین سبھی ہیں۔

ذرائع ابلاغ کافی نہ ہونے کے سبب علامہ حسنی کی حیات میں،موصوف کے عام ذکر وتذکرہ کا کوئی پتہ برصغیر ہندو پاک میں نہیں چلتا۔تاہم ہندوستان کے متعدد حضرات دمشق حاضر خدمت ہوکر فیض یاب ہوئے۔ان خوش نصیبوں میں حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ (۱۲۹۸؁ء تا ۱۳۶۰؁ھ مطابق ۱۸۸۱؁ء تا ۱۹۴۱؁ء) کا بھی ایک نام ہے۔

عمومی اشغال: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے اپنے سفرنامے میں علامہ حسنیؒ کے عمومی اشغال واطوار کے تذکرے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ انتہائی

اثر انگیز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ لکھتے ہیں:

علماء و صلحاء شام میں سب سے زیادہ مشہور شیخ بدر الدین ہیں، جو محدث کے نام سے مشہور ہیں۔ دمشق کا بچہ بچہ ان سے واقف ہے، اور عام، خواص ان کو قطبِ وقت سمجھتے ہیں، ضعیف العمر بوڑھے شخص ہیں، قائم الیل، صائم الدہر ہیں۔ دمشق کے مشہور مدرسہ دار الحدیث کے حجرہ میں مقیم ہیں جو جامع اموی کے قریب واقع اور مسجد وخانقاہ کا مجموعہ ہے۔ نہایت سادہ درویشانہ گذران ہے۔ چونکہ مجاہدہ وریاضت بہت کرتے ہیں اس لئے ناتواں و کمزور بھی زیادہ ہیں۔ رات و دن کے چوبیس گھنٹہ میں پانچ گھنٹے بھی نہ سوتے ہوں۔ سال بھر میں بجز ایام ممنوعہ کے کوئی دن روزہ سے خالی نہ جاتا۔ اشراق تک مراقبہ اور خلوت میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد تین چار گھنٹے تک درس دیتے ہیں، دوپہر کو قیلولہ کرتے اور بعد ظہر پھر درس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کم گو ہیں۔ زیادہ وقت اس چھوٹے سے حجرہ میں گذرتا ہے جو حجرہ در حجرہ بنا ہوا ہے۔

آپکے درس کی خصوصیت: ان کے شاگرد عموماً علماء اور دوسری جگہ سے فارغ التحصیل یا قریب التکمیل طلبہ ہوتے ہیں۔ بلا روک ٹوک جو کوئی بھی آئے بار یاب ہوتا ہے اور اخلاق نبویہ کے نمونے سے مستفیض ہوتا ہے۔ مقدس علم و عمل کے گویا حافظ تھے۔ ہر ہفتہ بعد نماز جمعہ جامع اموی میں چالیس حدیث کا ترجمہ مع تفسیر وشرح ونکات بیان کرتے تھے، جس میں بہ کثرت مخلوق شریک ہوتی ہے۔ نہایت حسین اور نورانی چہرہ، قابل زیارت بزرگ اور سلف کا نمونہ ہیں۔ بدعات سے غایت درجہ متنفر اور سنت مصطفویہ کے کمال درجہ محبّ وشیدا

بلکہ جاں نثار عاشق ہیں۔

امراء و حکام، فقراء و صلحاء، مشائخ و درویش، علماء ومضافاتی، غرض عوام وخاص سب کے نزدیک مقتدر اور جامع بین الشریعت والطریقت مسلم شیخ ہیں۔ دور، دور سے مخلوق زیارت کے لئے حاضر ہوتی ہے اور دعائیں لے کر واپس جاتی ہے۔ الحمد اللہ بندہ بھی ان کی زیارت سے مشرف ہوا، نہایت شفقت سے پیش آئے، دعائیں دیں اور علمی تذکرہ کے بعد کمال انس اور کریمانہ اخلاق سے نوازا ۔ حدیث مسلسل بالا ولیۃ کی خصوصاً اور دیگر اوراد و معلومات و جملہ احادیث کی عموماً اجازت عطا فرمائی اور اَسناد تام لکھ کر مزین بمہر کر کے حوالہ کی۔

بندہ ان بزرگ سے زیادہ مانوس اس لئے ہوا کہ جس طرح سیرت واخلاق، معمولات اور طرز معاشرت میں ان کو اپنے شیخ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی قدس سرہ کے مشابہ پایا۔ اسی طرح صورت شکل اور ہیئت جسمانی میں بھی کمال درجہ دونوں کو مماثل دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دمشق گویا گنگوہ ہے، اور شیخ بدرالدین محدث۔ گویا مولانا رشید احمد محدث۔ مشابہت تامہ ایک وہبی امر ہے، جس میں اسباب کو دخل نہیں، اور کیا عجب ہے کہ اقطاب ارض میں صورتاً بھی مشابہت ہوا کرتی ہو“۔

وفات: علامہ دمشقی کی وفات ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں ہوئی نور اللہ مرقدہ وبرد اللہ مضجعہ (کشکول نوادر صفحہ ۲۲۱ حصہ دوم)

شاعر اسلام جناب اصغر حسین اصغر گونڈوی المتوفی: ۱۳۵۵ھ

ولادت و تعلیم: اصغر صاحب گونڈوی ۱۸۸۴ء میں گونڈہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم پُرانے طرز پر ہوئی، وہ عربی فارسی پر عبور رکھتے تھے، چشمہ سازی کا کاروبار کیا۔ رسالہ ''ہندوستان'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔

آپ کے کلام کا مجموعہ: آپ کے کلام کے دو مجموعے ''نشاط روح'' اور ''سرود زندگی'' چھپ چکے ہیں، اس وقت ''سرود زندگی'' ہمارے مطالعہ میں ہے جس سے کچھ اشعار نقل کریں گے۔ چنانچہ اسی مجموعہ کلام پر اصغر صاحب نے جو دیباچہ ارقام فرمایا ہے وہ اپنے مضامین کے اعتبار سے مجھے بہت پسند ہے، اس لئے اس کو بعینہٖ نقل کرتا ہوں، امید ہے کہ اصحاب ذوق اس کو پسند کریں گے۔

دیباچہ: ''نشاطِ روح'' کو اکثر بزرگوں اور دوستوں نے پسند فرما کر میری حوصلہ افزائی کی جس کے لئے ان کا منت گذار ہوں۔ بعضوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ان کا بھی اس لئے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے خیال میں میری کوتاہیوں اور خامیوں کو گوارہ نہیں فرمایا۔ میں نیتوں کا محتسب نہیں۔ مجھے تو شکوہ سے زیادہ شکریہ میں مزہ ملتا ہے۔

اس اثناء میں وقتاً فوقتاً کچھ اور اشعار جو کہے تھے وہ آج ''سرود زندگی'' کے نام سے ناظرین کے سامنے پیش ہیں، سہو و خطا جو لازمۂ بشریت ہے اس کا دلی اعتراف ہے بلکہ بقول غالب ؎

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام　　آشکار ادم زعصیاں می زنم

(چونکہ آدم زادہ ہوں اس لئے آدمؑ ہی کی خود خصلت رکھتا ہوں لہذا اپنی معصیت کا علی الاعلان اعتراف کرتا ہوں۔ (مرتب)

بایں ہمہ ایک چیز کو کچھ لوگ پسند کرتے ہیں کچھ ناپسند، اور اس میں وہ قطعاً معذور بھی ہوتے ہیں اس لئے کہ پسندیدگی وناپسندیدگی کا دارومدار اکثر طبائع کی مناسبت اور عدم مناسبت پر ہے، اس کے لئے بحث، دلیل، انتقاد، جو چاہئے لفظ استعمال فرمایئے مگر وہ سب نام ہے اسی مناسبت وعدم مناسبت کی توضیح وتشریح کا اور بس۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے زبانی میری بہت کچھ حوصلہ افزائی فرمائی۔ جب کتاب کے چھپنے کا موقع آیا تو اپنے خیالات وتاثرات قلم بند فرما کر بھی مرحمت فرمائے، اس کے لئے ہمہ تن سپاس ہوں۔

چند سطور اسی حالت میں لکھ رہا ہوں کہ فالج سے صاحب فراش ہوں، جو کچھ اور جس قدر لکھنا چاہئے تھا وہ ہو نہ سکا۔ امید ہے کہ احباب معاف فرمائیں گے۔ احقر اصغر

اب جی چاہتا ہے کہ کلام اصغر سے لطف اندوز ہونے سے پہلے ''سرود زندگی'' ہی پر مولانا ابوالکلام صاحب جیسے ادیب کامل کے رقم فرمودہ تقریظ سے چند اقتباسات نقل کروں تاکہ اس کے پڑھنے سے کلام کی عظمت اور صاحب کلام کی قدرومنزلت ذہن نشین ہوجائے، چنانچہ یوں تحریر فرمارہے ہیں۔

احباب میری کوتاہ قلمی سے بے خبر نہیں خصوصاً تقریظ کے معاملہ میں، لیکن بعض تقاضے ایسے ہوتے ہیں جن کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے، ایسا ہی تقاضا ان سطور کی

نگارش کا باعث ہوا۔ یہ اگر صاحب کلام کا ہوتا تو میں حسب معمول معذرت کر دیتا مگر خود کلام کا تقاضا ہے اور اس کے لئے میرے پاس کوئی معذرت نہیں۔

کئی سال کی بات ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ جو" نشاط روح" کے نام سے شائع ہوا تھا، مجھے بھیجا تھا، اس وقت تک ان کا کلام میری نظر سے نہیں گذرا تھا، چونکہ وقت کی عام ادبی سرگرمیوں کی طرف سے طبیعت مایوسی کی عادی ہو چکی ہے، اس لئے قدرتی طور پر ذہن کسی غیر معمولی دلچسپی کے لئے مستعد نہ تھا، میں نے بیدلی سے مجموعہ اُٹھایا اور چاہا کہ ورق گردانی کر کے رکھدوں، لیکن مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گذرے، میں چونک اُٹھا، اور جوں جوں، مطالعہ کرتا گیا، میری تعجب انگیز مسرت بڑھتی گئی، میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں، میں وقت کی شاعری سے اس انداز کلام کا متوقع نہ تھا۔ ؎

کیا کہیئے جاں نوازئ پیکانِ یار کو — سیراب کر دیا دلِ منت گذار کو
جوشِ شباب، نشۂ صہباء، ہجومِ شوق — تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

؎ مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت — اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں
سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے — جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں

؎ آغوش میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں اس کو — یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے
بیچ حُسنِ تعین سے ظاہر ہو کہ باطن ہو — یہ قید نظر کی ہے، وہ فکر کا زنداں ہے

میں نے یہ مجموعہ بے دلی کے ساتھ اٹھایا تھا لیکن جب رکھا تو اس اعتراف کے ساتھ رکھا کہ اُردو میں ایک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی سے

میں اس وقت تک بے خبر تھا۔

میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی، میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا، اہل فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں، بدگمانی کی شکایت ہے، تاہم میں محسوس کرتا ہوں، جس شاعر کے کلام میں حسب ذیل اشعار موجود ہوں اس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی۔

؎ قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

؎ انتہا کیف کی افتادگی و پستی ہے
مجھ سے کہتا تھا یہی دُردِ تہ جام ابھی

؎ رودادِ چمن سُنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

؎ شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذب محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

؎ گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے
ملتی ہے اب انہیں سے کچھ اپنی خبر مجھے

دوسرے مجموعے یعنی ''سرودِ زندگی'' کا بھی یہی عالم ہے۔ اصحاب ذوق تسلیم کریں گے کہ یہ اشعار معیار میں ڈھلے ہوئے اور نقد و نظر سے بے پرواہ ہے۔ ؎

عالم یہ ہے اک سکونِ بیتاب
یا عکس ہے میری خامشی کا

ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک

دے مر کے ثبوت زندگی کا

؎ کیوں شکوہ سنج گردش لیل ونہار ہوں

اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

ان سطور کی نگارش سے مقصود انتقاد وتبصرہ نہیں ہے، اس کام کے لئے اور لوگ موجود ہیں، مقصود یہ تھا کہ اپنا تاثر ظاہر کر دوں، محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے، میں نے اصغر صاحب کے کلام میں حسن خوبی پائی، میرا فرض تھا کہ اس کی شہادت دوں ۔ (ابوالکلام آزاد، کلکتہ، ۲۸؍جون ۱۹۳۴ء)

اب اصغر صاحب کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں جو اس بے کیف وبدذوق کو پسند ہیں۔ ؎

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

اے تو بہار رنگ رنگ وائے تو ورائے آب درنگ

عشق کسی نگاہ میں حسن کسی نگاہ میں

در پہ جو تیرے آگیا اب نہ کہیں مجھے اُٹھا

گردشِ مہر وماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمین نہ آسماں

تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

رازفتادگی نہ پوچھ لذتِ خستگی نہ پوچھ

ورنہ ہزار جبرئیل چھپ گئے گردِ راہ میں

لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں

شرح نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

(سرودِ زندگی: ص/ ۶۲)

؎ آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو

پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

(ص/ ۲۴)

؎ یا تو خرد کو، ہوش کو، مستی و بے خودی سکھا

یا نہ کسی کو ساتھ لے اس کے حریم ناز میں

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی

ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

اصغرِ خاکسار وہ ذرّہ خود شناس ہے

حشر سا کردیا بپا جس نے جہانِ راز میں

(سرودِ زندگی: ص/ ۶۱)

؎ اس جہانِ غیر میں آرام کیا راحت کہاں

لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجئے

دیر سے بھولے ہوئے ہیں درسِ مستی اہل بزم

آج ہر موجِ نفس کو موجِ صہبا کیجئے

(ص ۹۴)

؎ وہ سامنے ہیں، نظام حواس برہم ہے

نہ آرزو میں سکت ہے، نہ عشق میں دم ہے

زمیں سے تا بہ فلک کچھ عجیب عالم ہے

یہ جذبِ مہر ہے یا آبروئے شبنم ہے

روائے لالہ وگل پردۂ مہ وانجم

جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

خوشا حوادث پیہم خوشا یہ اشکِ رواں

جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

(ص ۱۱۲)

؎ دل پہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہارِ زندگی

اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

لذتِ دردِ خستگی ، دولتِ دامنِ تہی

توڑ کے سارے حوصلے اب مجھے یہ صلہ دیا

(سرودِ زندگی: ص/ ۱۱۹)

ف :۔ یقیناً اصغر صاحب کے اشعار نہایت لطیف و با معنی ہیں اور ان میں ایسا اثر وکیف ہے کہ پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت اصغر محض شاعر ہی نہیں بلکہ صاحب نسبت ومعرفت بزرگ بھی تھے۔ (مرتب)

وفات: ۳۰/ نومبر ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳۵۵ھ کو انتقال ہوا، دائرہ شاہ محب اللہ کیٹ گنج الہ آباد میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا حکیم عبدالمجید بنارسی متوفی ۱۳۵۶ھ

نام ونسب ولادت: آپ کا نام عبدالمجید بن عبدالقادر بن سردار باب اللہ ساکن محلہ کٹیہر شہر بنارس۔آپ کی ولادت یکم شعبان ۱۲۷۸ھ بروز جمعہ بوقت عصر محلہ کٹیہر میں ہوئی۔آپ کا تاریخی نام ''محمد عبدالمجید احفظ وحید'' رکھا گیا۔ جس سے ۱۲۷۸ھ برآمد ہوتا ہے؛اس کے علاوہ ''چراغ دینی'' سے بھی آپ کی تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔

تعلیم: آپ نے ناظرہ میاں جی عبدالواحد ساکن محلہ کٹیہر (متوفی ۱۳۲۳ھ) سے پڑھا پندرہ سال کی عمر میں مدرسہ گیان بافی میں داخل ہوئے اور حافظ حسام الدین مئوی سے پندرہ ماہ کے اندر حفظ قرآن مکمل کرلیا۔اور چند سال تک مسجد کوتوالی میں تراویح میں محراب سنائی۔

ابتدائی فارسی کی کتابیں 'بی بی رضیہ کی مسجد' میں مولانا ثناء اللہ صاحب حنفی بنارسی سے پڑھیں، فارسی کے بعد عربی تعلیم حاصل کرنے کیلئے دوبارہ مسجد گیان بافی چلے آئے اور ابتدائی عربی صرف،نحواور ابتدائی منطق سے شرح وقایہ تک کی کتابیں مولانا عبدالرحمن مئوی (متوفی ۱۳۱۵ھ) سے پڑھیں یہی مولانا عبدالرحمن مئوی بعد میں آپکے خسر ہو گئے۔(تذکرہ علماء بنارس)

بنارس کے مدرسہ گیان بافی اور مسجد بی بی رضیہ سے حصول تعلیم کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔اور مولانا سید نذیر حسین صاحب (متوفی ۱۳۲۰ھ) سے

بخاری و مسلم شریف اور تفسیر وغیرہ پڑھی، میاں صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد شریف حسین (متوفی ۱۳۰۴) سے بلوغ المرام حصن حصین مشکوۃ اور ترمذی شریف پڑھیں۔ اور ۲۱ رسال کی عمر میں ۱۲۹۹ھ میں وہاں سے سند فراغت حاصل کی۔ اور وطن مالوف بنارس آ گئے۔

مزید تعلیم بالخصوص علوم عقلیہ کی تحصیل کے لئے ماہ صفر ۱۳۰۰ھ میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء سے پڑھا۔

تدریسی زندگی: ۱۳۰۴ھ میں حکیم عبد العزیز کے صاحبزادے حکیم عبد الرشید کے اتالیق مقرر ہوئے اور حکیم عبد الحفیظ کے صاحبزادے حکیم عبد المجید کو قرآن پاک حفظ کرایا۔ چھ سال لکھنؤ میں گذار کر فنون عقلیہ اور علم طب میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ماہ ذی قعدہ ۱۳۰۷ھ میں بنارس واپس آئے۔

۱۶ رصفر ۱۳۲۵ھ میں مدرسہ اسلامیہ سعیدیہ دارانگر بنارس میں مدرس ہوئے۔ اور تقریباً ۲۹ رسال تک مسلسل درس دینے کے بعد ۲۹ رمحرم ۱۳۵۴ھ میں ضعف پیری کی وجہ سے مدرسہ سے علیحدہ ہو گئے۔ آپ نے اپنے علوم وفنون سے بے شمار لوگوں کو فیض پہونچایا خاص طور سے بنگال میں آپ کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ شہر بنارس میں بھی آپکے تلامذہ کی خاصی تعداد ہے۔

سفر حج: ۷ رشوال ۱۳۲۵ھ پنجشنبہ کو سفر حج پر روانہ ہوئے۔ اور ۱۳ رذی قعدہ کو مکہ مکرمہ پہونچے، حج کے فریضہ سے فراغت کے بعد ۱۳ رمحرم الحرام ۱۳۲۶ھ کو مدینہ منورہ پہونچے اور زیارت روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہوئے۔ سفر حج کے بعد اکثر آپ حرمین شریفین کا خواب دیکھا کرتے تھے، ۲۷ رذی الحجہ ۱۳۳۳ھ کو

شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مبارک خواب میں نصیب ہوئی۔

آپ کی صفات حسنہ: سادگی پسند، زاہدنہ زندگی کے دلدادہ، متواضع اور منکسر المزاج تھے۔آپ کے بیٹھک میں ایک پلنگ بچھا رہتا تھا مگر آپ زمین ہی پر سوتے بستر بھی معمولی سا تھا۔مولانا مکی صاحب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک چھوٹا سا توشک (گدّا) بچھادیا ایک دو شب تو اس پر سوئے۔پھر مجھے بلا کر کہا مکی اس کو لیجاؤ تم بچھالینا۔

بنارس کے جید علماء میں آپ کا شمار تھا، اسلاف کا بہترین نمونہ تھے اخلاق ومروت آپ کا شیوہ تھا، بے نیازی وعزلت نشینی آپ کی فطرت تھی۔

ف: اکابر کا عموماً یہی حال رہا ہے مگر ہم اپنے اسلاف کے اخلاق سے دور ہوتے جارہے ہیں چنانچہ ایک عرب عالم نے اسی موضوع پر ایک کتاب ''این نحن من اخلاق السلف'' کے نام سے تصنیف فرمائی جس کا ترجمہ اس حقیر کے توسط سے ''سلف صالحین کے اخلاق'' کے نام سے شائع ہوا۔جس کو علماء بہت پسند فرمارہے ہیں۔(مرتب)

وفات: ۲۰ رصفر ۱۳۵۶ھ مطابق ۲ رمئی ۱۹۳۷ء یکشنبہ کو ۳ بجکر ۴۵ منٹ پر علم کا یہ روشن ستارہ روپوش ہوگیا۔**اناللہ وانا الیہ راجعون**

نماز جنازہ آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالحمید مکی نے پڑھائی اور قبرستان دھنسرا بنارس میں مدفون ہوئے۔رحمہ اللہ تعالی

(تذکرہ علماء بنارس ص ۱۹۷)

شاعر اسلام علامہ اقبال صاحب لاہوریؒ المتوفی ۱۳۵۷ھ

نام ونسب وولادت: اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا خاندان تھا، ان کے جد امجد دو سال قبل اسلام لائے تھے، اسی وقت سے صلاح وتقویٰ کا رنگ خاندان میں قائم رہا، ان کے والد محترم جن کا اسم گرامی ''نور محمد'' تھا۔

تعلیم: آپ کے والد ایک صوفی صافی انسان تھے اس لئے انہوں نے ان کی تربیت بالکل مذہبی اور اخلاقی اصول پر کی، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا، والد مرحوم اپنے اوراد ووظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گذر جاتے، ایک دن صبح کو میرے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا؛ بالآخر انہوں نے مدت کے بعد ایک دن صبح جب کہ میں حسبِ دستور قرآن پاک کی تلاوت کرر ہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا: بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے یعنی اللہ تعالی خود تم سے ہم کلام ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک شعر میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

(اقبال کامل: ص ر ۴)

عصری تعلیم : اقبال کی انگریزی تعلیم اپنے شہر سیالکوٹ کے اسکول و کالج میں ہوئی، پھر سیالکوٹ سے لاہور جاکر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، اور فلسفہ، عربی اور انگریزی اختیار کر کے بی۔اے۔ کی سند لی۔

۱۹۰۵ء میں کیمبرج میں داخل ہوئے اور فلسفہ و معاشیات کی امتیازی ڈگریاں پا کر تین سال تک لندن میں قیام پذیر رہے اور اس عرصے میں اسلامی موضوعات پر خطبات و مقالات کا سلسلہ بھی جاری رہا، جس سے ان کی شہرت و مقبولیت علمی حلقوں میں پھیلی، پھر مزید سیاسیات واقتصادیات میں امتیاز پیدا کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں عازم وطن ہوئے۔

۱۹۱۰ء میں طرابلس و بلقان کی جنگوں نے اقبال پر شدید اثر ڈالا اور ان کے قلبی احساسات کو ایک کاری زخم لگا جس نے مغربی تہذیب اور یورپی سامراج سے شدید نفرت کی شکل اختیار کر لی، ان کے رنج والم نے ان سے وہ پر جوش نظمیں کہلائیں جو مسلمانوں کے غم میں گرم آنسو اور مغرب کے خلاف تیر و نشتر تھیں۔

۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں پہلی بار پاکستان کا نظریہ پیش کیا، اور مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے، اور ۱۹۳۰-۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کی، لندن میں انہیں فرانس، اسپین اور اٹلی کی حکومتوں نے ملکی دورے کی دعوت دی چنانچہ آپ موخر الذکر دونوں ملکوں کی دعوت پر گئے، مسلمانوں کی صدیوں کی جلاوطنی کے بعد مسجد قرطبہ میں پہلی بار نماز پڑھی۔

علامہ اقبال کا مذہبی عقیدہ اور مکاتب اسلامیہ کے متعلق آپ کا خیال

علامہ اقبال اپنے مذہبی عقیدے کے متعلق لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ یہ ہے اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں، بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور وفکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اقوام انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے، جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خاصۃ للہ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوع انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے۔

مسلمانوں کو تو سیاست سے پہلے اشاعتِ اسلام کا کام ضروری ہے تاہم دونوں کام ساتھ ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔''

چنانچہ جب ان کے ایک عقیدتمند حکیم احمد شجاع نے علوم جدیدہ کی تدریس کے لئے سرسید کے طرز پر تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے ان سے مشورہ طلب کیا تو اقبال جذبات سے مغلوب ہو گئے اور انہوں نے رقت آمیز لہجہ میں جواب دیا:

یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی، ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اگر ہندوستان کے مسلمان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کے آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج

غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر، الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سال کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ (معارف: جولائی ۲۰۰۰ء بحوالہ اوراق گم گشتہ: ص/۱۱۹)

اکبر الہ آبادی اور شاعر اسلام علامہ اقبال کے متعلق مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے عالی

مکرم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ اردو زبان میں دو شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے دین کی خدمت کی ہے اور اس سے دینی فکر کی اشاعت کا کام لیا ہے، ایک اکبر الہ آبادی مرحوم ہیں اور دوسرے ڈاکٹر اقبال مرحوم، ان دونوں میں سے اکبر الہ آبادی مرحوم کے یہاں فکری سلامتی اقبال مرحوم کی بنسبت کہیں زیادہ ہے، اکبر مرحوم کی فکر ٹھیٹھ دینی فکر ہے اور ان کے یہاں حکمت کی بھی فراوانی ہے، اقبال مرحوم کی فکر بھی اگرچہ مجموعی اعتبار سے دینی فکر ہے مگر اس میں اس درجہ سلامتی نہیں، اس کے باوجود یہ بات واضح طور سے نظر آتی ہے کہ اقبال کی شاعری جتنی مؤثر ہوئی اور اس سے جتنا فائدہ پہنچا اکبر مرحوم کی شاعری اس درجہ مؤثر نہیں ہوئی، میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ اکبر مرحوم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے طنز و تعریض کا طریقہ اختیار کیا اور طنز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے ہم خیال لوگ لطف تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس سے کوئی مؤثر اصلاحی کام نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مخالفین میں ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ (البلاغ، بیاد فقیہ ملت مفتی شفیع صاحبؒ: ص/۴۶۸)

حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی دعا:

کسی صاحب نے علامہ اقبال کا یہ شعر حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اس شعر کو سن کر حضرت مصلح الامتؒ بیحد خوش ہوئے اور بار بار اس شعر کی تحسین فرمائی، نیز ایک صاحب نے حضرت مصلح الامتؒ سے یہ بیان کیا کہ علامہ اقبال سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت حسینؓ سے زیادہ کسی پر ظلم ہوا تو فرمایا کہ ہاں، قرآن پر، اس کو بھی بہت پسند فرمایا اور بار بار نقل فرمایا، ایک مرتبہ اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال کے اشعار کو سنکر یہ دعا فرمائی کہ اللہ تعالی اقبال اور اکبر کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ آمین یارب العالمین!

چند اشعار حکیمانہ:

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دنیا چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا، نہ من

اقبال کے نزدیک آہ سحر گاہی زندگی کا بہت ہی عزیز سرمایا ہے، بڑے سے بڑے عالم و زاہد اور حکیم و مفکر اس سے مستغنی نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

(نقوش اقبال: ص/۶۶)

؎ کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی

بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

حد ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی

سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

؎ نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری

رہا صوفی، گئی روشن ضمیری

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ

نہیں ممکن امیری بے فقیری

عطا اسلاف کا جذب دروں کر

شریک زمرۂ **لایحزنون** کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں

میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

؎ دل بیدار فاروقی، دل بیدار کرّاری

مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک

نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری

؎ دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

؎ محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج، دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

؎ تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو میں — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اشعار دُعائیہ

یوں تو آپ کے اشعار عارفانہ و مصلحانہ بہت ہیں، کہاں تک نقل کئے جائیں،

ہاں مگر آپ کے دعائیہ اشعار نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، وہ یہ ہیں ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روز محشر عذرہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اس کے متعلق حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانی تبلیغ نے فرمایا: اقبال کے ظاہری اعمال اگرچہ متقی لوگوں کے سے نہیں تھے مگر وفات سے کچھ دن پہلے انہوں نے یہ رباعی کہی تھی، تو یہ رباعی خصوصاً اس کا آخری مصرعہ بارگاہ حق تعالی میں ایسا مقبول ہوا کہ اقبال اچانک کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

(بہ خلد بریں ار مانوں کی مولفہ مولانا افتخار فریدی مرادآبادیؒ)

وفات: علامہ اقبال عرصے سے طرح طرح کے امراض وعوارض کا شکار چلے آرہے تھے بالآخر ان کی صحت نے جواب دے دیا، لیکن اس حال میں بھی شعر گوئی، تصانیف اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ اپنی وفات سے دس منٹ پہلے وہ قطعہ کہا جو شوق وحسرت کا بیان اور ان کی زندگی کا ترجمان ہے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور پھر اپنا آخری لافانی شعر کہا:

نشانِ مرد مومن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

آخر دین وادب کا یہ آفتاب ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء مطابق ۱۳۵۷ھ کا آفتاب نکلنے سے پہلے غروب ہوگیا۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔ اور لاہور میں مدفون ہوئے، نور اللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد عظیم آبادیؒ بہار[1] المتوفی ۱۳۵۹ھ

نام ونسب: نام محمد سجاد، کنیت ابوالمحاسن آپ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

ولادت: آپ کی ولادت ۱۲۹۹ھ میں ہوئی آپ نے بہار کے مردم خیز خطہ ضلع عظیم آباد (موجودہ پٹنہ) کے ایک غیر معروف قصبہ "پنہسہ" کو اپنا وطن ہونے کا شرف بخشا۔

تعلیم وتربیت: تیرہویں صدی کے شروع میں صوبہ بہار میں مولانا وحید الحق صاحب استھانوی بہاری کے دم قدم سے علم کو نئی رونق حاصل ہوئی، بہار میں انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان میں سے ایک مولانا سجاد بھی تھے، عربی کی ابتدائی تعلیم انہیں کے زیر سایہ ہوئی اور ان کی پہلی شادی بھی انہیں کی دختر نیک اختر سے ہوئی، آخری تعلیم الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں مولانا عبدالکافی صاحب الہ آبادی کے مدرسہ میں ہوئی اور وہیں ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۲ھ تک رہ کر سندِ فراغ حاصل کی۔

ابتدائی کام: تعلیم سے فارغ ہوکر تدریسی خدمت انجام دی، اس عرصہ میں کبھی وہ مدرسہ اسلامیہ بہار میں رہے اور کبھی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں، ۱۳۲۵ھ تک یعنی سات برس تک وہ اس فرض کو انجام دیتے رہے، ۱۳۲۹ھ میں گیا میں

---

[1] حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ نے آپ کے حالات نقل فرمائے ہیں۔ اسی سے یہ تذکرہ ماخوذ ہے۔ (مرتب)

مدرسہ انوار العلوم کی بنیاد ڈالی، مولانا عبدالوہاب منطقی بہاری بھی شریک کار تھے، یہ بات مجھے یوں یاد رہی کہ شاید ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء تھا کہ مدرسۂ مذکور کے ایک جلسۂ سالانہ میں مولانا عبدالوہاب صاحب حقانی دہلوی مرحوم شریک جلسہ ہوئے تھے اور تقریر کی تھی۔

مولانا سجاد صاحب مدرسہ انوار العلوم کا جلسہ سال بہ سال کیا کرتے تھے اور اس میں علماء کو بلاتے تھے اور ان سے تقریریں کراتے تھے، میرا خیال ہے کہ اکثر علماء سے ان کی ملاقاتوں کا آغاز انہی جلسوں میں ہوا، مجھے بھی ایک دو دفعہ ان جلسوں میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

امارت شرعیہ کا قیام: بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے، زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں ۱۹۱۸ء میں معارف میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلہ میں اس کو پیش کیا گیا، پھر ۱۹۲۰ء میں یوروپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے، مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علمبرداروں نے اس کو کسی طرح چلنے نہ دیا۔ مگر بہار میں مولانا سجاد صاحب کی قوت عملی نے اس کو وجود کا قالب بخش دیا۔

مولانا سجاد مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں قوم کی رہبری کا فرض انجام دیں، مسلمانوں میں دینی تنظیم قائم ہوجائے، جس کے تحت ان کے تمام تبلیغی و مذہبی و تعلیمی و تمدنی کام انجام پائیں، دارالقضاء قائم ہوکر مسلمانوں کے ہر قسم کے مقدمات و معاملات تصفیہ پائیں، مسلمانوں کا

بیت المال قائم ہو جائے جہاں مسلمانوں کے صدقات وخیرات وزکوٰۃ کی ساری رقمیں اکٹھی ہو کر ضروریات میں خرچ ہوں اور مستحقین میں تقسیم ہوں، مولانا نے عمر کے آخر بیس برس انہیں کاموں میں صرف کئے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی مالی بے بضاعتی مددگاروں کی کمی، رفقاء کی نامساعدت اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی حیرت انگیز قوتِ عملی کا ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہے۔

علم وفضل: فلسفہ وتاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم وعمل کم یکجا ہوتے ہیں لیکن کم یاب مثالوں میں مولانا سجاد کی ذات تھی، وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیاتِ فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے اُن کی نظر میں تھا، امارت شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی ومالی وسیاسی مسائل پر اُن کو عبور کامل تھا، زکوٰۃ وخراج وقضا وامارت وولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی، ہر چند کہ سالہا سال سے درس وتدریس ومطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر جب گفتگو کی گئی اُن کا علم تازہ نظر آیا۔

فہم ورائے: اُن کا علم کتابی نہ تھا، بلکہ آفاقی بھی تھا، معاملات کو خوب سمجھتے تھے ان کو بارہا بڑے بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہوا ہے کہ کیونکر فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اسی لئے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف اُن کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ فکر رسا اور رائے صائب

تھی، مسائل اور حوادث میں اُن کی نظر بہت دور دور پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھادیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع وخاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمتے تھے اور محض ہٹ اور ضد سے نہیں، بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں سے منوانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔

اخلاق: وہ بیحد خاکسار اور متواضع تھے، کبھی کوئی اچھا کپڑا انہوں نے نہیں پہنا، کبھی کوئی قیمتی چیز ان کے پاس نہیں دیکھی، کھدّر کا صافہ، کھدّر کا لمبا کرتہ کھدّر کی لمبی صدری، پاؤں میں معمولی دیسی جوتے اور ہاتھ میں ایک لمبا عصا، یہ وضع تھی، مگر اپنی اس سادہ اور معمولی وضع کے ساتھ بڑے بڑے لیڈروں اور بڑے بڑے مجمعوں میں بے تکلف جاتے تھے اور اپنا لوہا منواتے تھے۔

ان کی سادگی: اُن کی زندگی نہایت سادہ تھی، غربت وعسرت کی زندگی تھی، گھر کے خوشحال نہ تھے، امارت سے معاوضہ بہت قلیل لیتے تھے، سفر معمولی سواریوں اور معمولی درجوں میں کرتے اور اسی حال میں پورب سے پچھّم اور پچھّم سے پورب اور اُتر سے دکھن اور دکھن سے اتر دوڑتے رہتے تھے، اُن کا دن کہیں گزرتا تھا اور رات کہیں، مسلمانوں کی سلامتی اور تنظیم کی ایک دُھن تھی کہ ان کو دن رات چکر میں رکھتی تھی، کہیں قربانی کا جھگڑا ہو، مسلمانوں پر مقدمہ ہو کہیں سیلاب آئے، کہیں آگ لگے، کہیں مسلمانوں کا تنازعہ ہو، ہر جگہ خود پہنچ جاتے تھے، معاملہ کا پتہ لگاتے تھے، مظلوموں کی مدد کرتے تھے، ان کے لئے چندہ کرتے تھے۔ جہاں سے ہوسکتا وہ ان کو لاکر دیتے تھے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے۔

بہارؔ میں زلزلہ کے زمانے میں انہوں نے جس تن دہی سے کام کیا اور ایک ایک گاؤں میں جا کر جس طرح سے بے گھروں اور خانماؤں کو مدد دی وہ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے، جس کا صلہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ سے اُن کو عنایت فرمایا ہوگا۔

لیڈروں اور قومی کارکنوں کے پاس عام طور سے اُن کے اثر کے ذرائع تین ہیں، یا دولت ہے یا حسن تقریر ہے یا زورِ قلم ہے، مرحوم ان تینوں سے محروم تھے، وہ غریب تھے اور غریبوں ہی میں زندگی بسر کی، زبان میں لکنت تھی، جس کی وجہ سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے، اور اسی لئے تقریر بہت کم کرتے تھے اور ان کی قلم میں وہ زور بھی نہ تھا جو آجکل کی انشا پردازی کا کمال ہے، تاہم ان سب کا بدل ان کے پاس اُن کا ایک اخلاص تھا، جو اُن کی ہر کمی کو پورا کر دیتا تھا، عجب نہیں کہ زبان اور قلم کا عجز ہی تھا جو اُن کی قوتِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے خطبہ میں میرے قلم سے اُن کی نسبت یہ الفاظ نکلے تھے جو پہلے مدح تھی، اب مرثیہ ہے:۔

”۱۳۴۳ھ کے اجلاس خاص مرادآباد کے موقع پر بھی مجھے یہ عزت عطا ہوئی تھی، مگر عین وقت پر وفد جدہ کی شرکت نے انکار پر مجبور کیا اور میں خوش ہوں کہ اس کی بدولت ایک خاموش ہستی بولی، ایک بے زبان نے زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز و گداز نے کاغذ کے صفحوں پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرے۔“ یہ بھی مولانا ہی کی قوت جاذبہ تھی جو مختلف الخیال علماء اور مختلف الرائے سیاسی رہنماؤں اور قومی کارکنوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر

جمع کئے اور ایک شیرازہ میں باندھے ہوئے تھے۔

(یادرفتگاں: از مولانا سلیمان ندوی: ۲۱۵)

علمی ذوق: مولانا کا مزاج علم وتحقیق میں تقلید وقناعت کا نہ تھا، بلکہ آپ اخذ واستنتاج کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، قرآن مجید سے شغف کا حال یہ تھا کہ تفکر فی القرآن کے غلبہ کی جہ سے گھنٹہ، آدھا گھنٹہ میں بہ مشکل ایک صفحہ کی تلاوت کر پاتے، بہار اسمبلی میں حکومت نے ایک ایسا بل پیش کیا تھا، جس کے رو سے اوقاف پر زرعی ٹیکس عائد ہوتا تھا، مولانا نے اس کی موثر اور کامیاب مخالفت کی، مولانا عبدالصمد صاحبؒ نے دریافت کیا کہ اوقاف پر زرعی ٹیکس کے خلافِ شرع ہونے کی بابت قرآن مجید میں کیا ماخذ ہے؟ مولانا نے یہ آیت پڑھی:

"**فَمَنْ بَدَّلَه بَعْدَمَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ**" کہ جب وصیت میں تبدیلی جائز نہیں، جو مرض الموت میں کی جاتی ہے تو پھر وقف میں بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگی، جو صحت اور طمانینت کی حالت میں کیا جاتا ہے، اسی اصول پر "**شرط الوقف کالنص**" کا ضابطہ ہے، سورۂ فاتحہ میں مغضوب اور ضالین سے یہودی ونصاریٰ کی جماعت مراد لی گئی ہے، جس کو دن رات نمازوں میں بتیس دفعہ ہر مسلمان پڑھتا ہے اور گویا یہود و نصاریٰ سے براءت کا اظہار کرتا ہے؛ حالاں کہ مشرکین سے بھی اس درجہ براءت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ حضرت مولاناؒ سے اس سلسلہ میں جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس کی وجہ یہ کہ قرآن کی نظر میں یہودی ونصاریٰ کی جماعتی فطرت یہ ہے کہ ان میں حق کے قبول کرنے کی استعداد نہیں مشرکین کی جماعتی فطرت

میں حق کے قبول کرنے کی استعداد ہے؛ چنانچہ یہود ونصاریٰ کے متعلق قرآن نے کہا ہے: **"لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ"** (البقرہ ۱۲) اور مشرکین کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ: **وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ** (القلم:۹) غور فرمائیے! کتنی بلیغ ہے یہ توجیہ۔

مولاناؒ کی تحریروں میں احادیث کا بکثرت ذکر ملتا ہے، مولانا کا نقطۂ نظر تھا کہ ہر حدیث قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کی تفسیر ہے؛ اسی لئے مولانا کا خیال تھا کہ ہر حدیث کو پڑھاتے ہوئے قرآن مجید سے مربوط کر کے بتانا چاہئے۔

ف: ماشاء اللہ بہت حکمت وبصیرت کی بات فرمائی۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ (مرتب)

فقہ آپکا خاص موضوع تھا: فقہ مولاناؒ کا موضوع خاص تھا؛ جیسا کہ آپ کے فتاویٰ، قضایا اور دوسری تحریروں سے ظاہر ہے۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے ممتاز اصحابِ علم وفضل آپ کو "فقیہ النفس" کہا کرتے تھے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ سالہا سال سے درس وتدریس اور مطالعہ کا اتفاق نہ ہونے کے باوجود جب بھی آپ سے گفتگو کی جاتی تو علم تازہ نظر آتا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا بیان ہے کہ ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کر کے بیان کرنا مفتی محمد کفایت اللہؒ صاحب کا خاص حصہ ہے، لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا سجاد صاحب دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحبؒ بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے

ساختہ ان کی زبان سے کلماتِ تحسین نکل جاتے۔"

مولانا فقہ کے غواص اور شریعت کی روح ومقصد کے رمز شناس تھے اور اس کی وجہ سے اخذ واستنباط اور نکتہ سنجی ان کی طبیعت میں تھی۔مولاناؒ نہایت ہی اعلیٰ فقہی ذوق کے حامل تھے اور احوالِ زمانہ پر احکام فقہیہ کے انطباق میں یدطولیٰ رکھتے تھے،فقہاء کے درمیان جو اختلافِ رائے ہے،مولانا اس اختلاف کو اختلافِ برہان سے زیادہ اختلافِ زمانہ پر محمول کرتے تھے کہ اصل ماحول اور احوال میں تغیر کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی ہے؛ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان جو اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی مولانا سجاد صاحبؒ کا یہی نقطۂ نظر تھا؛ اسی لئے مولانا اربابِ افتاء کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ امام غزالی کی کتاب سے مصالح مرسلہ کا باب ضرور پڑھیں؛ تاکہ نئے پیش آمدہ مسائل میں وہ بصیرت کے ساتھ فتویٰ دے سکیں۔"

عہدۂ نظامت کی قبولیت: مولانا سے بارہا جمعیۃ علماء ہند کے عہدوں کی پیشکش کی جاتی رہی،مگر جمعیۃ علماء بہار کی نظامت اور مولانا عبدالوہاب بہاری کے انتقال کے بعد صدارت کا بوجھ، نیز امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ کی گراں بار ذمہ داریاں، بہار میں ہونے والی مختلف اسلام دشمن یورشوں اور قدرتی آفات وغیرہ نے آپ کو اس کی اجازت نہیں دی مگر مجلس عامہ کے مسلسل اصرار پر اخیر عمر میں جمعیۃ علماء ہند کے عہدۂ نظامت کو قبول فرمایا اور تھوڑے ہی دنوں میں عمدہ تنظیمی اور اشاعتی کام انجام دیئے،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا بیان:

عہدۂ نظامت کے قبول کرنے کے وقت سے وفات کے وقت

تک زندگی اس تھوڑے وقفہ میں اندرونی تنظیم اور بیرونی
نشر واشاعت کے علاوہ جمعیۃ علماء کی یہ نمایاں خدمات انجام دیں
کہ جمعیۃ علماء کی بیس سالہ تبلیغی، دینی، سیاسی اجتماعی خدمات اور
علمی جد وجہد کا ایک مرقع تالیف فرمایا، جو ''تذکرہ جمعیۃ علماء ہند''
کے نام سے معنون کیا گیا۔

امارت شرعیہ فی الہند: فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جہاں مسلمان اقتدار سے محروم ہوں اور اقلیت میں ہوں، وہاں بھی ان کے لئے ضروری ہے کہ امارت شرعی کا نظام قائم کریں، یا تو حکومت مسلمانوں کے لئے ان ہی میں سے ایک آدمی مقرر کر دے، جو مسلمانوں کے شرعی اُمور کا ذمہ دار ہو اور اگر غیر مسلم کی حکومت کی طرف سے اس طرح کا نظام قائم نہ ہو پائے تو خود مسلمان باہمی اتفاق رائے سے کسی کو امیر منتخب کر لیں، جو ان کے لئے قاضی کا تقرر کرے اور شرعی ذمہ داریوں کو انجام دے، اگر یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم باہمی اتفاق رائے سے قاضی کا تقرر کر لیا جائے اور اتفاق رائے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر ہر فرد کو اتفاق ہو؛ کیونکہ یہ عملاً ناممکن ہے؛ بلکہ اُمت کے اربابِ حل وعقد کی اکثریت کا متفق ہونا کافی ہوگا۔

امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ کا قیام: مولانا نے سوچا کہ جس طرح بہار میں جمعیۃ علماء قائم کر کے پورے ملک کو روشنی دیکھائی گئی ہے، اسی طرح بہار میں امارت شرعیہ قائم کر کے پورے ملک کے سامنے کام کا یہ نقشہ پیش کیا جائے، چنانچہ ۲۳۔۲۴ر شعبان ۱۳۲۹ھ کے اجلاس جمعیۃ علماء بہار

(ضلع دربھنگہ) میں ''قیام امارت'' کی تجویز منظور ہوگئی اور انتخاب کیلئے ایک خصوصی اجلاس منعقد کرنا طے پا گیا، مولانا نے بہار و اُڑیسہ کے تمام ممتاز علماء اور ذمہ داران کے نام ایک مفصل خط لکھا، جس میں امارت کی اہمیت، شرعی حیثیت اور امیر کے اوصاف بیان کرتے ہوئے جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اس خط کے حرف حرف سے داعی کا دردِ دل ابھرا پڑتا ہے۔

وفات: آپ کی وفات ۱۷؍شوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸؍نومبر ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ**

(وہ جو بیچتے تھے دوائے دل صفحہ ۱۱۴۔ مولفہ مفتی خالد سیف اللہ رحمانی)

ف: ماشاء اللہ آپ کے حالات و کارنامے پڑھ کر بہت مسرت بلکہ بصیرت نصیب ہوئی اللہ، تعالیٰ ایسے لوگوں کو کثیر تعداد میں پیدا فرمائے تا کہ امت کو صحیح رہبری نصیب ہو جس کی اشد ضرورت ہے (مرتب)

حضرت مولانا احمد حسین رسول پوری اعظمیؒ المتوفی ۱۳۵۹ھ

نام ونسب: حضرت مولانا احمد حسین بن عبدالرحیم بن شیخ جمال الدین جمن بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو حنفی رسول پوری اپنے عہد کے علماء کبار میں سے تھے، ان کا خاندان عہد جہانگیری میں رسول پور آ کر آباد ہوا۔

ولادت: مولانا احمد حسین ۱۲۸۸ھ میں رسول پور میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت: ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد قریب کے گاؤں سریّاں میں حافظ شاہ نظام الدینؒ سے عربی وفارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، یہاں سے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور گئے جہاں اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوری سے نور الانوار، اور میبذی وغیرہ کی تحصیل کی اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی متوفی ۱۳۲۷ھ سے شافیہ، قطبی، تلخیص المفتاح اور سبعہ معلقہ وغیرہ کی تعلیم پائی، اس زمانہ میں مدرسہ چشمہ رحمت کے بعد دیار مشرق میں دوسرا علمی مرکز مدرسہ امامیہ حنفیہ جون پور تھا، جو مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری متوفی ۱۳۲۶ھ کی وجہ سے طالبین علوم کا مرجع بنا ہوا تھا، مولانا احمد حسین نے جون پور جا کر ۱۳۰۹ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مولانا ہدایت اللہ خاں صاحبؒ سے ملا حسن، ملا جلال، رسالہ میر زاہد مع حاشیہ غلام یحیٰ، حاشیہ بحر العلوم اور دیگر علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں پھر یہاں سے مدرسہ جامع العلوم کانپور گئے جہاں حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے علم وفضل کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا، آپ نے حضرت مولانا تھانویؒ سے ہدایہ، جلالین،

مشکوٰۃ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھیں اور کتاب وسنت میں ان سے خصوصی شرف تلمذ حاصل کر کے دینی علوم فقہ وحدیث میں سلسلۂ ولی اللہی سے منسلک ہوئے۔اس کے بعد مدرسہ عالیہ رام پور گئے جو نواب کلب علی اور نواب حامد علی خاں کے علمی قدردانی سے علوم وفنون کا مرکز بنا ہوا تھا، یہاں آپ نے مولانا عبدالحق خیرابادی، مولانا ظہورالحسن فاروقی رام پوری، اور مولانا وزیر علی رام پوری سے بقیہ کتابوں کی تعلیم وتحصیل کی اور ادب عربیت کی تعلیم مولانا شیخ محمد طیب عرب مکی سے حاصل کی اور عربی ادب شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ دیار مشرق میں عربی شاعری میں کوئی ان کی ہمسری نہ کرسکا۔

رام پور ہی کے قیام کے زمانہ میں مولانا حکیم محمد حسین خاں سے طب وحکمت کی تحصیل کی اور ان سے مطب میں نباضی حاصل کر کے طب کی سند لی، رامپور ہی میں فلکیات اور ریاضی میں بھی کامل مہارت حاصل کی، الغرض ۱۳۲۰؁ھ میں مروجہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل سے فارغ ہوکر روحانی واحسانی سلسلہ میں مولانا سید ضیاء النبی رائے بریلوی قدس سرہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

تدریسی خدمت: فراغت کے بعد مدرسہ مظہر العلوم کچی باغ شہر بنارس میں تعلیمی خدمت پر مامور ہوئے اور تین برس یہاں تعلیم دے کر اپنے بھائی کی طلب پر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں چلے گئے اور وہاں ۱۳۲۶؁ھ تک تدریسی خدمات انجام دی اور اسی سال میں اہل ڈھاکہ کی طلب پر آپ ڈھاکہ منتقل ہو گئے اور مدرسہ حسینیہ ڈھاکہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے درس وتدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے، وہاں سے علیحدگی کے موقع پر مدرسہ کے مہتمم نے آپ کے بارے میں یہ تاثرات تحریر کئے: آپ کے ترک تعلق پر ہم لوگ انگشت بدنداں ہیں اور بہت ہی

افسوس کے ساتھ آپ کو رخصت کرتے ہیں اور آج ہم لوگوں نے ایک قیمتی دولت کھودیا ہے جملہ ارکان مدرسہ آپ کے بہترین کارگزاری کی شہادت دیتے ہیں۔

اس کے بعد متعدد مدارس میں تعلیمی خدمت انجام دیتے ہوئے، اخیر میں انجمن اسلامیہ گورکھپور میں چھ سال تک صدر مدرس رہ کر ۱۳۵۷ھ میں وہاں سے مستعفی ہوگئے، یعنی ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۵۷ھ تک کامل ۳۷ سال تک مسلسل تعلیم تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور اسی کے ساتھ تصنیف وتالیف اور طبابت وحکمت کا سلسلہ بھی قائم رہا۔

تصنیف وتالیف: مولانا جملہ علوم وفنون میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے اور طب وحکمت میں تو مجتہدانہ شان کے مالک تھے، فن خطاطی کے بھی ماہر تھے، اپنی تصانیف کی طباعت کے وقت کتابت خود ہی کرتے تھے، نسخ اور نستعلیق کے بہترین کاتب تھے۔ آپ کی تصانیف کی فہرست بڑی طویل ہے جس میں متعدد کتابیں طبع ہوچکی ہیں مطبوعہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

تحفۃ الاحباء فی فضل المدینہ ومناقب سید الشہداء، یہ اسی نام کی ایک عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں مدینہ منورہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب درج ہیں ڈھاکہ میں اردو ٹائپ میں چھپی تھی۔ اس کے علاوہ آٹھ کتابوں کا ذکر فرمایا ہے۔ نویں کتاب دیوان احمد ہے۔ اور مولانا صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد یحیٰ نے ۱۳۷۷ھ میں بمبئی میں چھپوایا ہے، اس کے کل ۴۸ صفحے ہیں۔

وفات: آپ کی وفات مقام عظمت گڑھ اپنے بھتیجے مولوی عبدالمجید صاحب کے یہاں ۲۶ رجب ۱۳۵۹ھ میں ہوئی اسی روز شام کو چار بجے رسول پور کے اپنے آبائی باغ میں دفن کئے گئے۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ**۔ (تذکرہ علماء اعظم گڑھ: ۸۶)

حضرت مولانا شاہ معین الدین صاحب اجمیریؒ متوفی ۱۳۵۹ھ

نام ونسب: مولانا معین الدین، والد کا نام مولانا عبدالرحمن ہے جو کہ بلیا کے نومسلم راجپوت تھے اسی طرح والدہ بھی راجپوت خاتون تھیں۔

ولادت: آپ کی ولادت ۲۵ رصفر ۱۲۹۹ھ میں ریاست ٹونک میں ہوئی جہاں آپ کے والد مولانا عبدالرحمن سیکریٹری کونسل تھے۔

تعلیم وتربیت: باپ کے زیر سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں، بچپن ہی سے سعادت وفیروزمندی کے آثار نمایاں تھے، چنانچہ دولت وثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالب علموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی۔ قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب بہاری، ثم ٹونکی سے تلمذ کا رشتہ قائم کرایا۔ جملہ معقول ومنقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب ہی سے ہوئی، علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ صاحبؒ سے حاصل فرمایا، بائیس سال کی عمر میں علوم میں ایسا رسوخ ہوگیا کہ جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہے۔ اسی وقت سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق در جوق آنا شروع ہوگئے، اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگادیے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب، صاحبِ تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا،

آریوں کی طرف سے پنڈت داشنا نند جی بحث کر رہے تھے، مسلمانوں کی طرف بھی بڑے بڑے مناظر گفتگو کر رہے تھے، تین دن سے سلسلہ جاری تھا، جب مولانا کی باری آئی تو آپ نے رُوح، مادّہ پرمیشر کی قدامت کے سلسلہ میں حدوث وقدیم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف سات منٹ میں پنڈت جی لاجواب ہو گئے اور موافق ومخالف آپ کے تبحّر علمی کے قائل ہو گئے۔

مدرسہ کا قیام: ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا اور ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قائم کیا، سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا، اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپے ماہانہ اس کے لئے جاری فرمادیا، مولانا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا، ۱۳۴۳ھ میں کارپردازان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا، چنانچہ انہوں نے استعفیٰ دے کر محرم ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم فرمایا، اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوضِ علمی وعملی سے سرفراز فرمایا، یہ مدرسہ اب تک قائم ہے اور شہر کے غریب مسلمان اس کو چلا رہے ہیں، دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے علیحدگی کے باوجود اس کے اراکین، مدرسین، طلبہ اور دیگر متعلقین سے تعلق خوش گوار رہے ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر یہاں واپس لائے، لیکن

سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲/ مارچ ۱۹۳۸ء کو بحکم سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہوگئے، لیکن اس علیحدگی کے بعد حلقۂ درس پوری آب وتاب کے ساتھ قائم رہا۔

تصنیف وتالیف: اس زمانہ درس وتدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے، چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتد بہ ذخیرہ چھوڑا ہے، جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہوسکا ہے،

عملی خدمات: یہ تھی مولانا کی علمی زندگی! عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدہا بدعات کا خاتمہ کیا، اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں باوجود مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریکِ خلافت میں مذہبی فتویٰ کے جرم میں دوسال کی قیدوبند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادرانؒ نے قدم چوم لئے، جس زمانہ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمدؒ سعید ناظم جمعیۃ العلماء قیدونظر بندی کی تکلیف اٹھارہے تھے، اس وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائل حاضرہ پر تقریر فرماتے، جمعیۃ العلماء کے اجلاسِ امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے، صوبہ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا، تحریکِ کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار السلام کے ڈائرکٹر رہے، مسلمانوں کے سوا برادرانِ وطن بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

مکارمِ اخلاق: استغناء، رجوع الی اللہ، توکل، وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن

چکے تھے، آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلاً نہ زندگی کے تھے، فرائض تعلیم افتاء اور رشد وہدایت کی ادائیگی کے بعد کبھی لوگوں میں بلاضرورت نہ ٹھہرتے، اربابِ دولت، اہل دنیا، خصوصاً امراء وحکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے، لیکن جب کوئی خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اپنے قلب میں مولانا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لے کر واپس جاتا۔

عبادت: عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے، تادمِ واپسیں اپنے اوراد و اشغال میں فرق نہ آنے دیا، حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرتے تھے، اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دوچار ہوئے لیکن اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کیا اور ہمیشہ وہی کیا جو ایک مجاہد اور ربّانی عالم کو کرنا چاہئے۔

حب رسولؐ: ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبّت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضورؐ کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں، "**یا ابتاہ**" (اے میرے باپ) سرکار دو عالمؐ نے فرمایا "**لَا کَرْبَ عَلٰی اَبِیْکَ بَعْدَ الْیَوْم**" (آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے) تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہوجاتے، آنسو نکل آتے، چیخ نکل جاتی، بسا اوقات غشی طاری ہوجاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

طلبہ سے محبت: طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے، ہونہار طالب علم مولانا کا مرکز توجہ بن جاتا تھا، ہر سال موسم بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو

اجمیر کی اصطلاح میں ’’گوٹ‘‘ کہتے ہیں، منعقد ہوتا، اس جلسہ میں ہر مُلک کے طلبہ کے مروجّہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا، مولانا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے، بیت بازی ہوتی، اس میں ایک فریق کی طرف مولانا بھی ہوتے، آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا، اس لئے کہ مولانا کو اردو و فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے۔

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا کہ مولانا کو ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے، لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا باقی پوری رقم طلبہ، سامان تعلیم اور نادر کتاب کی فراہمی پر صرف کردیتے تھے، کتاب کتنی ہی قیمتی ہو لیکن امکان بھر اس کو ضرور خریدتے، خواہ دوگنی، سہ گنی قیمت ادا کرنے پڑتی، مگر بہتر نسخہ خریدتے، قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے، کلکتہ کے بہترین کارخانوں میں بھیج کر اعلیٰ قسم کی جلد بندھواتے تھے۔

۵؍محرم الحرام ۱۳۵۷ھ کو ایسا بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے، دل، دماغ البتہ صحیح رہے اور اس حالت میں بھی سلسلہ درس وتدریس جاری رہا، وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے۔

وفات: ۱۰؍ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عاشورہ کے دن علم وفضل وکمال، مجاہدہ استقامت اور تقویٰ وطہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصہ دراز تک خالی رہے گی، **انّا للہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجعوْنَ**۔ خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین ہوئی، قبر میں اتارتے وقت در ودیوار اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا۔ رحمہ اللہ ونور اللہ مرقدہ۔ (یادرفتگاں ۱۹۶ مؤلفہ سید سلیمان ندویؒ)

حضرت مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوریؒ متوفی ۱۳۵۹ھ

نام ونسب: مرحوم جونپور کے ایک مشہور علمی خاندان کے فرد تھے، ان کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب، مولانا شاہ عبدالحیٔ صاحب دہلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کے فیض یافتہ اور پورب میں توحید وسنت کے سب سے بڑے داعی اور اس دور میں اسلامی علوم فنون کے بہت بڑے مدرس تھے، جونپور میں بیٹھ کر تن تنہا سینکڑوں علمائے دین پیدا کئے اور پورب کے خطہ میں ان کو جگہ جگہ پھیلا کر اس نازک موقع پر اسلام کی مورچہ بندی کی، اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں وفات پائی، راقم (سید سلیمان ندوی) کو بھی فخر حاصل ہوا ان کے دادا کے حقیقی بھائی کی مجلس درس سے مستفیض ہونے کا۔

مولانا کا پورا خاندان اس وقت سے اب تک علمائے دین کا خانوادہ ہے، جس کی سعی وکوشش نے پورب کی سرزمین کو بڑا فیض پہنچایا، مولانا مرحوم نے نیچے کی تعلیم گھر میں پا کر مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری سے قریب مدرسہ احمدیہ آرہ جا کر بقیہ علوم کی تحصیل کی اور واپس آکر اپنے خاندانی مدرسہ کے اہتمام وانتظام کا اور ساتھ ہی ملک کے مختلف گوشوں میں جا کر ہدایت وارشاد کا کام انجام دینا شروع کیا۔

موصوف سے میری ملاقات ۱۹۳۰ء میں تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں ہوئی۔ یہ ملاقات دوستی اور دوستی سے اتحاد کی اس منزل تک پہونچ گئی، جس کے بعد خیال کی دوئی کا کوئی مرتبہ نہیں رہتا، ایک دفعہ میں نے کہا اور انہوں نے مانا تھا

کہ ایک مذہب ہے جس کے دو ہی پیرو ہیں، ایک وہ اور ایک میں، مقصود تقلید وعدم تقلید کے مسائل میں اعتدال سے تھا، جب ان کے مرنے سے دو ہفتہ پہلے میں جونپور ان کی عیادت کو گیا، تو زبان سے ٹھیک طور پر بول نہ سکے، مگر غیر مفہوم آواز میں دو انگلیوں کو اٹھا کر اپنی طرف اور میری طرف اشارہ کیا، کیسا حسرتناک منظر تھا، چلتے وقت کا سلام اور فی امان اللہ اور فی حفظ اللہ کا ابدی پیام!

مکارم اخلاق: میں نے علماء میں ایسا شریف، ایسا نیک باطن، ایسا دور اندیش، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج، اس پر ایسا مستقل مزاج، خوش اخلاق، شیریں گفتار، باغ و بہار، ایسا خشک اور ایسا تر آدمی نہیں دیکھا، ایسا متقی و پرہیزگار اور ساتھ ہی ایسا وسیع المشرب اور وسیع اخلاق وہ مذہبی تھے اور سخت مذہبی، لیکن وہ بھی ان کو مانتے تھے جو مذہب کو نہیں مانتے تھے، وہ بے دینوں میں بھی ایسے ہی پیارے تھے جیسے دینداروں میں اور یہ ان کے حسن اخلاق کی بڑی کرامت تھی۔

۱۹۲۵ء سے لیکر ۱۹۴۰ء تک پندرہ برس مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات رہے، اس عرصہ میں کئی انقلاب آئے مگر وہ اپنی جگہ پر تھے، ساتھ ہی ان کے جبہ و دستار کی شان میں وہ بلندی رہی کہ پینٹ اور ہیٹ والے ان کے آگے جھک جھک جاتے تھے، مگر اس میل جول اور نرمی و نرم خوئی میں حق کے خلاف کوئی بات سن کر چپ نہیں رہ سکتے تھے، غرض وہ اپنے علم و عمل میں پہاڑ اور اخلاق و کرم میں بہتے پانی کی طرح تھے۔

نئے تعلیم یافتوں بلکہ نئی تعلیم کے اصل مرکز میں مذہبی وقار کو سلامت رکھنا کوئی آسان کام نہیں، انہوں نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا تھا، ان کا فضل وکمال کسی خاص علم وفن میں محدود نہ تھا، یہاں تک کہ حدیث وفقہ وتفسیر سے آگے

بڑھ کر شعروشاعری اور ریاضیات تک سے ان کو یکساں دلچسپی تھی، ان کی سادگی کو دیکھ کر کسی کو ان کی اس گہرائی کا یقین نہ آتا تھا اور ان کی اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی اس سادگی پر سب کو تعجب ہوتا تھا، اس قدر سادہ اور اس قدر رنگین!

وہ آکلہ (کینسر) کے مرض میں جس سے ایک طرف کا پور ار خسار اور جبڑا آدھے منہ تک خالی ہو گیا تھا، دو ڈھائی برس تک ہر قسم کی مصیبت اور ہر طرح کی تکلیف جھیلتے رہے اور اس طرح مدت میں ایک دفعہ بھی بے صبری کی آہ اور تکلیف کی کراہ ان کے منہ سے نہیں نکلی، کوئی نماز ترک نہیں ہوئی اور صبر و شکر کا دامن ایک لمحہ کے لئے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، دیکھنے والے ان کی حالت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے اور وہ ہاتھ اور زبان کے اشاروں سے صبر واستقلال کی نصیحت کرتے تھے۔

آہ! کہ فضل وکمال کا یہ پیکر حسن واخلاق اور شرافت کا یہ پتلا دینداری اور پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع اور خاکساری کا یہ سراپا، صبر و استقلال کا یہ مجسمہ ساٹھ برس دنیا کی نیرنگی کا تماشہ دیکھ کر دنیائے رنگ وبو سے مٹ گیا۔

وفات: افسوس ہے کہ مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری نے دو ڈھائی برس کی سخت علالت کے بعد اپنے وطن جونپور میں ۲۳ر شعبان ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۴۰ء کی رات کو ۳ بجے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**

بعد از وفات تربت مادر زمین مجو   در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

جانے والے جا! رحمت الٰہی تیری منتظر اور مغفرت الٰہی تیرے لئے چشم براہ ہوگی رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ اکتوبر ۱۹۴۰ء۔ (یادرفتگاں ص ۲۱۰)

حضرت مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوریؒ المتوفی ۱۳۶۰ھ

نام ونسب : نام محمد مصطفیٰ، آپ کے والد ماجد مردان علی صاحب بڑے عہدے دار اور خطاب یافتہ کارگذار اور اس کے ساتھ ہی نہایت دیندار بھی تھے۔ اپنے سب صاحبزادوں کو بجائے انگریزی کے عربی کی تعلیم دلائی۔

تعلیم : جناب حکیم صاحب کی استعداد علمی بہت اعلیٰ پایہ کی تھی۔ حضرت والا کے مواعظ کو تقریر کی روانی کے وقت بھی بلا تکلف قلم برداشتہ عربی عبارت میں ضبط کرتے جاتے تھے۔ کیونکہ عربی الفاظ جامع اور مختصر ہوتے ہیں۔ پھر بعد میں اس کی اردو کرتے تھے۔ آپ نے مناجات مقبول کا ایسا نفیس اور معنیٰ خیز اردو ترجمہ کیا ہے کہ حضرت تھانوی اس کی اکثر تعریف فرماتے تھے نیز یہ بھی فرماتے تھے کہ اپنے ذہن میں اس کے کسی فقرہ کا ترجمہ سوچا۔ پھر حکیم صاحب کے ترجمہ سے ملایا تو ہمیشہ حکیم صاحب کے ترجمہ کو بڑھا ہوا پایا۔

سب سے پہلے حضرت تھانوی کے مواعظ کو آپ ہی نے قلمبند کرنا شروع کیا تھا جو امت مرحومہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ثابت ہوئے۔ آپ نے حضرت تھانویؒ کی مشہور تصنیف **الا لتبا هات المفيده عن الا ستبا هات الجديدة** کی جو نوتعلیم یافتہ حضرات کے شبہات کے رد میں لاجواب کتاب ہے، ایک نہایت نفیس شرح بھی تحریر فرمائی جس سے آپ کی قابلیت اور علوم عقلیہ میں مہارت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ آپ نے حضرت والا کے رسالہ

''شوق وطن'' کی بھی تسہیل فرمائی ہے۔

فن طب مین کمال: آپ فن طب کے ماہر تھے اور میرٹھ کے ایک مشہور حاذق طبیب تھے، اور بہت سے نافع اور عجیب وغریب مرکبات کے موجد تھے۔ آپ نہایت لطیف الطبع اور ذکی الحس تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات کسی کے نقش تحریر ہی سے اخلاق اور مزاج کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور فاسق ومتقی کے قاروروں میں فرق کر لیتے تھے بہشتی زیور کے حصہ نہم میں اور بہشتی گوہر میں سب اصناف امراض کے متعلق اپنے خاص خاص مجربات کو بے دریغ تحریر فرما کر اور نہایت مفید معالجات وتدابیر طبیہ درج فرمائی۔ آپ اس کے علاوہ ''معمولاتِ اشرفیہ'' ''مجالس الحکمت'' ''امثال عبرت'' وغیرہ کے بھی مصنف ہیں۔ حضرت والا کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپ کو تقویٰ کا بہت ہی اہتمام تھا، اور دقیق دقیق شوائب نفس پر نظر رہتی تھی۔ صدق وخلوص آپ کا شعار اور عبدیت وانکسار آپ کا حال تھا۔ سفر حج میں موٹر چلانے والے نماز کے وقت جب کسی طرح موٹر روکنے پر راضی نہ ہوئے تو حکیم صاحب چلتی موٹر سے کودنے پر تیار ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کی شان موٹر میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی اور اسے خود بخود رکنا پڑا۔ آپ کارہائے خیر کے بے حد حریص تھے اور مساکین کا نہایت توجہ کے ساتھ مفت علاج کرتے تھے، نیز اپنے آشنا (جان پہچان) عازمین حج کو سفر میں کام آنے والی دواؤں اور بعض دیگر کارآمد اشیاء مثلاً سمت قبلہ معلوم کرنے کا نقشہ وغیرہ اکثر ہدیۃً عطا فرماتے تھے، بڑی عمر میں کلام پاک حفظ فرمایا اور حافظوں کو لقمہ دینے میں خاص طور سے ماہر تھے۔ غرض آپ کی ذات والا صفات مجموعۂ کمالات جلیلہ اور مخزن اوصاف جمیلہ تھی۔

حکیم الامتؒ سے عقیدت : حکیم صاحب کو حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ سے کس قدر عشق اور عقیدت تھی اس کا اندازہ حضرت تھانویؒ کے اس سفر کی روئیداد کے ابتدائی فقروں سے ہوتا ہے جس کو خود حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قلم بند کیا۔ انہوں نے تحریر فرمایا ''احقر محمد مصطفیٰ بجنوری عرض رسا ہے کہ مدت دراز سے خاکسار کو یہ تمنّا تھی کہ کسی موقع پر اپنے پیرو مرشد زبدۃ المحققین مجدد الملۃ والدین حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب مدظلہ کے ساتھ طویل سفر کرے تا کہ حضرت والا کے اخلاق ومعاملات ومعاشرت ومعمولات سے استفادہ کر سکے مگر اس آرزو کے پورا ہونے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانع موجود رہا۔ اتفاقاً ماہ محرم ۱۳۳۵ھ میں بروقت تشریف آوری حضرت والا کے میرٹھ میں احقر نے یہ خواہش ظاہر کی۔ فرمایا بہت قریب ایک سفر گورکھپور ہونے کو ہے اگر چلنا ہے تو یہ موقع ہے اور خرچ سفر تیرا ہمارے ذمہ۔ احقر کو جو خوشی ہوئی بیان نہیں کر سکتا اور باوجود کثرت علائق اور بعض خاص عوائق کے تہیہ کر لیا اور تاریخ ۱۹ رصفر ۱۳۳۵ھ کو میرٹھ سے مراد آباد پہنچ کر حضرت کے ہم کاب ہو گیا۔

جن لوگوں نے حضرت والا کی صحبت اٹھائی ہے یا ایک دفعہ بھی زیارت کی ہے وہ بخوبی اس بات کی تصدیق کریں گے کہ حضرت والا کی ذات بابرکت کو حق تعالیٰ نے سچ مچ حکیم الامت بنایا ہے اور حضرت والا کا کوئی فعل وقول بلکہ ادنیٰ حرکات وسکنات بھی حکمت سے خالی نہیں ؎

اے قبائے راہنمائی راست بر بالائے تو
علم و حکمت را شرف از گوہر والائے تو

احقر کا ارادہ خود ہی پہلے سے تھا کہ اس سفر کے تمام واقعات وملفوظات قلم بند کرے اور اس مقصد سے بعض حمیم (مخلص دوست) حضرات مثل خواجہ عزیز الحسن صاحب اور میر معصوم علی صاحب کی فرمائش نے اور بھی موکد کر دیا اور کاغذ وپنسل کافی مقدار میں ہمراہ لے لیا اور تمام سفر میں اسی کے سر رہا کہ حتی الامکان قلم کسی ملفوظ اور واقعہ کو قلمبند کرنے سے نہ چھوڑے۔ اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے ہر وقت کاغذ پنسل ساتھ رہتا۔ افسوس ہے کہ قلم زبان کا پورا ساتھ نہیں دے سکتا ورنہ ایک لفظ بھی حضرت والا کا ضائع نہ جانے دیتا۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا ''حکیم محمد مصطفیٰ میرٹھی کہتے ہیں کہ میں قارورہ دیکھنے سے مومن وکافر، فاسق اور متقی میں امتیاز کر لیتا ہوں۔ نیز نبض سے بے نمازی ہونے کا ادراک ہو جاتا ہے۔ نیز خط کے الفاظ سے کاتب کی حالت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ کس حالت میں اس نے خط لکھا ہے۔

حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری صاحب نے ایک مرتبہ خواب دیکھا جو رسالہ ''صدق الرویاء'' سے نقل کیا جاتا ہے۔ ''بندہ نے ایک خواب ۳؍اکتوبر ۱۹۰۱ء کو یعنی رجب ۱۳۱۹ھ میں جبکہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے قیام خانقاہ کا ابتدائی زمانہ تھا بمقام مراد آباد دیکھا کہ حضرت والاؒ خانقاہ تھانہ بھون میں جنوب کی جانب طلبہ کو درس دے رہے ہیں اور تہجد کا وقت ہے۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ عجب سہانا وقت ہے اتنے میں صبح صادق ہوئی طلبہ سبق ختم کر کے نماز کی تیاری کے لئے نکلے ان کے منہ سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔ بندہ نے عرض کیا کہ ان حضرات کے واسطے کوئی معجون مقوی کیوں نہ بنائی جائے۔ حضرت والا نے فرمایا۔ ان کے

واسطے معجون مشائین بنائی گئی ہے بس میری آنکھ کھل گئی'' یہ خواب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کو لکھا گیا تو آپ نے یہ جواب لکھا۔

''مشفقم سلمہم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' خواب بہت اچھا ہے۔ یہ خوشبو علم وذکر کی ہے جس میں بندگان خدا یہاں مشغول ہیں۔ مشائین سے مراد سالکین ہیں۔ مشی اور سلوک کے معنیٰ متقارب ہیں۔ آپ نے اپنے کو ان میں شامل دیکھا آپ کیلئے بھی بشارت عظمیٰ ہے'' والسلام۔

بیعت وخلافت: حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں ''حکیم صاحب حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے شاگرد بھی تھے، مرید بھی۔ پھر خلافت سے سرفراز ہوئے ان کی علمی قابلیت رسالہ ''حل الانتباہات'' سے ظاہر ہوئی جو حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے مختصر رسالہ انتباہات کی شرح ہے۔ حضرت قدس سرہٗ کا رسالہ ایک جزء سے زیادہ نہیں مگر حکیم صاحب کا رسالہ کئی سو صفحات سے متجاوز ہے۔ اس رسالہ میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے شبہات کا جواب ہے حکیم صاحب اگر طب کا مشغلہ اختیار نہ کرتے تو بڑے بڑے علماء کے ہمسر ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فہم وفراست عطا فرمائی تھی اور اس کے ساتھ تقویٰ کی دولت سے بھی نوازے گئے تھے۔ مکائد نفس پر بڑی گہری نظر تھی۔ تربیت السالک میں آپ کے خطوط کے جوابات حضرت حکیم الامت نے بڑی تفسیر سے دئے ہیں۔ ایک طویل مکتوب کا نام بھی مستقل رسالہ کی صورت میں غالباً ''الشفالاہل الاصطفاء'' تجویز فرمایا ہے۔ (بزم اشرف کے چراغ)

حضرت مصلح الامتؒ سے سنا ہوا واقعہ

حضرت حکیم مصطفیٰ صاحب کا ایک واقعہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے سنا ہوا یاد آیا وہ یہ کہ جب حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سفر میں آپ کی معیت کی اجازت طلب فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ آپ کو اجازت ہے مگر تخمین وجزاف سے کسی موقع پر کام نہ لیجئے گا۔

اس طرح سفر شروع ہوا کہ بعض موقع پر حضرت حکیم صاحب سے اس عہد و پیمان کے خلاف عمل صادر ہوا تو حضرت حکیم الامتؒ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہئے حکیم صاحب! یہ عہد تخمین وجزاف کے خلاف ہوا یا نہیں؟ فرمایا یقیناً ہوا اب انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا۔ مگر پھر دوبارہ سہ بارہ پورے سفر میں ہوتا رہا اور حضرت حکیم الامتؒ اسی طرح اس پر نکیر فرماتے رہے، یہ تھا حضرت حکیم الامتؒ کا طریقۂ اصلاح کہ بڑے سے بڑے شخص کی ایسی لغزشوں پر ضرور تنبیہ فرماتے تھے، جس کی وجہ سے طالبین وصادقین آپ کے خانقاہ سے کندن بن کر نکلے، اور دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بنے۔ **ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔**

اسی قسم کا دوسرا واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ ایک عالم نے حضرت حکیم الامتؒ سے درخواست کی کہ آپ اپنی خدمت میں قیام کی اجازت مرحمت فرمائیں تو فرمایا کہ اجازت ہے، مگر اثنائے قیام میں مخاطبت ومکاتبت کی اجازت نہ ہوگی، انھوں نے تسلیم کیا۔ مگر ایک مرتبہ حضرت حکیم الامتؒ کی مجلس خاص میں علماء کے درمیان کسی علمی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی، سبھی لوگ اپنی اپنی رائے پیش کر رہے تھے، اتنے میں وہ عالم صاحب جن سے معاہدہ تھا بول پڑے، تو حضرت حکیم الامتؒ

نے فوراً نکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو معاہدہ کے خلاف آپ نے کیا، تو انھوں نے کہا کہ حضرت بھول گیا تھا، تو فرمایا ایسا نہیں ہے، لہذا آپ یہاں سے چلے جایئے، تو فرمایا کہ حضرت مجھے معاہدہ یاد تھا مگر میں نے دیکھا کہ علماء علمی بحث ومباحثہ فرمارہے ہیں، اگر میں کچھ نہیں بولوں گا تو مجھے لوگ جاہل سمجھیں گے۔ تو حضرت حکیم الامتؒ نے ارشاد فرمایا کہ اب صحیح بات آپ نے کہہ دی اس لئے بیٹھ جایئے۔

یہ تھی حضرت حکیم الامتؒ کی اصلاح وتربیت کے باب میں حکمت ودانائی جس کی وجہ سے امت میں آپ حکیم الامت کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ایک اور واقعہ حضرت حکیم الامتؒ کی اصلاح وتربیت کے باب میں آپ کے اعتدال وتوسط پر شاہد ہے جس کو اس حقیر نے حضرت مصلح الامتؒ سے سنا ہے وہ یہ ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ نے کسی عالم کے اندر کسی باطنی مرض کی تشخیص فرمائی اور علاج یہ تجویز فرمایا کہ اس مرض کو کسی کاغذ پر لکھیں کہ یہ مرض میرے اندر موجود ہے اس لئے آپ لوگ اس مرض سے شفا کے لئے دعا کریں اور خانقاہ کے صدر دروازے پر اس کو چسپاں کریں۔

چنانچہ حسب ارشاد انھوں نے کاغذ پر لکھ لیا اور گوند لگا کر چسپاں کرنے کے لئے جارہے تھے کہ یکا یک یہ بات حضرت مولانا شبیر علی تھانوی جو حضرت حکیم الامتؒ کے حقیقی بھتیجے تھے ان کو معلوم ہوئی تو وہ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ ابا جان! آپ نے جو فلاں عالم میں خاص

مرض کولکھ کرصدر دروازے پر چسپاں کرنے کا حکم فرمایا ہے تو کیا اس سے ان کی اصلاح مقصود ہے یا ان کی تذلیل؟ تو حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ نہیں، ان کی اصلاح مقصود ہے تو فرمایا کہ جب انھوں نے کاغذ پر گوند لگا دیا اور چسپاں کرنے کے لئے جا رہے ہیں تو کیا اب بھی ان کی اصلاح نہیں ہوگئی، تو حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا یقیناً اصلاح ہوگئی، لہذا ان کو اس سے منع کردو۔ چنانچہ ان کو اس سے روک دیا۔

ف: سبحان اللہ! اس سے حضرت حکیم الامتؒ کی حقیقت شناسی و دانائی کی کیسی شان ظاہر ہوتی ہے جو سویدائے قلب میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ (مرتب)

وفات: آپ کی وفات ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا ابو السعد احمد خان صاحب پاکستان متوفی ۱۳۶۰ھ

نام و خاندان: احمد خان اور کنیت ابو السعد ہے۔ سلسلہ نسب اس طرح ہے، احمد خان بن ملک مستی خان بن ملک غلام محمد بن ملک فتح محمد، قوم راجپوت۔

ولادت باسعادت: حضرت موضع بکھڑا، تحصیل میانوالی ضلع بنوں پاکستان میں آپ کی ولادت ۱۸۸۰ء ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔ چونکہ ملک صاحب مرحوم مولانا غلام محمد صاحبؒ سے عقیدت مندانہ ربط و ضبط رکھتے تھے اس لئے عالم صغیر سنی ہی میں حضرت والا کو ان کے دوسرے بھائی ملک محمد خان صاحب کے ساتھ حضرت مولانا غلام محمد صاحب کی خدمت میں لے گئے اور دونوں کے لئے دعا کی درخواست کی۔ حضرت مولانا نے صاحبزادہ احمد خان کے حق میں علوم ربانیہ کے حصول کی دعا کی اور ملک صاحب سے فرمایا اس بچہ کو علم دین سکھانا یہ اس کے قابل ہے۔

تعلیم: آپکا خاندان زمینداروں اور ملکیوں کا خاندان تھا لیکن دنیا داری کے ساتھ ساتھ دینداری کا بھی چرچا تھا۔ تعلیم قرآن کا آغاز بکھڑے کے مسجد ہی میں ہوا، جہاں ایک امام مسجد تعلیم دیا کرتے تھے قرآن مجید انہی سے پڑھا۔

تحصیل علم کے لئے ہندوستان کا سفر: بندھیال میں آپ عربی کی متوسطات تقریباً پڑھنے کے بعد تکمیل علم کیلئے ہندوستان چلے گئے، پہلے مرادآباد پہنچے وہاں کچھ عرصہ مدرسہ شاہی میں پڑھا، پھر وہاں سے کانپور تشریف لے گئے

یہاں مولانا احمد حسین صاحب کانپوری اور مولانا عبید اللہ صاحب بکھڑوی تعلیم فقہ وحدیث دیتے تھے ان حضرات سے آپ نے تکمیل دورۂ حدیث فرمائی۔

تکمیل سلوک: غرض حضرت والا عربی و فارسی علوم کے جامع اور قرآن وحدیث کے انوار سے مستنیر اپنے وطن جالون بکھڑا مراجعت فرما ہوئے۔ معقول ومنقول کی تکمیل کے بعد قلب روح کا طائر بلند نظر عالم قدس کی فضا میں سیر کے لئے آمادہ پرواز ہوا۔

آپ بند ھال زمانۂ طالب علمی میں حضرت سید پیر زادشاہ قدس سرہ سے بیعت ہوئے انکی رحلت کے بعد حضرت خواجہ محمد عثمان قدس سرہ کی خدمت میں تجدید بیعت کی درخواست کی مگر انہوں نے کچھ نصیحتیں فرما کر بیعت نہیں فرمایا کہ بعد میں بیعت کریں گے، لیکن شعبان المعظم ۱۳۱۴ھ میں انتقال فرما گئے اس کے بعد حضرت خواجہ سراج الدین سے تجدید بیعت فرمائی۔

شیخ سراج الدین قدس سرہ کی خصوصی توجہ: حضرت خواجہ سراج الدینؒ آپ کو سرگرم طلب دیکھ کر ہمیشہ کرم نوازی فرماتے۔ اور آپ پر دامان رافت ورحمت کشادہ رکھتے تھے۔ جس قدر آپ کی طلب روز افزوں ہوتی جاتی تھی۔ اسی قدر حضرت خواجہؒ کی طبیعت میں گرمی اور جوش بڑھتا تھا۔

خلافت: جب آپکا سلوک ہر لحاظ سے مکمل ہوگیا تو حضرت خواجہ آپکو سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اور دیگر تمام سلاسل ولایت میں مجازِ مطلق قرار دے دیا۔ ابھی تک آپکا قیام اپنے آبائی مسکن موضع بکھڑے ہی میں تھا کہ رجوع خلق عام ہوگیا اور اہل طلب آپ سے بیعت ہوکر فیوضات طریقہ پاک سے بہرہ ور ہونے لگے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی نظر میں حضرت کی قدرومنزلت: علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے قرآن عزیز کی تفسیر لکھی تھی جو مدینہ پریس بجنور سے طبع ہوئی یہ تفسیر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ پر ہے البتہ اس میں سورۂ نساء تک تفسیر حضرت شیخ الہندؒ کی تحریر کردہ ہے۔حضرت نے اس تفسیر کے مطالعہ کے بعد علامہ عثمانیؒ کی خدمت میں ایک گرامی نامہ ارسال فرمایا۔جس میں تحریر کیا کہ آپ نے یہ تفسیر لکھکر اہل اسلام پر ایک احسانِ عظیم فرمایا ہے اور میں تہجد کی نماز پڑھکر روزانہ آپکی درازی عمر کی دعا کرتا ہوں کہ یہ علمی فیضان آپ کی ذات سے برابر جاری رہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کا مکتوب: بخدمت گراں مکرم و معظم جناب مولانا صاحب دامت برکاتہم بعد سلام مسنون آنکہ مدت ہوئی والا نامہ پہنچا تھا میں مشغول بہت رہا، پھر علیل ہوگیا آنکھوں میں تکلیف تھی۔جس سے نوشت وخواند کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔الحمد للہ افاقہ ہے۔آپ جیسے بزرگوں کی نظر عنایت اور دعوات صالحہ کا امیدوار ہوں۔اگر میری کتاب اور فوائد قرآن سے جناب کو دلچسپی ہوئی اور آپکی نگاہ میں پسندیدہ ٹھہری تو میں اس کو اپنے لئے اور کتاب کے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں،شاید وہاں بھی حق تعالیٰ توشہ آخرت بنادے حسن خاتمہ کیلئے دعا فرما کر بندے کو ممنون فرمائیں۔

(از ڈابھیل ضلع سورت یوم عاشورہ ۱۳۵۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۳۸ء)

آپ امام نقشبندیہ ہیں: آپ کے علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے بہت قریبی مراسم تھے آپ ایک مرتبہ ان کی ملاقات کیلئے دیوبند تشریف لے گئے۔دیوبند میں قیام کے دوران ایک روز حضرت علامہؒ نے اثنائے گفتگو

حضرت سے یہ فرمایا کہ مولانا حدیث شریف کا درس دیتے ہوئے مجھے کبھی کبھی حلقہ درس میں عفونت کا احساس ہوتا ہے جبکہ پیشتر درس کی فضا لطافت و پاکیزگی سے معمور ہوا کرتی تھی۔ حضرت نے شاہ صاحب قبلہ سے اگلے روز فرمایا کہ آپ کے درس میں بعض طلباء کا بے وضو اور ناپاک حالت میں شریک ہونا آپ کے اس احساس اور ناگواری کا باعث ہے تحقیق کرنے پر حضرت کا ارشاد درست نکلا۔ چنانچہ حضرت علامہ نے حضرت کے اس ارشاد کو اپنے ہم عصر علماء کے سامنے پیش کر کے بے حد تعریف کی اور فرمایا کہ حضرت مولانا احمد خان صاحب اس وقت سلسلۂ نقشبندیہ کے امام اور عارف کامل ہیں۔

فضل و کمال: حضرت کے کمالات و فضائل، حسن تلقین و موعظت، تربیت سالکین میں کمال دل سوزی، اتباع شریعت میں کامل رسوخ، بدعات سے اجتناب کی ترغیب، فرقہ بندی سے بیزاری علوم دینیہ خصوصاً تفسیر قرآن سے انتہائی شغف تحقیق و تدقیقِ مسائل میں نہایت جانفشانی، درویشوں کی ہمہ جہت نگرانی، ان کی ظاہری و باطنی اصلاح میں پوری تندہی، کتابوں سے عشق، ان کی آرائش کا شوق، استغنائے تام اور اخفائے کمال، یہ اور دوسرے بے شمار اوصاف حسنہ اور ان سے متعلق واقعات اس قدر ہیں کہ انہیں حیطۂ تحریر میں لانا زبان قلم کے بس کی بات نہیں۔

وفات: افسوس صد افسوس کہ ۱۲ رصفر ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۴ رمارچ ۱۹۴۱ء کو یہ آفتاب علم وعرفان عمر کی ۶۳ رمنزلیں طے کر کے کانپور کے افق میں غروب ہوگیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون، نور اللہ مرقدہ۔ (بیس مردان حق، مؤلفہ مولانا عبدالرشید ارشد:۵۱۶)

حضرت الشیخ سید علی محفوظ حسنی مصری م ۱۳۶۱ھ

نسب وتعلیم: آپ کا نسب حضرت سیدنا حسن ابن علی رضی اللہ عنہما تک پہونچتا ہے، آپ طنطا غربیہ میں پیدا ہوئے اور وہیں قرآن پاک کا حفظ کیا اور بعض متون کو بھی یاد کرلیا۔ ۱۳۰۶ھ میں طنطا کے جامع احمدی میں داخلہ لیا اور دس سال رہ کر کبار شیوخ سے تجوید اور دوسرے علوم حاصل کئے، اس کے بعد ۱۳۱۷ھ میں مصر آئے اور ازہر میں داخلہ لیا، وہاں آپ کی طبیعت حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کی طرف مائل ہوئی جبکہ اس سے قبل آپ شافعی المذہب تھے، وہاں بہت سے علمائے کبار سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، خصوصاً شیخ محمد عبدہؒ سے۔

۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں عالمیت کی سند حاصل کی، اس کے بعد خدمت تدریس میں مشغول ہوگئے، اور ۱۹۱۸ء میں ازہر میں وعظ وارشاد کا شعبہ قائم فرمایا، اور اس میں پوری جدوجہد اور محنت صرف کی جس کی وجہ سے ان کی حیات ہی میں رشد وہدایت کے بہترین داعی پیدا ہوگئے۔

آپ کا محبوب مشغلہ: دعوت وتبلیغ آپ کا محبوب مشغلہ تھا اس لئے کہ آپ نے اپنی فکر روشن سے جب علم وعلماء کو دیکھا تو محسوس فرمایا کہ اب اس کی مثال بالکل مخصوص کارخانوں جیسی ہوگئی ہے اس لئے اس کا اثر بس علماء وطلبہ ہی تک

آپ کے مختصر حالات آپ کی تصنیف ''الابداع فی مضار الابتداع'' میں درج ہے، اسی سے اقتباس کرکے نہایت اختصار سے آپ کے حالات پیش خدمت ہیں۔ (مرتب)

محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ ازہر کو بھی اسی راہ پر پایا جس کی وجہ سے امت کی اکثریت رشد و ہدایت کے نور سے محجوب ہوچکی ہے اس لئے آپ نے اپنے نفس سے عہد و پیمان لیا کہ سلف صالحین کے طریقہ کو زندہ کرے گا اور مصریوں کے تمام قبیلوں اور طبقوں کے درمیان صحیح دعوت اور رشد و ہدایت کے نشر و اشاعت کے لئے کھڑا ہوگا۔

چنانچہ آپ نے وعظ و ارشاد کی بنیاد رکھی اور اس قدر اخلاص اختیار فرمایا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا پھر اس کے ساتھ ساتھ آپ کا ایمان قوی بھی شامل ہوگیا اور یہ مبارک مجموعہ آپ کے قلب کریم اور نفسِ طیبہ، راضیہ میں جاگزیں ہوگیا، پس آپ نے اس قلب سلیم کے ساتھ دعوت الی اللہ کا جھنڈا بلند فرمایا اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مستعد ہو گئے جس کے اثرات ازہر کے علماء و طلبہ میں چمکنے لگے اور وعظ و ارشاد کا مستقل شعبہ کلیۃ اصول الدین میں قائم ہوگیا۔

نیز مساجد اور مختلف اداروں میں وعظ و ارشاد کا کام جاری فرمایا جس سے آپ کا نور و اثر ظاہر ہوا، اور لوگوں کے قلوب نے اس کو جگہ دی اور اپنایا اس لئے کہ آپ کے وعظ میں دلچسپ حکایات اور واقعات تھے، رمضان شریف میں بعد نماز عصر جامعہ ازہر میں وعظ فرماتے تھے، نیز دیہاتوں میں جاکر بھی وعظ فرماتے تھے۔

تصانیف: آپ نے اس سلسلہ میں تصانیف بھی فرمائی ہیں جس میں مشہور یہ ہیں:

ہدایۃ المرشدین[1] الی طریق الوعظ والخطابۃ، اور الابداع فی مضار الابتداع وغیرہ۔

---

(۱) بہت ہی جامع اور مفید ترین کتاب ہے، اس کا ترجمہ اس حقیر نے عزیزم مولانا عبدالرشید بستوی استاذ جامعۃ الامام انور دیوبند سے کرایا ہے جو "تحفۃ الناصحین کے نام سے انشاء اللہ شائع ہوگی، اس کتاب کو احقر نے بالاستیعاب دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ آسان فرمائے۔ مترجم کا دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے سنہ ۱۴۱۴ھ میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کا خیال تھا کہ علم ایک ثروت ودولت ہے اوراس کی زکوۃ وعظ وارشاد ہے۔

خاتمہ: آپ یقیناً نور وعلم کے ایک شعلہ تھے جس کا نور امت کے ہر جماعت میں شائع تھا اور آپ ایک سراج تھے جس سے راستہ کے لئے نور حاصل کیا جاتا تھا۔

آپ اپنی ہیئت اور وقار، نشست وبرخاست سے پہچان لئے جاتے تھے قبل اس کے کہ آپ اپنے کلمات طیبات سے وعظ کہیں، اور آپ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے بالکل مصداق تھے۔

خیارکم من تذکرکم باللہ	تم میں بہترین وہ شخص ہے جس کا دیکھنا
رویتہ وزیدفی علمکم منطقہ	خدا کو یاد دلائے، اور اس کی بات
ویرغبکم فی الآخرۃ عملہ۔	تمہارے علم میں اضافہ کرے اور اس کا
رواہ الترمذی عن ابن عمر	عمل آخرت کی طرف راغب کرے۔

آپ کی تصنیف ''الابداع فی مضار الابتداع'' مرشدی مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کو بہت پسند تھی اور اس کے مضامین اکثر سنایا کرتے تھے، بعض دفعہ تو یہاں تک ارشاد فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید علی محفوظ مصر کے مجدد تھے جیسا کہ ہندوستان میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ مجدد تھے۔

اقتباسات: اب ہم ''الابداع فی مضار الابتداع'' کی بعض اصلاحی عبارات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں، جسے ناظرین ان شاء اللہ پسند فرمائیں گے۔

منجملہ بدعات سیئہ کے جو عام طور پر شائع ہیں یہ ہے کہ خواص امت یعنی

علماء وطلبہ سنتوں اور مستحبات کے سلسلہ میں کوتاہی کرتے ہیں جیسے اول وقت میں نماز پڑھنا، مسجد میں آکر جماعت سے نماز پڑھنا، پہلی صف میں پہونچنے کے لئے سبقت ورغبت کرنا، صلوٰۃ اشراق و چاشت اور کسوف وخسوف کی ادائیگی کا اہتمام کرنا۔

بسا اوقات تو طلبہ کے سامنے جماعت کھڑی ہوتی ہے مگر ان کو جماعت کی ذرا پروانہیں ہوتی، اور بسا اوقات کسوف وخسوف (یعنی سورج گہن، چاند گہن) علماء و دینداروں کی نظروں کے سامنے واقع ہوتا ہے مگر اس کا ذرا اہتمام نہیں کرتے کہ وہ نماز ودعا میں مشغول ہوجائیں۔

ان کے اس رویہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حوادث اور ہولناک امور سے یہ لوگ مامون ہیں جن سے اللہ تعالی نے اپنے بندوں کوڈرایا ہے، یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے یہ گمان کررکھا ہے کہ اللہ تعالی کے نزدیک ان کواتنا بلند مقام حاصل ہے کہ جن امور کا دوسروں کو حکم دیتے ہیں اگر خود ان کو بالکل مہمل چھوڑے رہیں تو ان پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔

نیز بدعات سیئہ میں سے ایک بدعت خیر وتقوی پر تعاون کو ترک کرنا ہے جس کا حکم اللہ نے اپنے اس رشاد میں فرمایا ہے **وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى** اسکے بعد مصنف نے حکام کو خود عملِ خیر کے کرنے پر ابھارا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ترغیب دی ہے، اس لئے کہ نفوس کی یہ طبیعت ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی اتباع کو پسند کرتی ہے اس لئے جب اپنے امراء کو عمل کرتے دیکھیں گے تو عوام کے لئے عمل آسان ہوجائے گا اسی طرح جب حکام امر بالمعروف

کریں گے تو ان کی ہیبت کا بہترین اثر مرتب ہوگا چنانچہ وارد ہوا ہے کہ ''اِنَّ اللہ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَالَایَزَعُهُ بِالْقُرْآنِ'' بیشک اللہ تعالیٰ سلطان کے ذریعہ سے وہ چیز دفع کردیتا ہے جو قرآن کے ذریعہ نہیں ہوتی۔

ومن البدع المذمومة التهاون بامور الدين حتى أَصْبَحَ الوسط مختلا و المدرسة الاجتماعية اليوم تُعلِّمُ النشئ فنون الفساد و ضروب الضلال۔(ومن شبَّ عَلى شئ شاب عليه) فاستعصى الداء على المرشدين ولم يفلحوا فى تقويم المعوج من اخلاق الامة وتطهيرها من درن الرذائل، حتى استولى عليهم الياس من الاصلاح فاهملوا نصح الامة و تعليمها امر دينها۔	اور بری بدعات میں سے امور دین میں کسلمندی بھی ہے حتی کہ مراکز دینیہ خلل پذیر ہوگئے اور اجتماعی مدرسے آج کل نئی نسل کو طرح طرح کے فساد اور قسم قسم کی گمراہی سکھارہے ہیں اور ظاہر ہے بچہ جس حال پر جوان ہوگا اسی حال پر بوڑھا بھی ہوگا اس لئے مرشدین پر علاج دشوار ہوگیا اور اخلاقِ امت کی کجی کو دور کرنے اور ان کو رذائل کی میل کچیل سے پاک کرنے میں ناکام ہوگئے، جس کی وجہ سے ان پر ناامیدی کا غلبہ ہوگیا اس لئے امت کی نصیحت اور ان کی دینی تعلیم ہی کو ترک کردیا۔
(الابداع فی مضار الابتداع: ۳۰۱)	

ف: سبحان اللہ! کس قدر مفید مضامین ہیں جو اس زمانہ کے حال کے عین مطابق ہیں، اسی لئے حضرت مصلح الامتؒ اس مضمون کو خصوصیت کے ساتھ بہت

پسند فرماتے تھے یہاں تک کہ نقل کرا کے دار العلوم دیو بند حضرت العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ کی خدمت میں ارسال فرمایا کہ علماء وطلبہ کو جمع کر کے سنا دیں۔ چنانچہ انھوں نے سنایا۔(مرتب)

اب ہم سید علی محفوظؒ کی دوسری اہم تصنیف ''ہدایۃ المرشدین'' سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں رفق ونرمی کی فضیلت وضرورت میں جو کلام فرمایا ہے اس کا حاصل ترجمہ پیش کرتے ہیں، امید ہے کہ قارئین کرام محظوظ ومنتفع ہوں گے، چنانچہ یوں ارقام فرمارہے ہیں:

رفق ونرمی کی فضیلت: داعی کے صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ کلام میں رفق اور معاملہ میں نرمی اختیار کرے اس لئے کہ دعوت الی الخیر کے مقام میں مرشد کو اسی سے کامیابی نصیب ہوسکتی ہے، قرآن حکیم نے اس کی طرف بہت سے مقامات میں رہبری فرمائی ہے اس لئے اس کو اختیار کرنا لازم ہے، راز اس میں یہ ہے کہ عام طور سے نفوس کی فطرت وطبیعت میں عظمت وکرامت کی محبت وہوس ودیعت کی گئی ہے اور عموماً کبر ورعونت ہی میں نشونما ہوتی ہے اس لئے جس شخص نے چاہا کہ ان کے نفوس کو گمراہی سے رشد وہدایت کی طرف لائے اور ان کی الفت وعادت والی چیزوں سے ان کو نکالے تو اس کو چاہئے کہ رفق ونرمی سے پیش آئے اگر اس نے حق کی تلخی کے ساتھ لطف وشفقت کی شیرینی کو نہ ملایا اور شرعی تکلیف کی مشقت کو رفق ونرمی کی چاشنی سے آسان نہ کیا تو اس کی دعوت بجائے کامیابی کے ناکامی کے زیادہ قریب ہوگی اور بجائے قبول کے رد کے زیادہ لائق ہوگی اور اس کی مثال ایسی ہوگی کہ کسی نے اپنے کپڑے کو نجاست

سے پاک کرنا چاہا تو بجائے گرم پانی میں ڈالنے کے اس کو آگ ہی میں ڈال دیا جس نے اس کو جلا کر راکھ کر ڈالا، کیا اللہ کے اس ارشاد کو نہیں دیکھتے ہو "**فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى**" اے موسیٰ وہارون! فرعون سے نرمی کی بات کرنا تاکہ وہ نصیحت قبول کرے اور ڈر جائے پس اللہ تعالی کے اس ارشاد سے یہ بات نکلتی ہے کہ نرم کلام ہی نصیحت وتذکر کا محل ہے، اور یہی نفوس کے لئے خوف اور تاثر کا ذریعہ ہے، چنانچہ حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ ایک جوان شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے اللہ کے نبی! کیا آپ مجھے زنا کی اجازت دے سکتے ہیں؟ یہ بات سن کر صحابہؓ چیخ اٹھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ اس کو میرے قریب لاؤ اور اس سے فرمایا کہ قریب آجاؤ چنانچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی ماں کے ساتھ زنا کو پسند کرتے ہو؟ تو اس نے کہا: نہیں، اور اللہ مجھ کو آپ پر فدا کردے نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسے ہی سبھی لوگ اپنی ماں کے ساتھ زنا کو پسند نہیں کرتے، پھر فرمایا کہ تم اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کو پسند کرتے ہو؟ تو کہا نہیں، اللہ مجھ کو آپ پر قربان کرے، تو فرمایا کہ ایسے ہی تمام لوگ اپنی بیٹیوں کے ساتھ زنا کو مکروہ سمجھتے ہیں، اور فرمایا: اپنی بہن کے ساتھ اس بُرے فعل کو پسند کرتے ہو؟ حضرت ابن عوفؓ (راوی) نے پھوپھی اور خالہ کا بھی ذکر فرمایا ہے اور وہ جوان ہر مرتبہ "لا" نہیں "**جعلنی اللہ فداک**" اللہ مجھ کو آپ پر نثار کرے کہتا تھا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو اس کے سینہ پر رکھا اور یہ دعا فرمائی "**اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبَهٗ وَاغْفِرْ ذَنْبَهٗ وَحَصِّنْ فَرْجَهٗ**" اے اللہ! اس

کے قلب کو پاک فرما دیجئے، اور اس کے گناہ کو معاف کردیجئے، اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرمائیے، اس کے بعد زنا سے زیادہ مبغوض اس کے نزدیک کوئی چیز نہ رہ گئی۔ (رواہ احمد باسناد جید)

پس یہ وہی دعوت میں حکمت ہے جس کا ذکر قرآن میں **اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ** میں مذکور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **"قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"** الخ۔ پس ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس وقت تک متبع نہیں ہوسکتے جب تک کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی آپ کے طریقہ کی اتباع نہ کریں۔ (ہدایۃ المرشدین: ص/۱۳۱)

ف: مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رفق ونرمی اختیار کرنا منجملہ آداب کے ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعوت وتبلیغ کے طریقۂ کار میں ہم آزاد نہیں ہیں بلکہ اس میں بھی اتباع سنت کا لحاظ ضروری ہے پس جس طرح مقصد کی صحت ضروری ہے اسی طرح اس کے طریق کی صحت بھی لازم ہے، لہٰذا ہم اس باب میں بھی خود مختار نہیں ہیں کہ جو چاہیں طریق اختیار کرلیں اگر کسی طریق سے بظاہر نفع محسوس بھی ہورہا ہو مگر وہ طریق سنت کے خلاف ہو تو وہ واجب الترک ہے۔ اب ایک بات تتمیم فائدہ کے لئے یہ عرض ہے کہ حضرت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں رفق وغلظت کے سلسلہ میں نہایت بصیرت افروز اور جامع بات تحریر فرمائی ہے اس کو نقل کرتا ہوں۔

والحاجة الى العنف قد تقع ولكن على الندور وانما الكامل من يميز مواقع الرفق عن مواقع العنف فيعطي كل امر أحقه فان كان قاصر البصيرة واشكل عليه حكم واقعة من الوقائع فليكن ميله الى الرفق۔ فان النجح معه فى الاكثر۔ (احیاالعلوم: ج ۳،ص ۱۴۶)

یوں سختی کی ضرورت بھی پڑتی ہے مگر کبھی کبھی، یقینا کامل وہ شخص ہے جو رفق وغلظت کے مواقع میں بخوبی تمیز کرتا ہو جس کی وجہ سے ہر شخص کے حق کا لحاظ کرتا ہو، لہذا اگر کوئی شخص قاصر البصیرت ہے اور کسی معاملہ کے متعلق فیصلہ میں اشکال ہو تو ایسی صورت میں اس کا میلان ورجحان نرمی کی طرف ہونا چاہئے اس لئے کہ نرمی کے ساتھ کامیابی کا زیادہ امکان ہے۔

وفات حسرت آیات: آخر یہ داعی الی اللہ اور مصلح کبیر ۳؍ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۱؍نومبر ۱۹۴۲ء میں اپنے مولیٰ تعالی سے واصل ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ رحمہ اللہ تعالی۔

حضرت مولانا شکر اللہ مبارک پوری اعظم گڈھیؒ المتوفی ۱۳۶۱ھ

نام ونسب : مولانا مفتی شکر اللہ بن عبد الواحد محلہ رانی پور، قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڈھ یوپی میں چودھویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوئے۔

تعلیم : قرآن شریف اور اردو کی تعلیم اپنے گھر اور محلہ میں حاصل کی، اس کے بعد ۱۳۰۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا اجراء ہوا تو اس میں داخل ہو کر مولانا محمد محمود معروفی متوفی ۱۳۰۷ھ سے عربی کی کتابیں پڑھیں، ان دنوں مولانا کے گھریلو حالات نہایت ابتر تھے اور معاشی فکر ہر دم دامنگیر رہتی تھی، اس لئے صبح دو گھنٹہ کام کر کے مدرسہ جاتے تھے اور مدرسہ سے واپس آ کر رات کو بھی کام کرتے تھے، اس طرح سے تعلیمی شوق خانگی مشاغل کی کشاکش میں پورا کیا اور نحو، صرف وغیرہ کی تعلیم مدرسہ میں مولانا محمد محمود معروفی سے حاصل کی۔ گھر کے لوگ کام میں لگانا چاہتے تھے اس ڈر سے گھر سے چپکے سے نکل کر بھاگے اور الہ آباد جا کر مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے، ان ہی ایام میں مولانا حکیم الٰہی بخش ناظم مدرسہ احیاء العلوم، الہ آباد گئے تو راستے میں ان سے مڈبھیڑ ہو گئی، انہوں نے مکان چلنے پر اصرار کیا، آخر اس شرط پر راضی ہو گئے کہ گھر پر مجھے تعلیم سے روکا نہ جائے، چنانچہ بھائیوں کی طرف سے پوری آزادی مل گئی اور مولانا لہر پور ضلع سیتا پور کے ایک مدرسہ میں چلے گئے جہاں سلسلۂ خیر آباد کا فیض جاری تھا، آپ نے وہاں معقولات

ومنقولات کی تعلیم کے ساتھ فن تجوید اور قرأت کی بھی تعلیم حاصل کی، یہاں کے اساتذہ میں مولانا حیدر حسن اور مولانا فیض اللہ صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انہیں اساتذہ سے مولانا نے شرح مطالع، توضیح وتلویح اور افق المبین وغیرہ پڑھیں، یہاں سے نکل کر ریاست مینڈھو علی گڈھ چلے گئے جہاں اس دور کے نامور عالم مولانا ماجد علی مانوی جونپوری متوفی ۱۳۵۲ھ کا دریائے فیض ٹھاٹھیں مار رہا تھا، مولانا نے ان سے کسب علم کیا، پھر یہاں سے جا کر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، جہاں اس وقت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ، مولانا حافظ احمد صاحبؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اسرارہم کا فیض جاری تھا، آپنے انہیں اساتذہ وشیوخ سے تعلیم مکمل کی اور ۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی۔

مدرسہ احیاء العلوم کی نظامت: وطن آئے تو مولانا حکیم الٰہی بخش نے مدرسہ احیاء العلوم کی نظامت سپرد کردی، اس وقت مدرسہ ایک مسجد میں تھا، اس کے پاس کوئی مستقل عمارت نہیں تھی، مولانا نے سب سے پہلے مدرسہ کی مستقل عمارت بنوائی، اس کے بعد اپنی نگرانی میں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی ۱۳۵۹ھ کو ایک عظیم الشان جلسہ میں اس کی بنیاد پڑی، یہ مسجد فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، نیز قصبہ کے باہر دکھن جانب عظیم الشان عیدگاہ تعمیر کرائی جو ۱۳۶۵ھ میں مکمل ہوئی۔ مدرسہ، جامع مسجد اور عیدگاہ مولانا کی یادگار ہیں۔

اصلاحی کام: مولانا پر دارالعلوم دیوبند کا اصلاحی، دینی اور سیاسی رنگ اس طرح چڑھ گیا تھا کہ اسی مکتب فکر وخیال کے سرگرم رکن اور ترجمان بن کر زندہ رہے بدعات وخرافات کے خلاف نہایت بے باکی سے جنگ کی، مولانا نہایت کامیاب واعظ تھے،

ہر موضوع پر بلا تکلف تین تین چار چار گھنٹے تقریر کرتے تھے، موت، حیات، شادی، بیاہ ذات برادری کی غلط رسموں میں اصلاح اور سدھار پیدا کرنا ان کا عظیم کارنامہ تھا۔ ساتھ ہی علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی ہر علم وفن کی کتابیں بلا تکلف پڑھاتے تھے اور خوب پڑھاتے تھے، افہام وتفہیم میں خداداد ملکہ حاصل تھا، آخری دور میں جب دوسری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں، منطق، فلسفہ اور دیگر علوم وفنون کی منتہی کتابیں بے مطالعہ اس طرح پڑھاتے تھے کہ مشہور اساتذہ بھی نہیں پڑھا سکتے تھے۔ ابتداء میں دورۂ حدیث بھی پڑھاتے تھے، حج وزیارت کی دولت سے بھی بہرور اور مشرف تھے، سفر حج پر جاتے وقت جہاز میں برطانوی حکومت کے خلاف تقریر کی جس کی تحقیقات بعد تک ہوتی رہی ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹ رجون ۱۹۲۳ء کو بدیسی حکومت کے خلاف ستیہ گرہ کرنے پر گرفتار بھی ہوئے چھ ماہ تک قید میں رہ کر اسلاف کی سنت کو زندہ کیا۔

وفات: مدرسہ کے مشاغل، جماعتی معاملات اور دوسرے کام کی ہماہمی میں مولانا انتھک محنت کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ صحت گرنے لگی اور دق کا موذی مرض لاحق ہوگیا، ابتداء میں اپنے استاذ مولانا محمود معروفی کا علاج کیا پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، مگر مرض کی شدت اور ضعف ونقاہت بڑھتی ہی رہی بالآخر دوشنبہ ۵ رربیع الاول ۱۳۶۱ھ میں چاشت کے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مولانا کا وصال کا دن مبارک پور میں یوم غم اور جنازہ مشہودہ تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مصنف کتب متعددہ، مولانا عبد الباری اعظمی، مولانا شمس الدین اعظمی، مولانا بشیر احمد وغیرہ خاص شہرت کے مالک ہیں۔

(تذکرہ علمائے مبارک پور صفحہ: ۲۱۵ تا ۲۲۶) (تذکرہ علماء اعظم گڈھ صفحہ: ۱۵۹)

حضرت مولانا حکیم محمد نعمت اللہ صاحب قادری بنارسیؒ متوفی ۱۳۶۱ھ

نام ونسب وولادت: حضرت مولانا شاہ نعمت اللہ صاحبؒ ۱۲۹۸ھ میں ربیع الاول کی چاندرات پیدا ہوئے۔ ماشاء اللہ آپ کی والدہ ماجدہ صوم صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ جامع شریعت وطریقت باپ کی آغوش میں تربیت پائی۔ بچپن ہی میں علم وعرفان کے نور سے پیشانی چمک رہی تھی۔

تعلیم وتربیت: خاندانی روایت کے مطابق قرآن عظیم کی تعلیم شروع ہوئی۔ چند ہی برسوں میں حفظ وتجوید کی تکمیل فرما کر عربی فارسی کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، ابتدائی کتابیں حضرت حکیم عبد الغفار صاحب بنارسیؒ سے پڑھیں، متوسطات کے لئے جامع العلوم کانپور میں داخلہ لیا، دورہ حدیث کی تکمیل کے لئے صاحب علم وعرفان حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے خود ہی خواہش ظاہر فرمائی۔

کانپور سے بنارس تشریف لائے اور مدرسہ مطلع العلوم بنارس میں مولانا عبدالرحمٰنؒ صاحب سے دورہ حدیث شریف کی تکمیل فرمائی اور ۱۳۲۵ھ میں سند فرغت حاصل فرمائی۔ اللہ اللہ ایسے شاگرد کی علمی صلاحیت کا کیا عالم ہوگا جس کے علم ودانش کی تعریف خود استاد کرے۔ دورہ حدیث کی تکمیل کی تاریخ استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ خود ہی ارشاد فرما رہے ہیں:

نعمت اللہ از فراغت شد زعلم دین حق ‏ ‏ ‏ علم وعمرش در ترقی باد حاسد در زوال

بشنواز باب فضیلت سال ختمش گویمت　　نوش از 'جام فراغ' از خواہی صباء وصال
۱۳۲۵ھ

گوش کردی از 'لبیب فارغ' از مقصود خویش　　بالیقین رستی بفکر سال از ہر قیل وقال
۱۳۲۵ھ

جونپور کا سفر: درس نظامیہ کی تحصیل وتکمیل کے بعد بھی علم کی تشنگی نہ گئی تو بحر العلوم استاذ الاساتذہ حضرت علامہ ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری (م: ۱۳۲۶ھ) کی خدمت میں مدرسہ حنفیہ جونپور حاضر ہوئے جہاں دو برس رہ کر حضرت علامہ کے تبحر علمی سے مستفیض ہوتے رہے۔ منطق وفلسفہ کی کتابوں سے استفادہ کے ساتھ ہی خطابت وفتویٰ نویسی کے مشاغل بھی جاری رہے۔

(تذکرہ علماء بنارس: صفحہ ۱۹۱)

بنارس واپسی: ۲۸ر شعبان ۱۳۲۷ھ کو حضرت علامہ ہدایت اللہ خاں صاحب نے اپنے سعادت مند شاگرد کو حکم دیا کہ جاؤ رمضان المبارک اپنے والدین کی خدمت میں گزارو، شفیق استاد نے اپنے سعادت مند شاگرد کو اپنے ہاتھوں سے اپنا عباء پہنایا، دعائیں دیں، رخصت فرماتے وقت ارشاد فرمایا: ''جاؤ میں بھی دو ہی روز کا مہمان ہوں۔'' رخصت کا منظر بھی عجیب رقت انگیز تھا۔ استاد اور شاگرد دونوں ہی کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں اور دونوں کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ ایک دعاء خیر کا طالب تھا تو دوسرا کلمات خیر کی بارش اپنے شاگرد پر نچھاور کر رہا تھا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس سعادت مند شاگرد کی رخصتی کے ٹھیک دو روز بعد

بحر العلوم حضرت علامہ ہدایت اللہ خاں صاحبؒ کا یکم شب رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ کو انتقال ہو گیا اور درگاہ رشیدیہ جونپور میں مدفون ہوئے۔ حضرت کا عطا کیا ہوا عباء اب بھی تبرکاً عارف باللہ کے نعمت خانہ میں محفوظ ہے۔ استاذ محترم کے حکم سے بنارس تشریف لائے۔ ماں باپ کی قدم بوسی سے مستفیض ہوئے۔ قرآن شریف تراویح میں سنایا۔ رمضان المبارک کے بعد پھر حصول علم کی جانب متوجہ ہو گئے۔ علم طب کی تکمیل کے لئے حکیم حضرت محمد حسین خاں صاحب کشمیریؒ طبیب خاص جناب نواب صاحب والی ریاست ٹونک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درسیات مکمل کر کے ۱۳۲۸ھ میں علم طب کی سند حاصل کی۔

بیعت و خلافت: حضرت شاہ نعمت اللہ صاحبؒ دو برس تک جونپور کے زمانہ قیام میں علم ظاہری کے ساتھ ہی علم باطنی کے حصول کے لئے بھی کوشاں رہے۔ حضرت مخدوم بینائے دل حضرت خواجہ حمزہ چشتیؒ اور سیّد امیر علی نقشبندی کے مزارات پر اکثر حاضری دیا کرتے اور اکتساب فیض فرماتے رہے۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ علم ظاہری کی پیاس تو بجھ چکی تھی، لیکن علم باطنی کی پیاس تیز ہو گئی۔ قلب و روح کی تسکین کے لئے حقائق آگاہ حضرت گلزار شاہ کشنوی کے خلیفہ مقبول بارگاہ رحمن مولانا شاہ عبد السبحان نقشبندی مچھلی شہریؒ (م: ۱۳۲۳ھ) کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے۔ شرف بیعت سے مشرف ہوئے دوائر نقشبندیہ کی تعلیم حاصل فرمائی۔ اپنی ریاضت اور شیخ کی روحانی نسبت کے سہارے منزل سلوک طے فرمایا۔ حضرت مولانا شاہ عبد السبحان صاحبؒ کے وصال کے بعد باشارہ غیبی حضرت قدوۃ السالکین برہان العاشقین،

آیۃ من آیات الرحمن سرکار صوفی محمد جان صاحب قادری، نقشبندی، مجددی، کرمانی (م: ۱۹۳۵) کی خدمت میں ولید پور حاضر ہوئے۔ ابھی خانقاہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ حضرت سرکار نے تبسم فرمایا اور کہا کہ ہمارا شیر آرہا ہے۔ حضرت عارف باللہ حاضر بارگاہ ہوئے۔ سلام عرض کیا، اور بے تابانہ قدم بوس ہوئے۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے سر اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔ تسکین وتحسین فرماتے ہوئے ارشاد ہوا: ''حضرت غوث الوقت چراغ ربانیؒ کے نور سے آپ بھی مستفیض ہوں گے'' نماز مغرب کے بعد حلقہ ذکر میں شریک ہوئے۔ سلسلہ عالیہ قادریہ میں شرف بیعت حاصل ہوا اور لطائف ستہ کی تعلیم سے مستفیض ہوئے۔ اب عارف باللہ کا سفینہ حیات سرکار صوفی صاحبؒ کے روحانی تصرفات کے سہارے بحر تصوف میں ساحل مراد کی جانب رواں دواں ہوا۔ معرفت الٰہیہ کے حصول کے شوق میں دس برس کی ریاضت شاقہ اور شیخ کی توجہ خصوصی کے سہارے سالک راہ طلب جذب وسلوک کے نشیب وفراز سے گزرتا ہوا **فاینما تولوا فثم وجہ اللہ** کی منزل رفیع تک پہنچ ہی گیا۔

آپ کے محاسن: آپ کو قدرت نے علمی و مالی وجاہت کے ساتھ وجاہت ظاہری سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ نہایت نفاست پسند، جاذب مؤثر شخصیت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ خوش لباس و جامہ زیب بھی تھے۔ آپ اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب تھے۔ آواز میں کشش اور زبان میں اثر تھا۔ جس جلسہ میں پہنچ جاتے رونق آجاتی اور جذب وکیف کا عالم طاری ہوجاتا۔ تقریباً چالیس سال شاہی مسجد گیا نوافی میں نماز پنجگانہ کی امامت فرمائی۔ رمضان المبارک میں تین پارہ روز تراویح میں سناتے۔ ایک مجمع کثیر کلام الٰہی سننے کے لئے آپ کی اقتدا میں نماز تراویح ادا کرتا۔

ان سارے ظاہری محاسن کے باوجود دائرہ تصوف میں قدم رکھنے کے بعد اسی کے ہو رہے۔ نہ تو شفا خانہ قائم کیا اور نہ ہی درس و تدریس کا مشغلہ اپنایا اور نہ ہی شیخ کی زندگی میں کسی کو داخل سلسلہ فرمایا۔ ہمیشہ صابر و قانع رہے۔ مزاج میں توکل وقناعت غالب رہا۔ کسی مطب میں ملازمت نہیں کی۔ جو مریض آیا نسخہ لکھ دیا چند ہی خوراک میں قدرت نے شفا بخشی۔ کسی مدرسہ کے پابند نہ رہے جب بھی طالب علم حاضر ہوا درس سے سرفراز ہوا۔ راہ سلوک کا مسافر حاضر ہوا تو اس کی رہنمائی فرمادی۔ مشکلوں اور پریشانیوں میں لوگ حاضر ہوتے تو ان کے حق میں دعا فرمادیتے۔ رب کریم دعا قبول فرماتا۔ حاجتمندوں کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں۔ کشف احوال واجابت دعا میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ہمیشہ نماز تہجد سے اشراق تک عبادت وریاضت میں مشغول رہتے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور کثرت نوافل نے **ماتقرب الی عبدی۔۔۔الخ** کا مصداق بنادیا تھا بڑی ہی بافیض وباکرامت شخصیت تھی جسکی بناء پر ساری زندگی مرجع خلائق رہے۔ ان تمام ہی ظاہری وباطنی محاسن اور خوبیوں کے باوجود نام ونمود، ریا وتفاخر سے دور رہے۔ اپنے احوال واوصاف کو چھپانے کی کوشش فرماتے۔ اکثر ارشاد فرماتے ''بہ کشف وکرامت کفش باید زد'' (کشف وکرامت پر جوتے مارنا چاہئے) یہ سالک کو راہ سلوک میں ترقی سے روک دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مریدین و متوسلین کو اپنا کرامت نامہ شائع کرنے کی کبھی اجازت نہ دی۔

وفات: ۴؍رجب المرجب ۱۳۶۱ھ بروز یکشنبہ بوقت اشراق آپ نے وصال فرمایا۔ درگاہ صوفیہ کے قبرستان واقع محلہ اورنگ آباد شہر بنارس میں مدفون ہیں۔ **نوراللہ مرقدہ**۔ (تذکرہ مشائخ بنارس ۱۹۱)

حضرت مولانا ابوالحسن صاحب عراقی مئوی رحؒ المتوفی ۱۳۶۲ھ

نام وولادت: آپ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مئوی کے برادر صغیر تھے، پیدائش ۱۲۹۶ھ میں ہوئی، والد کا نام عبداللہ ہے۔

تعلیم: اپنے برادر اکبر مولانا عبدالغفار سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کانپور تشریف لے گئے، جبکہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ وہاں تعلیم دیتے تھے، آپ نے وہاں علوم عالیہ تفسیر وحدیث وغیرہ پڑھیں اور سلوک وطریقت حضرت چاند شاہ صاحب قدس سرہٗ سے حاصل کی اور خلیفہ ہوئے، ان کے بعد حضرت حکیم الامتؒ کی طرف رجوع فرمایا اور عرصہ تک خانقاہ امدادیہ میں مشغولِ ذکروشغل رہے۔

ف: غور کرنے کی بات ہے کہ یہ دونوں بھائی شہرۂ آفاق علماء ومشائخ کے شاگرد تھے مگر ان سے بیعت نہ ہوئے، بلکہ حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی (جو امی تھے) سے بیعت ہوئے اور دونوں ہی حضرات خلعتِ خلافت سے مشرف ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ بیعت کیلئے محض کسی کی عظمت وعقیدت کافی نہیں ہے بلکہ باطنی مناسبت بھی ضروری ہے۔ ایسے ہی حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے، مگر بیعت حضرت مرزا مظہر جانجاناں سے ہوئے، اسی بناء پر اپنی تفسیر کا نام اپنے شیخ کی طرف نسبت کرتے ہوئے تفسیر مظہری رکھا۔ (مرتب)

طریقۂ درس: منطق وفلسفہ کے سبق میں بھی اپنے اکابر مجدد الف ثانیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم کا شدومد سے ذکر فرماتے تھے، گویا شاگردوں کے قلوب میں ان حضرات صالحین کاملین کی محبت پلا دیتے تھے، جس کی آج بھی ضرورت ہے، جبکہ اس سلسلہ میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔

معمولات: نماز باجماعت اور قرآن پاک سے عشق تھا، روزانہ ایک منزل تلاوت قرآن پاک کا معمول تھا، دلائل الخیرات بھی آپ کے معمولات میں داخل تھی، جو طالب علم نماز باجماعت اور تلاوت قرآن پاک کی پابندی کرتا، اس سے بہت خوش ہوتے اور اس کی خاص رعایت فرماتے۔

ہمیشہ اخیر تک علمی مشغلہ یعنی درس وتدریس میں مشغول رہے، آپ صاحب قلب کے ساتھ ساتھ صاحب لسان وصاحب قلم بھی تھے، جامع مسجد کٹرہ، مئو میں جمعہ کے روز وعظ کہتے، وعظ میں نماز کا ذکر اور اس کی پابندی کو ضرور بالضرور فرماتے، اس کے علاوہ دیگر مقامات اور جلسوں میں وعظ فرماتے تھے، جو بڑا ہی دلسوز اور مؤثر ہوتا تھا، آپ کا منظوم کلام بھی بہت ہی مؤثر ہوتا تھا جو منظوم وعظ ہی ہوتا تھا، دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی نعمتوں وراحتوں کا ذکر آپ نے نظم فرمایا ہے، جو درجِ ذیل ہے:

ترغیب راحت عقبیٰ و بے ثباتی دنیا

عقبیٰ کا کام کرنا شغل اپنا تم بناؤ   سارے بدن کو اپنے حسنات میں لگاؤ

کچھ آنکھ سے بھی دیکھو کانوں کو کچھ سناؤ   پڑھ لو زباں سے کچھ، کچھ دست و پا ہلاؤ

ہے یہ سرائے فانی اس میں نہ دل لگاؤ ‏ اصلی مکان اپنا اے مومنو بناؤ

فرزند وزن یگانے ،ماں باپ اور بھائی ‏ احباب اور اقارب کرتے ہیں جو بھلائی

کرتے ہیں جس سے ہم سب یاری وآشنائی ‏ ہوگی ضرور سب سے اک روز پھر جدائی

ہے یہ سرائے فانی اس میں نہ دل لگاؤ ‏ اصلی مکان اپنا اے مومنو بناؤ

سب چل دیئے یہاں سے اصغرہوں یاکہ اکبر ‏ داؤد اور سلیماں، جمشید اور سکندر

تھے تخت پر جواک دن تھا تاج جن کے سر پر ‏ وہ قبر میں پڑے ہیں، ہے خاک ان کا بستر

ہے یہ سرائے فانی اس میں نہ دل لگاؤ ‏ اصلی مکان اپنا اے مومنو بناؤ

کوئی نہیں ہے یارو دنیا میں رہنے والا ‏ چکھنا ہے سب کو اک دن جب موت کا نوالہ

ایسا کروکہ جس سے راضی ہو حق تعالی ‏ حضرت پلائیں تم کو،کوثر کا اک پیالا

ہے یہ سرائے فانی اس میں نہ دل لگاؤ ‏ اصلی مکان اپنا اے مومنو بناؤ

ہے جاہ ومال ودولت بس قصہ وکہانی ‏ باقی رہا سکندر نہ تو افسر کیانی

کچھ بھی نہیں ہے دنیا اور اسکی زندگانی ‏ نہ تو ہم رہیں گے باقی نہ تو قبر کی نشانی

ہے یہ سرائے فانی اس میں نہ دل لگاؤ ‏ اصلی مکان اپنا اے مومنو بناؤ

ف :- یقیناً یہ اشعار اس لائق ہیں کہ بطورِ ورد ان کو پڑھا جائے۔(مرتب)

وفات : ۱۳۶۲ھ میں بعارضہ اسہال (ہیضہ) انتقال ہوا،مئو،محلہ اورنگ آباد عقب عیدگاہ مدفن ہے۔نوراللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگ پوری بہار المتوفی ۱۳۶۳ھ

نام ونسب: آپ کا اسم گرامی ''محمد عارف'' اور والد محترم کا نام نامی شیخ بلاغت حسین، تھا جو قطب دوراں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب قدس سرہ سے ارادت وبیعت کا تعلق رکھتے تھے، نسباً آپ صدیقی تھے۔

آبائی وطن: آبائی وطن ہرسنگ پور ضلع دربھنگہ تھا مگر آپ کی ولادت باسعادت اپنے نانہال سعدی پور ضلع دربھنگہ میں ہوئی، جو علم وعمل کا گہوارہ تھا۔

ابتدائی تعلیم: مکتب کی ابتداء تو آپ کے والد محترم نے کرائی مگر اس کے بعد فارسی، عربی کی تعلیم مولانا محمد واسع صاحبؒ سے حاصل کی، پھر کانپور مدرسہ ''فیض عام'' میں داخل ہوئے، اس کے بعد اپنے خاص استاذ مولانا خیر الدین صاحبؒ کے ساتھ رُدولی شریف تشریف لے گئے، وہاں مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ وغیرہ تک کی تعلیم حاصل کی، اسی اثناء میں اپنے استاذ محترم مولانا خیر الدین صاحب کی رفاقت میں حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف بہ بیعت ہوئے، اس کے کچھ دنوں بعد رُدولی کا قیام ترک کرکے گنج مراد آباد ہی میں قیام پذیر ہوگئے، اور حضرت مولانا عبد الکریم صاحبؒ سے حدیث شریف کی بقیہ کتابیں پڑھیں، چنانچہ آپ کو حدیث مسلسل بالاولیت کی اجازت حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحبؒ سے اور ان کو سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے حاصل تھی، اور صحاح ستہ کی اجازت حضرت شاہ عبد الکریم صاحبؒ سے

اور ان کو شاہ فضل رحمن صاحب ؒ اور انہیں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب ؒ اور انہیں اپنے نانا شاہ عبدالعزیز صاحب ؒ سے حاصل تھی۔

آپ نے فراغت اور سند فضیلت کی تحصیل کے بعد کچھ دنوں درس وتدریس کا مشغلہ رکھا چنانچہ مدرسہ رحمانیہ سپول ضلع دربھنگہ آپ کی یادگار ہے۔

باطنی تعلیم: یوں تو صلاح وسلامت روی بچپن ہی سے تھی، جو روز بروز ترقّی پذیر رہی، تصوّف وسلوک سے بھی خاصی مناسبت تھی، اسی بناء پر طالب علمی کے زمانہ میں ہی حضرت قطب دوراں مولانا شاہ فضل رحمن صاحب ؒ سے بیعت ہو گئے اور حضرت ؒ نے آپ کو تعلیم باطن دی اور اسم ذات کے ذکر کی تلقین فرمائی، جب آپ کی رحلت ہو گئی تو آپ کے خلفاء سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

اخیر میں حضرت مولانا محمد علی مونگیری ؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور تیس سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے اور مقامات سلوک کی تکمیل فرمائی۔

اجازت: حضرت مولانا مونگیری ؒ نے سلسلہ نقشبندیہ، قادریہ کے تمام اوراد ووظائف اور بیعت لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے علاوہ مختلف سلاسل سے اجازت حاصل ہوئی۔

اقوال: اکثر ارشاد فرماتے: بال بچوں پر جو کچھ خرچ کرتا ہوں محض اللہ کے واسطے کرتا ہوں، سب کام اللہ کے واسطے کیا کرو، ایک بچّی مُنہ تکنے لگی تو فرمایا: تم لوگ بھی میری خدمت اللہ کے واسطے ہی کیا کرو۔

نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا: پرہیز سے رہو، خبردار! بدچلنی سے بچو، حیاء ایمان کا حصہ ہے۔

تقوی اختیار کرو، میرے اہل وعیال میں سے جو بھی تقوی اختیار کرے گا کبھی محتاج نہیں رہے گا۔

مہمان کے کھلانے میں زیادہ تکلف نہیں کرنا چاہئے، جو کچھ بسہولت میسّر ہو وہی کرنا چاہئے، اس سے راحت ہوتی ہے۔

فضول خرچی نہیں کرنی چاہئے، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں اور بخل بھی نہ کرنا چاہئے، اس سے آمد بند ہو جاتی ہے، مثال دیتے ہوئے فرمایا: دیکھو ! دریا کے جاری رہنے میں بے حساب پانی ایک طرف سے آتا ہے اور دوسری طرف کو جاتا ہے، اگر اس کے دہانے کو بند کر دیا جائے تو پانی کی روانی کے ساتھ اس کی آمد بھی بند ہو جاتی ہے۔

ف: سبحان اللہ! کتنے مفید ارشادات ہیں جو لائحہ عمل بنانے کے لائق ہیں۔

(قمر الزمان)

تصنیف لطیف: آپ کی ایک تصنیف لطیف ”کلید معارف“ ہے جو سلوک نقشبندیہ کے منتہیوں کے لئے ارقام فرمایا ہے، حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ صاحبؒ جو صاحب سوانح کے مجاز بھی ہیں، وہ اس کتاب کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں:

قطب عالم مجدد العلم والعرفان حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ قدس سرّہ نے اپنی کتاب ”ارشاد رحمانی“ میں سلوک نقشبندیہ کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ اس قدر ذکر وفکر کا بیان مبتدی کے لئے کیا گیا، مگر اس زمانہ کے منتہیوں کے لئے کافی ہے، اللہ تعالی عمل کی توفیق دے، اگر مشیّت الٰہی ہوئی

تو دوسرے رسالہ میں اس کا مفصل بیان کروں گا چنانچہ "کلید معارف" کے ذریعہ مولانا محمد عارفؒ نے اس فرمائش کو پورا فرمایا۔ خدا کا شکر ہے کہ مرشد کا چھوڑا ہوا کام خلیفہ کے ہاتھوں انجام پایا۔

وفات: ۹؍صفر ۱۳۶۳ھ مطابق ۴؍فروری ۱۹۴۴ء بروز جمعہ عین اذان خطبہ کے وقت آپ کی وفات ہوئی اور رہرسنگ پور ضلع دربھنگہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے، نوراللہ مرقدہٗ۔

پسماندگان: حضرت مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگ پوریؒ نے چار صاحبزادے چھوڑے جن کے اسماء یہ ہیں: مولانا عبدالرحمن صاحبؒ، مولانا لطف الرحمن صاحبؒ، مولانا حکیم عبدالمنان صاحبؒ، اور مولانا ولی الرحمن صاحب جو باحیات ہیں، ماشاءاللہ سبھی عالم فاضل ہوئے جو آپ کے لئے یقیناً نعمت عظیم اور صدقات جاریہ ہیں۔

ف: حضرت حکیم عبدالمنان صاحب سے اس حقیر کی ملاقات حضرت مرشدی مصلح الامتؒ کی خدمت میں متعدد بار ہوئی اور مولانا اسد اللہ صاحب، ابن مولانا عبدالرحمن صاحب سے تو بار بار حضرت مرشدی مولانا محمد احمد صاحبؒ کی خدمت میں ملاقات ہوتی رہی بلکہ بعد میں بھی ایک دو بار ہوئی۔ (مرتب)

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ المتوفی ۱۳۶۳ھ

نام ونسب وولادت: آپ کا وطن موضع محی الدین پور ضلع الہ آباد تھا، ولادت ۱۳۰۰ھ میں ہوئی، ۱۹۰۲ء میں جبکہ آپ بی۔اے۔میں زیر درس تھے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تشریف آوری الہ آباد میں ہوئی اور متعدد مقامات پر خصوصاً مدرسہ احیاء العلوم ملحق شیخ عبداللہ کی مسجد میں آپ کے وعظ ہوئے، آپ ان مواعظ حسنہ میں شریک ہوئے۔

تھانہ بھون کا سفر: جس سے بہت متاثر ہوئے حتی کہ خانقاہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر جا کر حضرت حکیم الامتؒ سے بیعت ہو گئے اور سلسلۂ چشتیہ کے اذکار واشغال کو جاری فرما کر مقامات سلوک کو طے فرمایا، مرشدِ کامل حضرت حکیم الامتؒ نے آپ کو خلعتِ خلافت سے نوازا اور ایک موقع پر فرمایا کہ ”عیسیٰ مسیح سے بڑھ گئے“، مسیح سے مراد مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی ہیں جنہوں نے جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ میں وفات پائی ہے۔

فضل وکمال: آپ فتح پور ہنسوہ کے کسی اسکول میں ماسٹر تھے اسی اثناء میں علوم دینیہ کے پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا چنانچہ حضرت مولانا نور محمد صاحبؒ خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے تفسیر، حدیث، فقہ کی کتابیں پڑھیں، پھر ۴۵ سال کی عمر میں آپ کو حفظ قرآن کا شوق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی پورا فرمایا۔

فتح پور ہنسوہ سے متعدد مقامات پر تبادلے ہوتے رہے، آخر ۱۹۲۳ء میں الہ آباد آئے اور ۱۹۳۷ء میں ریٹائر ہوئے اور بحکم مرشد اپنے وطن محی الدین پور میں قیام فرمایا، اہل الہ آباد رجوع ہوئے اور فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے، بعد میں آپ کے اکثر الہ آبادی مریدین حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی طرف رجوع ہوئے، حضرت مصلح الامت مولانا کے بڑے ہی مداح تھے اور عقیدت سے ان کے واقعات بیان فرماتے رہتے تھے۔

اتباع سنت: اتباع سنت طبیعت ثانیہ بن گئی تھی نمونۃً ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کرتا ہوں، جناب نامی صاحب مرحوم کی کوٹھی میں نہایت شگفتگی کے ساتھ بیٹھے حضرت مولانا باتیں کررہے تھے، نامی صاحب مرحوم اور احقر کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جہاں تک ہوسکتا ہے میں اپنے اختیار سے ایک ایک سنت پر عمل کرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تریسٹھ سال کی عمر میں میرا بھی انتقال ہوجائے تو یہ سنت بھی ادا ہوجائے لیکن یہ غیر اختیاری ہے، پھر تھوڑی دیر سکوت کے بعد فرمایا لیکن اللہ تعالی دل دیکھتا ہے ”امید کہ اس سنت پر بھی عمل کرادے گا“ اس کے بعد فرمایا کہ اس وقت میری عمر ۶۰ سال کی ہے، اس گفتگو کے ایک دو دن بعد اپنے وطن محی الدین پور تشریف لے گئے، خبر آئی کہ مولانا بیمار ہیں، اب یہ سلسلہ بیماری کا چلا، تین سال تک یہی رہا، کبھی بیمار کبھی صحت یاب، ۶۳ سال کی عمر میں اللہ اللہ کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے، کیسی مبارک زندگی اور کیسی مبارک موت تھی، اللہ تعالی ایسی مبارک موت ہر مومن کو نصیب فرمائے۔ آمین۔

تصانیف: آپ نے "انفاس عیسیٰ" کتاب لکھی جس میں حضرت حکیم الامت کے ملفوظات مفیدہ جمع فرمائے ہیں جو قابل مطالعہ ہے، نیز بہشتی زیور کا خلاصہ بنام بہشتی ثمر تحریر فرمایا جو اس لائق ہے کہ ہر مکتب میں اس کو داخل نصاب کیا جائے۔

وفات: سنہ ۱۹۴۰ء میں حضرتؒ پر فالج کا اثر ہوا، بغرض علاج جونپور مکرم حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحبؒ خلیفہ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے، مشیت ایزدی کہ وہاں پر فالج کا زبردست حملہ ہوا اور جانبر نہ ہو سکے اور ۲۵/ربیع الاول سنہ ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۱/مارچ سنہ ۱۹۴۴ء کو وفات پائی۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔**

اور مسجد اٹالہ کے متصل ایک چھوٹی مسجد کے زیر دیوار مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ونور اللہ مرقدہ۔

حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب حیدرآبادی لکھنویؒ المتوفی ۱۳۴۳ھ

پیدائش و ابتدائی حالات: مولانا کے آباءواجداد ریاست بیجاپور میں مقیم تھے پھر حیدرآباد آ کر سکونت پذیر ہوئے اور آپ وہیں ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو چہارشنبہ کے روز پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد سید محمد وزیرؒ صحیح النسب سادات میں سے تھے، آپ کا سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جا کر ملتا ہے، سید محمد وزیرؒ بہت متقی اور پرہیزگار انسان تھے اور عملیات میں بڑا تجربہ اور معلومات رکھتے تھے، اس فن میں بڑی شہرت اور قبولیت حاصل تھی۔

تعلیم و تربیت: مولانا کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی، اس کے بعد جب مزید تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو اس دور کے مختلف علماءوفضلاء کی طرف نظر دوڑائی گئی مگر نگاہ انتخاب استاذ الاساتذہ علامہ ابوالحسنات مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلیؒ پر پڑی، لہٰذا والد محترم سید صاحب آپ کو لے کر لکھنؤ تشریف لے آئے اور علامہ فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں داخل کر دیا، اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ۱۵ سال کی تھی، چند کتب درسیہ حضرت علامہ فرنگی محلی کے بعض منتہی طلباء سے پڑھیں جن میں شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ (م ۱۳۲۲ھ) کا نام قابل ذکر ہے۔

جناب مولوی عبدالحی صاحب فاروقی ایم اے نے رسالہ ''برہان'' دہلی بابت ماہ اپریل ۱۹۷۵ء میں مولانا عین القضاۃ صاحب کے حالات درج فرمائے ہیں اسی کو سامنے رکھ کر مختصراً آپ کے حالات پیش خدمت ہیں۔ (مرتب)

درسیات سے فارغ ہونے کے بعد سکونت مستقل طور پر لکھنؤ میں اختیار کرلی، مگر تمام عمر مجرد رہے اور نکاح نہیں کیا، لباس میں کرتا پائجامہ پنج گوشیہ ٹوپی اور حیدرآبادی رومال تھا، نہایت سادہ غذا استعمال کرتے، عام طور سے شوربا اور پھلکا آپ کو بہت مرغوب تھا۔ مہمان نوازی اور تواضع میں بے مثال تھے، انکساری وخاکساری طبیعت میں بہت تھی، ایک بار حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ (م.۱۳۳۹ھ) مولانا کے پاس تشریف لائے، آپ استقبال کے لئے زینہ تک آئے اور خود اپنی نشست گاہ پر بٹھانے کی کوشش کی، حضرت شیخ الہندؒ نے انکار فرمایا، مولانا نے فرمایا: یہ فقیر کی کمبلی ہے اس پر تشریف رکھیں'' شیخ الہندؒ نے انکار فرمایا، بجائے بزرگاں نشستن خطاست'' لیکن مولانا کا اصرار جاری رہا، مجبوراً شیخ الہندؒ کو بیٹھنا ہی پڑا۔

طریق درس: درس کے اوقات صبح اور شام تھے، آپ کا حلقہ درس اپنے استاذ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ کے زمانہ ہی سے شروع ہوگیا تھا اور کافی شہرت ہوچکی تھی سلسلہ تعلیم اور طریق درس ایسا عمدہ اور دلنشین تھا کہ جو شخص ایک کتاب بھی آپ سے سمجھ کر پڑھ لیتا اس میں ایک قسم کی استعداد پیدا ہوجاتی تھی اور چند ہی اسباق میں مطالعہ دیکھنے کا سلیقہ آجاتا تھا، تقریر درس بالکل علامہ فرنگی محلی کے مشابہ تھی اگر کوئی طالب علم ناغہ کرتا یا محنت نہ کرتا تو اس کی طرف نظر التفات کم ہوجاتی۔

بیعت وارشاد: آپ کو بیعت کا شرف شیخ موسٰی مہتر ترکیسری نقشبندیؒ مجددی سے تھا جو ترکیسر ضلع سورت کے رہنے والے تھے، جن کا ذکر جلد ہشتم میں آچکا ہے، ملاحظہ فرمالیا جائے۔

مدرسہ عالیہ فرقانیہ: آپ کے والد ماجد نے لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا مکتب بچوں کو قرآن پڑھانے کے لئے قائم کیا تھا اسی مکتب کو بعد میں مولانا عین القضاۃ

صاحب نے وقت کی ضرورت دیکھتے ہوئے ایک عظیم الشان مدرسہ کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کا نام مدرسہ عالیہ فرقانیہ تجویز فرمایا، اس مدرسہ کے لئے اعلیٰ درجہ کے حفاظ وقراء و علماء مقرر ہوئے حتیٰ کہ قاری عبدالرحمن مکیؒ بھی اس مدرسہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہے۔ مولانا کی حیات میں ہر طالب علم کو دونوں وقت کی خوراک اور اخراجات کے لئے وظیفہ ملتا تھا اور ہر ایک کو سردی و گرمی کے لحاظ سے کپڑے بھی مہیا کئے جاتے تھے، جب کوئی بچہ مولانا کے پاس حاضر ہوتا تو آپ اس سے قراءت کی فرمائش کرتے اور سن کر فرماتے:

ہم کو یہ آوازیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور یہی بچے ہمارے قوال ہیں۔

جود وسخاوت: مولاناؒ بہت فیاض وسخی تھے، غرباء ومساکین، یتیموں بیواؤں کے ساتھ بڑی داد و دہش فرماتے، ساتھ ہی اتنے بڑے مدرسہ کے اخراجات کی آمدنی کن ذرائع سے ہوتی تھی اب تک کسی کو علم نہیں، مولانا نے کبھی مدرسہ کے لئے یا اور کسی دوسرے کاموں کے لئے کوئی چندہ وغیرہ نہ کیا اور نہ ہی کوئی ہدیہ بظاہر قبول کیا۔

ثقہ اور باخبر حضرات کا خیال ہے کہ مولانا کے بعض مخصوص معتقدین تھے جو پوشیدہ طور پر ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

وفات: ۲؍رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ کا ۶۸؍سال کی عمر میں وصال ہوگیا اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ چوک لکھنؤ کے چمن میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ۔

تلامذہ: مولانا کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے، ان میں ایک امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی بھی ہیں، جو اپنے کارناموں کی وجہ سے معروف ومشہور ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوبؒ المتوفی: ۱۳۶۳ھ

نام وولادت: نام خواجہ عزیز الحسن اور تخلص مجذوب ہے، آپ کی ولادت ۱۱رشعبان ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔

فضل وکمال: حضرت خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ فطری شاعر تھے ان کا شمار ملک کے مشاہیر شعراء میں ہوتا تھا، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے، اپنے شیخ سے والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے اورانہیں فنافی الشیخ کا درجہ حاصل تھا، کہتے ہیں کہ مجذوب صاحب کومولانا تھانوی سے وہی نسبت تھی جوحضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں حضرت امیر خسروؒ کو حاصل تھی، حضرت حکیم الامتؒ کوبھی خواجہ صاحب سے بدرجہ غایت اُنس تھا، مجذوب صاحب جب اپنا کلام پڑھتے توان پر کیف ووارفتگی کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوجاتی، بعض اوقات حضرتؒ بھی دیر تک سرجھکائے ان کا کلام سنتے رہتے، ان کے کلام میں حقائق وبصائر اورتعلیمات اشرفیہ کوبھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے، ان کو اپنے شیخ کا ایک ایک ملفوظ، ایک ایک حکم، ایک ایک نصیحت یادتھی، حضرتؒ کی برسہابرس اور ہزاروں صفحات پرلکھی جانے والی تعلیمات کو چند صفحات میں نظم کردیا، مولانا تھانویؒ ان کے

عزیزم مولانا سید نجم الحسن صاحب ناظم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون نے ''قطعات مجذوب'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کردیا ہے، اسی سے حالات وقطعات نقل کررہاہوں۔ (مرتب)

اشعار کی ایک ملفوظ میں اس طرح تعریف فرماتے ہیں۔

''خواجہ صاحب تصوف کے دقائق اورغوامض کواپنے اشعار میں ادا کرتے ہیں''

خدمات: خواجہ صاحب اولاً ڈپٹی کلکٹر رہے، پھر بعض دینی مصالح کی بنا پر اپنا تبادلہ ڈپٹی انسپکٹر تعلیم کے عہدہ پر کرالیا، اسی عہدہ سے پنشن پاکر ریٹائر ہوئے اوراس کے بعد زیادہ وقت خانقاہ امدادیہ میں گزارا، دنیاوی وجاہت کے باوجود طبیعت میں تواضع اور سادگی غالب تھی، خواجہ صاحب نے اپنے مفصل حالات اشرف السوانح میں ضمناً تحریر فرمادیئے ہیں، ذکر مجذوب کے نام سے آپ کی مستقل سوانح بھی آچکی ہے، آپ کے مختلف مجموعہ کلام بھی شائع ہوچکے ہیں جن میں کشکول مجذوب مشہور رہے، اب آپ کے اشعار وقطعات ملاحظہ ہوں۔

استفاضہ کے شرائط:

چارشرطیں لازمی ہیں استفاضہ کیلئے　　اطلاع واتباع واعتقاد و انقیاد

یہ مقفیٰ قول ہے رنگین بھی سنگین بھی　　حضرتِ مرشد کا یہ ارشاد رکھ تاعمر یاد

ف: آج بزرگوں سے تعلق کے باوجود ان کے فیض سے جو ہم محروم رہتے ہیں تواس کی وجہ انہیں شرائط پر عمل نہ کرنا ہے۔ خوب سمجھ لیں۔ (مرتب)

سستی کا علاج:

اصلاح میں اپنی کرنہ سستی　　ہمت پہ ہے منحصر درستی

فرماگئے ہیں حکیم الامت　　سستی کا علاج بس ہے چستی

ف: اسی کو حضرت حکیم الامتؒ فرمایا کرتے ہیں کہ اختیاری اعمال کو اپنے

اختیار سے کرو اور غیر اختیاری کے پیچھے نہ پڑو، اس سے دین کے یسر و سہولت کو واضح فرما کے امت پر احسانِ عظیم فرمایا۔ (مرتب)

ظاہر و باطن کا ہر چھوٹا گناہ　　اس سے بچ رہو کہ ہے وہ سدِّ راہ

لب پہ ہر دم ذکر بھی ہو دل میں ہر دم فکر بھی　　پھر تو بالکل راستہ ہے صاف تا دربارِ شاہ

وساوس کا علاج:

وساوس جو آتے ہیں اس کا ہو غم کیوں　　عبث اپنے جی کو جلانا برا ہے

خبر تجھ کو اتنی بھی ناداں نہیں ہے　　وساوس کا لانا کہ آنا برا ہے

ف: سبحان اللہ! اس اہم مسئلہ کو کتنی آسانی سے حل فرما دیا، یہ حکیم الامتؒ ہی کا ارشاد ہے، جس کو حضرت خواجہ صاحب نے منظوم فرما دیا ہے، فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ (مرتب)

حال کا خیال:

سوچ ماضی کو نہ استقبال کو　　ٹھیک رکھ تو تو بس اپنے حال کو

کیا ہوا کیا ہوگا اس غم میں نہ پڑ　　تو عبث سر لے نہ اس جنجال کو

ف: یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے جو ہزار الجھنوں اور پریشانیوں کا علاج ہے، اس لئے کہ عموماً لوگ ماضی و مستقبل کے غم و فکر میں اپنے اوقات کو ضائع کرتے ہیں، اور حال کا خیال کر کے کام میں نہیں لگتے جس سے محروم کے محروم رہ جاتے ہیں۔ (مرتب)

کیا نتیجہ ہوگا کیونکر ہوگا یہ اوہام چھوڑ
کام کر اور جس کا ہے کام اس پہ تو انجام چھوڑ
اجر لے ناکام ہو کر بھی نہ رب کا کام چھوڑ
وقت ہے جدو جہد کا راحت و آرام چھوڑ

ف: اس قطعہ میں کام کی طرف زبردست ترغیب دی ہے، اس لئے کہ ہمارا کام تو عمل ہی کرنا ہے، رہا اجر تو اللہ کریم ہے ضرور عنایت فرمائے گا، اس لئے کہ ع ''خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند'' یعنی آقا خود بندہ پروری کا طریقہ جانتا ہے۔ (مرتب)

دل کیوں نہیں لگتا طاعتوں میں
اس فکر کے پاس بھی نہ جانا
دل لگنا کہاں ہے فرض تجھ پر
ترا تو فرض ہے دل لگانا

ف: اس میں بھی طالبین کی تسلی کے لئے سہل نسخہ بیان فرمایا ہے جو مستحضر رکھنے کے لائق ہے بلکہ لوگوں کو بتلانے کی ضرورت ہے۔ (مرتب)

مالک ہے جو چاہے کر تصرف
کیا وجہ کسی بھی فکر کی ہے
بیٹھا ہوں میں مطمئن کہ یا رب
حاکم بھی ہے تو حکیم بھی ہے

ف: اس قطعہ میں اہل مصیبت کے لئے کیا ہی خوب مراقبہ ہے جو یقیناً موجبِ طمانینت وتسلی ہے۔ (مرتب)

تو ہو کسی بھی حال میں مولا سے لَو لگائے جا
قدرتِ ذوالجلال میں کیا نہیں گڑگڑائے جا
بیٹھے گا چین سے اگر، کام کے کیا رہیں گے پر
گو نہ نکل سکے مگر پنجرہ میں پھڑ پھڑائے جا

ضربیں کسی کے نام کی دل پہ یوں ہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ، دَر یوں ہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں دَر، اس پہ ہو کیوں تیری نظر
تو تو بس اپنا کام کر، یعنی صَدا لگائے جا

کتنی ہی مشکلات ہوں پروا نہ چاہیے
اقدام راہِ حق میں دلیرانہ چاہیے
لیکن یہ گُر رسائی منزل کا یاد رکھ
کوشش تو خوب چاہیے دعویٰ نہ چاہیے

ف: سبحان اللہ! ان تینوں قطعات میں طریق کی نہایت اہم تعلیم ہے، جو ہر سالک راہ بلکہ مسلمان کو پیش نظر ہی نہیں بلکہ لائحہ عمل بنانا چاہیے، اور اس کے ذریعہ اپنے خالق و مالک سے تعلق کو استوار کرنا چاہیے۔ (مرتب)

کامیابی تو کام سے ہوگی نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
فکر اور اہتمام سے ہوگی ذکر کے التزام سے ہوگی

ف: نہایت مفید و کارآمد قطعہ ہے، اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ (مرتب)

لب پہ ذکر اللہ کی تکرار ہو دل میں ہردم حق کا استحضار ہو
اس پہ تو کرلے اگر حاصل دوام پھر تو بس کچھ دن میں بیڑا پار ہو

ف: سبحان اللہ! کیا خوب قطعہ ہے جو قابل استحضار ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ (مرتب)

رکھ نظر میں ہمیشہ دو باتیں اے دو عالم کی خیر کے طالب
طبع غالب نہ عقل پر ہو کبھی اور نہ ہو عقل شرع پر غالب

ف: ماشاءاللہ! کیا ہی خوب کلیہ بیان فرمایا یعنی طبیعت پر عقل کو غالب رکھنا چاہئے اور عقل پر شریعت کو، یعنی طبع و عقل اگر دونوں ہی شریعت کے مزاحم ہوں تو تقاضائے عقل وطبع کو ترک کر دینا چاہئے۔ (مرتب)

جو ناکام ہوتا رہے زندگی بھر بہر حال کوشش تو عاشق نہ چھوڑے

یہ رشتہ محبت کا قائم ہی رکھے جو سوبار ٹوٹے تو سو بار جوڑے

ف: عشق ومحبت کا یہی تقاضا ہے کہ معشوق ومحبوب کی اطاعت اور اس کے راضی رکھنے کی فکر میں لگا رہے ورنہ عاشقی کا دم بھرنا عبث ولغو ہے بلکہ ایسے کو عاشق کہا ہی نہیں جاتا، بوالہوس کہا جاتا ہے۔ (مرتب)

احسان جتا کر نہ کوئی میرے گھر آئے

احسان مراماں کر آئے اگر آئے

بیٹھا ہوں غنی ہو کے میں ہر شاہ وگدا سے

سو بار غرض جس کو پڑے وہ اِدھر آئے

ف: اہل اللہ کی یہی شان ہوتی ہے، اللہ تعالی سے ایسا ربط اور ان پر ایسا توکل کا غلبہ ہو جاتا ہے کہ مخلوق سے استغناء کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک اللہ سے تعلق کی بنا پر سارے جہان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ (مرتب)

لطف دنیا کے ہیں کے دن کے لئے

کھو نہ جنت کے مزے ان کے لئے

یہ کیا اے دل تو بس پھر یوں سمجھ

تو نے ناداں گل دیئے تنکے کے لئے

ف: اس میں آخرت کی بقاودوام اور دنیا اور اس کی لذات کی بے ثباتی کو بیان فرمایا ہے اور اس کے پیچھے پڑکر آخرت کی نعمتوں سے غفلت ولا پرواہی انتہائی نادانی کی بات ہے جو ایک مسلمان کی شان سے بعید ہے۔(مرتب)

ترک دنیا کر، نہ ہر لذت کو چھوڑ
معصیت کو ترک کر غفلت کو چھوڑ

نفس وشیطاں لاکھ درپے ہوں مگر
تو نہ ہرگز ذکر اور طاعت کو چھوڑ

ف: اس میں بھی نفس وشیطان کی اطاعت سے روکا ہے اور ذکر وطاعت کی ترغیب دی ہے اللہ تعالی ہم کو عمل کی توفیق دے۔(مرتب)

فکر دنیا تجھ کو صبح و شام ہے
اس سے غفلت ہے جو اصلی کام ہے

کچھ دنوں سہہ لے مشقت دین کی
پھر تو بس آرام ہی آرام ہے

ف: سبحان اللہ! کیا ہی خوب حقیقت بیان فرمائی جو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔(مرتب)

نفع دینی دیکھ تو دنیا کی بہبودی نہ دیکھ
مرضیِ حق پر نظر کر اپنی بہبودی نہ دیکھ

تو اکیلا تیرے دشمن سیکڑوں یہ بھی نہ دیکھ
قدرتِ حق پر نظر کر اپنی کمزوری نہ دیکھ

ف: سبحان اللہ! کیسی زبردست تعلیم مسلمانوں کو دی ہے اگر یہ پیش نظر ہو جائے تو آج مسلمانوں کا کام بن جائے۔ (مرتب)

بہرِ غفلت یہ تیری ہستی نہیں
دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں

رہ گزر دنیا ہے یہ بستی نہیں
جائے عیش و عشرت و مستی نہیں

ف: سبحان اللہ! دنیا و آخرت کی کیسی حقیقت بیان فرمائی جو عین حقیقت ہے اور موید بالکتاب والسنۃ ہے۔ (مرتب)

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
چپکے چپکے رفتہ رفتہ دَم بدم

سانس ہے اک رہروِ ملکِ عدم
دفعتاً اک روز یہ جائے گا تھم

ف: اس قطعہ میں کتنا عمدہ مراقبۂ موت ہے، جو نہایت مؤثر و مفید ہے اس لئے اس کو مستحضر رکھنا چاہئے۔ (قطعات مجذوب)

اب ہم "کشکول مجذوب" کے پیش لفظ مرقومہ مولانا انعام الرحمن صاحب تھانوی سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کر کے تذکرہ خواجہ صاحب مجذوب کو تمام کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا کلام علم و حکمت کا خزینہ اور حقائق و معارف کا بیش بہا گنجینہ ہے، زندگی کی تمام تعبیریں ان کے کلام میں موجود ہیں، حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ نہیں ہے جس کے متعلق انہوں نے کوئی راہِ عمل نہ دکھائی ہو اور عشق

ومحبتِ الٰہی کا جذبہ تو ان کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، وہ ہر موقع پر مالکِ حقیقی کی رضا و خوشنودی کے طالب اور مشتاق نظر آتے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی　　اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

واقعی اس محبوبِ حقیقی کی لگن اور عشق صادق کی سچی تڑپ سے اہل دل حضرات کی یہی کیفیت ہوتی ہے، وہ تمام تمناؤں سے اپنے سینے کو خالی کر لیتے ہیں، صرف ایک اس کی تمنا کے لئے وہ سب آرزؤوں کو ختم کردیتے ہیں، صرف ایک اس کی آرزو کے لئے۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ اس شعر کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے، خود خواجہ صاحب کا بیان ہے، یہ شعر حضرت اقدس کو اپنے حسب حال ہونے کی وجہ سے اس درجہ پسند تھا کہ ایک بار مسکراتے ہوئے فرمایا: اگر میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں ایک لاکھ روپیہ آپ کو اس شعر کا انعام دیتا، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا:

جب کبھی مجھکو یہ شعر یاد آجاتا ہے، تو کم از کم تین بار پڑھے بغیر سیری نہیں ہوتی۔ حضرت حکیم الامتؒ ان کے اشعار کی ایک سلسلۂ ملفوظ میں اس طرح تعریف فرماتے ہیں: ''خواجہ صاحب تصوف کے حقائق وغوامض کو اپنے اشعار میں ادا کرتے ہیں۔''

حضرت حکیم الامتؒ جیسے مجمع الفضائل جامع کمالات اور باذوق بزرگ کی مدح وتوصیف خواجہ صاحبؒ کے لئے حسن قبول کی ایک عمدہ اور بہترین سند ہے۔

وفات: آپ کی وفات ۲۷؍شعبان ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء کو اپنے وطن اورئی ضلع جالون میں ہوئی۔ نوّر اللہ مرقدہ۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب دملوی بہار المتوفی ۱۳۶۴ھ

نام ونسب مع ولادت : مولانا محمد ادریس بن حاجی امیر الدین تقریباً ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں اپنی ماں کی نانیہال موضع پروہی میں پیدا ہوئے، ضلع دربھنگہ (حال مدھوبنی) کے مشہور ومعروف موضع دملہ میں کو آپ کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

تعلیم وتربیت : ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، کچھ دنوں بعد مدرسہ احمدیہ مدھوبنی میں بھی رہے، پھر اعلیٰ تعلیم کے غرض سے دارالعلوم دیوبند گئے۔اسی زمانہ میں نودرہ کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم کے شیخ الحدیث تھے، مولانا محمد ادریس حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں رہنے لگے، اپنی فطری صلاحیتوں کی وجہ سے استاد کے نور نظر ہو گئے۔اور دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں فراغت حاصل کی۔

بیعت : زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کے اندر خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور اپنے استاذ مکرم حضرت شیخ الہندؒ کے دست مبارک پر بیعت ہو گئے، اور ان سے پورے طور پر فیض یاب ہوئے۔آپ کی تعلیم وتربیت میں آپ کے بھائی حافظ محمد یاسین کا خاص حصہ ہے۔ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء میں فارغ التحصیل ہوکر وطن واپس تشریف لائے۔

تدریسی خدمت : حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے مدرسہ دارالعلوم ڈابھیل گجرات میں تدریسی خدمت انجام دیا۔ حافظ محمد یاسین کا ارادہ شروع ہی سے مدرسہ قائم کرنے کا تھا۔مولانا کو بھی اس پروگرام میں شریک کرلیا۔بعض تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا گجرات نہیں گئے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں صورت

حال لکھ دیا۔ اور معذرت طلب کرلی اور اپنے ہی دروازہ پر اپنے معاونین کی مدد سے ایک مدرسہ قائم کیا۔اس کا نام حضرت شیخ الہندؒ کے نام پر ہی مدرسہ محمود العلوم رکھا،شروع میں آپ ہی کا گھرانا مدرسہ کے سارے اخراجات برداشت کرتا رہا۔پھر مدرسہ کو موجودہ جگہ پر منتقل کردیا گیا۔

مولانا نے اپنے ہی زمانہ میں مدرسہ کو خوب ترقی دی ،آپ مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس بھی تھے۔نحو، فقہ،تفسیر اور منطق کی کتابیں خود پڑھایا کرتے تھے۔حدیث کی کتابیں بڑے محققانہ انداز پر پڑھایا کرتے تھے۔آپ کے بھائی حافظ محمد یاسین جو مدرسہ کے اصل محرک تھے ،بڑے نیک اور کامیاب تاجر تھے ،آپ کا کاروبار گھر سے کلکتہ اور وہاں سے ڈھاکہ اور کراچی تک پھیلا ہوا تھا۔آپ شروع سے مدرسہ کے مہتمم رہے،اور یہ خدمت اپنے وصال تک انجام دیتے رہے۔

حضرت مولانا محمد بشارت کریم گڑھولویؒ کے شیخ طریقت حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ سے بھی آپ کو اجازت حاصل تھی ،اس علاقہ کا کوئی آدمی حضرت مولانا محمد بشارت کریمؒ کی خدمت میں بیعت کے لئے جاتا تو فرماتے، یہاں کیوں آئے ہو وہاں کے لئے مولانا محمد ادریس کافی ہیں۔

حضرت مولانا محمد ادریسؒ جید عالم اور بافیض بزرگ تھے۔آپ سے بہت سے علماء نے فیض حاصل کیا حضرت مولانا صاحب جائداد تھے۔ مدرسہ کے بہت سے طلبہ کی کفالت بھی کرتے تھے۔

وفات: ۱۴/ اپریل ۱۹۴۴ء مطابق ۱۳۶۴ھ میں دملہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ **نور اللہ مرقدہٗ**۔ (تذکرہ علماء بہار صفحہ: ۳۰۳)

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ م ۱۳۶۴ھ

نام ونسب وولادت: آپ کی ولادت ۸ رشوال ۱۲۹۴ھ بمقام دیوبند ہوئی والد ماجد کا اسمِ گرامی محمد حسین شاہ صاحبؒ ہے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، دیوبند میں حضرت میاں صاحبؒ کے لقب سے مشہور تھے، دارالعلوم میں درجہ علیا کے استاذ تھے۔

تعلیم: فارسی کی تعلیم آپ نے اپنے والد صاحب سے حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر ۱۳۱۰ھ میں فارسی کی تکمیل فرمائی، اور شعبۂ عربی میں داخلہ لیا، ۱۳۲۰ھ میں درس نظامی کی تکمیل فرمائی، آپ کے مشہور اساتذہ یہ ہیں: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب قاسمیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ۔

تدریس: ۱۳۲۱ھ میں آپ کو جونپور کی اٹالہ مسجد کے مدرسہ میں صدر مدرس بنا کر بھیج دیا گیا، وہاں برابر تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، آخر ۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کی طلبی پر دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور علاوہ درس وتدریس کے (ماہنامہ رسالہ القاسم) کی ادارت کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔

عزیزم مولوی صغیر احمد پرتا بگڈھی استاد جامعۃ الامام انور دیوبند نے مولاناؒ کے متعلق طویل مضمون لکھ کر بھیجا اسی کی تلخیص پیش خدمت ہے۔ (مرتب)

اسباق میں پابندیٔ اوقات آپ کی بلند خصوصیات میں سے ہے، چنانچہ ۱۳۵۴ھ میں آپ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا تو آپ نے نماز فجر پڑھ کر تجہیز وتکفین کا کام اپنے صاحبزادوں کے سپرد کیا اور مدرسہ سبق پڑھانے آ گئے، حسب دستور سبق پڑھایا اور سبق کے بعد مرحومہ کیلئے طلبہ سے دعائے مغفرت کرائی، اور جنازہ تیار ہونے پر شریک جنازہ ہو گئے۔

بیعت: آپ بیعت حضرت شاہ عبداللہ عرف مناشاہ صاحبؒ سے تھے جو اپنے زمانہ کے کاملین میں سے تھے۔

اجازت: آپ کو اجازت حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے حاصل تھی، نیز از خود حضرت مناشاہ صاحب نے وفات سے ایک دن قبل اجازت بیعت وخلافت عطا فرمائی۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں سے فتاویٰ محمدیہ، نیک بیبیاں اور حیات شیخ الہندؒ ہے۔

ارشادات

آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے احباب سے گذارش کرتا ہوں کہ ہر سنت کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام رکھیں، اور کسی سنت کو خواہ وہ کتنی بھی چھوٹی ہو معمولی نہ سمجھیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ہر سنت اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

ایک مجلس میں حضرت نے "**وَمَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَاللهِ بَاقٍ**" کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ مال ومتاع، دولت وسامان کے اندر ہی منحصر نہیں بلکہ ہمارے جملہ احوال واوصاف وحوادث وعوارض کا بھی یہی حال ہے۔

ایک بار فرمایا کہ دنیا ومافیہا فانی ہیں، اصل مقصود حیات اخروی ہے اور اس کا مدار قرب خداوندی پر ہے اور قرب خداوندی کے اندر درجات ہیں اور قرب کا حصول اخلاق حسنہ کے حصول اور اخلاق ذمیمہ سے اجتناب پر موقوف ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا: زندگی مستعار ہے، راحت وآرام سے بسر ہو یا ضیق وافلاس سے، ہر حال میں شکر گذار رہنا چاہئے۔

ایک بار ارشاد فرمایا کہ ساری ولایت وبزرگی اتباعِ سنت ہے اور جس درجہ تقویٰ اور خشیّت ہوگی اسی درجہ معرفتِ حق تعالی پیدا ہوگی۔

ایک بار ارشاد فرمایا کہ شریعت سے انحراف کے ساتھ طریقت کا دعویٰ باطل ہے اور شریعت وطریقت دو چیزیں الگ الگ نہیں، اور مقصود دونوں کا ایک ہے۔

ف: سبحان اللہ تعالی! کیسے مفید وجامع ارشادات ہیں جو درحقیقت شریعت وطریقت کا مغز وخلاصہ ہیں، جس سے اپنے اکابر کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ **فَهَنِيئًا لَهُم**۔ (مرتب)

وفات: آپ نے ساری زندگی درس وتدریس اور اصلاح وتبلیغ میں گذاری، ۱۳۶۳ھ بعد رمضان راندیر ضلع سورت گجرات تشریف لے گئے، اور ۲۲ محرم ۱۳۶۴ھ مطابق ۸ جنوری ۱۹۴۵ء دوشنبہ کے دن سیٹھ اسمٰعیل غلام حسین سورتی صاحب کے مکان پر اس دار فانی سے رحلت فرمائی **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔ اور راندیر ضلع سورت کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ۔

حضرت مولانا حکیم عبدالخالق صاحب ہوشیار پوری المتوفی ۱۳۶۵ھ

نام ونسب مع ولادت: مولانا حکیم عبدالخالق صاحب ٹانڈہ ہوشیار پور میں ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میاں غلام نقشبند ایک نیک وصالح بزرگ اور بڑے زمیندار تھے۔

تعلیم: حکیم صاحب نے حضرت مفتی محمد حسن صاحب سے ابتدائی کتب پڑھنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید اصغر حسین صاحب سے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد لکھنؤ کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور نہایت اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ امرتسر میں اپنا مطب قائم کیا۔ طب کا مشغلہ آپ کا ذریعہ معاش نہ تھا بلکہ یہ محض خدمتِ خلق کی غرض سے اختیار کیا تھا۔

بیعت وخلافت: اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے تعلق قائم فرما دیا وہاں پر دینی رنگ اور زیادہ چڑھ گیا۔ ہر سال رمضان المبارک خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذارتے تھے حضرت حکیم الامت نے آپ کو بیعت وتلقین کی اجازت سے نوازا تھا۔

حضرت تھانویؒ سے مکاتبت: جب حکیم صاحب کی بیوی کا انتقال ہوا تو آپ نے حضرت تھانوی قدس سرہ کو اس کی اطلاع دی پھر مکرر خط لکھا کہ ''میں پہلے بھی حضرت کو اطلاع دے چکا ہوں کہ میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے میری

اہلیہ مجھے اس قدر محبوب تھی کہ مجھے اس کی جدائی کا تحمل نہیں مجھے کسی پہلو قرار نہیں اب میرے لئے اندھیرے ہیں حضرت کوئی علاج ارشاد فرمائیں جس سے میرے دل کو قرار ہو۔ حضرت حکیم الامت نے جواب میں ارشاد فرمایا دنیا آرام کا گھر ہی نہیں، ہمارا اصل گھر آخرت ہے اصل آرام وہیں ملے گا۔ یہاں ہر تکلیف کیلئے تیار رہنا چاہئے اور جس تکلیف سے آخرت بنتی ہو اس کا تحمل کرنا چاہئے'' جب یہ خط حکیم صاحب کو پہنچا تو حضرت کی خدمت میں لکھا کہ ''خط مل گیا۔ حضرت کی تجویز کردہ علاج کو پڑھا ایک جادو اور شومنتر ہاتھ میں آ گیا۔ غم کے سب بادل چھٹ گئے۔ دل کو قرار آ گیا'' حضرت حکیم الامت نے جب یہ خط پڑھا تو فرمایا ''مجھے حکیم صاحب کے اس خط سے بیحد خوشی ہوئی''۔

ایک مرتبہ آپ نے حضرت قدس سرہ کی خدمت میں تحریر کیا کہ تصورِ شیخ سے طبیعت میں ایک قسم کا انتشار پیدا ہوتا ہے تو حضرت نے اس پر تحریر فرمایا۔

دست بوسی چوں رسید از فضلِ شاہ

پائے بوسی اندر آں دم شد گناہ

آپ نے ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت کی خدمت مین تحریر کیا کہ اہل امرتسر حضور کی عنایت عامہ سے بہت خوش ہیں'' اس پر حضرت قدس سرہ نے جواب میں تحریر فرمایا ''میں خود ان کی محبت سے بہت متاثر ہوں۔

حکیم صاحب کو اپنے شیخ کے ساتھ جو محبت وعقیدت تھی اس کا اندازہ فیوض الخالق کے دیباچہ سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ یہ کتاب حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے انہوں نے مرتب کیا تھا۔ آپ نے عرض حال کے

زیر عنوان لکھا'' یہ مجموعہ حضرت سیدی وسندی حکیم الامت مجدد الملت قطب الارشاد حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کے ملفوظاتِ مبارکہ کا ہے جو اس خاکسار نے پانچ سال کے ہر ماہ رمضان شریف کی حاضری خانقاہ کے موقع پر حضرت والا کی مجلس شریف میں بیٹھ کر سنے اور ان کے متفرق حصوں کو ایک جگہ جمع کر کے حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اس کو پسند فرمایا اور اس کا نام فیوض الخالق تجویز فرمایا چونکہ ان ملفوظات میں علوم ومعارف کا ایک خاص ذخیرہ ہے اس لئے ان کو طباعت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

وفات: ۱۱/فروری ۱۹۴۵ء مطابق ۱۳۶۵ھ کو آپ نے وفات پائی۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ۔**

(بزم اشرف کے چراغ صفحہ: ۵۶)

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اعظمیؒ المتوفی ۱۳۶۵ھ

بانی مدرسہ الاصلاح سرائمیر

نام ونسب و ولادت: حضرت مولانا محمد شفیع ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں ''سیدھا سلطان پور'' میں پیدا ہوئے، جو قصبہ سرائے میر سے چار میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں واقع ہے۔آپ کا تاریخی نام ابوالبرکات محمد شفیع خان ہے،اس حساب سے سنہ ولادت ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۸۳ھ ہے آپ کے والد کا نام کریم بخش خاں تھا، بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو آپ کے حقیقی چچا حافظ قادر بخش اور حافظ کریم نے آپ کی پرورش و پرداخت کی،مولانا محمد شفیع کے خاندان میں دینی تعلیم بھی تھی اور دینداری بھی، اور نہ صرف یہ کہ کھاتا پیتا خاندان تھا، بلکہ اپنی پرہیز گاری اور پابندیٔ شریعت کی بنا پر اطراف و دیار میں ایک ممتاز خاندان شمار کیا جاتا تھا۔

تعلیم وتربیت: سات برس کے ہوئے تو آپ کے چچا حافظ قادر بخش صاحب ان کو دانا پور پٹنہ لے گئے جہاں وہ مدت سے تعلیمی خدمات پر مامور تھے وہ پورے شہر دانا پور میں اپنی شرافت اور بزرگی کی بنا پر نہایت احترام وعزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کی فیاضی، بے لوث خدمت اور خشیت وتقوی کے سبھی معترف تھے اور احتراماً نام کے بجائے تمام لوگ بڑے حافظ صاحب سے آپ کو مخاطب کرتے تھے۔حافظ قادر بخش نے ہونہار بھتیجے کی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی پہلے قرآن حفظ کرایا، اردو اور فارسی کی تعلیم دی، پھر شہر دانا پور میں

ناریل گھاٹ کے مدرسہ میں داخل کردیا، یہ مدرسہ اس زمانے میں غیر مقلدوں کا ممتاز مدرسہ سمجھا جاتا تھا، بہار کے جید علماء اور صادق پور کی بعض اہم شخصیتیں اس میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہی تھیں اور صدارتِ تدریس کے منصب پر مولانا فیض اللہ مئوی تلمیذ مولانا سخاوت علی جونپوری جلوہ افروز تھے۔ مولانا فیض اللہ صاحب مولانا محمد شفیع کی ذہانت وفطانت اور فطری صلاح وتقوی سے بہت متاثر تھے اس لئے بہت زیادہ شفقت فرماتے۔

مولانا محمد شفیع صاحبؒ نے عربی ادب، معقولات اور منقولات کی مکمل تعلیم مدرسہ دارالحدیث ناریل گھاٹ داناپور ہی میں پائی، رفقائے درس میں مولانا ابوالحسنات عبدالغفور داناپوریؒ اور مولانا ابوالمکارم محمد علی مئویؒ تھے، ان دونوں کے مولانا سے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے، مولانا عبدالغفورؒ کی بعض تالیفات پر آپ نے حواشی بھی لکھے ہیں۔

۱۳۰٦ھ مطابق ۱۸۸۹ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اس موقع پر مولانا فیض اللہ اس زمانے میں دہلی کے اندر میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی کے درس حدیث کی بڑی شہرت تھی، چنانچہ دہلی جاکر میاں صاحب سے بھی حدیث کے چند اسباق پڑھے اور سند واجازت حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں تک ناریل گھاٹ داناپور کے مدرسہ دارالحدیث میں تعلیم دی پھر اپنے وطن چلے آئے، پہلے اپنے آبائی وطن سیدھا سلطان پور میں تدریسی سلسلہ شروع کیا، پھر بڈہریا اور ہمئی درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔

بیعت وخلافت: چونکہ مولانا کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی، اس لئے

تعلیم سے فراغت کے بعد، اصلاحِ باطن، تزکیہ نفس اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کی طرف دھیان ہوا اور اس دور کے مشہور صاحب دل بزرگ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی سے بیعت ہو گئے۔ حضرت چاند شاہ اصطلاحی اور عرفی طور پر باقاعدہ عالم تو نہ تھے، لیکن ان سے سیکڑوں عالم اور بندگان خدا نے باطنی تربیت حاصل کی، ان کی خانقاہ انتہائی سادہ ہوتے ہوئے بھی تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس کی بے مثال درس گاہ مانی جاتی تھی، مولانا محمد شفیع نے اسی خانقاہ سے روحانی فیض حاصل کیا، حضرت چاند شاہ مولانا کے متعلق فرماتے تھے کہ ایسا جوانِ صالح کم نظر آیا جو دولت علم کے ساتھ گداز قلب کی غیر معمولی کیفیت بھی رکھتا ہو۔ اسی خصوصیت کی بنا پر شاہ صاحبؒ نے اپنے پوتوں میں سے مولانا نور الحسن اور مولانا فخر الحسن کی بسم اللہ مولانا محمد شفیع ہی سے کرائی۔

مولانا محمد شفیع صاحب کا اعمال و اشغال کی جانب انہماک بڑھنے لگا تو اپنی خاص مجلس میں مولانا کو مخاطب کر کے اپنے پوربی لہجے میں فرمایا:

”بھیا شفیع صفیانہ بکھیڑوں میں زیادہ مت پڑو جتنا کرتے ہو اس سے زیادہ کی آپ کو ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ آپ سے دوسرے طرز کا کام لینے والا ہے، آپ کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح ہوگی اور علم دین کا ایسا سرچشمہ پیدا ہوگا جس کا فیضان دور دور تک پہونچے گا۔ چنانچہ حضرت چاند شاہ کی بشارت انجمن اصلاح المسلمین اور مدرسۃ الاصلاح کی شکل میں ظاہر ہوئی، حضرت چاند شاہ المتوفی ۱۳۱۷ھ کی وفات کے بعد مولانا نے حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی المتوفی ۱۳۴۹ھ کی جانب رجوع کیا اور حضرت سید صاحبؒ

سے آپ کو خلافت و اجازت بھی حاصل ہوئی، حضرت سید صاحبؒ بڑے جلالی اور باکمال بزرگ تھے، دعوت و ارشاد کے ساتھ ازالۂ بدعات میں بیحد متشدد تھے، ان سے جب مولانا محمد شفیع کو قربت اور روحانی ارتباط حاصل ہوا تو اصلاح دینی کا جذبہ اور بھی ابھر گیا، اس سے پہلے بھی وہ معاشرتی اصلاح کے لیے وعظ کہا کرتے تھے، مگر اب ان میں اور بھی تازگی آگئی اور حضرت سید صاحب کی اتباع میں انسداد شرک و بدعات اور رسومات کے مٹانے کی فکر دامن گیر ہوئی، اعظمگڈھ کے دیہاتوں میں نوابان اودھ کے اثر سے سنی مسلمانوں میں تعزیہ داری کی بدعت جاری ہوگئی تھی، مولانا نے اس ختم کرنے کا منصوبہ بنایا، اس کے لئے گاؤں گاؤں کا دورہ کیا اور وہاں کے سر برآوردہ لوگوں سے مل کر دھیرے دھیرے بہت سی بستیوں سے اس بدعت کا خاتمہ کرادیا۔ اور اس کے لئے انجمن اصلاح المسلمین قائم کیا۔

انجمن اصلاح المسلمین: اس انجمن نے اپنے دائرۂ کار کو اور وسیع کیا تو دینی و اخلاقی اصلاح کو اس کے مقاصد میں شامل کیا گیا، اس کا نام اصلاح معاشرت سے بدل کر انجمن اصلاح المسلمین رکھا گیا، انجمن اصلاح المسلمین نے بڑے پیانے پر نہایت شاندار جلسوں کا اہتمام کیا، اس کے جلسوں میں ہندوستان کے مشاہیر علماء تشریف لاتے، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالحق حقانیؒ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبدالشکور لکھنویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا ابوبکر شیث فاروقی جونپوری، مولانا سید امین نصیر آبادی، مولانا فیض الحسن میرٹھی اور علامہ شبلی نعمانی نے اس کے جلسوں میں قوم سے خطاب کیا۔

انجمن کے قیام نے اس علاقہ کے مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح کے ساتھ دینی تعلیم کا جذبہ بھی پیدا کیا اور ایک معیاری درس گاہ کے لئے فضا ہموار ہوگئی، اس وقت تک اس دیار میں جو علماء باہر سے پڑھ کر آئے تھے وہ انفرادی طور پر عربی کی کتابیں پڑھاتے تھے، علوم دینیہ کی منتہی تعلیم کے لئے بہت دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی بنیاد: اس لیے انجمن اصلاح المسلمین کے کارکنوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک دینی تعلیم کا پورے طور سے بندوبست نہ کیا جائے گا صحیح اسلامی زندگی پیدا نہ ہوگی اور نہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سدھرے گی اس لیے انجمن کے ناظم اور روح رواں مولانا محمد شفیع نے قصبہ سرائے میر کے قریب ایک چٹیل میدان میں ایک درس گاہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا اور اصلاح المسلمین کی مناسبت سے اس کا نام مدرسۃ الاصلاح تجویز کیا، سنگِ بنیاد کی تقریب میں حضرت مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندی کو بھی دعوت دی گئی اور انہیں کے مبارک ہاتھوں مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا۔

مدرسہ کے لیے شروع میں جھونپڑے بنائے گئے اولین استاذ ایک نیک سیرت بزرگ حافظ عبدالحی سرائے میری مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں مولانا محمد شفیع صاحب کے شاگرد مولانا عبدالاحد ساکن منجیر پٹی جو مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد میں درس دیا کرتے تھے وہاں سے علیحدہ ہو کر اپنے گاؤں آگئے تھے اور ان کے ساتھ کچھ طلبہ بھی آئے تھے جن کو وہ اپنے گھر ہی پر پڑھاتے تھے، مولانا محمد شفیع نے موقع غنیمت سمجھ کر انہیں مدرسہ میں بلا لیا تھوڑے دنوں تک ان طلبا کے

وظائف منجیر پٹی ہی میں رہے پھر جب مدرسہ میں عمارت تعمیر ہوگئی تو باقاعدہ وہ مدرسہ کے دارالاقامہ میں آ گئے، مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ، مولانا محمد شبلی نعمانیؒ نے اپنی اپنی خدمات پیش کیں، حکیم محمد احمد لہراویؒ، مولانا عبدالغفور جیراج پوری اور مولانا عبدالرحمن بہاری بھی مدرس ہوکر آ گئے تو منتہی درجوں تک تعلیم ہونے لگی اور بخاری شریف کا افتتاح بھی مولانا سید اصغر حسین محدث دیوبندیؒ ہی نے کرایا، مولانا اس وقت مسجد اٹالہ شہر جون پور میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی حیدر آباد سے مستعفی ہوکر اپنے مکان آ گئے تو وہاں جا کر ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے فکر و عمل کی جولانگاہ مدرسۃ الاصلاح کو بنائیں، چنانچہ مولانا فراہی ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ مدرسہ میں تشریف لائے اور انہیں مدرسہ کا ناظم بنادیا گیا اور مولانا محمد شفیع ان کے نائب بن کر مدرسہ کی خدمت کرنے لگے، یہ مولانا محمد شفیع کا مدرسہ کے حق میں انتہائی خلوص تھا کہ اپنی جگہ پر اپنے سے بڑے اور تجربہ کار عالم کو لائے تاکہ مدرسہ ترقی کرے اور اس کا دوسرے مدارس کے مقابلے میں ایک ممتاز مقام ہوجائے۔

اخلاق حمیدہ: مولانا مرحوم پاکیزہ صورت تھے اور پاکیزہ سیرت بھی، فطری طور پر نہایت نرم دل، حلیم الطبع اور سادہ مزاج تھے دین و دنیا کے ہر کام میں اتباع سنت کا لحاظ رکھتے تھے، وضع قطع اور رہن سہن قدیم علماء اور بزرگوں کے روش پر تھی، عام طور سے لباس سادہ کرتہ پائجامہ اور گول ٹوپی پہنا کرتے، البتہ عیدین اور جلسوں کے موقع پر عمامہ اور چغہ بھی زیب تن کرتے، ان کی شخصیت میں خاص کشش اور محبوبیت تھی، ایک بات وہ خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ میری

تربیت چچا نے ایسے طریقہ پر کی کہ آٹھ برس کی عمر سے نماز باجماعت کی عادت پڑی تو اب تک قائم ہے، ابتدائے عمر سے فرائض وواجبات، سنن ونوافل اور وظائف کی جو پابندی اختیار کی تو بحمد اللہ ان میں فرق نہ آیا۔ قرآن پڑھتے تو اس میں سوز وگداز کی کیفیت ظاہر ہوتی، اکثر نماز کی امامت کرتے اور قرأت کرتے تو معلوم ہوتا کہ خاص کیفیت طاری ہے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ فرماتے تھے کہ مولانا قرآن پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا نزول ہو رہا ہے، اپنی مجلسوں میں شعراء کا کلام اکثر پڑھا کرتے، فارسی ادب کا ذوق نہایت صاف ستھرا تھا، سعدیؒ، عطارؒ، نظامیؒ، اور مولانا رومؒ کے کلام سے بڑا انس تھا۔

وفات: بالآخر قوم کا یہ مصلح ومعلم اپنی عمر طبعی میں پہونچ کر فالج کے عارضہ میں مبتلا ہو کر اپریل ۱۹۴۵ء مطابق ۱۳۶۵ھ میں اپنے مکان سیدھا سلطان پور اعظم گڈھ میں عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی اور اپنے آبائی باغ میں سپرد خاک ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

(تذکرہ علماء اعظم گڈھ ص ۳۴۵)

حضرت مولانا بشیر احمد صاحب غالب پوریؒ اعظمگڈھ متوفی ۱۳۶۵ھ

نام ونسب: مولانا بشیر احمد غالب پوری علماء اعظمگڈھ میں بڑی شہرت ومقبولیت کے مالک تھے، قدرت نے علم وعمل کے ساتھ زور بیان سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔

تعلیم: مولانا نے ابتداءً پرائمری اسکول میں پڑھا، یہاں کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ضلع اعظم گڈھ کی مشہور درسگاہ مدرسہ الاصلاح سرائے میر میں داخل ہوئے اور وہاں کتاب النحو اور کتاب الصرف پڑھی، اسی زمانہ میں مولانا کو کسی نے دیوبند جانے کا مشورہ دیا، مولانا کے دل میں یہ مشورہ کچھ اس طرح بیٹھ گیا کہ گھر اطلاع کئے بغیر دیوبند چلے گئے، دیوبند میں داخلہ کے لئے شرحِ جامی کے معیار کی کتابوں میں کامیابی شرط تھی اس لئے وہاں داخلہ نہ ہوسکا، چونکہ مولانا گھر سے بغیر کسی اطلاع کے آئے تھے اور اپنے بھائی محمد عیسیٰ خاں کو بھی خبر نہ دی تھی جو مولانا کی کفالت کرتے تھے اور اس وقت حصول معاش کی غرض سے ملیشیا میں تھے، اس لئے مولانا کا ہاتھ بالکل خالی تھا، داخلہ کی کوئی صورت نہیں تھی اور نہ گھر ہی واپس ہوسکتے تھے، غرض بڑی الجھنوں میں گرفتار ہو گئے، ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' اس وقت دارالعلوم میں اعظم گڈھ کے بہت سے طلبہ اونچے درجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جن میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری قدس سرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ (تذکرہ علماء اعظم گڈھ)

حضرت فتحپوری کا ایثار: حضرت فتحپوریؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اعظم گڈھ کا

ایک طالب علم ان دشواریوں میں پھنسا ہے تو مولانا نے مولانا بشیر احمد کو بلا کر بڑی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، ایک سال کے اندر محنت و جانفشانی کر کے شرحِ جامی کے معیار تک تعلیم مکمل کر لو اور کھانے کے سلسلے میں بے فکر رہو، میرا دوپہر کا کھانا اور شام کا نصف تمہیں مل جایا کرے گا، مولانا فتحپوری اکثر روزے سے رہتے تھے، شام کے کھانے سے آدھا افطار وغیرہ کیلئے رکھ لیتے تھے اور بقیہ مولانا بشیر صاحب کے حوالے کر دیتے تھے، یہ قابل رشک اور بے نظیر مجاہدہ اور ایثار ہے جو مولانا فتحپوری نے زمانہ طالب علمی میں پیش کیا۔ سچ ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

ف: سبحان اللہ یہ تھا ہمارے مرشد حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے زمانے طالب علمی کے ایثار و ہمدردی کا حال رفیعہ جو ہم سب نسبی اور دینی منتسبین کے لئے اسوۂ حسنہ ہے کاش کہ اس اخلاق حسنہ کا عشر عشیر ہی حاصل ہو جاتا تو ہماری زندگی کا نمایاں پہلو ہوتا۔ واللہ الموفق (مرتب)

تدریسی زندگی: تکمیل تعلیم کے بعد ضلع آرہ کے ناصری گنج کے ایک قدیمی ادارے میں ہدایہ اخرین مشکوٰۃ وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے پھر اس کے بعد گھوسی اور سرائے میر کے مدرسوں میں تعلیم دینے لگے آخر میں دوبارہ آرہ جا کر کام کرنے لگے۔ اور سخت بیمار پڑ گئے۔

وفات: بیماری کی حالت میں آبائی وطن غالب پور اعظم گڈھ لائے گئے اور ۱۳۶۵ھ میں یہیں وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے **رحمہ اللہ تعالیٰ۔**

(تذکرہ علماء اعظم گڈھ صفحہ ۱۱۱)

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب امروہوی رحمہ اللہ متوفی ۱۳۶۷ھ

نسب وولادت: آپ کی ولادت ۱۲۷۷ھ میں ہوئی والد مکرم کا نام عنایت اللہ ہے۔ سلسلہ نسب شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے متصل ہو کر حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے، اسی لئے صدیقی سے مشہور تھے۔ آپ کا آبائی وطن سندیلہ تھا۔

تعلیم: حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کی عمر جب پانچ چھ سال کی تھی اپنی بہن کے ہمراہ مکہ معظّمہ چلے گئے تھے اور وہاں اپنے بہنوئی عبد العزیز (ساعتچی) کے پاس رہتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں اپنے ہم نام حافظ عبدالرحمن صاحب (موصوف نگینہ کے باشندے تھے عبید الرحمن مکی، معلم الحجاج انہی کے پوتے تھے) سے قرآن مجید حفظ کیا۔ تکمیل حفظ کے بعد پہلی تراویح مکہ مکرمہ میں سنائی۔ حضرتؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے مکہ معظّمہ میں جو پہلی مرتبہ قرآن شریف تراویح میں سنایا تو میں نابالغ تھا۔ درس نظامی کی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور ۱۲۹۲ھ سے ۱۲۹۷ھ تک دار العلوم میں قیام کر کے درس نظامی کی تکمیل فرمائی۔ اور سند سے مشرف ہوئے۔

فرمایا کہ جب میں دیوبند پڑھنے کے لئے گیا تو شروع شروع میں میری طبیعت نہیں لگی، میں رویا کرتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم تھے، انہوں نے اپنی فراست سے کام لیا اور مجھے ہم عمروں میں کھیلنے کی اجازت دیدی، اس

طرح میری طبیعت بہلی۔

فرمایا کہ جس زمانہ میں، میں دیوبند گیا تھا مدرسہ قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا، نودرا ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا، چند جھونپڑیاں تھیں۔ اس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ صدر مدرس تھے۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی، حضرت ملا محمود صاحب، حضرت مولانا منفعت علی صاحب مدرس تھے۔ اور مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم تھے۔

دیوبند سے مرادآباد: حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہویؒ کی خدمت میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد آ گئے۔

حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں: مرادآباد سے ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں سند فراغ حاصل کی۔ سالانہ امتحان حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ نے لیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد گنگوہ تشریف لے گئے اور قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے حدیث شریف پڑھی۔ قیام گنگوہ کے متعلق فرمایا کہ:

میں نے حضرت گنگوہیؒ کے یہاں چودہ دن میں ''بخاری شریف'' جلد ثانی پڑھی تھی۔ ایک مجلس میں حضرت گنگوہیؒ کے علم وکمال اور ان کے تبحر اور بروقت اشکال کرنے کے سلسلے میں فرمایا کہ:

ایک مرتبہ استفتاء آیا کہ نابالغ کے پیچھے تراویح جائز ہے یا نہیں؟ حضرتؒ نے جواب دیا کہ ناجائز ہے، طلبہ نے دلیل دریافت کی، تو فرمایا کہ دلیل ''الامام ضامن'' ہے جو تم حدیث پڑھ چکے ہو، چنانچہ جب ضامن نہیں ہوسکتا، تو امام بھی نہیں ہوسکتا۔

مولانا: فرماتے تھے یہ دلیل سن کر حیرت ہوئی کہ یہ حدیث تو دیکھی اور سنی ہوئی تھی، مگر اس طرف بالکل توجہ نہیں ہوئی کہ اس میں سے یہ مضمون نکلتا ہے۔

شیخ حسین یمانی سے اجازت حدیث: پھر بھوپال میں قاضی ایوب صاحب اور عظیم محدث شیخ حسین بن محسن یمانی خزرجیؒ جو بیک واسطہ علامہ قاضی شوکانی کے شاگرد تھے سے سند حدیث حاصل کی۔

رفقائے درس: آپ کے رفقائے درس میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب دیوبندی وغیرہ تھے۔

اساتذہ: آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ، حضرت ملا محمود صاحبؒ، حضرت مولانا منفعت علی صاحبؒ، قاضی ایوب صاحبؒ، عظیم محدث شیخ حسین بن محسن یمانی خزرجی "**رحمهم الله تعالى اجمعين**" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

تدریس: مدرسہ شاہی میں طالب علمی ہی کے دوران آپ کو معین مدرس کی حیثیت سے خدمت کا موقع مل گیا تھا۔ فراغت کے بعد کچھ عرصہ بمبئی کے کمو سیٹھ کے مدرسہ میں پڑھایا۔ چند ماہ ریاست مینڈھو میں بھی خدمت انجام دی۔

سنہ ۱۳۳۰ھ میں حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہیؒ کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو اعزاز بخشا اور اپنے استاذ کی وفات سے پیدا ہونے

والے خلاء کو پر کر دیا۔ ذی قعدہ ۲۵ ۱۳ھ سے شوال ۲۹ ۱۳ھ تک مدرسہ شاہی مراد آباد کی مسند صدارت پر فائز رہے۔

(ماہنامہ ندائے شاہی "تاریخ شاہی نمبر ص ۳۲۵)

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ۵۲ ۱۳ھ میں تشریف لائے اور ۶۲ ۱۳ھ تک رہے۔ ۵۹ ۱۳ھ سے اخیر تک منصب شیخ الحدیث پر فائز رہے۔

(تاریخ جامعہ ڈابھیل ص ۳۰۴)

۶۲ ۱۳ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ گرفتار کر لئے گئے تو دیوبند میں بھی بعہدۂ صدر مدرسی درس حدیث دیا۔

("تاریخ دار العلوم دیوبند" از حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ ص ۶۰)

آخر میں امروہہ آکر باوجود ضعیفی کے درس قرآن وحدیث دیتے رہے۔ آپ کے تلامذہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا نام نامی بھی ہے۔ تقریباً ساٹھ سال تک درس وتدریس کی عظیم خدمات انجام دیں۔ فجزاہم اللہ تعالی۔

بیعت وخلافت: پہلے حضرت گنگوہیؒ سے دیوبند کے زمانہ میں بیعت ہوئے تھے۔ پھر حضرت مولانا نانوتویؒ سے زبانی بیعت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ آخر میں اللہ تعالی نے علوم باطنی کے لئے آپ کو مجدد زماں اور تصوف کے امام حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی خدمت میں پہنچا دیا تھا، اور ان سے بیعت ہو کر خلافت سے بھی نوازے گئے۔ حضرتؒ کے مریدین اور مسترشدین کا بھی کافی حلقہ تھا۔

اوصاف وکمالات: حضرت مولاناؒ بے حد زندہ دل، سادہ لوح، اور طبیعت کی

سچائی اور صفائی کے لحاظ سے قدیم بزرگوں کا اک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

مولاناؒ کی عادت تھی کہ اپنے چھوٹوں، نیازمندوں کی بات اتنی دلچسپی سے سنتے تھے کہ گویا ایک چھوٹا اپنے کسی بڑے کی بات سن رہا ہے۔

حضرتؒ کی بات بات میں نکتہ ہر موقع پر شعر اور لطائف و حکایات کا انبار ہوتا تھا۔ ملنے جلنے اور ساتھ رہنے والوں کے ساتھ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ رہتے اور اتنی بے تکلفی سے رہتے کہ قطعا یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ ان میں دو نسل کا بعد ہے اور نہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہیں۔ ڈابھیل کے قیام میں حضرت کی مجلس میں اساتذہ طلبہ اور گاؤں کے لوگ سبھی جمع رہتے اور رات کو بارہ بارہ بجے تک مجلس قائم رہتی۔

آپ کی محفل میں اللہ و رسول کا ذکر، بزرگان دین کے تذکرے سن کر دل کو نشاط اور روح کو سرور حاصل ہوتا تھا۔ وہ اکابر دیوبند کی زندہ یادگار اور ناطق تاریخ تھے۔ جب آپ اکابر کے چشم دید حالات اور ان کے ملفوظات سناتے تھے تو ستر، اسی سال پیشتر کے قدسی صفات مجسمے نظروں کے سامنے آجاتے تھے آپ کی مجلس کی ایک خاص اور قابل اتباع خصوصیت یہ تھی اس میں کبھی کسی کی غیبت نہیں ہوتی، جب وہ کسی دوسرے کو غیبت کرتے پاتے تو فوراً ٹوک دیتے اور منع فرمادیتے۔ حدیث و تفسیر کے مسند درس پر آپ علم و فضل کے ایک بحر ذخار تھے۔ حدیث و تفسیر کے مشکل مسائل کو چند لفظوں میں یوں سلجھا دیتے تھے کہ دوسرے گھنٹوں کی تقریر سے بھی اسے اس طرح ادا نہیں کرسکتے تھے۔ قرآن فہمی کی خداداد دولت سے آپ کو حصہ وافر ملا تھا۔

اعلی بصیرت، بے انتہا ذہانت و ذکاوت قدرت کی جانب سے آپ کو ودیعت کی گئی تھی۔ ان کی طبیعت کی معصومیت و نیکی، ان کی فطری پاکبازی، ان کے علم و فضل اور ان کے وسیع اخلاق اور مزاج کی سادگی کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس دور کے ہیں بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ بہت پہلے کے انسان ہیں، وہ قدیم تاریخ کا ایک صفحہ تھے۔ ایسے پاکباز اور سادہ دل انسان، قدرت کی ایک گراں مایہ امانت کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے وجود اور کمالات کی روشنی میں گم کردہ راہ لوگوں کو اپنے مقاصد کی منزل تک پہونچنے کا موقعہ ملتا ہے۔

دنیا سے بے رغبتی کا یہ حال تھا زندگی بھر کوئی مکان آپ نے اپنے لئے تعمیر نہیں کروایا۔ عمر کے اخیر چند سال مدرسہ کی چہار دیواری میں گذارے۔ آپ کا ایک بیش قیمت کتب خانہ تھا، جن میں چند نوادرات بھی تھیں، مدرسہ امروہہ کو وقف کر دیا تھا۔

ف: اپنے ان اکابر کے احوال و اخلاق کو معلوم کر کے رشک ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر متاخرین کے یہ علوم اور اخلاق و اطوار تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو نوازا تھا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کمالات سے ہم سب کو نوازے۔ آمین (مرتب)

ملفوظات

ایک پیر صاحب کا واقعہ اور توحید کے دلائل: فرمایا کہ ایک پیر صاحب پونہ میں آیا کرتے تھے، ان کے مریدین خلاف توحید امور کے مرتکب تھے۔ میں نے ان مریدین کے سامنے تین آیتیں تلاوت کیں اور کہا تم جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو پکارتے ہو اس کے متعلق قرآن کا فیصلہ سنو!

(۱) {اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ}۔ (سورۂ انعام، آیت/۳۶)

ترجمہ: جواب تو بس وہی لوگ دیتے ہیں جو سنتے ہیں۔

(۲) **{وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ}**۔ (سورۂ فاطر، آیت ر ۲۲)

ترجمہ: اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔

(۳) **{وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ}**۔ (سورۂ احقاب، آیت ر ۵)

ترجمہ: اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا جو اللہ کے سوا کسی اور کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کی بات کا جواب نہ دے سکے۔

ان تینوں سے بطور صغریٰ وکبریٰ نتیجہ صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ جو سنتے ہیں وہ جواب دیتے ہیں جو قبروں میں ہیں، ان کو سنا نہیں سکتے، پس نتیجہ نکلا کہ قبر والے جواب نہیں دے سکتے۔ اب جو ایسوں کو پکارے جو جواب نہ دے سکیں، اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا؟ ان آیتوں کو پیر صاحب کے سامنے سنایا گیا، ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ شیخ مکی نے (جو مشہور ادیب اور ریاست بھول پال میں رہتے تھے) ان آیتوں کو اس ترتیب سے سنا تو فرمایا کہ میں نے بہت سی آیتیں توحید کے مضمون کی جمع کی تھیں، مگر ان تین آیتوں نے بہت ہی زبردست طریقہ سے توحید کو واضح فرمادیا ہے۔

فرمایا کہ: توحید کی بارے میں یہ آیت بھی جامع ہے:

{وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ، اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا یُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِیْرٍ}۔ (سورۂ فاطر، آیت ر ۱۳ ر ۱۴)

ترجمہ: اور جنہیں تم اس کے علاوہ پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے ، اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری سنیں گے بھی نہیں ، اور اگر سن بھی لیں تو جواب نہ دے سکیں گے، اور قیامت کے دن وہ تمہارے شریک کرنے ہی سے منکر ہوں گے اور تجھ کو (خدائے) خبیر کا سا کوئی نہ بتائے گا۔

ایک مجلس میں فرمایا: **{اعدوالهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل}**۔ (سورۂ، آیت / ٦٠)

ترجمہ: اور ان سے مقابلہ کے لئے جس قدر بھی تم سے ہو سکے سامان درست رکھو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے۔

اس آیت میں ''قوۃ'' کو نکرہ لایا گیا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قوت ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہے، ایک زمانہ میں تیر و کمان تھے، پھر کچھ اور آج کچھ اور۔

حضرت مولانا کو لسان العصر اکبر الہ آبادی کا کلام بہت پسند تھا، چنانچہ ان کے بہت سے منتخب اشعار اپنی بیاض میں درج فرمائے تھے، یہ دو شعر ان کے بہت پسندیدہ تھے۔

اللہ کی راہ اب بھی ہے کھلی، آثار و نشان سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن، اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا
جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی، اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

حکیم مؤمن خان کے کلام سے بہت ربط تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ

مؤمن خاندان ولی اللہی سے تلمیذانہ تعلق رکھتے تھے اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے خاص آدمی تھے۔ایک دن ایک موقع پر مؤمن کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

وہ چلا جان چلی ، دونوں یہاں سے کھسکے
اس کو تھاموں کہ اسے پاؤں پڑوں کس کس کے

وفات: ۲۳؍جمادی الثانیہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۲؍مئی ۱۹۴۲ء بروز یکشنبہ بوقت صبح چھ بجے آپ کی وفات کا حادثہ امروہہ میں پیش آیا۔ ۹۰؍سال کی عمر پائی۔ ایک بڑی جماعت نے نماز جنازہ ادا کی۔صحن جامع مسجد امروہہ کے جنوبی گوشے میں اپنے استاذ حضرت مولانا سید احمد حسن امروہیؒ کے پہلو میں تدفین ہوئی۔

رحمہ اللہ ونور اللہ مرقدہ (ذکر صالحین، مؤلفہ مولانا مرغوب احمد لاجپوری: ج؍۱ص؍۱۷۸)

حضرت مولانا محمد خیر الدین گیاوی المتوفی ۱۳۶۷ھ

نام ونسب: مولانا محمد خیر الدین کے والد کا نام الف الدین اور وطن حضرو ضلع کامل پور (اٹک) تھا۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم حضرو میں میاں افضل الٰہیؒ سے حاصل کی، پھر قریبی گاؤں میں آپ کے ماموں مولانا راغب اللہ رہتے تھے، انہوں نے مولانا کو اپنے پاس بلالیا، اور کچھ عربی فارسی پڑھا کر فقہ کی کتابیں پڑھائیں۔ وہ فقہ کے امام تھے، ان سے لوگ صرف فقہ پڑھنے آتے تھے راغب اللہ کی برکت سے فقہ پر عبور حاصل ہو گیا۔ نحو میں کمزوری تھی، اس کو دور کرنے کیلئے ہندوستان آئے، اور سفر کرتے ہوئے کرنال پہنچے، اور وہاں کے مدرسہ میں تحصیل علم کیا، پھر پانی پت چلے گئے، یہاں حضرت مولانا قاری عبد الرحمان پانی پتیؒ سے پڑھنا شروع کیا۔ علوم عربیہ کے علاوہ قرآن پاک باتجوید وقرات اور مسائل تجوید کی کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔

مولانا الطاف حسین حالی مصنف مسدس حالی سے فارسی کی تکمیل کی، حالی نے لاہور یونیورسٹی میں شعبہ عربی و فارسی میں داخلہ لے کر سند حاصل کر لینے کا مشورہ دیا، اور سفارشی خط بھی لکھ دیا، راستہ میں ایک قافلہ سے ملاقات ہوئی، قافلہ کے لوگ حضرت مولانا محمود حسن محدثؒ سے حدیث پڑھنے دیوبند جارہے تھے۔ مولانا بھی اسی قافلہ کے ساتھ ہولئے، اور دیوبند تشریف لے آئے۔ دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے ہدایہ آخرین پڑھی۔ دورہ حدیث شیخ الہند حضرت

مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے پڑھا۔ آپ کے شریک دورہ حضرت مولانا صدیق احمد تھے۔ یہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بڑے بھائی تھے۔ دیوبند سے فارغ ہوکر کانپور چلے آئے۔ اس زمانہ میں مولانا احمد حسن کانپوری مدرس اول مدرسہ فیض عام کا معقولات میں بہت شہرہ تھا، وہاں رہ کر مولانا نے معقولات کی تکمیل کی، کانپور میں حضرت مولانا غلام حسینؒ آپ کے ہم درس تھے، ان کے مرید خاص حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولوی نیچے کی کتابیں پڑھتے تھے۔

تدریسی خدمت : فراغت کے بعد مدرسہ فیض عام میں مدرس ہو گئے۔ پھر مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے حکم سے شاہ التفات احمد رودولی سجادہ نشین خانقاہ شاہ عبدالحق رودولوی کے لڑکے کے اتالیق بن کر رودولوی تشریف لے گئے، اس کے بعد حضرت مولانا عبد الغفار گیاوی نے اپنے مدرسہ اسلامیہ میں، جو آج مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ کے نام سے مشہور ہے، مدرس رکھ لیا، اور وصیت کی کہ اس کو کبھی نہ چھوڑنا، چنانچہ گیا میں مدرس ہونے کے بعد گیا میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اپنے زمانہ کے تمام بزرگوں سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ کانپور میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رابطہ تھا۔ وہ حضرت مولانا پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ حضرت گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں بار بار جاتے، وہ بھی بہت کرم فرمایا کرتے تھے حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بھی گہرا تعلق تھا۔

وفات : آپ کی وفات کے ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء کو گیا میں ہوئی، نماز جنازہ محلّہ کریم گنج میں ادا کی گئی، اور کریم گنج ہی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ **نور اللہ مرقدہٗ**۔ (تذکرہ علماء بہار صفحہ: ۳۰۸)

حضرت الشیخ الشہید حسن البناء مصری م ۱۳۶۸ھ

نام ونسب وولادت: شیخ حسن البناء اسکندریہ سے قریب ''محمودیہ'' نامی مقام پر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالرحمن تھا، شیخ حسن البناء نے دارالعلوم قاہرہ سے فراغت حاصل کی تھی، وہ ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے، ان کی کتاب (مذاکرات الدعوۃ والداعیہ) پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے نہایت شاندار مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جو بذات خود شیخ حسن البناء کا نہایت جامع اور مؤثر تعارف ہے، اس لئے اس کے بصیرت افروز اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ یوں رقم طراز ہیں:

جامع تعارف: ''مقدمہ نگار ایسی اہم کتاب اور اس کے عظیم مصنف پر لکھتے اور روشنی ڈالتے ہوئے عرصہ تک جھجکتا اور ہچکچاتا رہا اور جب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مزید تاخیر کر کے مسلم نوجوانوں نیز دعوت واصلاح کے میدان میں کام کرنے والوں کو ایک خیر سے محروم رکھ رہا ہوں، تب میں نے اس پر چند سطریں لکھنے کی جرأت کی۔

اسلام ابدی اور اللہ کا پسندیدہ دین اور امت مسلمہ اس کا شاداب اور سدابہار درخت ہے۔ یہ خدائی ترکش ہے کہ نہ اس کے تیر ختم ہوتے ہیں اور نہ نشانہ خطا ہوتا ہے، سب سے بڑا ثبوت اس امت میں ایسے مصلحین ومجاہدین خداداد صلاحیتوں سے مالامال ،موید من اللہ ، نادرۂ روزگار اور اسلام کے لئے باعث صد افتخار شخصیتیں ہیں جو ناسازگار حالات، مخالف ماحول اور بیم ورجا کی تیرہ وتاریک فضا میں ایک ایسی قوم

میں پیدا ہوتی ہیں جو فکری اضمحلال، روحانی افلاس، ارادہ کی کمزوری، عزم و ہمت کی پستی، اخلاقی فساد، راحت طلبی و عافیت پسندی، ہر قوت وطاقت کے سامنے سپر اندازی اور اصلاح حال سے مایوسی کا شکار ہوتی ہے، اس وقت یہ پوری نسل ایک ہی سانچہ میں ڈھلی ہوتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک پریس سے شائع ہونے والی کتاب کا کوئی ایڈیشن ہو کہ جس کے ایک نسخہ کو پڑھ کر باقی سارے نسخوں کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے، اس ماحول و معاشرہ میں نہ کوئی ندرت وجدت ہوتی ہے، نہ حوصلہ مندی کا جذبہ، اس ماحول میں عام و رائج چیزوں کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی اور نہ عام معیار سے اونچی کوئی چیز نظر آتی ہے، پوری زندگی ایک ہی ٹرین کی مانند ہے جس کو ایک ہی انجن کھینچ رہا ہے اور وہ شکم پروری، مادہ پرستی، خودغرضی، مصلحت پرستی، لطف اندوزی و نفع خوری کا انجن ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پورے عالم عربی خصوصاً مصر میں یہی ڈرامہ اسٹیج ہو رہا تھا، قافلہ رواں دواں تھا، زندگی کی ٹرین اپنے محدود مقاصد کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف چل رہی تھی، ایک ہی طرح کی آوازیں آرہی تھیں، ایک ہی راگ الاپا جارہا تھا کہ پردہ کے آڑ سے ایک شخص نمودار ہوتا ہے اور اس مطمئن اور غافل قافلہ کو چونکا دیتا ہے جو چند حقیر مقاصد کی حصول یابی کے سوا کچھ نہیں جانتا، جس کو اپنی دنیاوی ضروریات اور جسمانی راحت و آرام کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی۔

پردہ کے پیچھے سے آنے والا یہ شخص قافلہ والوں کو ہاتھ دیتا ہے اور ٹرین کے سامنے خطرہ کی جھنڈی ہلاتا ہے، اصلاح حال اور انسانیت کے عام رجحان

اور اس کے انجام، امت مسلمہ کے مقام اور اس کی اصل ذمہ داری کے بارے میں از سر نو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، اس امت کو اس کا پیغام یاد دلاتا ہے، وہ بگڑے ہوئے حالات ، اخلاقی پستی، گمراہ کن عقائد ، جاہلی رسوم وعادات ، شکم پروری وہوس پرستی اور قوت وطاقت کے سامنے سرافگندگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، وہ ایک صاف ستھری زندگی ، نیک چلن اور انصاف پسند معاشرہ اور نئے اور پختہ ایمان کی دعوت دیتا ہے، تھوڑا ہی وقت گزرتا ہے کہ قافلہ والوں کی بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے، یہ داعی اس مجموعہ سے ایک نیا قافلہ تیار کرتا ہے اور پھر یہ قافلہ اس کی دل لگتی باتوں پر سرمست وسرشار ہو کر، اللہ پر بھروسہ واعتماد کر کے سفر شروع کرتا ہے، ایسے ماحول ومعاشرہ کے خلاف آواز بلند کرنے والے ان داعیوں کی زندگی ایسی درخشاں وتابناک ہے کہ اس سے دعوت اصلاح کی تاریخ میں چار چاند لگ جاتے ہیں، یہ داعیان اسلام کا وہ قافلہ ہے جس سے تاریخ اسلام کا کوئی عہد کبھی خالی نہ رہا، اس کتاب کا مصنف جس کا مقدمہ لکھنے کی مجھے سعادت حاصل ہو رہی ہے ان شخصیتوں میں سے ہے جنہیں دست قدرت بناتا اور سنوارتا ہے اور خدائی تربیت اسے پروان چڑھاتی ہے پھر صحیح وقت اور صحیح جگہ پر اس کو کھڑا کر دیتی ہے، فکر صالح اور قلب سلیم رکھنے والا جو شخص بھی تعصب سے بلند ہو کر اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ یہ شخص خداداد صلاحیتوں سے مالا مال ہے، وہ کسی خاص ماحول یا درسگاہ، تاریخ اور زمانہ یا محنت وکدوکاوش یا مشق وتجربہ کی پیداوار نہیں، بلکہ وہ توفیق خداوندی، حکمت ربانی اور اس دین کے ساتھ اس کی عنایت کی پیداوار ہے، وہ ایسا ہونہار پودا ہے جس کی نگہداشت کسی بڑے کام

اور بڑی امید کے لئے کی جاتی ہے جہاں اس کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔

جو شخص بیسویں صدی کے اوائل میں مشرق وسطیٰ اور خاص طور سے مصر کے حالات سے واقف ہو اور عالم اسلام کا یہ اہم مرکزی خطہ عقیدہ وجذبات، اخلاق ومعاشرت، عزم وارادہ اور جسم وقلب کی جس کمزوری کا شکار تھا اس پر اس کی نظر ہو، اس پر آشوب دور کو کتابوں کے ذریعہ نہیں بلکہ قریب رہ کر دیکھا ہو، وہی اس شخصیت کی عظمت وانفرادیت کو سمجھ سکتا ہے جو یکایک پردہ کے پیچھے سے باہر آنکلتی ہے اور پہلے مصر پھر پورے عالم عربی کو اپنی دعوت وتربیت جہاد وطاقتور شخصیت کے ذریعہ اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے، اللہ نے اس رجل رشید اور فرزند فرید میں ایسی قوتیں وصلاحیتیں جمع فرمادی تھیں جو انسانی نفسیات اور علم الاخلاق کے ماہرین اور متعدد نقّاد ومورخین کے نزدیک متضاد تھیں۔ ان اعلیٰ صفات وخداداد صلاحیتوں نے ایک ایسی دینی واجتماعی قیادت کی تشکیل میں ان کی مدد کی جس سے زیادہ موثر، عمیق اور نتیجہ خیز دینی وسیاسی قیادت مدت دراز سے عالم عربی میں وجود میں نہیں آئی تھی۔

دو خصوصیات: ان صفات نے ایک ایسی دینی اسلامی تحریک پیدا کردی جس سے زیادہ ہمہ گیر وفعال تحریک خصوصاً عرب ممالک میں عرصہ سے دیکھنے میں نہ آئی تھی، یوں تو قدرتی صلاحیتوں سے مالا مال یہ داعی جامعِ کمالات تھا مگر دو صفتیں اس میں ایسی تھیں جو بہت کم داعیوں، مصلحین اور قائدین میں پائی جاتی ہیں۔

(۱) پہلی صفت اپنی دعوت تحریک سے غیر معمولی شغف اور اس پر کامل اطمینان وانشراح اور اس کے لئے فنائیت اور اپنی ساری صلاحیتوں اور

توانائیوں، وسائل اور طاقتوں کے ساتھ اس میں ہمہ تن مشغول رہنا ، ان داعیوں اور قائدین کے لئے جن سے اللہ کوئی بڑا کام لیتا ہے، اور عمومی فائدہ پہونچاتا ہے، یہ اہم اور بنیادی شرط ہے۔

(۲) ان کی دوسری اہم خصوصیت وصفت تربیت ومردم سازی کے کام میں ان کی حیرت انگیز کامیابی ہے، انہوں نے ایک نئی نسل تیار کی، وہ ایک پوری قوم کے مربی تھے، وہ ایک علمی فکری اور اخلاقی مکتبۂ فکر کے بانی تھے، پڑھے لکھے لوگوں اور اہل منصب میں جو بھی ان کے ساتھ کچھ دن رہا ان کے فکرورجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، اپنے ہمنشینوں پر ان کا اثر ایسا گہرا تھا کہ عرصہ گزر جانے اور طرح طرح کے انقلابات وتغیرات پیش آنے کے باوجود بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، یہ اثر ایسا شعار اور علامت بن گیا ہے کہ زمان ومکان کی تبدیلی کے باوجود وہ اسی سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ان کی اس دعوت سے یہ جدید نسل تازہ دم ہوگئی، اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا اور اس نے شجاعت وجواں مردی اور صبر وثابت قدمی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا، اس تحریک کے اثرات کو ختم کرنے اور اس کے نقوش کو مٹانے کی کوشش اور اس کے چلانے والوں کو قید وبند اور جلا وطنی کی سزائیں اور رونگٹے کھڑا کردینے والی اذیتیں وہ بدترین جرم ہے جس کو تاریخ اسلام کبھی معاف نہیں کرسکتی، یہ ایسا المیہ ہے جس کو عالم اسلام کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ یہ عالم عربی کے ساتھ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور ظلم نہیں ہوسکتا، اس جرم کا کفارہ ملک کے کسی بڑی سے بڑی تعمیری وسیاسی خدمت سے نہیں کیا جاسکتا، یہ

اتنا وحشت ناک جرم ہے کہ جس کی مثال صرف تا تاریوں کی وبربریت یا قدیم مسیحی دنیا کے دور تعصب میں ملتی ہے۔'' انتہیٰ

ف: ماشاء اللہ! حضرت شیخ حسن البناءؒ کا حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے خوب ہی خوب تعارف کرایا جو انہیں کا حق تھا، خصوصاً جو ان کے داعیانہ صفات بیان فرمائے وہ نہایت اہم ہیں، انہیں ہر داعی الی اللہ و مبلغ دین کو اختیار کرنا لازم ہے جن کا خلاصہ یہ ہے ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز　　یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

اب ہم ایک امریکی، غیر مسلم صحافی کا تعارفی مضمون جو حضرت حسن البناءؒ کے متعلق ''مردِ قرآنی'' کے عنوان سے عربی میں لکھا ہے جس کا ترجمہ مکرم مولانا شمس الحق صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء نے نہایت عمدہ سلیس فرمایا ہے، اس کے چند اقتباسات نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جن سے مزید شیخ حسن البناءؒ کی خصوصیات وکمالات پر روشنی پڑے گی، سچ ہے ؎

الفضل لمن شهدت به الاعداء۔

مردِ قرآنی سائز کہ از امریکن صحافی رابرٹ جاکسن

فروری ۱۹۴۶ء میں جب میں قاہرہ میں تھا مجھے اخوان المسلمین کے بانی ولیڈر شیخ حسن البناء سے ملنے کا خیال آیا، اس وقت ان کے ماننے والوں کی تعداد کوئی پانچ لاکھ ہوگی، چنانچہ میں نے ان سے ملاقات کی اور اسی زمانے میں اخبار (نیو یارک کرانیکل) میں ذیل کے جملے لکھے۔

''میں اس ہفتہ ایک ایسے شخص سے ملا جو عصر حاضر کی تاریخ کا عظیم شخص

ہوگا اور اگر اس کی مخالفت میں بہت غیر معمولی حالات پیش آئے (جس کے قرائن نظر آرہے ہیں) تو وہ پردۂ خفا میں چلا جائے گا، یہ شخصیت اخوان المسلمین کے لیڈر شیخ حسن البناء کی ہے"

یہ بات میں نے پانچ سال پہلے لکھی تھی، بعد میں پیش آنے والے پُرآشوب حالات نے میرے خیالات واندیشوں کی تصدیق کی اور اس نادرۂ روزگار شخصیت کا چراغ زندگی بہت سویرے ہی بجھادیا گیا، اور یہ چراغ ایسے نازک گھڑیوں میں بجھا جب مشرق بڑی امیدوں وآرزؤوں کے ساتھ سامراجیوں سے برسر پیکار تھا، میں مشرق کی نفسیات کو سمجھ نہ سکا، اس وقت تو اس کو کسی ایسے مصلح وقائد کی شدید ضرورت تھی جو اس کی صفوں کو درست کرے اور انہیں متحد کر کے مشرق کے کھوئے ہوئے وقار کو پھر سے واپس لائے، منزل دور اور راہ پر خطر وتاریک لیکن انہیں نازک گھڑیوں میں مشرق بڑے المناک طریقہ پر شیخ حسن البناء کو شہید کر کے اپنا چراغ راہ بجھادیتا ہے، مشرق کا یہی حال ہے اس کے ہاتھ جو بھی دولت لگتی ہے وہ زیادہ دنوں تک اس کی حفاظت نہیں کرتا۔

امریکہ سے دوبارہ لوٹنے کے بعد میں شیخ حسن البناء کی تاریخ کا برابر جائزہ لیتا رہا اور اس کی فکر میں لگا رہا، بالآخر ان کے خلاف شکوک وشبہات کا کیچڑ اچھالا جانے لگا، اس کا انجام یہ ہوا کہ ان کے ساتھی قید کر لئے گئے اور یہ ایسا مرحلہ تھا کہ ان کے ساتھیوں کو ان سے گزرنا ضروری تھا، اس لئے کہ عبقری لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے، پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد منزل مقصود تک پہونچنے سے قبل ہی نہایت المناک طریقہ پر انہیں شہید کر دیا گیا۔ میں اس بات کی شہادت

دے سکتا ہوں کہ شیخ حسن البناء عورت و مال وجاہ کے پھندے میں نہ آسکے اور یہی وہ تین پر کشش چیزیں، خاص حربے تھے جن کو سامراجیوں نے مجاہدین پر سب سے زیادہ استعمال کیا مگر اس عقابی روح رکھنے والے شخص کو دام فریب میں لانے کی ساری تدبیریں ناکام رہیں۔(درحقیقت) ان سارے فتنوں اور آزمائشوں سے بچنے میں ان کے سچے تصوف اور فطری زہد کا بڑا دخل تھا۔

شیخ حسن البناء اپنے موافق ومخالف دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرنے میں عجیب وغریب صلاحیت کے مالک تھے، وہ اپنے مخالفین پر ناشائستہ انداز میں حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو مطمئن کر کے اپنا ہم خیال بنالینے کی کوشش کرتے، ان کا نظریہ تھا کہ مقصد کا حصول بحث وٹکراؤ سے ممکن نہیں، وہ نظریات میں مخالفت کے قائل تھے مگر اس کو ذاتی عداوت کا سبب نہیں بناتے تھے۔

ان کی عقل میں پختگی، فکر میں آزادی، روح میں تابانی اور سینہ میں طاقتور ایمان موجزن تھا، اور اس شخص کی طرح کریم النفس اور متواضع تھے جو اپنے مقام ومنصب کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے، ان کی زبان اور قلم دونوں دل آزاری سے پاک تھے، وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ تیز اور چرب زبان لوگوں کا شعار اپنائیں، اور گفتگو میں تلخ لب ولہجہ اختیار کریں۔

زہد وسادگی: ان کے گھر کا ساز وسامان درویشانہ، لباس نہایت سادہ، کمرے کا فرش بہت معمولی و پرانا مگر کتابوں سے بھرا ہوا، اور کوئی شئی عام انسانوں کے معیار سے اونچی نہ ملے گی، ان کی ایک اور صفت جس میں بہت سے لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے صفت گویائی تھی، وہ چند الفاظ میں ایسے اہم اور طویل مسائل بیان

کر دیتے جن کے لئے بڑی بڑی کتابیں بھی نا کافی ہوتیں ۔ان کی قائدانہ صفات میں سے ان کا وہ اسلوب بیان بھی تھا، جس میں دردو تاثیر اور اندرونی خلش پائی جاتی تھی ،وہ اپنی باتوں سے لوگوں کا دل موہ لیتے ، پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے ، اپنی باتوں سے مخاطب کو مطمئن کرنے کا سلیقہ اور مہارت وتجربہ ان کی قائدانہ صفات کا غماز تھا۔

ان اہم خصوصیات وصلاحیتوں کی بدولت انہوں نے تھوڑی سی مدت میں ایک زبردست جماعت تیار کر لی۔

ف: ماشاء اللہ تعالی امریکن غیر مسلم صحافی نے ایک مسلمان داعی کے تعارف کا حق ادا کر دیا جو ہمارے لئے باعث فخر وعزت بھی ہے اور موجبِ غیرت وخجالت بھی ہے، ایسے مخلص داعی کو اپنے ہاتھوں ہم نے ہی شہید کر دیا اور ایسے داعی سے محروم ہو گئے، **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔اس حادثۂ فاجعہ پر غیر مسلم صحافی نے بھی تعجب اور تحیر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اہل مشرق کی کتنی زبوں حالی ہے کہ اپنے باصلاحیت مقتدا و پیشوا کی قدر تو کیا کرتے شہید تک کر ڈالتے ہیں۔العیاذ باللہ تعالی۔

اخوان المسلمین: ’’محب مکرم مولانا سید اجتباء ندوی صاحب زید مجدہم نے آپ کی تحریک کا بہترین تعارف اپنی تالیف لطیف ’’تاریخ فکر اسلامی‘‘ میں کرایا ہے، اس کو مختصراً پیش کر رہا ہوں۔

جس وقت خلافت عثمانیہ ٹوٹ چکی تھی، صلیبی طاقتوں نے اسلام کو ختم کرنے کی مہم شروع کر رکھی تھی، معاشرہ بد دینی، اباحیت، بے حیائی، بے عملی، فسق وفجور کا آماجگاہ بن گیا تھا ایسے نازک حالات میں حسن البناءؒ نے ’’اخوان

المسلمین'' کی جماعت بنا کر اپنی دعوت کا آغاز کیا، خدا تعالی نے اس کام میں ان کے اخلاص وایثار کی بنا پر بڑی برکت دی، امام حسنؒ نے قاہرہ میں اخوان کا مرکز قائم کیا اور پوری جدو جہد اور توانائی وقوت کے ساتھ قاہرہ اور اس کے آس پاس کے شہروں، دیہاتوں میں دورے کر کے، کیمپ لگا کر، جلسے کر کے دعوت کا کام شروع کیا، انہوں نے ایک تقریر میں بہت واضح الفاظ میں کہا:

اسلام عقیدہ و دین ہے، وطن اور شہریت ہے، فراخ دلی اور قوت ہے، اخلاق اور مادیت ہے، اور ثقافت وقانون ہے، قاہرہ میں مرکز قائم کرنے کے بعد ایک روزنامہ اخوان المسلمین کے نام سے نکالا۔ ہر طبقہ کے لوگ آپ کی تحریک سے وابستہ ہوئے جن کی تعداد پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہوگئی، ان میں علماء، صلحاء، مفکر، انشاء پرداز ادیب، قانون داں شامل تھے، اور نہ صرف مصر بلکہ عالم عرب واسلام اخوان کی دعوت وتحریک سے آشنا ومتعارف ہوگیا۔ لیکن مصر کے شاہ فاروق اور دنیا کی سامراجی اور اسلام دشمن قوتوں کو یہ تحریک اور امام حسن البناءؒ کی وفاشعاری وخدمت دین ووطن ایک نظر نہ بھائی، اور بہانہ بنا کر اخوان کو گرفتار کر لیا گیا۔

وفات: ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کی شب میں قاہرہ میں شبان مسلمین کے مرکز کے سامنے امام حسن البناءؒ پر حملہ کر کے شہید کر دیا گیا، فاروق کی حکومت نے ناکہ بندی کر کے کسی کو قریب آنے کی اجازت نہیں دی، ان کا جنازہ چار عورتوں اور بوڑھے باپ شیخ احمد عبدالرحمان البناء کے کندھوں پر قبرستان پہونچایا گیا اور انتہائی تاریک رات میں دفن کر دیا گیا۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔ فیاحسرۃً علی العباد۔ نور اللہ مرقدہ۔ (تاریخ فکر اسلامی: ص ر ۲۵۸)

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ م ۱۳۶۸ھ

ولادت: آپ کی ولادت امرتسر میں ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں ہوئی، مولانا کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے منٹو خاندان سے تھا، اصلی وطن کشمیر کا علاقہ ڈور تحصیل اسلام آباد ضلع سرینگر تھا، ان کے والد ماجد شیخ خضر جو پشمینہ کی تجارت کرتے تھے ۱۸۶۰ء میں ڈوگرہ راج کی ستم ظریفیوں سے تنگ آکر بغرض تجارت امرتسر آگئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی، وادئ کشمیر پر مسلمانوں کی تقریبًا پانچ سو سال حکومت رہی، اس زمانہ میں اکثر خاندان خصوصاً کشمیری پنڈتوں کے خاندان مشرف باسلام ہوئے ابھی آپ سات سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے، اور چودہ سال کے ہوئے تو والدہ محترمہ کی وفات ہوگئی۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔**

تعلیم و تعلم: مولاناؒ کے بڑے بھائی رفوگری کا کام کرتے تھے؛ چنانچہ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اس فن سے روشناس کرایا اور اس کام میں لگادیا مگر ایک عالم دین کے توجہ دلانے سے علم دین کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا احمد اللہ صاحب امرتسریؒ کی خدمت میں پہنچ گئے، رفوگری کے کام کے ساتھ ابتدائی کتابوں کا سبق مولانا احمد اللہ صاحبؒ سے لینے لگے، چنانچہ ابتدائی تعلیم

مولانا کی سوانح حیات تحریر کردہ مولانا فضل الرحمٰن ابن میاں محمد کی کتاب سے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، یہ کتاب برادر مکرم جلال الدین صاحب کے ہاتھ سے مجھ کو ملی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ (مرتب)

سے فارغ ہونے کے بعد حافظ الحدیث حافظ عبدالمنان صاحب وزیرآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۱۸۸۹ء میں ان سے حدیث کی سند حاصل کی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد دہلی جا کر حضرت مولانا نذیر حسین محدث دہلویؒ کی شاگردی اختیار کی، حافظ عبدالمنان صاحب وزیرآبادی کی سند دکھانے پر تدریس حدیث کی اجازت مل گئی، پھر سہارن پور کے مدرسہ مظاہر علوم میں تشریف لاکر وہاں سے سند حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند چلے گئے، دیوبند مدرسہ کے مدرّسِ اعلی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے یہاں رہ کر معقول و منقول کی کُتب درسیہ پڑھ کر سند حاصل کی۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ مولاناؒ کو حضرت شیخ الہندؒ سے شرف شاگردی تو حاصل تھا ہی؛ مزید یہ کہ آپ سیاسی معاملہ میں بھی رفیق کار رہے جیسا کہ ان کی سوانح کے پڑھنے سے بخوبی آشکارا ہے، آپ اگر چہ مسلکاً غیر مقلد تھے مگر حضرت شیخ الہندؒ کے بہت معتقد اور آپ کے علم و عمل کے بڑے مدّاح تھے۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ موصوف بڑے پایہ کے عالم تھے، ہر فن کی تعلیم دیتے تھے مگر حدیث کے ساتھ آپ کو خاص اُنس تھا، میرا چشم دید واقعہ بلکہ روزانہ کے واقعات ہیں کہ آپ جس چوکی پر حدیث کی کتاب رکھ کر پڑھاتے تھے منطق کی کتابیں اس پر نہیں رکھتے تھے بلکے نیچے رکھتے تھے، یہ واقعہ اپنی ساری مدت تعلیم میں دیکھتا رہا، بحقِ حدیث آپ کے حسنِ عقیدہ کا اظہار ان اشعار میں کروں تو بجا ہے، آپ گویا زبان حال سے فرماتے تھے۔ ؎

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے ۔۔۔ دُر دانۂ دُرجِ مصطفیٰ ﷺ ہے

صوفی و عالم و حکیم دینی کرتے رہے اس کی خوشہ چینی
بابا کے ہاں سے کون لایا جس نے پایا یہیں سے پایا

مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت واہمیت: مولانا امرتسریؒ ان حضرات مصلحین میں سے ہیں جنہوں نے مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی، اس سلسلہ میں تقریریں کیں، مضامین لکھے، ان میں سے ایک تقریر کا بعض حصہ نقل کرتا ہوں:

اتحاد واتفاق، تنظیم وسنگٹھن میں مسلمانان ہند بہت نیچے گرے ہوئے ہیں، ہماری قوم میں جس قدر اختلاف، پھوٹ، فرقہ بندی اور نااتفاقی ہے، ہندوؤں میں ہے نہ سکھوں میں، عیسائیوں میں ہے نہ دُنیا کی کسی قوم میں؛ غرضیکہ ساری قومیں مُتّحد اور متفق ہوکر اپنے سیاسی، مذہبی اور ملی مفاد کو حاصل کرنے میں کوشاں اور منہمک ہیں، مگر آہ! ایک ہم ہیں کہ نہ ہماری سیاسی پارٹیاں متحد ہیں اور نہ ہی مذہبی انجمنیں۔ نہ عوام میں اتفاق ہے اور نہ خواص میں اتحاد۔ کیا اچھا کہا ہے شاعر نے:

ترقی کر رہی ہیں اورقومیں علم وحکمت میں
ہماری قوم لیکن مبتلائے خواب غفلت ہے

جو ہیں دو بھائی تو ہے ایک کا اِک دُشمن جانی
نہ آپس میں محبت ہے نہ باہم ربط اُلفت ہے

سنائیں کس کو افسانہ غم وآلام کا اپنے
طبیعت میں مسلمانوں کی کیا جوشِ حمیّت ہے

بہر کیف، اتحاد و اتفاق کی تعلیم وہ قانون ہے جس سے لوگوں میں اخوّت ومحبت کی زیادتی اور اس کی اجتماعی قوت کی مضبوطی ہوسکتی ہے، اس سے مخالفوں کے قلوب میں دہشت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کی جرأت وہمت نہیں پڑتی، مشاہدہ کے طور پر مکھی کو لیجئے، دنیا کے جمیع جانور سے کمزور ہوتی ہے، دو انگلیوں کے درمیان پسی جاسکتی ہے لیکن اسکی ایک جماعت اجتماعی صورت میں سیکڑوں انسانوں کو اضطراب کی گھاٹ اتار سکتی ہے۔

یہی اتحاد و اتفاق اور اسلامی ہمدردی تھی کہ جب ان کو میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ میں صف بستہ دیکھا تو خلاّق عالم نے ان الفاظ میں تعریف کی:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (سورہ الصّف، آیت: ۴)

"بے شک اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بندی کے ساتھ قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ ایک پگھلائی ہوئی عمارت ہے"۔

یعنی اللہ تعالی اپنے ان محبوب بندوں سے یقینا محبت رکھتا ہے، جو اللہ کی راہ میں جس وقت صف بستہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دیوار سیسہ پگھلائی ہوئی ہے۔ اس سے مقصود اللہ تعالی کا یہ تھا کہ ان میں نہ کوئی رخنہ وانتشار ہے نہ اختلاف واختلال ہے بلکہ وہ سب ایک ہیں اور متفق ہوکر دشمن کے سامنے اس طرح کھڑے ہیں جس طرح فولادی دیوار ہوتی ہے۔

قرآن پاک دوسری جگہ بنی آدم کو تعلیم دیتا ہے: **لَاتَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ** (انفال:۴۶)

ترجمہ: آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

یعنی اگر تم فتنہ وفساد کرو گے تو تمہاری دھاک نکل جائے گی اور تم کمزور ہو جاؤ گے، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس اصول اسلامی کو چھوڑنے کی وجہ سے آج دنیا کو خصوصاً مسلمانوں کو کس کس مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کیا بہار اور کلکتہ وغیرہ کے دردانگیز واقعات آپ کے لئے درس عبرت نہیں بن سکتے، اتنی تعداد میں مسلمان ہونے کے باوجود کس ظلم وقہر کے ساتھ قتل کئے گئے۔ اسی اتحاد واتفاق کی بدولت بدر کے موقع پر ۳۱۳ آدمی ہزاروں کا مقابلہ کر کے فتح حاصل کر لیتے ہیں اور آج ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود شکست اور ناکامی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے وجوہ اور علل بہت ہوں، لیکن عدم اتحاد واتفاق ایک وجہ ضرور ہے، اور اسی قانون کو چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔

مقصد مذہب پر تحقیقی مضمون: ہندوستان میں تقابل مذاہب کے سلسلہ میں کسی مجلس یا جلسہ کا اہتمام ہوتا تو مولانا کو خاص طور سے بلایا جاتا، چنانچہ ''انجمن احمدیہ لاہور'' کے انتظام سے لاہور میں ایک ایسی ہی مذہبی کانفرنس بتاریخ ۲۸، ۲۹، دسمبر ۱۹۲۳ء کو منعقد ہوئی جس نے تمام مذاہب کو شرکت کی دعوت دی کہ اپنی اپنی کتاب کی روشنی میں بتاؤ کہ مذہب کا کیا مقصد ہے؟ مدعووین میں مولانا امرتسریؒ بھی تھے چنانچہ مولانا اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور نہایت جامع اور مفید مضمون پڑھا، اس لئے ناظرین کرام کی بصیرت ونصیحت کے لئے پورا مضمون نقل کرتا ہوں۔ وھو ھٰذا۔ (ص ۲۳۱)

تہذیب نفس: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی:

صاحبان! کچھ شک نہیں کہ انسان کی پیدائش مثل سونے کے ہے جو باوجود قیمتی جوہر ہونے کے کان سے خاک آلود نکلتا ہے، بعد میں صاف سُتھرا کیا جاتا ہے تو قدر و قیمت پاتا ہے، اسی طرح انسان اپنی فطری حالت میں نفسانی آلائشوں سے آلودہ ہے جن سے صاف ہونا اس کا فرض قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: **قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔**

(الشمس: ۱۰)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کرلیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

پس ثابت ہوا کہ مذہب سے مقصد ہے ''تہذیب نفس'' دگر ہیچ۔ یعنی انسان جن آلائشوں میں آلودہ ہے ان سے پاک ہونے کی کوشش کرنا اس کا فرض ہے تاکہ نتھرے ہوئے سونے کی طرح خالص ہوجائے، سچ ہے ؎

تا مثل حنا سودہ نہ گردی تہِ سنگ
ہرگز بکف دست نگارے نہ رسی

یعنی جب تک مہندی کی طرح پتھر کے نیچے پسے نہیں جاؤ گے، کسی محبوب کے ہاتھ کی ہتھیلی تک تمہاری رسائی نہ ہوسکے گی۔

ف: مولانا امرتسریؒ نے نزولِ کتاب کا مقصد تہذیب نفس یا بالفاظ دیگر تزکیہ نفس قرار دیا ہے، بلکہ دیکھا جائے تو یہ تزکیۂ نفوس ہی تمام دین وشریعت کی غایت اور بعثتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اصلی مقصد ہے اور تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے اذہان، اعمال واخلاق کو ان رذائل وجرائم سے پاک کیا جائے

جو روحانی و اخلاقی بیماریوں کے سبب بنتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے اندر ان نیکیوں کی تخم ریزی کی جائے جو انسان کے ظاہر و باطن کو سنوارتی اور اس کے عادات و خصال کو مہذب بناتی ہیں۔

اس لئے صوفیائے کرام نے اس تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس کی طرف خاص توجہ فرمائی اور اپنے طریق کی اصل و بنیاد حسن اخلاق کو قرار دی۔ چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم اپنی مشہور کتاب ''مشائخ چشت'' میں یوں رقمطراز ہیں:۔

شیخ ابوالحسن کا قول ہے کہ:

ليس التصوّف رسوما ولا علوما ولكنه اخلاق۔

تصوف رسوم اور علوم کا نام نہیں بلکہ اخلاق کا نام ہے۔

حضرت شیخ محمد ابن قصاب کہا کرتے تھے:

التصوف اخلاق كريمة ظهرت في زمان كريم من رجل كريم مع قوم كريم۔

تصوف اخلاق کریمہ ہیں جو بہتر زمانہ میں بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔

حضرت محمد ابن علی حسین ابن علیؓ ابن ابی طالب کا قول ہے:۔

التصوف خلق فمن زاد عليك في الخلق زاد عليك في التصوف۔

تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے پس جو شخص تم میں زیادہ اخلاق والا ہے وہ تصوف میں تم سے بڑھا ہوا ہے۔

حضرت شیخ مرتعشؒ فرماتے ہیں:

”التصوف حسن الخلق“ تصوف خلق نیک کا نام ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

تصوف راہ صدق و اخلاق حسنہ کا نام ہے۔

چنانچہ صوفیاء کرامؒ کے حالاتِ زندگی اور تصوف کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی تصوف نفوس انسانی کو مادی نجاستوں سے پاک کرنے اور اعلیٰ اخلاق و کردار پیدا کرنے کی ایک عظیم الشان تحریک تھی، صوفیہؒ نے کار نبوی کو جاری رکھا اور بنی نوع انسان کے اخلاق و اطوار، فکر و عمل کو درست کرنے کی کوششیں کیں، مشائخ متقدمین کے ملفوظات تعلیم اخلاق کی سلسبیل و کوثر ہیں۔ جن کی خاموش روانی دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور دلوں میں اچھے عمل کا جذبہ اور ولولہ جوش مارنے لگتا ہے۔ (مشائخ چشت: ج/۱ص/۷۸)

خود اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے فرائض میں سے آیات اللہ کی تلاوت اور کتاب وحکمت کی تعلیم کے علاوہ تزکیۂ نفس کو بھی ایک فریضہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِه وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (الجمعة:۲)

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور دانشمندی سکھاتے ہیں۔ اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ**

(مشکوٰۃ: ص ر ۴۳۲)

''میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ حُسن اخلاق کی تکمیل کروں۔''

ف: اب غور فرمائیے کہ قرآن وحدیث میں تہذیب نفس اور اصلاح اخلاق کی اس قدر اہمیت بیان فرمائی گئی ہے اور آج کے دور میں اسی فریضہ کی طرف سے عام غفلت برتی جارہی ہے، لہذا نتیجہ ظاہر ہے کہ تمام عالم میں بگاڑ وفساد کا دور دورہ ہے حتیٰ کہ دین اسلام سے منسلک جماعتوں میں بھی اتحاد واتفاق نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ **فَیَاوَیْلَاہُ وَیَاحَسْرَتَاہ** (مرتب)

وفات: آزادی کے بعد بہت سی مصیبتیں جھیل کر امرتسر سے پاکستان کو ہجرت فرمائی اور سرگودھا میں قیام فرمایا، وہیں آپ کو فالج کا اثر ہوا اور ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۹۴۸ء کو رحلت فرمائی۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ۔**

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ المتوفی ۱۳۶۹ھ

نسب وولادت: ۱۰ر محرم الحرام ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، مولانا عثمانیؒ حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ کے فرزند جلیل القدر تھے اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی کے برادر خورد۔

عہد تعلیم: علامہ عثمانیؒ کی ۱۳۱۱ھ میں بسم اللہ ہوئی اور حافظ نامدار صاحب دیوبندی کے سران کی بسم اللہ کا سہرا بندھا، اُردو کی کتابیں پڑھنے کے بعد اور مولانا محمد یٰسین صاحب سے فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں عربی کا آغاز کیا اور ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں تمام دورے کے طلبہ میں اول رہ کر فراغت حاصل کی۔

علامہ اپنے عہد طالبعلمی ہی میں بڑے ذہین اور فطین مشہور تھے، اسی زمانہ میں طلبہ کو منطق وغیرہ کی مختلف کتابیں پڑھاتے، گویا طالبعلمی کے زمانہ میں طالبعلم بھی تھے اور مدرس بھی، اس زمانہ ہی میں دارالعلوم کی چہار دیواری میں انکی شہرت چل نکلی تھی، دیوبند میں صدیقی اور عثمانی خاندان اپنی علمی سرگرمیوں کے باعث دو مشہور خاندان تھے اور اب بھی ہیں، علامہ شبیر احمد، عثمانی خاندان کے ذی وجاہت چشم وچراغ ثابت ہوئے، اور اپنے ماحول سے انہیں پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

اساتذہ: یوں تو آپ کے مختلف اساتذہ تھے لیکن ان میں سب سے بڑے

استاذ حدیث حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا تھے، استاذ آفتاب اور شاگرد ماہتاب ہو تو استفادہ اپنا رنگ لا کر رہتا ہے جس شاگرد کو ایسا جلیل القدر استاذ مل جائے اور جس استاذ کو ایسا ذہین وفہیم شاگرد نصیب ہو جائے وہ دونوں **نور علی نور** نہ ہوں تو اور کون ہوگا؟

فراغت کے بعد: چونکہ علامہ کی علمی شہرت طالبعلمی کے زمانہ میں ہو چکی تھی اس لئے فراغت کے بعد آپ نے چند ماہ دارالعلوم میں اونچے درجہ کی کتابیں پڑھائی، بعد ازاں فتح پوری مسجد دہلی کے عربی مدرسہ میں صدر مدرسی کے عہدے پر ۱۹۰۹ء میں تشریف لے گئے، وہاں کے قیام میں دہلی میں آپ کی تقریریں ہوئیں اور اہل دہلی میں آپ کی شہرت نے زبردست خراجِ تحسین حاصل کیا۔

چونکہ اکابر دیوبند کی نظر میں آپ کی علمی لیاقت اور تقریر وتحریر کے اوصاف عیاں تھے اور سب چھوٹے بڑے ان کی فہم وفراست سے متاثر ہو چکے تھے اس لئے سب کی خواہش یہی تھی کہ علامہ عثمانی کو دارالعلوم دیوبند واپس بلالیا جائے، چنانچہ واپس آ گئے، اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا، اور ہر قسم کے علم وفن کی کتابیں پڑھائیں، آغاز درس میں آپ کو معقولات یعنی منطق وفلسفہ سے بیحد شغف تھا، یہ دیکھ کر آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ نے جو اس زمانہ میں نائب مہتمم تھے آپ کو حدیث وفقہ کے اسباق دیکر خصوصیت کے ساتھ علوم منقولات کی طرف متوجہ کیا، آپ نے تفسیر وحدیث اور فقہ میں بڑا کمال حاصل کیا بلکہ فن تفسیر کا آپ کو ہندوستان میں امام تسلیم کیا جانے لگا، اس طرح آپ معقولات ومنقولات دونوں میں یکساں مہارت کے مالک ہو گئے۔

فن تفسیر: فن تفسیر میں کمال پر آپ کا زبردست شاہکار قرآن کریم کے وہ تفسیری فوائد ہیں جو تمام ملک پاک وہند میں چھپ کر بڑے مقبول ہوئے، بیسیوں ایڈیشن متحدہ ہندوستان میں چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے، حکومت افغانستان نے فارسی میں ترجمہ کرا کے اپنے ملک میں چھپوایا اور دوسری کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

ان تفسیری فوائد پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ یوں تحریر فرما رہے ہیں:

''اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے علامہ زمان، محقق دوراں، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ زید مجدہم کو دنیائے اسلام کا درخشاں آفتاب بنایا ہے، مولانائے موصوف کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، بے مثل تحریر، عجیب وغریب حافظہ، عجیب وغریب تبحر وغیرہ کمالات علمیہ ایسے نہیں ہیں کہ کوئی شخص منصف مزاج اس میں تامّل کر سکے، قدرت قدیمہ نے مولانا شبیر احمد صاحبؒ موصوف کی توجہ تکمیل فوائد اور ازالہ مغلقات کی طرف منعطف فرما کر تمام عالم اسلامی بالخصوص اہل ہند کے لئے عدیم النظیر حجت بالغہ قائم کردی ہے، یقینا مولانا نے بہت سے ضخیم ضخیم تفسیروں سے مستغنی کر کے سمندر کو کوزے میں بھر دیا۔''

(قرآن کریم تفسیر عثمانی، مدینہ پریس بجنور)

مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ان کی تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو میں ان کے قرآن کے حواشی ہیں جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن

کے ساتھ چھپے ہیں، ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی اور تفسیروں پر عبور اور عوام کے دلنشین کرنے کے لئے ان کی قوت تفہیم بیان سے باہر ہے۔'' (معارف: اپریل، ۱۹۵۰ء)

اور مولانا سید محمد میاں صاحب مصنف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' نے تو آپ کو صاف طور پر قاسم ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے، علامہ عثمانی کے تفسیری فوائد کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ تفسیر ایک ایسے متبحر عالم نے لکھی ہے جس کے متعلق مسلمانان ہند کا صحیح علم یہ ہے کہ فہم قرآن، غور وفکر اور سلاستِ کلام، دلچسپی تحریر، دلپذیری تقریر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، یعنی شیخنا واستاذنا مفسر اعظم قاسم ثانی حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ شارح مسلم۔''

(قرآن کریم مطبوعہ مدینہ پریس بجنور)

تقریر وتحریر: علامہ کی تصنیفی خدمات یعنی کتابوں سے ان کے ادبی کمال اور انشا پردازی کا اندازہ لگانا آسان ہے اور تقریر کا حال یہ تھا کہ کسی کی کیا مجال تھی کہ دوران تقریر اٹھ کر چلا جائے، آپ کی تقریر دلوں کو گرماتی چلی جاتی تھی اور اتنی موثر ہوتی تھی کہ جسمانی مشین کے پرزوں کو عمل کے لئے متحرک کرنے کا پورا کرنٹ چھوڑ دیتی اور اہل مجلس کا شوق اور زیادہ ہوجاتا تھا، ان کی فصاحت اور بلاغت اور معانی پر دل قربان ہونے کو چاہتا تھا۔

تدریس: علامہ جہاں بہترین عالم تھے، وہاں بہترین مقرر وانشاء پرداز ہونے کے علاوہ بہترین مدرس بھی تھے، میدان درس ایک جدا میدان ہے جس میں ہر عالم

کامیاب نہیں ہوتا، آپ کا درس بیشمار خصوصیات کا حامل ہوتا تھا، سبق پڑھاتے وقت پورے ذوق وشوق کو عمل میں لاتے تھے، طلبہ بیحد متاثر ہوتے تھے، اس طرح تقریر فرماتے کہ کتاب کا ایک ایک لفظ دل میں اتر جاتا، مشکل سے مشکل مضمون کو اس طرح بیان فرماتے کہ مشکل مسئلہ مشکل نہ رہتا، بلکہ آسان ہوکر سامنے آجاتا۔

قرآن پاک کی تفسیر فرماتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ مطالب کا کشف ہو رہا ہے، اسی طرح درسِ حدیث کے وقت قرن اول کے محدثوں کا گمان ہوتا تھا کہ آسمان سے وحی نازل ہو رہی ہے، اسی طرح درسِ حدیث کے وقت دلوں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ مجلس میں تشریف فرما ہیں اور قال الرسول کا بازار گرم ہے۔ (بیس بڑے مسلمان: ص/۵۵۱)

آپ نے دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۸ء تک تعلیم دی اور اس سے پہلے دو سال مدرسہ عربیہ فتح پوری دہلی اور ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۳ء تک دو تین سال کے سواڈابھیل سورت (گجرات) کے جامعہ عربیہ میں درس دیا۔

آپ بعض وجوہ کے سبب ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے جدا ہوکر جامعہ عربیہ ڈابھیل میں مقیم ہوگئے، اور وہاں درس دیتے رہے، ۱۹۳۶ء میں پھر دارالعلوم کے صدر منتخب ہوئے اور دونوں جگہ کام کرتے رہے لیکن چند سال کے بعد ڈابھیل سے مستقل طور پر دیوبند تشریف لائے۔

اس عرصہ میں آپ نے طلبہ قدیم کی تنظیم، چندے کی فراوانی اور انتظامات مدرسہ میں بہت دلچسپی لی۔

دارالعلوم سے علیحدگی: ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف ملک

میں آزادی کا نیا ولولہ اور جوش پیدا ہوا، طلبہ دارالعلوم نے بھی اس میں حصہ لیا، علامہ نے بعض طلبہ کو مدرسہ سے خارج کردیا، بعض شورش پسندوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کے بعض افراد نے طلبہ کو پھر داخل کرانا چاہا، چنانچہ علامہ پر سفارشوں کا دباؤ پڑا اور آپ نے بادل ناخواستہ طلبہ کو داخل کرلیا لیکن دل وہاں رہنے سے اچاٹ ہوگیا، اس لئے خود وہاں آنا جانا چھوڑ دیا اور صدارت اہتمام سے علٰیحدگی اختیار کرلی۔

اس کے بعد پھر ڈابھیل والوں نے بلالیا کچھ عرصہ آپ نے وہاں بحیثیت صدر جامعہ کام کیا اور بخاری وترمذی کا سبق دیتے رہے لیکن بیمار ہوگئے، آپ کے گھٹنوں میں درد رہتا اور چلنے پھرنے سے عاجز ہوگئے، اس اثنا میں اپنے دولت خانہ دیوبند میں ۱۹۴۷ء تک اقامت پذیر رہے۔

سیاست میں شرکت: آپ نے جمعیۃ الانصار میں سرگرمی سے حصہ لیا، نیز تحریک خلافت میں علامہ نے بڑا کام کیا، تحریک خلافت جب شباب پر آئی اور ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد ڈالی گئی تو اس میں خصوصیت کے ساتھ شریک ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تمام جلسوں میں ہمراہ ہوتے تھے اور تقریریں فرماتے تھے اور یہ شرکت ان کے لئے استاذ محترم کی نیابت کا بہت بڑا شرف تھا۔ خلافت اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت اور تقریروں نے علامہ کی شخصیت میں اور چار چاند لگادیئے، اس طرح مولانا موصوف جمعیۃ العلماء میں شریک رہے، تا آنکہ مسلم لیگ نے اپنا زبردست محاذ قائم کرلیا۔

چونکہ حضرت موصوف کا رجحان ابتداء سے ہی اس طرف تھا کہ مسلمانوں کے

حقوق کی نمائندہ جماعت ایسی ہونی چاہئے جو اپنے حقوق کی نگرانی کر سکے تو ایسی جماعت مسلم لیگ ہی ہو سکتی تھی اس لئے آپ اس میں شریک ہوئے جس سے مسلم لیگ کو بہت تقویت پہونچی اور علامہ عثمانی کی اس میں شرکت بہت ہی بابرکت ثابت ہوئی۔

چنانچہ علامہ عثمانی نے مسٹر محمد علی جناح سے تعاون کرنے کا جو اقدام کیا اس میں جو عوامل کارفرما تھے ان میں سب سے بڑا یہ تھا کہ وہ لیگ میں اس بناء پر شریک ہوئے کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائیگی۔

ف: اسلامی مملکت تو الحمدللہ علی احسانہ قائم ہوگئی، مگر اسلامی نظام قائم نہ ہو سکا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسلامی نظام قائم کرنے کی وہاں کے اہالیان کو توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین **وماذٰلک علی اللہ بعزیز** (مرتب)

وفات: دنیا میں کوئی رہا نہ رہ جائے گا، چنانچہ قدرت کو آپ سے جو کام لینا تھا اس کی تکمیل کے بعد ۶۹ ۱۳ھ مطابق ۱۳ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو اپنے جوار رحمت میں بلالیا۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔ اور کراچی میں مدفون ہوئے۔ **نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ**

حضرت مولانا حافظ قاری امین اظہر صاحب مئویؒ المتوفی: ۱۳۶۹ھ

ولادت وخاندان : آپ کی ولادت غالباً ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں موضع کاری ساتھ ضلع مئو میں ہوئی، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی محمد اسحٰق خاں تھا، خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ الحمد للہ ہمارے یہاں حضرت مولانا سید امین صاحب نصیر آبادیؒ تشریف لاتے تھے، ان کے بعد حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا بھی اس خاندان سے خاص تعلق تھا، جس کی بنا پر اپنی چاروں ہی صاحبزادیوں کا رشتہ اسی خاندان میں قائم فرمایا، جو ہم لوگوں کیلئے نہایت سعادت وکرامت کی بات تھی اور ہے۔

تعلیم : ابتدائی تعلیم تو گاؤں کے مکتب میں ہوئی، اس کے بعد شہر جونپور کی جامع مسجد اٹالہ میں حفظ قرآن پاک کی تکمیل فرمائی، آپ نے قصبہ جین پور ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ جامع العلوم (جس کے ناظم حضرت مولانا عبد الحکیم صاحب فتحپوریؒ تھے) میں عربی کی متوسط کتابیں پڑھیں، اس مدرسہ میں حضرت مفتی نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند اور حافظ زکریا صاحب فتحپوری نے بھی پڑھایا ہے، ہمارے والد ماجد جناب سلطان احمد صاحبؒ نے بھی اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی مدرسہ میں پڑھی تھیں، مگر اب یہ مدرسہ محض بچیوں کی تعلیم کے لئے خاص کردیا گیا ہے، جو" جامعۃ البنات جین پور، ضلع اعظم گڑھ کے نام سے مشہور ہے، جہاں ماشاء اللہ دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے، اس کے ناظم

مولانا عبدالحکیم صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا شمس الدین صاحبؒ تھے۔اور اب ان کے صاحبزادے مولوی محمد شاہد صاحب ہیں۔

آپ نے موضع مانی کلاں ضلع جونپور کے مولانا ماجد علی صاحبؒ سے (جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے شاگرد تھے) بھی بعض عربی کتابیں پڑھی تھیں، پھراس کے بعد مدرسہ دارالعلوم مئو میں داخل ہوکر مکرم قاری ریاست علی صاحبؒ اور قاری محمد مصطفیٰؒ سے قراءت پڑھی اور سند تجوید سے مشرف ہوئے۔

تدریس: پاکستان بننے سے پہلے مکرم قاری اسد اللہ صاحب فتحپوری کے ساتھ پڑھانے کے لئے ریاست بہاولپور پنجاب بھی تشریف لے گئے تھے، قصبہ کوپاگنج ضلع مئو میں کچھ دنوں سیٹھ سعد اللہ صاحب کی مسجد میں امامت اورتدریس کی خدمت انجام دی ،پھر مدرسہ دارالعلوم مئو میں تجوید کے مدرس ہوئے ،اور وفات سے قریب ایک ڈیڑھ سال پہلے تک تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، اس وقت ماہوار وظیفہ ۲۷ تا ۳۵ روپیہ تھا مگر اسی پر قانع رہے، باوجودیکہ دوسری جگہ اس سے بڑی تنخواہ پر ملازمت مل سکتی تھی۔

تزکیۂ نفس : اس اہم مقصد کیلئے حضرت مصلح الامتؒ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا اور دارالعلوم مئو سے جمعرات کوسائیکل سے کاری ساتھ آتے اور جمعہ کے دن حضرت والاؒ کی خدمت میں فتحپور تال نرجا حاضر ہوتے ،ساتھ میں اکثر وبیشتر والدمکرم جناب سلطان احمد صاحب ہوا کرتے تھے،کبھی اس حقیر کو والد صاحب ساتھ لے جاتے تھے۔حضرت مصلح الامت کی ایماء پر باطنی دولت کی تحصیل کیلئے وفات سے کچھ پہلے دارالعلوم مئو سے علیحدہ ہوکر حضرت والاؒ کے قدموں

میں جا پڑے اور اصلاحِ باطن میں مشغول ہو گئے، حضرت مصلح الامتؒ کی طرف سے اجازت وخلافت سے بھی مشرف ہوئے۔ جو ہم سب کے لئے شرف کی بات ہے۔ فللہ الحمد والمنہ

حسن خلق وکثرتِ عبادت: زہد وقناعت آپ کی خاص شان تھی، عبادت میں نماز تہجد، اشراق واوّابین کے پابند تھے، کلام اللہ کی تلاوت پابندی سے کرتے تھے، مغرب کے بعد نماز اوابین میں کچھ حصہ کلام پاک کی قراءت کا معمول تھا، ہر سال تراویح میں پورا قرآن پاک سناتے تھے، لایعنی باتوں سے احتراز فرماتے تھے، عموماً برادری کے لوگ جہاں حقہ وغیرہ پیتے وہاں سے الگ رہتے، ہاں بچوں سے بہت خوش طبعی فرماتے جوان کی زندہ دلی کی علامت تھی۔

بستی کے لوگ آپ سے عقیدت رکھتے تھے، نہایت نیک وصالح سمجھتے تھے، اور آپ کا لحاظ کرتے، آپ کی برکت سے گاؤں کے لوگ بھی حضرت مصلح الامتؒ کی طرف متوجہ ہوئے، مثلاً ہمارے دادا محمد نذیر خاں صاحبؒ بڑے والد حافظ مختار احمد صاحبؒ، ہمارے والد سلطان احمد صاحبؒ، مکرم صوفی محمد اسلام صاحبؒ، حافظ انوار الحق صاحبؒ حافظ ثناء اللہ صاحب نیز دیگر حضرات آمد ورفت رکھتے تھے۔

وفات: ۱۹۴۸ء میں حضرت مصلح الامتؒ کی خدمت میں مستقل قیام کے لئے تشریف لے گئے، مگر اتفاق کہ کچھ دنوں کے بعد آپ ایک مہلک بیماری کے شکار ہو گئے، اور ۱۹۴۹ء مطابق ۱۳۶۹ھ کے اخیر میں موضع کاری ساتھ ہی میں بروز جمعہ بوقت عصر رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جبکہ حضرت مصلح الامتؒ آپ کی عیادت کیلئے موضع کاری ساتھ تشریف لائے ہوئے تھے، اور غالبًا حضرت مصلح الامتؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور اسی دن گاؤں کے وسیع قبرستان میں تالاب کے کنارے مدفون ہوئے۔ (نوّر اللہ مرقدہ)

اپنی سعادت: یہ حقیر محمد قمر الزمان عرض پرداز ہے کہ آپ ہمارے حقیقی پھوپھا تھے اور استاذ بھی، آپ تو صالح تھے ہی، ہماری پھوپھی صاحبہ بھی ماشاء اللہ بہت ہی نیک و دیندار بلکہ بقول حضرت مصلح الامتؒ ولیہ تھیں، نماز روزے کی نہایت پابند تھیں، ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں کاری ساتھ ہی میں ان کی وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئیں، رحمہا اللہ تعالیٰ۔

یہ حقیر ۱۹۴۷ء میں مڈل کلاس پاس کرکے انہی کی سرپرستی میں دارالعلوم مئو میں داخل ہوا، چنانچہ آپ نے نہایت شفقت و محبت سے تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا۔ اور آپ کے توسط سے حضرت مصلح الامتؒ کی صاحبزادی عقیلہ خاتون سے نکاح ہوا۔ مگر افسوس کہ ہماری شادی سے چند ماہ قبل آپ کی وفات ہوگئی، جس کا ہم سب کو بہت قلق ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پھوپھا کی قبر کو نور سے بھر دے، اور ان کے ساتھ جو لوگ ذکور و اناث حضرات اس قبرستان میں مدفون ہیں ان سب کی قبروں کو منور فرمادے اور جنت میں مقام عالیہ سے نوازے۔ آمین (مرتب)

حضرت مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی رحمہ اللہ المتوفی ۱۳۶۹ھ

(نواب صدر یار جنگ)

ولادت وتعلیم: آپ کی ولادت ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوئی، مختلف اساتذہ سے قرآن شریف، اردو فارسی پڑھی اور خطاطی کی مشق کی، اسی طرح منطق، نحو، فقہ وحدیث بھی پڑھی اور ان علوم میں خاصی ترقی کی، اس کے بعد استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم علیگڈھی کولوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، حدیث کی سماعت اپنے پیرومرشد مولانا فضل رحمن صاحب علیہ الرحمہ گنج مرادآبادی اور قاری عبدالرحمن صاحب مرحوم پانی پتی سے بھی کی، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں حاضری کے دوران مشہور قراء سے قرأت میں استفادہ کیا۔

انگریزی پڑھنے کا بھی سلسلہ جاری رکھا، یہاں تک کہ انگریزی استعداد میں اس قدر ترقی کی کہ انگریزی کتب اور اخباروں کو بے تکلف سمجھتے تھے اور انگریزوں سے ان کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

آپ کا کتب خانہ: مولانا موصوف کو لڑکپن ہی سے کتابوں کے جمع کرنے کا شوق تھا، چنانچہ آپ کا کتب خانہ ہندوستان میں کیا، پوری دنیا میں مشہور ومعروف ہے، آپ اس کتب خانہ میں نہایت ذوق وشوق سے اوقات مقررہ میں مصروف رہتے تھے، اس کی فہرست بڑی محنت سے کئی حصوں میں خود مرحوم نے مرتب فرمائی تھی۔

آپ کی تصنیفات سے آپ کا کثرت مطالعہ اور علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے علمی حلقوں میں نہایت عظیم اور ذی استعداد سمجھے جاتے ہیں، آپ بہت سے علمی و دینی مناصب پر فائز رہے۔

تذکرہ علماء سلف سے اقتباس: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کی مشہور تصنیف ''تذکرہ علمائے سلف'' سے اپنے اکابر کی حق شناسی و حق گوئی کے سلسلہ میں جو مضمون تحریر فرمایا ہے اس کا کچھ حصہ نقل کروں، امید ہے کہ ناظرین کرام اس کو صرف پسند ہی نہیں بلکہ اس سے نصیحت بھی حاصل کریں گے۔ واللہ الموفق۔

معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف: عربی کا ایک مقولہ ہے **"المعاصرة سبب المنافرة"** یعنی ہم عصری باہم نفرت کا باعث ہوتی ہے، یہ عادت تقریباً طبیعت ہو چکی ہے جو ہم فن اہل کمال ایک ہی زمانہ میں ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے کمال کا اعتراف کما حقہ نہیں کرتے اِلا ماشاء اللہ تعالی، جب ایک ہی عہد کے دو ہم فن اہل کمال کے دل ٹٹولے جائیں تو ان کی باہمی بے پرواہی رقابت کے اثر سے کم وبیش پرخاش و مغائرت کی حد تک ترقی کئے ہوئے نظر آئے گی۔

مگر ہم جن علماء کے حالات آپکو سنا رہے ہیں ان کی جوش حق پرستی نے کبھی معاصرین کے فضل وکمال سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔

معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ علی الاعلان ان کو اپنے آپ سے زیادہ عالم و کامل بتائیں، ان کی جلالت کے

سامنے اپنی بے مائگی کا اقرار کریں اور جب کوئی مشکل پیش آئے تو ان سے ان کے حل کر دینے کا سوال، یا اگروہ ان کی تصانیف پر اعتراض کریں تو شکریہ ادا کیا جائے، اور دعائے خیر سے یاد۔

ایک موقع پر سرخیل تابعین امام شعبیؒ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے جنگی معرکوں کو بیان کرر ہے تھے، اتفاقاً حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا گذر اسی راستہ سے ہوا، امام ممدوح کا بیان سن کرفرمایا کہ جس قوم کا یہ ذکر کرر ہے ہیں، میں اس کے دیکھنے والوں میں ہوں، لیکن مغازی، یہ مجھ سے زیادہ اور بہتر جانتے ہیں۔

حضرت امام باقرؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی شخص حج کے مسئلے عطاؒ سے بہتر نہیں جانتا۔

حضرت امام زین العابدینؒ اپنے ایک شاگرد زید ابن اسلم کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے، لوگوں نے اس پر تعجب ظاہر کیا تو پاک نفس امام نے فرمایا کہ جس کی صحبت میں دین کا نفع ہوتا ہے اس کے پاس انسان بیٹھتا ہی ہے۔

ابن اسحاق اصفہانیؒ جب بصرہ گئے اور وہاں کے محدثین سے حدیث پڑھنی چاہی تو سب نے پوچھا کہ تمہارے شہر میں عباس ابن یزیدؒ نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا: ہیں، تو فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے تم ہمارے پاس کیوں آئے؟

اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد مبارک میں افراد نہیں بلکہ گروہ کے گروہ حق کے گرویدہ تھے اور حسنِ تعلیم نے سب کے مذاق یکساں پاک

وصاف کر دیئے تھے۔

جب تک حضرت سالم ابن عبداللہؒ زندہ رہے، امام نافعؒ نے فتویٰ نہیں دیا، حضرت سعید ابن المسیبؒ کے پاس جب کوئی حاجت مند فتویٰ پوچھنے آجاتا تو امام ممدوحؒ فرماتے کہ سلیمان ابن یسارؒ کے پاس جا کر پوچھو، اس لئے کہ آج وہ سب سے زیادہ عالم ہیں۔

حضرت قاسمؒ (ابن محمد ابن ابوبکرؓ) سے کسی نے پوچھا کہ آپ زیادہ عالم ہیں کہ سالمؒ (ابن عبداللہؓ ابن عمرؓ)؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ مرتبہ سالمؒ ہی کو حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو جب ضرورت پیش آتی تو وہ زِرابن حبیشؓ سے عربیت کے متعلق باتیں دریافت فرمایا کرتے۔

قابوس نے جب اپنے والد سے یہ سوال کیا کہ آپ صحابۂ کرام کی موجودگی میں علقمہؒ (تابعی) کے پاس کیوں جایا کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس لئے جایا کرتا تھا کہ میں نے بعض صحابہ کو دیکھا کہ وہ علقمہؒ کے پاس تشریف لے جا کر مسائل دریافت فرماتے تھے۔

خواجہ حسن بصریؒ کو جب کوئی مشکل پیش آجاتی تو بذریعہ تحریر حضرت سعید ابن المسیبؒ سے دریافت فرمالیتے۔

امام احمدؒ کو فنِ حدیث میں ایک بار اشکال پیش آیا تو انہوں نے اپنے معاصر ابن مندہؒ سے نیشاپور خط بھیج کر حل کر لیا۔

حضرت ابن عمرؓ اکثر امام مجاہدؒ (تابعی) کے گھوڑے کی رکاب تھام لیا

کرتے تھے۔

اشہب ابن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو امام مالکؒ کے حضور میں ایسا مؤدب بیٹھا دیکھا جیسے چھوٹے بڑوں کے سامنے بیٹھتے ہیں۔

امام اعظمؒ امام مالکؒ سے تیرہ برس بڑے تھے اور طبقہ میں بھی ان سے عالی ہیں، اسی واسطے امام ذہبیؒ واقعہ بالانقل کر کے فرماتے ہیں کہ ''اس سے امام ابوحنیفہؒ کے حسنِ ادب اور تواضع کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور حق یہ ہے کہ ان بزرگوں کی عظمت کے اصلی اسباب یہی صفات تھیں۔

(تذکرہ علمائے سلف: ص ر ۹۴، مؤلفہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانیؒ)

ف: سبحان اللہ! یہ تھے ہمارے اکابر جن کے ہر ہر قول وفعل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات سراپا اخلاص تھے، جس کے صلہ میں اللہ تعالی نے ان کے ساتھ خاص انعام واکرام کا معاملہ فرمایا، دنیا میں بھی نیک نام ہوئے، اور آخرت میں بھی ان شاء اللہ تعالی فائز المرام ہوں گے۔ کفٰی لنا قدوۃً۔ اللہ تعالی ہم سب کو ان حضرات کی اقتداء وتقلید کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین! (مرتب)

وفات: ۱۳۶۹ھ مطابق اگست ۱۹۵۰ء میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے اور ۸۶ سال کی عمر پائی۔ رحمہ اللہ تعالی۔

حضرت مولانا حکیم محمد محمود صاحب معروفیؒ المتوفی ۱۳۰۷ھ

نام ونسب: مولانا محمد محمود بن محمد ظاہر بن محمد طاہر بن شیخ پیر محمد معروفی نے علم ودولت اور سیادت وقیادت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، آپ کے دادا مولانا محمد طاہر[1] معروفی ایک جید عالم اور طبیب کی حیثیت سے پورے ضلع میں مشہور تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں علمی وروحانی سیادت کے ساتھ مال ودولت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، جس کا مولانا محمد محمود معروفی کی نشو ونما پر بڑا اچھا اثر پڑا۔

تعلیم: سن شعور کو پہونچے تو گھر ہی پر قرآن مجید وغیرہ کی تعلیم کے بعد عربی وفارسی کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ فیض عام کان پور میں داخل ہوگئے اور مولانا احمد حسن کانپوری اور دوسرے اساتذہ سے درس نظامیہ کی تحصیل کی، طالب علمی ہی کی زمانہ میں مولانا کو مطالعۂ کتب کا خاصا ذوق پیدا ہوگیا تھا، چنانچہ اسی وقت سے درسی وغیر درسی کتابوں کو جمع کرنا شروع کردیا اور مطالعہ کے بعد ہر کتاب کے سرورق پر اپنی یادداشت کی فہرست، مجمل ومشکل مقامات کی تشریح وتوضیح کتابوں کے حوالے کے ساتھ تحریر کرتے رہتے تھے، یہ کتابیں آج بھی مولانا کے کتب خانہ میں موجود ہیں جن سے ان کی وسعتِ مطالعہ اور کثرت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمود مرحوم نہایت ذہین وطبّاع واقع ہوئے تھے، آپ کے رفقائے

---

[1] مولانا محمد طاہر معروفی کے تفصیلی حالات اوصاف وکمالات اقوال سلف حصہ ششم میں ملاحظہ کریں (مرتب)

درس میں کئی ایسے علماء تھے جو سالوں تدریس کا کام کرنے کے بعد مزید تحقیق کی غرض سے مولانا احمد حسن کانپوری سے دوبارہ پڑھ رہے تھے، مگر یہ حضرات بھی علمی وفنی شکوک وشبہات پیش کرنے میں کبھی مولانا محمود سے سبقت نہ لے جا سکے، اسی بنا پر حضرت مولانا احمد حسن انھیں اپنے لڑکے کی طرح مانتے تھے، غرض تین برس تک مسلسل مولانا کانپوری کی خدمت میں رہ کر پورے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ جملہ علوم وفنون کی تحصیل کر کے ۲۷ رجب ۱۳۱۴ھ میں سند فراغت حاصل کی، مولانا کانپوری نے انھیں جو سند دی تھی اس میں مختلف علوم وفنون کی اکیس کتابوں کے نام مرقوم ہیں۔

تدریسی خدمات: تعلیم سے فارغ ہو جانے کے بعد دو برس تک گھر ہی پر مقامی طور سے طلبہ کو پڑھاتے رہے اور جب ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے پہلے مدرس منتخب ہوئے، تفہیم مطالب میں مولانا کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ سخت سے سخت تر مباحث کو ایسے سہل اور آسان انداز میں طلبہ کو سمجھا دیا کرتے تھے کہ گویا وہ سمجھتے کہ یہ کتاب کی آسان ترین بحث ہے، آپ کے مشہور شاگرد مولانا شکر اللہ مبارک پوری اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بہت سے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی مگر مولانا محمد محمود صاحب جیسا پڑھانے والا کسی کو نہ پایا، مبارک پور میں آپ کے شاگردوں میں بڑے اچھے عالم پیدا ہوئے جن میں مولانا نعمت اللہ مبارک پوری، مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مفتی محمد یٰسین مبارک پوری، مولانا محمد امین ادروی، مولانا محمد صابر مئوی وغیرہ بڑی شہرت کے مالک ہوئے۔

آپ نے ایک عرصہ تک احیاء العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی، آخر میں پورہ معروف کے ملی وقومی کاموں کی وجہ سے طویل رخصت لے کر کچھ دنوں کیلئے مکان پر رہے اور ایام رخصت گذر جانے کے بعد پھر احیاء العلوم میں آگئے، لیکن پورہ معروف کے گونا گوں امور اس بات کے متقاضی ہوئے کہ آپ پورہ معروف کے قریب ہی رہیں، اس لئے مجبوراً احیاء العلوم سے علیحدہ ہوکر دار العلوم مئو میں بحیثیت صدر مدرس کے آگئے، لیکن ۱۳۲۴ھ میں جب ان کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا تو ناچار دار العلوم کو بھی چھوڑ دیا اور گھر ہی پر رہنے لگے۔

مدرسہ معروفیہ کا قیام: یہاں بھی علمی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ۱۳۳۰ھ میں مدرسہ معروفیہ کی بناڈالی اور اپنے تلمیذ رشید مولانا نعمت اللہ مبارک پوری کو مدرسی کے لئے مقرر کیا، مولانا نعمت اللہ نے ۱۳۳۷ھ تک یعنی پورے سات سال اس مدرسہ میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اس کے بعد ۱۳۵۶ھ میں ایک دوسرا مدرسہ اشاعت العلوم کے نام سے جاری کیا۔

مہارت طب: ان علمی صلاحیتوں کے ساتھ مولانا طب وحکمت میں بھی ماہر تھے، کان پور میں اس فن کو بھی حاصل کیا تھا اور گھر پر اپنے والد حکیم ظاہر صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا، راجہ عظمت گڈھ کے آپ خاص معالج تھے اور خطیر رقم بطور وظیفہ کے آپ کو یہاں سے ملتی تھی، بڑے اعزاز کے ساتھ پالکی پر سوار ہوکر راجہ کے یہاں جایا کرتے تھے، تشخیص وتجویز کا یہ عالم تھا کہ نبض پر ہاتھ رکھا اور اٹھایا ایک سکنڈ میں مرض کی شناخت کر لیتے تھے، ایک مرتبہ بعض منچلوں نے بطور امتحان کے بھینس کا قارورہ آپ کو دکھایا آپ نے اسے دیکھ کر نسخہ میں کھلی

اور بھوسہ لکھ دیا، اسے دیکھ کر وہ لوگ آپ کی حذاقت ومہارت پر دنگ رہ گئے، ۱۳۵۴ھ میں حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، حاصل کلام مولانا محمد محمود مرحوم جامع کمالات عالم تھے اور آپ کی ذات سے علمی دنیا کو بڑا فائدہ پہونچا تھا، تالیفات میں آپ کے وہ حواشی جو اپنے کتابوں پر تحریر فرمائے ہیں، علم وفن کے اعتبار سے بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، مگر شائع نہ ہونے کی وجہ سے علمی دنیا میں معروف نہ ہو سکے۔

ف: یہ حقیر بچپن سے ہی حکیم صاحب کا ذکر طبابت بلکہ ذکر حذاقت سنا کرتا تھا آپ فتحپور تال نرجا ضلع مئو کے لوگوں کا علاج فرماتے تھے اس سلسلے میں میں نے سنا کہ فرماتے تھے کہ فتح پور کے لوگوں کو نزلہ وزکام میں مچھلی کھانے سے پرہیز کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کی ان کی یہ خاص غذا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے جس کی وجہ سے زکام میں مچھلی مضر نہ ہوگی میرا خیال ہے کہ حضرت مصلح الامت سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کی خدمت میں آمدورفت رکھتے تھے (مرتب)

وفات: مولانا نے اپنے عمر طبعی کو پہنچ کر ۷ رشعبان ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴ر اپریل ۱۹۵۱ء کو علی الصباح داعی اجل کو لبیک کہا اور بعد نماز ظہر آبائی قبرستان پورہ معروف میں سپرد خاک ہوئے۔ **نور اللہ مرقدہ۔**

(تذکرہ علماء اعظم گڈھ صفحہ: ۳۸۵)

حضرت مولانا قاری ضیاء الدین صاحب الہ آبادیؒ[1] المتوفی ۱۳۷۱ھ

نام و تعارف: آپ کا اسم گرامی ضیاء الدین احمد ہے، آپ کے والد محترم کا نام شیخ عبد الرزاق تھا، قصبہ نارا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے، ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں آپ پیدا ہوئے ابھی چار پانچ سال ہی کی عمر تھی کہ آپ کے والد ماجد مولانا شیخ عبد الرزاق صاحب کا انتقال ہو گیا۔

تعلیم و تربیت اور تدریس: بعض اعزاء نے چاہا کہ حضرت قاری صاحب کو انگریزی تعلیم دلوائی جائے لیکن آپ کی والدہ ماجدہ نے سختی سے مخالفت کی اور آپ کی دینی تعلیم شروع کرائی، بارہ تیرہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کریم سے مشرف ہوئے، پھر کانپور میں درس نظامی کے ساتھ ساتھ شیخ القراء مقری حضرت مولانا قاری عبد الرحمن صاحب علیہ الرحمۃ سے قراءت عشرہ کی تکمیل کی۔

لیکن درس نظامی سے ابھی فراغت ہوئی نہ تھی کہ امروہہ کے ایک مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد نے آپ کو بہت اصرار سے دعوت دی اور آپ موصوف اس

---

[1] آپ کے حالات ''فتح الرحمن فی شرح خلاصۃ البیان'' میں شارح خلاصہ عزیز مکرم قاری محمد صدیق سانسرودی صدر القراء مدرسہ فلاح دارین ترکیسر گجرات نے نقل کیا ہے اسی سے ماخوذ ہے قاری صاحب اس کے ماخذ کے سلسلہ میں یوں رقم طراز ہیں۔ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ کے یہ مختصر حالات تذکرۂ قاریان ہند فیضان رحمت، التبیان شرح خلاصۃ البیان، دراسۃ العرفان شرح خلاصۃ البیان اور تنویر المرأت میں مصنفؒ کے تلمیذ رشید ڈاکٹر غلام کے لکھے ہوئے حالات سے مستفاد ہے۔ (مرتب)

مدرسہ میں تقریباً سولہ سال کی ہی عمر سے تجوید وقرأت کی تدریس میں مشغول ہو گئے۔

حضرتؒ بھی اپنے استاذ کی طرح بڑے خوش الحان تھے، ادائیگیوں میں بھی خوب صفائی اور بڑا کمال رکھتے تھے، اسی مدرسہ میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے دو مشہور ومعروف شاگرد حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی اور حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب مفسر علیہما الرحمۃ والرضوان تھے جو طلبہ عزیز کو تفسیر و حدیث شریف کے علم سے فیضیاب فرما رہے تھے، آپ نے بھی ان دونوں بزرگوں سے بقیہ درس نظامی کی تکمیل فرمائی اور ایک مدت تک اسی ادارہ میں مصروف کار رہے اور طلبۂ عزیز کی کثیر تعداد حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تجوید وقرأت میں مستفیض ہوتی رہی۔

اس طرح مختلف مدارس اسلامیہ مثلاً مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ، مدرسہ تجوید القرآن سہارنپور، مدرسہ عربیہ سرائے میر ضلع اعظم گڈھ، اخیر میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی طلبی پر آپ وہاں تشریف لے گئے۔

اخلاق و عادات: حضرت قاری صاحبؒ سراپا تقویٰ، سراپا حیا اور سراپا خلوص تھے، زبان مبارک یا اشارہ سے بھی کبھی کسی کے خلاف کچھ نہیں فرماتے، سنت وشریعت پر سختی سے عمل کرتے تھے، صبر وشکر آپ کا خاص شیوہ تھا، چھوٹے بڑے ہر شخص سے خاتمہ بالخیر کے لئے دعا کراتے تھے۔

علمی یادگار: بایں ہمہ قدرت نے آپ کو علمی تعمق وفنی بصیرت کے ساتھ زور قلم

سے بھی خوب نوازا تھا جس کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل وقیع تصانیف آپ کی علمی یاد گار ہیں؛

(۱) تیس سال کی عمر میں آپ نے خلاصۃ البیان تصنیف فرمائی اور اسی سال پہلی بار طبع ہوئی۔

(۲) خلاصۃ البیان کی عربی شرح لکھنی شروع کی تھی وہ تشنۂ تکمیل رہی اور بقول حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب دامت برکاتہم اس کا نام ضیاء القرآن رکھا تھا۔

(۳) رائیہ کی بھی اردو زبان میں شرح لکھنی شروع کی تھی مگر وہ بھی نامکمل رہی۔

(۴) ضیاء القرأت یہ اردو زبان میں مختصر مگر جامع رسالہ ہے جس میں مسائل تجوید کو جمع فرمایا ہے اور اس کی ایک بہترین شرح آپ ہی کے خلف رشید و صحیح جانشین حضرت مولانا قاری محب الدین صاحب رحمۃ اللہ نے لکھی ہے۔

پسماندگان: حضرت قاری ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چار صاحب زادے تھے اور سب ہی علم قرأت میں مہارت رکھتے تھے، ان میں سب سے بڑے قاری ریاض الدین احمد صاحب تھے والد ہی کی زندگی میں ۱۳۴۲ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے صاحب زادے قاری عصام الدین احمد صاحب تھے والد محترم سے کسب فیض کیا تھا، علی گڈھ یونیورسٹی میں تجوید و قرأت کا درس دیتے رہے۔

تیسرے قاری مستجاب الدین احمد صاحب تھے والد صاحب ہی سے حفظ،

تجوید وقرأت سبعہ کی تکمیل اور مختلف مقامات میں تادم حیات اس علم شریف کی خدمت فرماتے رہے۔

چوتھے قاری محب الدین احمد صاحب تھے جو سب سے چھوٹے تھے، علوم متداولہ عربیہ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ حضرت قاری عبد الرحمن مکی رحمۃ اللہ علیہ سے تجوید وقرأت سبعہ وعشرہ کی تکمیل اور استاذ محترم حضرت قاری عبد الرحمن صاحبؒ ہی کے ایماء پر والد محترم سے سند تجوید وقرأت حاصل کی اور اس فن کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں چنانچہ آپ کے دور میں ملک و بیرون ملک کے ماہرین فن بھی ضرورت کے موقع پر آپ ہی کی طرف رجوع فرماتے اور گوشہ میں بیٹھ کر فن کے سینکڑوں افراد تیار فرمائے بقول جناب قاری ابوالحسن صاحب اعظمی دامت برکاتہم آپ قاری گر تھے، علاوہ ازیں قیمتی تصانیف بھی آپ کی یادگار ہیں۔ غرض یہ کہ ضیائی شجرہ ہندوستان کے طول وعرض میں خوب پھیلا اور واسطہ بالواسطہ ہزاروں نہیں لاکھوں بندگان خدا کو تجوید وقرأت سے فیضیاب فرمایا۔ **فجزاهم الله عنا وعن جميع المسلمين احسن الجزاء**

وفات: عرصہ تک علیل رہ کر ۷ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ بروز شنبہ مغرب سے قبل الہ آباد میں انتقال فرمایا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(فتح الرحمن فی شرح خلاصۃ البیان ص ۱۵)

(مولفہ عزیز مکرم قاری صدیق احمد سارودی استاد فلاح دارین ترکیسر سورت گجرات)

حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ المتوفی ۱۳۷۱ھ

نام و نسب: مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب کے والد حکیم سید بنیاد علی قصبہ چاند پور ضلع بجنور کے مشہور اور حاذق طبیب تھے۔آپ کے اجداد میں عارف باللہ شیخ طریقت اور صاحب کرامات جناب سید عارف علی شاہ صاحب تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت شاہ عبد القادر جیلانیؒ سے جاملتا ہے۔مولانا مرتضیٰ صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۲۸۵ء کے لگ بھگ ہے۔

تعلیم: آپ درس نظامی کی تکمیل کے لئے ۱۲۹۷ء میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔آپ ہمیشہ اپنی جماعت میں اعلیٰ وامتیازی نمبر حاصل کرکے تمغہ امتیاز حاصل کرتے رہے۔

آپ کے جلیل القدر اور ممتاز اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہند، حضرت مولانا ذو الفقار علی اور حضرت مولانا منفعت علی صاحب شامل تھے۔دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہ کر مکرر دورہ حدیث پڑھا اور فیض صحبت حاصل کیا۔چونکہ آپ کو فن معقولات سے کافی دلچسپی تھی اس لئے اس فن میں تحصیل کمال کی غرض سے معقولات کے نامور اور ماہر استاد مولانا احمد حسن صاحب کی خدمت میں کانپور حاضر ہوئے اور معقولات کی اعلیٰ کتب پڑھ کر اس فن میں کمال ومہارت تامہ حاصل کی۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد آپ اپنے وطن چاند پور واپس آ گئے اور اپنے والد کے مطب میں مشغول ہو کر تشخیص امراض و تجویز نسخہ جات و فن دوا سازی میں بدرجہ کمال عبور حاصل کیا اب آپ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر و حاذق طبیب بھی تھے۔

تدریسی خدمات: اسی زمانہ میں مولانا منور علی صاحب خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے دربھنگہ کے قریب مدرسہ امدادیہ قائم کیا اور حضرت تھانوی سے ایک اعلیٰ و قابل مدرس کی فرمائش کی۔ تب حضرت تھانوی کی فرمائش پر آپ طبی شغل چھوڑ کر دربھنگہ تشریف لے گئے اور وہاں علمی درس میں مصروف ہو گئے اور ایک زمانہ تک وہیں صدر مدرس رہے پھر کچھ عرصہ مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں صدر مدرس رہے۔ اس دوران آپ نے آریہ سماج کے رد میں متعدد رسائل تحریر فرمائے اور بابو رام چندر سے مشہور تاریخی مناظرہ کیا ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند نے مالٹا سے واپسی پر پھر دار العلوم دیوبند میں واپس آنے کا حکم دیا اور حضرت حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے غیر معمولی اصرار فرمایا چنانچہ آپ دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں آپ کو ناظم تعلیمات مقرر کر دیا گیا۔ ساتھ ہی سلسلۂ تدریس بھی جاری رہا۔ اس دور میں آپ نے قادیانیت کے رد میں بکثرت رسائل تحریر فرمائے جو خصوصیت کے ساتھ پنجاب و صوبہ سرحد میں بہت مقبول اور پسندیدہ ہوئے۔ چونکہ عوارضات ضعف پیری عیاں ہو چکے تھے اس لئے تقریباً نصف صدی سے زائد اپنے وطن چاند پور سے باہر رہ کر واپس آ گئے اور یہاں صرف ذکر و عبادت اور اوراد میں تاحیات مصروف رہے۔ آپ

کے علمی شغف کا یہ حال تھا کہ آپ کی ساری عمر کا ذخیرہ تقریباً آٹھ دس ہزار کتب منتخبہ کی صورت میں موجود ہے۔

تبلیغ مواعظ : مولانا چاند پوری بھی حضرت تھانوی کی طرح اس دور کے مشہور و مقبول مقرر تھے۔ ملک کے اطراف و اکناف کا کوئی بھی حصہ ایسا نہ ہوگا جو آپ کے مواعظ حسنہ سے مستفید نہ ہوا ہو۔ آپ کو فن تقریر کا ملکہ تامہ حاصل تھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وعظ سے قبل دل میں کوئی مضمون نہیں ہوتا ہے۔ خطبہ پڑھنے کے بعد جو مضمون اس وقت ذہن میں آتا ہے اسی پر بعونہ تعالیٰ تقریر شروع کر دیتا ہوں'' آپ کی تقریر پند و نصائح کے ساتھ لطائف علمیہ و نکات حکمیہ، معرفت، عبادات، قصص و حکایات سے مملو ہوتی تھیں۔ آپ کو فن مناظرہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ابتدا میں مولانا بریلوی کی تردید میں بکثرت رسائل تصنیف کئے۔ آپ کے زمانہ قیام مرادآباد میں آریہ سماج مرادآباد کی جانب سے بنام اہل مرادآباد متعدد سوالات شائع کئے گئے تھے۔ مولانا نے ان کے بے مثال جوابی رسائل تحریر فرمائے۔ اسی زمانہ میں آریہ سماج کے مشہور و معروف مقرر پنڈت رام چندر سے امروہہ میں مناظرہ ہوا اور پنڈت کو لاجواب ہو کر دہلی واپس جانا پڑا۔

فراغت علوم کے بعد جب آپ اپنے والد کے پاس طبی مشغلہ میں مصروف تھے اسی زمانہ میں حکیم بنیاد علی صاحب اپنے دونوں صاحب زادوں کو ہمراہ لے کر حج کیلئے روانہ ہو گئے۔ اس وقت حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی بقید حیات تھے۔ حکیم صاحب کو حضرت حاجی صاحب سے بیحد عقیدت تھی اور

حضرت حاجی صاحب کو بھی ان سے خصوصی تعلق تھا۔حکیم صاحب نے مع مولانا چاند پوری حج کی سعادت حاصل کی اور ساتھ ہی حضرت حاجی صاحب کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوتے رہے۔بعد فراغت حج حکیم صاحب کا مدینہ منورہ ہی میں انتقال ہوگیا۔ صاحب زادگان کو حکیم صاحب کی جدائی کا بیحد صدمہ ہوا۔حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی نے دونوں کی سرپرستی فرمائی اور ان کو تسلی وتشفی دیتے رہے دوسری مرتبہ جب مولانا چاند پوری حج کے لئے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تو وہاں سے کتب علمیہ کا کافی ذخیرہ خرید کر لائے تھے۔تیسری مرتبہ آپ نے حضرت شیخ الہند کی رفاقت میں حج کیا۔اس سفر میں صرف مخصوص رفقاء شامل تھے۔جب فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد سب لوگ مدینہ منورہ پہنچے تو کچھ عرصہ قیام کے بعد مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور دیگر رفقاء کو حضرت شیخ الہند نے واپسی وطن کا حکم دیا چنانچہ آپ ہندوستان تشریف لائے۔

بیعت وخلافت: آپ تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب خلیفہ حضرت شاہ عبد الغنی سے بیعت ہوئے اور حضرت شاہ صاحب کی صحبت میں رہ کر تعلیم وتربیت سے مستفیض ہوئے اور زمانہ قیام مکہ معظّمہ حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی کی خدمت مین رہ کر استفادہ فرمایا۔حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت کی اور مکرر حدیث پڑھی اور تعلیم وتربیت وارشادات سے ایک عرصہ تک مستفیض ہوتے رہے۔

زمانہ قیام کانپور اکثر مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں برابر

حاضر ہوتے رہے۔ حضرت گنگوہی کے انتقال کے بعد آپ نے حضرت شیخ الہند کی طرف رجوع کیا۔ پھر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت مولانا محمد علی مونگیری صاحب کو سرپرست ومربی بنایا۔

حضرت مونگیری کے انتقال کے بعد آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''سب ہی بزرگ اور سرپرست اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جس کا کوئی بزرگ وسرپرست نہیں۔ بھائی اب تو میں نے اپنا بزرگ وسرپرست حضرت مولانا تھانوی کو بنالیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے فیوض جاریہ سے مجھ کو بھی مستفید فرمائے'' باوجودیکہ حضرت مولانا تھانوی آپ کے ہمعصر تھے اور دونوں حضرات نے ایک ہی اساتذہ سے استفادہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود حضرت مولانا تھانوی سے آپ کو تعلق وعقیدت ایسی ہی تھی جیسے اکابر اسلاف سے تھی۔ اور حضرت تھانوی کو بھی نسبت بیعت سے بہت قبل آپ سے خصوصیت رہی چنانچہ جب کبھی آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے حضرت مولانا تھانوی نے آپ کو اپنا مہمان خصوصی بنایا اور بعد ظہر مجلس ارشاد میں حضرت نے آپ کیلئے اپنے قریب مخصوص جگہ مقرر فرمادی تھی اسی خاص جگہ پر نشست فرماتے تھے مجلس ارشاد میں کسی کو بولنے کی جرأت نہ تھی صرف مولانا چاند پوری اس سے مستثنیٰ رہے اور آپ اکثر علمی سوالات کیا کرتے۔ ایک مرتبہ زمانہ قیام تھانہ بھون میں آپ کو دو صاحبزادوں اور قریبی عزیزوں کو مولانا تھانوی نے مدعو کیا۔ مولانا چاند پوری نے حضرت تھانوی سے درخواست کی کہ آپ ان چاروں کو بیعت

فرمالیں۔ حضرت تھانوی نے درخواست منظور فرماتے ہوئے کہا کہ آپ کے ساتھ یہ خصوصیت ہے اور اسی خصوصیت کی بناء پر آپ کے صرف ایک مرتبہ کہنے پر ان چاروں لڑکوں کو بیعت کرتا ہوں۔

مولانا اکثر ہدایات فرمایا کرتے کہ حضرت تھانوی کے ملفوظات ومواعظ کا مطالعہ کرتے رہو کہ یہ علم وتقویٰ میں ترقی کا باعث ہوں گے۔

وفات: ۱۹۵۱ء دسمبر میں آپ کو عشاء کے وضو سے غیر معمولی سردی معلوم ہوئی۔ کچھ دیر بعد حرارت ہوگئی۔ آپ نے نماز عشاء ادا فرمائی۔ اس کے بعد پھر وہی سردی کی کیفیت طاری ہوگئی اور حالت غشی پیدا ہوگئی۔ اس حالت میں زبان متحرک اور مصروف ذکر رہی۔ کچھ ہوش آنے پر ذکر میں آواز بلند ہو جاتی تھی۔ تقریباً ایک ہفتہ تک یہی حالت رہی۔ ذکر کے سوا زبان سے کچھ نہیں نکلتا تھا۔ اس عرصہ میں توجہ الی اللہ کے ساتھ ذکر کرتے رہے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۱ء مطابق ۱۳۷۱ھ بآواز بلند کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے انتقال فرمائے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

(بزم اشرف کے چراغ صفحہ: ۱۳۲)

حضرت مولانا احمد بزرگ سملکی صاحبؒ سورت[۱] متوفی ۱۳۷۱ھ

نام ونسب : نام احمد، بچپن ہی سے لقب بزرگ تھا۔ والد کا نام ابراہیم عرف نانا اور وہ ''پیر'' کے لقب سے مشہور تھے، سملک کے باشندے تھے۔ معمولی طور پر پڑھے لکھے اور زراعت پیشہ تھے۔ اللہ والوں کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ علماء اور بزرگوں سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ بیٹا عنایت فرمایا۔

ولادت : ظن غالب ہے کہ آپ کی ولادت ۱۲۹۸ھ میں بمقام سملک ضلع سورت ہوئی۔

ابتدائی تعلیم : شوال ۱۳۱۸ھ میں مولانا احمد بزرگ صاحب دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔ ۱۳۲۲ھ تک چار سال دارالعلوم دیوبند میں رہ کر سندفراغت حاصل کی۔ علوم وفنون کی جملہ درس نظامیہ کی کتابیں حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحبؒ نائب مہتمم ومولانا غلام رسول صاحبؒ سے پڑھیں، اور

---

[۱] آپ کے حالات مفصلاً حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوری مقیم حال ڈیوزبری نے اپنی کتاب ''ذکر صالحین جلد دوم'' میں کیا ہے اس سے بعض مضامین ماخوذ ہیں۔ نیز مفتی اعظم برما حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب، مرتب فتاویٰ نے بھی اپنی تصنیف ''اطیب القطرات'' میں آپ سے متعلق مضمون کو نقل کیا ہے جو مولانا احمد بزرگ کے انتقال کے موقع پر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۱۳۷۱ھ میں شائع کیا گیا تھا۔ اس مضمون سے اقتباسات لیے گیے ہیں۔ ''اطیب القطرات'' بھی ذکر صالحین میں درج ہے۔ (مرتب)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ سے پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

بیعت: ۱۳۲۲ھ کے آخر میں حضرت قطبِ وقت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر بیعت سے سرفراز ہوئے، اور حضرت شیخ کی خدمت میں آپ کی وصال تک تقریباً آٹھ نو مہینے حضرت کی تلقین و تعلیم کے مطابق ذکر و فکر شغل اور مجاہدہ وریاضت کرتے رہے، یہاں تک کہ مرشد اعظم کا ۸ رجمادی الآخر کو وصال ہوجانے کے بعد بادل ناخواستہ وطن تشریف لائے اور تازیست اوراد و وظائف اور معمول کے پابند رہے۔

دارالعلوم دیوبند کے ۱۳۲۸ھ کے بڑے جلسے میں ۲۸ رسال کے فارغ شدہ علماء کو دستار فضیلت دی گئی، جو حضرات جلسہ میں حاضر نہ ہوسکے انہیں پہنچائی گئی، چنانچہ مولانا بزرگ صاحبؒ کو دستار فضیلت بذریعۂ پارسل جہانسبرگ (جنوبی افریقہ کا ایک شہر ہے) پہنچائی گئی، مولانا کا قیام چند سال افریقہ میں بھی رہا۔

سفر رنگون: اس کے بعد وطن پہنچ کر ربانی جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل مولانا احمد حسن صاحب کے معاون بن کر جامعہ کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۳۳۵ھ میں مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب راندیری کی فرمائش وطلبی پر رنگون میں سورتی جامع مسجد کے پہلے مفتی مقرر ہوکر رنگون تشریف لے گئے۔ تین سالہ قیام میں افتاء، وعظ، درس قرآن و تفسیر کا فیض پہنچایا۔

دارالعلوم دیوبند میں اختلاف: ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں منتظمین مدرسہ و مدرسین میں کچھ اختلاف ہوا، جس کا انجام یہ ہوا کہ ایک جماعت علماء وطلباء کی دارالعلوم سے علیحدہ ہوگئی، ان طلبہ میں فخر خاندان

مولانا محمد میاں صاحب سملکی بھی تھے، جو حضرت شیخ المحدثین مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب کی شیدائی طلبہ میں سے تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب نے حسب صوابدید مولانا احمد بزرگ صاحب اس مقدس جماعت کو ڈابھیل بلانے کا مصمم قصد کرلیا۔ اور مولانا محمد میاں صاحب اور مولانا بزرگ صاحب کی مخلصانہ سعی سے جناب حاجی موسیٰ میاں صاحب اور سیٹھ حاجی یوسف ابراہیم گارڈی صاحب اور دو عالی ہمت اور نیک تاجروں نے اس نعمت غیر مترقبہ کو بطیب خاطر منظور کیا، اور اپنی عالی حوصلگی سے بتوفیق یزدانی اس مقدس جماعت کو ڈابھیل مدعو کرنے کے جملہ مصارف کا انتظام کردیا، اور فوری ووقتی ضرورت یعنی کتب خانہ کے لئے ایک کثیر اور گراں قدر رقم عنایت فرمائی، اور دائمی اخراجات کے لئے ماہوار ایک ایک ہزار روپیہ مقرر کردیا، اور ان سر برآوردہ علماء وصلحاء ومہمان رسول ﷺ کی ایک بڑی جماعت دارالعلوم دیوبند کے مرکز سے ہٹ کر ڈابھیل آگئی، اور فیوض برکات وعلوم نبویہ کا ایک اور چشمہ جامعہ اسلامیہ سے بہنے لگا۔ یہ کام کتنا عظیم تھا جو اللہ تعالیٰ نے اس مخلص ومرنجان مرنج بزرگ کے زمانۂ اہتمام میں اہل گجرات کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔

مولانا احمد بزرگؒ اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل: مولانا احمد بھام سملکی (متوفی ۱۳۲۷ھ) نے توکلاً علی اللہ سملک کی مسجد میں ماہ شعبان المعظم ۱۳۲۶ھ میں جامعہ کا افتتاح ''مدرسہ تعلیم الدین'' کے نام سے ایک بڑے مجمع میں اپنے استاذ حضرت مولانا صوفی احمد میاں صاحب لاجپوریؒ (متوفی ۱۳۲۷ھ) کے دست بابرکت سے کرایا۔

سملک کی مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، مگر جگہ غیر مستقل اور نا کافی تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ مدرسہ کے لئے کوئی مستقل اور وسیع جگہ حاصل کی جائے، چنانچہ ہر چہار طرف تلاش و جستجو کے بعد ڈابھیل کے غربی جانب عیدگاہ کے مقابل زمین کا ایک قطعہ خرید لیا، جہاں پر آج جامعہ قائم کیا ہے۔ زمین مل جانے کے بعد مولانا نے سب سے پہلے مسجد تعمیر کرائی۔ اب تعلیم کا سلسلہ سملک سے ڈابھیل منتقل ہو گیا۔ زمین ملنے کے بعد مسجد تو تیار ہو گئی، مگر درس گاہوں، دار الطلبہ وغیرہ دوسری ضروریات باقی تھیں، اس مقصد کی تکمیل کے لئے بانی جامعہ مولانا حسن بھام صاحبؒ نے جنوبی افریقہ کا سفر کیا۔ افریقی احباب کی اعانت سے ایک گراں قدر رقم جمع ہو گئی، جس کو مولاناؒ نے یہاں بھیج دیا۔

آپ واپسی کا قصد فرما ہی رہے تھے کہ انفلوئنزا کا سخت حملہ ہوا، اور چند روز علالت کے بعد ۱۰ محرم ۱۳۲۳ھ پنج شنبہ کو واصل بحق ہو گئے، اور جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ

مولانا احمد حسن بھامؒ کی وفات کے بعد جناب حاجی یوسف میاں صاحب افریقہ سے تشریف لائے اور مدرسہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا، لیکن اس اثناء میں حاجی صاحب موصوف اور دوسرے متعلقین مدرسہ اس امر کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ مدرسہ کا اہتمام کسی صاحب علم کو سپرد کرنا چاہئے، اس اہم ذمہ داری کے لئے نظر انتخاب حضرت مولانا احمد بزرگ صاحبؒ پر پڑی، مولانا کو رنگون سے بلایا گیا، تعمیر درس گاہ کی تکمیل کے بعد اس کے افتتاحی جلسہ میں محدث راندیر قاضی رحمت اللہ صاحب لاجپوریؒ ثم راندیری (م ۱۳۴۲ھ

مطابق ۱۹۲۴ء) نے اہتمام کے لئے مولانا بزرگ صاحب کا نام پیش کیا، جس کی تائید تمام حاضرین نے کی، اس طرح شعبان ۱۳۳۹ھ میں مولانا کو مہتمم مدرسہ بنایا گیا۔ مولانا بزرگ خود تحریر فرماتے ہیں:

''بالآخر بہی خواہان مدرسہ نے راقم الحروف کو اہتمام سپرد کرنا چاہا، ان دنوں دارالافتاء سورتی جامع مسجد رنگون کی خدمت راقم کے سپرد تھی اگرچہ حضرات رنگون وہاں کے قیام پر مجبور کررہے تھے، لیکن ایک اسلامی مدرسہ کی خدمت ایسی چیز نہیں تھی جس کو نظر انداز کردیا جاتا، خصوصاً جب کہ اس سے اہل وطن کی خدمت اور مولانا مرحوم کی دیرینہ رفاقت کا بہترین حق ادا ہوتا تھا، اس لئے راقم کو قیام رنگون ترک کر کے اپنے وطن ڈابھیل سملک آنا پڑا، اور خدا پر بھروسہ کر کے ۲۳ رشعبان ۱۳۳۹ھ کو اہتمام کی گراں بار ذمہ داریوں کو قبول کرلیا''۔

مولانا کے حسن انتظام پر چند اکابرین کی آراء: مدرسہ کی اس حیران کن ترقی میں مولاناؒ کے ایثار و اخلاص کے ساتھ آپ کی انتظامی صلاحیت کو بھی بڑا دخل ہے۔ آپ میں انتظامی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ جامعہ کا ۲۲ رسالہ دور اہتمام اور مدرسہ کی ترقی اس کا بین ثبوت ہے۔ آپ کے حسن انتظام کی اکابر زمانہ نے تحسین فرمائی ہے۔ ''مشتے نمونہ از خروارے'' چند اکابر کی آراء نقل کرتا ہوں:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ) نے ۲۳ رجمادی الاول ۱۳۴۴ھ میں جامعہ کے کل طلبہ کے تجوید کا امتحان لیا، اور مدرسہ دیکھا، مدرسہ دیکھنے کے بعد معاینہ میں طلبہ کی کامیابی کا تذکرہ فرماتے

ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ صریح ثمر ہے کہ طلبہ اور مدرس صاحب کی مشقت وتوجہ اور مہتمم صاحب کی نگرانی کا جو کہ طلبہ کے ساتھ ہے، اگر مشقت وتوجہ کی یہی رفتار رہی تو مدرسہ کو بہت اچھی ترقی کی امید ہے''۔(تاریخ جامعہ صفحہ ۳۱)

علامہ سیّد سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ) رقم طراز ہیں:

''خوش قسمتی سے اس جامعہ کو مولانا احمد بزرگ صاحبؒ جیسے بزرگ کے اہتمام کی سعادت حاصل ہے''۔(صفحہ ٦٦)

سبحان الہند مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اس جامعہ کا اہتمام وذمہ داری مولانا احمد بزرگ صاحب کے سپرد ہے، جو صوبہ گجرات کے ایک مشہور عالم ہیں، موصوف اپنے فرائض کو پوری کوشش ومحنت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اس وقت جامعہ کی تعلیمی اور انتظامی حیثیت ہر اعتبار سے قابل اطمینان ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا احمد بزرگ صاحب کی مساعی کو مشکور فرمائیں۔(۱۷)

مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ (م ۱۳۸۲ھ) مولانا حمد بزرگ کے اوصاف کو بیان فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''باوجود سیدھے سادے ہونے کے اچھے منتظم تھے''۔

مولانا سیّد انظر شاہ کشمیریؒ آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ان کے میمون عہد میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے وہ ترقی کی جو بعد کے ادوار میں نصیب نہیں ہوئی''۔(نقش دوام: صفحہ ۴۳)

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا سپاس نامہ: اس سپاس نامہ میں مولانا بزرگؒ کے علم وفضل کو ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

''حضرت مولانا احمد بزرگ ایک مدت تک ہمارے اس شہر رنگون میں قیام فرما کر بحیثیت مفتی اعظم مسلمانان برما کو اپنے فیوض وبرکات سے بہرہ یاب فرما چکے ہیں'' ''عیاں راچہ بیاں'' اب ڈابھیل میں دارالعلوم کی روح رواں آپ ہی کی ذات گرامی ہے، اور آپ ہی کے زیر اہتمام یہ دارالعلوم نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔(تاریخ جامعہ: صفحہ ۵۰)

مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مولانا بزرگ صاحبؒ سیدھے سادے، بھولے بھالے بزرگ تھے، تکلف وتصنع مطلق نہیں تھا، لباس موٹا پہنتے تھے، کفایت شعار تھے، فضول خرچی سے محترز رہے، سادہ خوراک تھے، جو سامنے آیا کھالیا، مرغن ولذیذ کھانے بھی خوب سیر ہوکر شوق سے کھاتے تھے۔ ہاضمہ بہت قوی تھا۔ قوی بہت مضبوط تھے۔ بہت ہی بے تکلف سادہ وضع بزرگ تھے۔ چالاکی عیاری بناوٹ اور اظہار شان سے کوسوں دور رہے''۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند: صفحہ ۴۰۔ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ)

آپ کے سفر افریقہ کے موقع پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے الوداعی تقریر فرمائی تھی، جس میں آپ نے مولانا بزرگؒ کے تین اوصاف بیان فرمائے تھے، آپ نے فرمایا: مہتمم صاحب کے تین وصف ہیں، جن سے میں بہت متاثر ہوں: ایک قلت تکلف وتصنع، کہ یہ اس زمانہ میں بہت کم ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ

علیہم اجمعین کا ایک وصف خاص یہ بھی تھا کہ ان میں تکلف وتصنع نہیں تھا، چنانچہ ایک صحابی سے کسی نے صحابہ کے اوصاف پوچھے تو یہی جواب دیا:

''کانوا اعمقھم علما واقلھم تکلفاً وابرھم قلوباً'' الخ۔

درحقیقت اس '' **اقلھم تکلفاً** '' کے الفاظ میں بھی قلت تکلف کا جز موجود ہے، ورنہ قلت کو بھی کیوں بیان کرتے۔ دوسرا اوصاف ہے اخلاص، جو تمام اعمال حسنہ کی روح ہے۔ یہ وصف بھی اس زمانہ میں تقریباً نایاب ہے۔ دینی خدمات کو خصوصاً وہ جن میں کوئی نمایاں حیثیت بھی ہو بہت کم اخلاص کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہم نے مہتمم صاحب کے تمام کاموں کو دیکھا کہ ان میں اخلاص کا جز بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو کامیابی ہوئی ہے۔ تیسرا وصف یہ ہے کہ مہتمم صاحب کو دینی علوم کے احیاء کا جو قلبی شغف وشوق ہے، وہ بھی اس زمانہ کے نوادر سے ہے''۔ (ملخصاً، تاریخ جامعہ: صفحہ ۸۹)

وفات: آپ کی وفات ۵/ربیع الاول ۱۳۷۱ھ سہ شنبہ وچہارشنبہ کی درمیان شب میں ہوئی، سملک کے قبرستان میں آسودہ خواب ہیں۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ**۔ نور اللہ مرقدہ۔ (ذکر صالحین جلد دوم)

حضرت علامہ زاہد الکوثری صاحب مصری رحؒ [۱] المتوفی ۱۳۷۱ھ

نام ونسب: نام زاہد والد کا نام حسن بن علی الکوثری ہے آپ کے مورث اعلی کا نام کوثر ہے اسلئے الکوثری کہلاتے ہیں۔ آپ کا خاندان روس کا باشندہ تھا لیکن تیرہوی صدی ھجری میں ہجرت کر کے دولت عثمانیہ یعنی ترکی چلا آیا اس کے بعد ۱۳۲۳ھ میں علامہ زاہد الکوثریؒ نے مصر کو اپنا وطن بنالیا اور اخیر تک وہیں رہے۔

ولادت: آپکی ولادت ترکی کے ایک گاؤں ''قریہ حاجی حسن آفندی'' میں ۲۷ / یا ۲۸ / شوال ۱۲۹۶ء میں ہوئی۔

تعلیم: آپ نے اپنی سوانح خود لکھی ہے جب کہ آپ سے مولانا ابوالوفا صاحب صدر لجنتہ احیاء المعارف حیدر آباد نے درخواست کی تھی۔ اسی کا اختصار پیش خدمت ہے۔

میری ابتدائی تعلیم: میں نے سب سے پہلے تجوید قرآن کا رسالہ ''تحفتہ الاطفال'' شیخ موسی حمانیؒ سے پڑھا، پھر اپنے شہر کے دوسرے اساتذہ سے صرف ونحو، حساب الجبرا، تاریخ اسلام اور فارسی میں شیخ عطارؒ کا پند نامہ، شیخ سعدیؒ کی گلستان پڑھی، نحو وادب شیخ شعبان فوزیؒ سے اور تاریخ اسلام شیخ محمد ناظم چلپی سے پڑھی سے خاص طور سے پڑھی، جس سال میری ابتدائی اور متوسط تعلیم ختم ہوئی۔

---

[۱] آپ کے حالات معارف اعظم گڈھ میں خودنوشت سوانح کے نام سے ہیں اس کو سامنے رکھکر مزید دوسری کتابوں کی مدد سے مرتب کئے گئے ہیں (مرتب)

اخلاق فاضلہ: یہاں تک تو علامہ زاہد الکوثری کی خود نوشت سوانح عمری تھی، جسکی تلخیص پیش کی گئی۔ اس کے بعد مولانا ابوالوفا صاحب نے ان کے اخلاق و کردار، زہد وقناعت اور تصانیف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

نہایت ہی کریم النفس، علم دوست، سیر چشم اور فیاض تھے، ان اوصاف میں ان کے جیسا آدمی میں نے نہیں دیکھا، انہوں نے ہمیشہ اپنی تصانیف اور دوسری اہم کتابیں تنہا مجھی کو نہیں بلکہ ہندوستان کے دوسرے علماء کو بھی ہدیۃً بھیجتے تھے، مصر میں وہ بڑی عسرت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر اسکے باوجود جب بھی لجنۃ المعارف کیلئے نادر کتابیں یا مخطوطات وغیرہ طلب کئے گئے، تو انہوں نے ہمیشہ نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے خرچ سے روانہ کئے، بلکہ بعض کتابوں کا فوٹو تک انہوں نے لیکر بھیجا اور کبھی ایک پیسہ قبول نہیں کیا، نہایت صابر، شاکر اور متحمل مزاج تھے تنگ دست تھے، مگر اس کا اظہار شاذ و نادر ہی کرتے تھے، دوسرے مصائب و آلام کے علاوہ دائم المریض تھے، مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے جب کبھی میں ان کے مرض کے بارے مین دریافت کرتا تو وہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتے اور صرف اتنا لکھتے کہ میں پسند نہیں کرتا کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں بس اس بات کی دعا کیجئے کہ صحت سے رہوں، آپ ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ صاحبِ زہد واتقا بھی تھے، طریقۂ خالدیہ میں بیعت تھے ساری عمر حق کے اعلان اور باطل کی تردید میں سینہ سپر رہے۔

علمی یادگار: گو ان کی کوئی مادی یادگار اس دنیا میں موجود نہیں ہے مگر علمی اور

روحانی یادگاریں اس کثرت سے چھوڑ گئے ہیں کہ دینا ان کو ہمیشہ یادر کھے گی، ان کی سینتالیس مستقل تصانیف ہیں اور پچاس سے زائد کتابوں پر حاشیے اور مقدمے لکھے ہیں، ان کی تصانیف میں بعض مختصر رسالے بھی ہیں اور بعض ضخیم کتابیں بھی انکے حواشی اور مقدمے بھی بڑے کام کی چیزیں ہیں۔

تقریباً تمام علوم متداولہ مثلاً حدیث وفقہ، تاریخ وتراجم، ادب وشاعری، کلام وفلسفہ پر انہوں نے اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

(معارف اعظم گڈھ: ج/۲ص/۲۷)

فضل وکمال: آپ کے شاگرد شیخ محمد اسماعیل واعظ القاہرہ یوں نقل کرتے ہیں کہ آپ حسن اخلاق کے پیکر تھے۔کریم الطبع اور متواضع شخصیت کے حامل تھے جلالت علم اور وقار میں آپکی مثال دی جاتی تھی۔ ورع اور تقویٰ میں آپکی زندگی مثالی تھی۔آپ حسن صورت کے ساتھ بارعب بھی تھے۔ ہشاش بشاش طریقے سے لوگوں سے ملتے تھے۔بلالومتہ لائم حق گو تھے۔

ف: بدل وجان دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات حسنہ سے ہم سب کو متصف فرمائے جو محض نام کے مولوی وعالم ہیں اور صفات حسنہ سے کورے ہیں۔

(مرتب)

آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی میں آپ کے گھر عباسیہ مصر میں بغرض ملاقات یا کسی اہم مسئلہ پر آپ کی رائے معلوم کرنے کیلئے گیا تو دیکھا کہ آپ سے ملنے والوں پڑھنے والوں اور مختلف علاقہ کے اکابر علماء کا ازدھام ہوتا تھا کوئی اپنے مشکل اور پیچیدہ مسائل بتارہا ہے تو کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے اور کوئی

نصیحت طلب کر رہا ہے اور شیخ بحر بیکراں کی طرح سب کی پیاس بجھاتے تھے۔

ف: سبحان اللہ! کیا ہی قابل رشک خصال حمیدہ تھے جو سویدائے قلب میں جگہ دیئے جانے کے لائق ہیں۔ (مرتب)

اخیر میں لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے خدمت اسلام کی ادئیگی میں کوئی کمی نہیں کیا اور مصر میں ایک مدرسہ علمیہ فکریہ قائم کر دیا۔ (مقالات کوثری ص ۱۶)

آپ کے ایک شاگرد شیخ عبدالفتاح ابوغدہ استاذ حدیث جامعہ امام سعود ریاض نے اپنی تصنیف (**صفحات من صبر العلماء**) میں لکھا ہے کہ ہمارے شیخ کوثری مرحوم سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موصوف اپنے نام کی طرح واقعی ''زاہد'' اور خدا رسیدہ انسان تھے ان کا شمار ان لوگوں میں تھا جو کچھ ملنے پر ایثار اور نہ ملنے پر صبر و شکر سے کام لیتے تھے۔ اللہ تعالی انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور بلند مقام عطا فرمائے۔

آپ کے حالات وکمالات پر ایک نظر

علامہ مرحوم کے متعلق حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ مدظلہ اپنی تصنیف لطیف ''لالہ وگل'' کے ص: ۲۷۴ میں یوں رقمطراز ہیں:

فضل وکمال: ترکی کے جلاوطن علامہ زاہد الکوثری علم وفضل میں یگانہ، دین ودانش میں یکتائے روزگار تھے، حریت پسندی و دین پروری کے نیک جذبات کی فضا میں ترکی سے جلاوطن کئے گئے، مختلف ممالک میں گھومتے پھرتے قاہرہ کی علمی فضاؤں میں ہمیشہ کے لئے قیام کیا۔ دوران ہجرت یہ المناک واقعہ بھی پیش آیا کہ بحری سفر میں شیخ کوثری کا جہاز حادثہ کا شکار ہوا اور شیخ موجوں کی لپیٹ

میں آ گئے، اس جانکاہ حادثہ نے دماغی قوتوں کو مفلوج کر دیا اور حافظہ کو اتنا متاثر کیا کہ علوم سب محو ہو گئے، اور شیخ نے بڑا وقت تعطل کا گزارا، مگر قدرت کی چارہ سازیاں کہ بتدریج حافظہ بیدار ہوا، اور علامہ نے از سر نو علوم حاصل کئے، وہ اپنے وقت کے محقق، مبصر اور نابغہ شخصیتوں میں سے تھے جن کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ جملہ علوم وفنون پر دسترس تھی، رجال پر بڑی گہری نظر، فقہ حنفی سے وابستگی تصلب کی حد تک تھی۔ اپنی مستحکم حنفیت کے باوجود غیر حنفی حلقوں میں بھی ان کے علم وفضل کا احترام تھا، خطیب بغدادی کی ہفوات کا جواب دیا، امام محمدؒ کی جامع سوانح حیات قلمبند کی۔ امام طحاویؒ پر ان کی علمی کاوشیں تاریخی دستاویز کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مقالات کوثری پاکستان اور پھر ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں جو اہل علم کی نظر میں خاصہ کی چیز ہیں۔ مجلس علمی ڈابھیل نے فیض الباری امالی علامہ کشمیری علیہ الرحمۃ اور نصب الرایہ زیلعی کی طباعت کے لئے مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا احمد رضا صاحب کو جب قاہرہ بھیجا اور ان ہر دو کا چند ماہ وہاں مسلسل قیام رہا تو شیخ کوثری کے خوان علم سے زلہ ربائی (بچا ہوا) ان کی تقدیر تھی۔ ہر دو کا بیان ہے کہ حضرت علامہ کشمیریؒ کے بعد عبقریت میں اگر کوئی ان کی نظیر تھی تو شیخ کوثریؒ تھے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ المغفور انہی علامہ کوثریؒ کے باختصاص شاگرد تھے۔ (لالہ وگل ص: ۲۷۴)

نیز یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ شیخ نے مصر جاتے ہی امام حسن البناء سے بھی رابطہ قائم کیا اور ان کے دبستان علم سے قریب ہو کر اپنی فکر، اجتماعی مزاج اور جہاد کے ولولہ کو انگیز کیا۔ استاذ حسن البناء کے واقعۂ شہادت تک

پابندی سے ہر منگل کے روز ان کے درس میں حاضر ہوتے رہے۔

۱۹۵۰ء میں شیخ مصر کے علمی چشموں سے سیراب ہوکر شام واپس لوٹ آئے اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۵ء تک حلب کے مدارس اور دمشق کی جامعہ میں تعلیمی خدمت انجام دیتے رہے، مگر ملک شام کے سنگین حالات اور حکام کے ''اخوان المسلمین'' پر ظلم وستم میں شیخ مجبوراً وطن چھوڑ کر ''قطر'' کے لئے روانہ ہو گئے، وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد سعودی عرب منتقل ہو گئے، شیخ یہاں جامعہ الامام محمد بن سعود کے کلیۃ الشرعیۃ میں بحیثیت استاذ حدیث تشریف لائے مگر جامعہ کے شعبۂ شریعت اور قضاء کے دوسرے شعبہ ''المعہد العالی للقضاء'' میں ۱۳ سال اور پھر کلیۃ اصول الدین کے دراسات علیا میں دس سال حدیث شریف اور دیگر علوم شریعت بھی پڑھاتے رہے۔ اس طرح مسلسل ۲۳ سال تک اسی جامعہ سے منسلک رہے۔ اور جامعہ کے ذمہ داروں نے شیخ کے ساتھ بہت ہی اعزاز واکرام کا معاملہ کیا۔

وفات: آپ کی وفات ۱۸/ذوالحجہ ۱۴۱۷ھ کو سنیچر کے دن ہوئی اور مصر میں امام شافعیؒ کے جوار میں سپرد خاک ہوئے، **رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعہ۔**

حضرت مولانا عبدالمجید صاحب بچھرانویؒ المتوفی ۱۳۷۰ھ

نام ونسب: مولانا عبدالمجید بچھرانوی ضلع مرادآباد کے راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے بچپن اور جوانی کے آغاز تک ہل چلاتے اور زمینداری کرتے تھے۔

تلاش حق: پھر اچانک ایک روز گھر سے بھاگ کر انبالہ حضرت سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں پہنچ گئے، آپ کے گھر والے تلاش کرتے کرتے انبالہ جا پہنچے اور سائیں توکل شاہ صاحب سے عرض کیا کہ ہمارا لڑکا آپ کے پاس آ گیا ہے۔ حضرت نے آپکے مونڈھے پکڑ کر ہلائے اور فرمایا ''یہ ہمارا مست ہے'' اس بات نے اتنا اثر دکھایا کہ زمینداری چھوڑ دی تعلیم شروع کر دی اور حضرت گنگوہی سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ تعلیم کے دوران اپنے استاد کے گھر کا کام کرتے، بچے کھلاتے آٹا پسواتے اور سخت سے سخت کام کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

تبلیغی کام: جب سوامی شردھانند نے آگرہ میں مسلمانوں کو ہندو بنانے کیلئے شدھی تحریک کا آغاز کیا تو حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے مولانا عبدالکریم گمتھلوی اور آپ کو تبلیغی کاموں پر مقرر کیا۔ ان حضرات کو تبلیغ کے دوران نہ تو کسی سے کھانا کھانے کی اجازت تھی، نہ ہی نذرانہ یا چندہ وصول کرنے کا حکم تھا اور سواری لینے کی بھی ممانعت کر دی گئی تھی۔ آپ نے تبلیغ کے دوران عائد کی گئی تمام

پابندیوں کو بخوشی تسلیم کیا اور بیس سال کے قریب بھرت پور، الور، گوڑگاؤں متھرا اور آگرہ میں دینی مدارس قائم کئے آپ کو تنخواہ خانقاہ امدادیہ سے ملتی رہی جو بتیس روپے سے زائد کبھی نہیں ملی۔ اگرچہ دیہات میں سواری مفت مل جاتی تھی مگر آپ ہمیشہ صندوق سر پر رکھ کر پیدل سفر کرتے۔ تبلیغ کے دوران مناجات مقبول یا حضرت مولانا تھانوی کے وعظ کی کتاب ساتھ رکھتے تھے۔ اس طرح ساتھ ہی ساتھ کتابوں کی تجارت بھی شروع کردی اور جب تھانہ بھون سے تنخواہ بند ہوگئی تو آہستہ آہستہ ایک ایک دودو کتابیں چھپوا کر دہلی میں ایک مسجد کے امام صاحب کے پاس اور تھانہ بھون میں اپنے گھر میں رکھتے تھے۔

طباعت کتب کا ذوق: حضرت تھانوی کی مشہور کتاب تربیت السالک آپ ہی نے چھپوائی تھی یہ وہ کتاب ہے جو پاکستان میں تیس روپۓ تک بکی ہے پہلی مرتبہ کے بعد اب تک اس کو چھپوانے کی کسی میں ہمت نہیں ہوئی چونکہ تصوف کی کتاب ہے اس لئے اس کا فروخت ہونا مشکل تھا جب مولانا نے حضرت تھانوی سے کہا کہ میں چھپوالوں تو آپ نے فرمایا کہ تمہاری نہ تو کوئی دکان ہے نہ کتب خانہ یہ کیسے فروخت ہوگی۔ مولانا نے فرمایا کہ دوکاندار تو اس کو لے گا نہیں۔ میں چھپوا کر کچھ قرض داروں کو دیدوں گا۔ پھر جو باقی رہ جائے گی ہر سال زکوۃ میں دیتا رہوں گا۔ آپ کتاب کی اشاعت میں برابر دلچسپی لیتے رہے۔ مختلف کاتبوں سے نمونہ لکھوا کر حضرت تھانوی قدس سرہ کو دکھایا اور آپ کے پسند کے کاتب سے کتابت کروائی۔ پھر دہلی سے مختلف کاغذوں کے نمونے حضرت کی خدمت میں تھانہ بھون لے گئے اور جب یہ کتاب چھپ کر تیار ہوئی تو حضرت

قدس سرہ نے اسے اپنے سر پر رکھ کر فرمایا کہ میری کوئی کتاب اتنی اچھی اور میری مرضی کے موافق نہیں چھپی ہے۔ مولانا عبدالمجید صاحب کو یہ بھی فرمایا کہ ایک چھوٹا سا پرچہ اشتہار کی صورت میں چھپوالو میں اپنے خطوط میں رکھ دیا کروں گا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت قدس سرہ کی عادت یہ تھی کہ اگر کوئی کتاب کا پتہ پوچھتا تو کبھی اس کو سفارش نہ کرتے کہ فلاں کتب خانہ سے خریدو اور یہ فرماتے کہ لوگ اس کو ترجیح سمجھیں گے۔

حضرت تھانوی سے تعلق : علم دین سے فراغت پر آپ نے تھانہ بھون میں مستقل رہائش اختیار کرلی جو کم وبیش تیس سال جاری رہی۔ آپ نے خانقاہ میں ذکر اس قدر کثرت سے کیا کہ دوسرے پیر بھائی کہتے تھے کہ یہ پاگل ہو جائیں گے۔ حضرت تھانوی نے آپکو ۱۳۴۵ھ میں خلافت سے نوازنے کے ساتھ ساتھ وعظ کرنے کی بھی اجازت مرحمت فرمائی تھی جب حضرت قدس سرہ نے سفر کرنا بند کر دیا تو حضرت وعظ کے لئے آپ ہی کو بھیجا کرتے تھے۔

حضرت تھانوی کا طریقہ اصلاح : مولانا عبدالمجید صاحب نے حضرت گنگوہی کی وفات کے بعد حضرت تھانوی سے تعلق قائم کیا اور راہِ سلوک میں محنت ومشقت کی۔ آپ کو کشف بہت ہونے لگا تھا یہاں تک کہ معمولی جڑی بوٹی بھی بولتی تھی کہ میں فلاں بیماری کا علاج ہوں۔ آپ نے ایک کاپی لے کر اس میں اپنے کشف اور جو بات ذہن میں آتی جمع فرمالی حضرت کو اسکی اطلاع ہوگئی تو ایک روز مجلس میں گول مول الفاظ میں سب کے سامنے کہا کہ بڑا بننے اور اپنے کو بڑا سمجھنے کا مرض بہت برا ہے اگر کوئی ایسا مریض میری مجلس میں ہے تو یہاں سے

چلا جائے۔ یہ بھی دراصل آپ کا بہت بڑا امتحان تھا کہ آیا خود اپنی غلطی مانتے ہیں یا نہیں۔آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھ میں یہ مرض ہے۔حضرت اقدس نے فرمایا فوراً خانقاہ سے نکل جاؤ اور اہل خانقاہ سے کہا کہ ان سے کوئی بات نہ کرے۔آپ نے وہ کاپی جلادی اور سارا دن حجرے میں پڑے رہتے صرف نماز پڑھنے کیلئے باہر نکلا کرتے۔دعاء استغفار کرتے رہتے کہ ایک روز حضرت قدس سرہ نے خود بخود کہلا بھیجا کہ مجھے خوش کرنا ہے تو آج نماز پڑھادو آپ نے حسب حکم نماز پڑھائی اور حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن سے صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بولنا بند کردیا تھا اور پھر ان کی برأت پر جو آیات نازل ہوئی تھیں وہ نماز میں پڑھیں۔نماز کے بعد حضرت مولانا تھانوی نے اعلان کیا کہ اب ان سے بولنے کی اجازت ہے اور اس واقعہ سے اگر کوئی ان کی تذلیل کرے گا تو اس کے اعمال حبط ہوجائیں گے مولانا کے پاس جو رقم تھی وہ حضرت قدس سرہ کو پیش کیا کہ ہدیہ قبول فرمالیں وہ قبول فرمایا اور آپ کو مخاطب کرکے کہنے لگے کہ میں نے ایسا مسہل آپ کو دیا ہے جو پہلے کسی کو نہیں دیا تھا۔الحمدللہ آپ کامیاب ہوئے اور مجھے یہی امید تھی کہ آپ اسے برداشت کریں گے۔

وفات: آپ نے ۷ / مارچ ۱۹۵۲ء مطابق ۲۷ / ۱۳۷۱ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون ورحمہ اللہ رحمۃ واسعہ

(بزم اشرف کے چراغ صفحہ: ۶۱)

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوریؒ المتوفی ۱۳۷۲ھ

اسم گرامی اور پیدائش : آپ کا اسم گرامی کفایت اللہ، والد کا نام شیخ عنایت اللہ ہے، آپ یو، پی کے مشہور شہر شاہجہانپور کے محلہ ورگ زئی میں ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم : آپ نے پانچ سال کی عمر میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب شاہجہانپور میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا، اسی مکتب میں آپ نے ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد اردو فارسی کی تعلیم دوسرے مکاتب میں حاصل کی، اور فارسی ادب کی اعلیٰ کتاب ''سکندر نامہ'' اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کر کے آپ قریب کے مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل ہوئے۔

طالب علمی کے زمانہ میں آپ کا قیام حضرت مولانا محمد حسن صاحب مرادآبادی ثم بھوپالی کے یہاں تھا اور کھانا بھی مولانا ممدوح کے یہاں کھاتے تھے، اوپر کے خرچ کیلئے اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں بُن کر بازار میں فروخت فرماتے تھے، اور نہایت خودداری کے ساتھ طالبعلمانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ : مدرسہ شاہی مرادآباد میں دوسال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۱۲ھ میں حضرت مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد منیر صاحبؒ تھے، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ صدر مدرس تھے۔

آپ نے بائیس سال کی عمر میں ۱۳۱۵ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اور مولانا عبدالعلی صاحبؒ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

(بیس بڑے مسلمان: ص ر ۴۱۸)

چونکہ آپ کا حافظہ بہت تیز تھا اور آپ بلا کے ذہین تھے اس لئے اسباق میں بہت کم محنت کرنے کے باوجود امتحانوں میں اپنے ہم سبقوں سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

سلسلۂ تدریس: دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنے وطن شاہجہانپور پہنچے تو اس زمانہ میں آپ کے اولین مربی مولانا عبدالحق خان صاحب ۱۳۱۴ھ میں ایک نئے مدرسہ عین العلم کی بنیاد ڈال چکے تھے، اس لئے انہوں نے آپ کو اپنے مدرسہ میں مدرس مقرر کرلیا، اور اس کے ساتھ مدرسہ کے دفتر کا سارا کام بھی آپ کے سپرد کردیا، اس وقت آپ کی تنخواہ غالباً پندرہ روپئے تھی، دفتری اور تعلیمی کام کے ساتھ آپ نے فتویٰ نویسی کا کام بھی سنبھال لیا تھا، آپ نے سب سے پہلا فتوی اسی مدرسہ عین العلم میں تحریر کیا۔

رسالہ "البُرھان" کا اجراء: مدرسہ عین العلم کی مدرسی کے زمانہ میں آپ نے فتنۂ قادیانیت کی تردید میں ایک ماہانہ رسالہ ''البرھان'' جاری کیا، اس کے مدیر آپ خود تھے، اور منیجر مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کے بڑے بھائی منشی سلطان حسن صاحب تھے، پہلا نمبر شعبان ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا، اس رسالہ میں قادیانیت کی تردید میں نہایت عمدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب مدرسہ عین العلم میں کتب عربی کے ساتھ فارسی کی

کتابیں بھی پڑھاتے تھے اورضرورت پڑنے پر غیر مسلموں سے مناظرہ بھی کرتے تھے، چنانچہ عیسائیوں سے کئی مرتبہ آپ نے کامیاب مناظرہ فرمایا۔

مدرسہ امینیہ دہلی میں تدریسی خدمت : حضرت مفتی صاحب کے رفیق خاص مولانا امین الدین صاحب نے ماہ ربیع الثانی ۱۵ ۱۳ھ کو سنہری مسجد چاندنی چوک دہلی میں اسلامی تعلیم کیلئے یہ درسگاہ مدرسہ امینیہ کے نام سے قائم کی، اس وقت حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔

جب علامہ انورشاہ کشمیریؒ ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو اپنے والد محترم کے حکم کے مطابق اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے، تو مدرسہ کی صدر مدرسی کی جگہ خالی ہوگئی، تو مولانا امین الدین صاحبؒ کی کوشش سے آپ دہلی منتقل ہو گئے، یکم شوال ۱۳۲۱ھ سے آپ کی تنخواہ بیس روپئے ماہوار مقرر ہوئی، گو مولانا امین الدین صاحب مدرسہ کے مہتمم تھے، مگر عملی حیثیت سے درس حدیث اور افتاء کے علاوہ مدرسہ کے تمام انتظامی امور و معاملات مفتی صاحب ہی انجام دیتے تھے۔

تعلیمی اصلاحات : مدرسہ امینیہ میں آنے کے بعد آپ نے رفتہ رفتہ اس درسگاہ کے تعلیمی نظام میں مفید اصلاحات نافذ فرمائیں، جب آپ دہلی آئے تو آپ نے مشاہدہ کیا کہ مخیر حضرات مذہبی مدارس کے طلبہ کو گھر بلا کر شادی بیاہ اور موت وغمی کی تقریبات میں انہیں کھانا کھلاتے ہیں، اس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے علم دین کی بے حرمتی محسوس فرمائی، اس لئے آپ نے گھروں پر جا کر کھانے کے سلسلہ کو بالکل ختم کردیا۔

اصلاحِ مدارس کی اہم تجاویز : مدرسہ امینیہ کے آٹھویں سالانہ جلسہ میں مدارس

عربیہ کی اصلاح کیلئے آپ نے ایک مقالہ میں چند تجاویز پیش کیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) تمام مدارس اسلامیہ کا مقصد ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کی جائے، اس لئے تمام اسلامی اور عربی مدارس کو انتظامی حیثیت سے ایک ہی نظام میں منسلک ہونا چاہیئے، یعنی تعاون واتحاد کے ساتھ کام کیا جائے اور انہیں ایک دوسرے کا مخالف نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) یہ اسلامی مدارس اس وجہ سے ترقی نہیں کررہے ہیں کہ ان کے کارکن یعنی اہل شوریٰ اور منتظمین دیندار اور عالم نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر نئی وضع کے پابند اور جدید مغربی طرز کے شیدائی ہیں، وہ دینی علوم سے بالکل بے بہرہ ہیں، بعض مدارس کے اہل شوریٰ اہل علم اور دیانت دار ہوتے ہیں مگر ان کے مہتممین بدنیت ہوتے ہیں، وہ تعلیمی معاملات کو خوب سمجھتے ہیں مگر مالی معاملات میں دیانت دار نہیں ہوتے اور مدارس کے چندوں کو اپنا مال اور اپنی جائداد سمجھتے ہیں، اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مدارس عربیہ کے ارکان شوریٰ اہل علم اور دیانت دار ہوں، اور تمام انتظامی اور تعلیمی معاملات انہی کے مشوروں اور فیصلوں کے مطابق انجام پذیر ہوں، مدارس عربیہ کے مہتممین کے دلوں میں خدا کا خوف ہونا چاہیئے، وہ اپنے فرائض کو ذمہ داری کے ساتھ محسوس کریں اور مدارس عربیہ کے مال کا بیجا استعمال نہ کریں، اور اگر ضرورت مند ہوں تو اس قومی امانت کو اپنی ذات پر بقدر ضرورت خرچ کریں۔

(۳) جو شخص کسی اسلامی مدرسہ کا مہتمم بنے اسے چاہیئے کہ وہ اپنی پوری توجہ اور تمام اوقات مدرسہ کے انتظام میں صرف کرے، مدرسہ کے کاموں کے

علاوہ اور کام اپنے ذمہ نہ لے، بلکہ اپنی تمام زندگی اس کے کاموں کیلئے وقف کرے، کیونکہ کوئی شخص پوری توجہ کے ساتھ دو کام نہیں کرسکتا۔

مہتممین اور مدرسین کو چاہئے کہ وہ خدا کے ان مہمانوں (طلبہ) کے ساتھ نہایت نرمی اور خیر خواہی کا سلوک کریں، ان کی مشکلات کو دور کریں اور ان کے اندر تعلیم کا ذوق وشوق پیدا کریں۔

(۵) طلبہ کے داخلہ کے وقت نہایت احتیاط سے کام لیا جاوے، صرف انہی طلبہ کو داخل کیا جاوے جو دینی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کا ذوق وشوق رکھتے ہوں، نیز انہیں داخل کرنے سے پیشتر سابقہ مدرسہ کی طرف سے ان کی نیک چلنی کا سرٹیفکٹ حاصل کیا جائے۔

(۶) طلبہ میں عزتِ نفس برقرار رکھنے کیلئے انہیں مدرسہ سے باہر کسی دعوت میں نہ بھیجا جائے، اگر اہل خیر طلبہ کی دعوت کرنا چاہیں تو ایک دن قبل مہتمم صاحب کو اطلاع دیں اور وقت مقررہ پر کھانا لاکر مدرسہ کے اندر ہی اپنے آدمیوں کے انتظام میں طلبہ کو کھلائیں۔

ف: سبحان اللہ! اصلاح مدارس کیلئے کتنے مفید اصول وضوابط ہیں جو یقیناً لائحہ عمل بنانے کے لائق ہیں۔ (مرتب)

انجمن اصلاح الکلام: اصلاح مدارس کی مذکورہ بالا تجاویز کے ساتھ ساتھ آپ نے طلبہ کی تعلیمی کمزوریوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، آپ نے محسوس کیا کہ طلبہ اپنے خیالات کو عوام کے سامنے اچھی طرح ادا نہیں کرسکتے اور وعظ وتقریر کی بھی عمدہ قابلیت نہیں رکھتے، اور نہ بوقت ضرورت غیر مسلموں کے

مقرروں کے ساتھ بحث ومناظرہ کرسکتے ہیں، لہذا ان کی ان خامیوں کو دور کرنے کیلئے آپ نے ۱۳۲۸ھ میں ایک مجلس تقریر ومناظرہ قائم کی، جس کا نام کچھ عرصہ کے بعد ''انجمن اصلاح الکلام'' تجویز کیا گیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو تقریر ومناظرہ سکھایا جائے ، ہر آٹھویں دن طلبہ تقریر اور مناظرہ کیا کرتے تھے، اور آپ بذات خود ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔

(بیس بڑے مسلمان: ص ر ۴۲۳)

ف: اس کے بعد مکرم مولانا عبدالرشید ارشد صاحب نے حضرت مفتی صاحبؒ کے تعلیمی وتبلیغی اورسیاسی مساعی کا بالتفصیل ذکر فرمایا ہے، مزید آزادی ہند کیلئے گرفتاری اور جیل خانوں میں صعوبت ومشقت کو بھی بیان فرمایا ہے، اس کے ساتھ ہی جیل خانوں میں دینی وتعلیمی مشاغل کو بھی واضح فرمایا ہے، جو یقیناً ہم مسلمانوں کے لئے موجب عبرت ونصیحت ہے اور ہمارے برادران وطن کیلئے انکشاف حقیقت اور ازدیاد بصیرت کا سبب ہے، مگر اللہ ہی اس دور عصبیت میں ان کی آنکھیں کھولے اور توفیق دے تو کسی خیر وخوبی کی امید ہے۔ (مرتب)

تصانیف: آپ کی سب سے مشہور تصنیف ''تعلیم الاسلام'' ہے جو آپ نے بچوں کیلئے نہایت سلیس اور آسان زبان میں بطور سوال وجواب چار حصوں میں تحریر کی تھی ، یہ نہایت ضروری اسلامی عقائد پر مشتمل ہے یہ بہت مقبول ہوئی اور برصغیر پاک وہند میں اسلامی مدارس میں بچوں کے لئے داخل نصاب ہوئی۔

(حوالہ بالا: ص ر ۴۴۶)

کفایت المفتی: حضرت مفتی صاحبؒ نے شاہجہانپور کے زمانہ سے ہی فتویٰ

نویسی کا کام شروع کردیا تھا، اس کے بعد بھی جب آپ مدرسہ امینیہ میں آئے تو وہاں آتے ہی یہ کام شروع کردیا، چنانچہ آپ کی فتویٰ نویسی کی وجہ سے یہ مدرسہ تمام دہلی میں بہت جلد مشہور ہوگیا، چنانچہ مولانا عبدالحق حقانی صاحبؒ مؤلف تفسیر حقانی نے اس مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں مجمع کثیر کے روبرو فرمایا:

''میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ مدرسہ مدارس دہلی میں تعلیمی حالت اور طلبہ کی تہذیب ومتانت، مدرسین کی لیاقت اور مہتمم مدرسہ کی دیانت کے اعتبار سے اعلیٰ پیمانہ پر ہے، دہلی میں فقط یہی ایک مدرسہ ہے جس میں فتویٰ نویسی کی اعلیٰ مہتم بالشان اسلامی خدمت انجام دی جاتی ہے''۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً پچاس سال کے عرصہ میں آپ نے لاکھوں فتووں کے جوابات دیئے جواب ''کفایت المفتی' کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں طبع ہوگئے ہیں، اس طرح آپ کے فتویٰ کا عظیم الشان ذخیرہ جزئیات فقہ اسلامی کا لازوال خزینہ اسلامی فقہ وفتاوی میں بیش بہا اضافہ ہے۔ (ص/۴۴۳)

وفات : حضرت مفتی صاحبؒ نے جمعرات بتاریخ ۲۱/دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ بوقت ساڑھے دس بجے شب ملک بقا کو رحلت فرمایا **اِنَّا لِلہِ وِاِنَّا اِلَیْہِ راجِعُون**۔ دوسرے دن دہلی کے ایک لاکھ مسلمانوں نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی اور آپ کا جنازہ مہرولی لے جایا گیا اور آپ کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے احاطہ کے قریب سپرد خاک کیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی طرف سے تعزیتی مضمون:

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب شاہجہانپوری ثم الدہلوی نور اللہ مرقدہ کی

وفات کو کئی ہفتے ہو چکے اور ملک کا گوشہ گوشہ اب تک ان کے ماتم وشیون سے گونجا ہوا ہے، خود پاکستان تک سیاسی اختلاف کے باوجود تعزیت میں پیچھے نہیں ہے، زندگی بھر مسلمانوں کے مکرم ومحترم رہے، سالہا سال ہمیشہ علماء کے صدر، ایک بڑی درسگاہ کے روح رواں اور مجلس خلافت کے اہم رکن وکارکن، لیکن آپ کو علم ہے کہ اتنے بڑے مقتدا، جید عالم اور شیخ وقت کیا تھے؟ نہ سید، نہ شیخ، نہ حسنی، نہ حسینی، نہ صدیقی، نہ فاروقی، نہ علوی، نہ عثمانی، باوجود اس کے آپ نے دیکھا کہ بڑے بڑے عالی نسب شیخ اور سید ان کے علم وفضل، تقویٰ اور تدین کے آگے جھکتے رہے، بڑے سے بڑے علماء ومشائخ ان کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔

مخالفوں اور معاندوں میں بھی کبھی کسی کو انگشت نمائی کرنے بلکہ ادھر اشارہ کرنے کی جرءت نہ پڑی، یہ فیض اگر اسلام اور شارع اسلام کا نہ تھا تو اور کس کا تھا؟ اس بیسویں صدی کے گئے گزرے ہوئے اسلام کا بھی! ؎

امتیازات نسب راپاک سوخت　　آتش او ایں خس وخاشاک سوخت
برنسب نازاں شدن نادانی است　　حکم او اندر تن وتن فانی است

اور خود اقبال جنھوں نے یہ ترانہ گایا ہے وہی کون سید زادے یا شیخ زادے تھے، اور اسلام کے ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں یہ مثالیں نئی اور انوکھی کب ہیں؟۔ (بیس بڑے مسلمان: ص ر ۴۵۱)

حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ المتوفی ۱۳۷۳ھ

نسب اور وطن: سید سلیمان ندویؒ نسب کے اعتبار سے دادھیال کی طرف سے ''حسینی'' اور ننہال کی طرف سے زیدی سادات سے تعلق رکھتے ہیں، دو صدیوں سے زائد عرصہ گذرا کہ ان کے اجداد جزیرۃ العرب سے نکل کر سندھ کے ساحل پر اترے اور یہاں اجمیر کے راستہ سے یو، پی، سے گذر کر بہار کو اپنا مسکن بنایا، علامہؒ کا وطن بہار کے ضلع پٹنہ میں دیسنہ کا علاقہ ہے۔

والد محترم: حضرت سید صاحبؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالحسن (متوفی ۱۳۴۰ھ) ایک ممتاز عالم دین تھے، وہ ریاست ''اسلام پور'' میں شاہی طبیب تھے، اور سلسلہ نقشبندیہ کے شیخ کامل تھے، ان کا ظاہر باوقار اور ان کا باطن تقویٰ کا آئینہ دار تھا، سید صاحب کی والدہ ماجدہ بھی ایک عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں، اور آپ کے بڑے بھائی سید ابوحبیب صاحب کو سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت لینے کی اجازت تھی۔

ولادت: آپ کی ولادت ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو بروز جمعہ بوقت صبح ہوئی۔

طفولیت وتعلیم: ابتدائی تعلیم کے لئے آپ کو باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی اس لئے کہ ان کے گھر کا ماحول علمی ودینی تھا، ان کے بڑے بھائی سید ابوحبیب نے بعض کتابیں پڑھائیں اور کبھی اپنے حلقہ توجہ میں بھی بیٹھاتے

تھے، سید صاحب نے اپنے ان بڑے بھائی کے بارے میں فرمایا ہے:

''میں اپنے بھائی صاحب کے فیض صحبت سے اپنے قلب میں پاکی محسوس کرتا ہوں''

یہ گویا ابتداء تھی جس کی تکمیل بعد میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھوں انجام پائی جس کی کسی قدر تفصیل بعد میں آئے گی۔

سید صاحب اپنے برادر بزرگ سے ابتدائی تعلیم اور بنیادی تربیت پا کر اپنے والد ماجد کے پاس اسلام پور پہونچے، کچھ کتابیں یہاں رہ کر ختم کیں، پھر اس کے بعد پھلواری شریف (پٹنہ) کی خانقاہِ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین صاحبؒ (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری) سے کچھ اور کتابوں کی تکمیل فرمائی، اس کے بعد سید صاحب کو مدرسہ امدادیہ (دربھنگہ) بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک سال رہ کر درس نظامی کی بعض اور کتابیں ختم فرمائیں۔

ندوۃ العلماء: سید صاحب ۱۹۰۱ء میں ذہن وفکر کی آخری تربیت گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کئے گئے، جہاں سے انہیں پانچ سال تک حصول تعلیم کے بعد ۱۹۰۶ء میں فراغ و تکمیل کی سند ملی۔

اسی زمانہ میں انہیں علامہ شبلیؒ جیسے مشہور زمانہ ادیب، مورّخ، متکلم، فلسفی، محقق و مفکر کی تربیت و نگہداشت کا ماحول میسّر آیا، اس دارالعلوم کے قیام کے دوران انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اس میں بعض دیگر اساتذہ کرام کا بھی حصہ نا قابل نظر انداز ہے، اس سلسلہ میں مولانا محمد فاروقؒ چریاکوٹی، مولانا حفیظ اللہؒ، مفتی عبداللطیفؒ اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ کے اسمائے گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

علمی شہرہ: سید صاحب مختلف علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ انہیں ''الندوہ'' جیسے بلند پایہ خالص علمی ماہنامے کا نائب مدیر بنادیا گیا، رسالے کی ادارت تو برائے نام تھی، اصل میں ایک شعبۂ تصنیف وتالیف تھا، اس رسالے کا معیار اس قدر اعلیٰ تھا کہ ملک کے چیدہ چیدہ اہل قلم کے ہی مضامین اس میں زیب اشاعت ہوسکتے تھے، سید صاحبؒ کے معاصر شہیر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''نگاہیں جس شوق اور بے تابی سے مولانا شبلی کی تحریروں کی منتظر رہتی تھیں اس سے کچھ کم اشتیاق حضرت سلیمان کے بھی علمی افادات کا نہیں رہتا تھا۔'' (صدق جدید ۲۲ رجنوری ۱۹۵۴ء)

آپ علامہ شبلی کی نظر میں: سید سلیمان ندویؒ کی علمی قابلیت وجامعیت کا اعتراف صرف ان کے ہم پایہ علم میں ان سے فروتر لوگوں کو ہی نہ تھا بلکہ ان کے اساتذہ بھی اس افتخار وشرف کے معترف تھے، خود مولانا شبلی اس سلسلہ میں اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء میں اپنے خطبے میں برملا فرمادیا:

''ندوہ نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، صرف ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے۔''

اسی زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جدید عربی اور علم کلام کے ایک اعلیٰ استاذ کی ضرورت پیش آئی، مولانا شبلیؒ نے یہ اہم مسندِ درس اپنے اسی نوجوان عمر لیکن پختہ شاگرد کے سپرد کردی اور وقت نے ثابت کردیا کہ یہ انتخاب بلاشبہ لاجواب تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب سید صاحب موصوف کی عمر

صرف پچیس (۲۵) برس کے لگ بھگ تھی۔

علامہ شبلی کی جانشینی : نومبر ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ علامہ شبلی کا وقت آخر نزدیک سے نزدیک تر آ گیا، انہوں نے سید صاحبؒ کو تار دے کر پونا سے طلب فرمایا اور ہمیشہ کے لئے اپنے لب و آنکھیں بند کرنے سے پہلے انہیں نہایت شفقت و محبت سے اپنی زیر تکمیل علمی مہمات بالخصوص ''سیرت النبی'' کو مکمل کرنے کی وصیت فرمائی اور یہ عہدِ مستحکم کر کے ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس بزم رنگ و بو کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیش کے لئے رحلت فرما گئے۔

اب علامہ شبلی کی مسند خالی تھی مگر کس کا حوصلہ تھا کہ اس کی طرف بڑھنے کی جرأت کرتا، آخر علامہ شبلیؒ کے وابستگانِ ارادت نے متفقہ طور پر استاذ کی جانشینی کا تاج سید صاحب کے سر پر رکھا اور یہ واقعہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔

دار المصنفین کی بنیاد: جب سید سلیمان ندویؒ اعظم گڈھ تشریف لائے تو یہاں اس وقت ''دار المصنفین'' کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا، کوئی ایک سال پہلے علامہ شبلیؒ نے اس کا خاکہ سا ضرور تیار فرمایا تھا لیکن یہ تصور ہی تھا جس کا ابھی تک کوئی وجود نہ تھا، یہ صرف سید صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک روز حضرت شبلیؒ کا خواب شرمندۂ تعبیر و تعمیر ہو گیا، اور پھر اسے ترقی دینے کے سلسلہ میں انہوں نے اپنے قلب و دماغ کی جملہ صلاحیتوں کو اس طرح مرکوز کر دیا کہ کچھ ہی عرصہ بعد علمی دنیا میں ''دار المصنفین'' اور اس کی علمی خدمات کا شہرہ دور و نزدیک پھیل گیا۔ (بیس بڑے مسلمان: ص ر ۸۴۰)

حسن اخلاق: سید صاحبؒ حسن اخلاق میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی

پیروی کی کوشش کرتے تھے، حلم ،غیرت ، مروت ،حیا، تواضع ، انکساری وغیرہ سب نیک اوصاف ان کی سرشت میں شامل تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک بار اپنی گفتگو میں ان کے بارے میں گواہی دی تھی کہ: رذائل اخلاق بالطبع ان میں موجود ہی نہ تھے۔

تلاش مرشد: سید صاحبؒ کو باوجود خود جید عالمِ دین ہونے کے کسی پیر طریقت کی تلاش تھی، آخر تقریباً دس برس تک تلاش کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، جس میں ان سے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندویؒ وغیرہ داخل ہو چکے تھے۔

اعزازِ خلافت: سید صاحب نے اپنے شیخ کی زندگی ہی میں سلوک ومعرفت کے جملہ مقامات طے کر لئے تو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دل میں انہیں اپنا خلیفہ بنانے کی خواہش پیدا ہوئی اس مقصد کے لئے انہوں نے استخارہ کیا، تو اس کی تائید حاصل ہوئی اور خلافت عطا فرمائی۔

انقلاب: حضرت حکیم الامتؒ کے فیضِ صحبت سے سید صاحب کی زندگی میں واضح انقلاب نمایاں ہوا، جس کا اندازہ آپ کے مکاتیب سے بھی ہوتا ہے چنانچہ مولانا عبدالباری ندویؒ کے نام وہ ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں:

''دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور پر سمجھ میں نہ آتی تھی وہ عملاً سمجھ میں آ گئی اور اب تلافئ مافات میں مصروف ہوں۔''

اسی طرح مولانا مسعود عالم ندوی کو ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''واہ واہ کا مزہ بہت اٹھا چکا، اور اب یہ رنگ اتر چکا، اب تو آہ آہ کا

دور ہے، اور اپنی پچھلی تباہی پر ماتم اور آئندہ کی فکر درپیش ہے۔'' (مکاتیب سلیمان)

حسب ذیل غزل سید صاحب کے انہیں جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے:

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے — اثر کے واسطے کچھ دیر انتظار کرے

جو آج لذت دردنہاں کا جو یا ہے — وہ پہلے سوز سے دل کو داغدار کرے

انہیں کے دینے سے ملتا ہے، جسکو ملتا ہے — وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے

ادب سے دیکھ لیں عشاق دور سے انکو — محال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے

سنا تو دے انہیں افسانۂ غم ہجراں — وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے

وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو — وہ طرز نالہ ہو جوان کو بیقرار کرے

پلادے ساغر سرشار مجھ کو وہ ساقی — خزاں کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے

تری نظر میں ہے تاثیر مستئ صہبا — تری نگاہ جسے چاہے میخوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں — وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

غور کیجئے یہ ساری غزل آثار جذب و عشق کی کیفیت سے لبریز ہے، یہ غزل اعظم گڑھ سے الہ آباد جاتے ہوئے راہ میں کہی گئی، پھر جب سید صاحب نے الہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا تو اس سفر کی یادگار یہ غزل ہے:

صدق احساس کی دولت میرے مولا دیدے
غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دیدے

دُھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی
دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے

اپنے میخانے سے اور دستِ کرم سے اپنے

دونوں ہاتھوں میں میرے ساغر و مینا دیدے

کھول دے میرے لئے علمِ حقیقت کے دَر

دلِ دانا دلِ بینا، دلِ شنوا دیدے

قول میں رنگ عمل بھر کے بنادے رنگیں

لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دے دے

دل بیتاب ملے دیدۂ پُر آب ملے

تپ آتش مجھے دیدے، دلِ دریا دیدے

دردِ دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے

جو نہ ٹھہرے مجھے وہ دردِ خدایا دیدے

(بیس بڑے مسلمان: ص/۸۵۰)

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی کا مبصرانہ مضمون

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، پرانے چراغ میں حضرت حکیم الامتؒ سے ارادت اور اصلاحی تعلق کے بعد کے حالات وجذبات کے سلسلہ میں یوں رقم طراز ہیں:

رجحان اور ذوق کی تبدیلی اور عمر کی ترقی کے ساتھ سید صاحب کا دارالعلوم کے بارے میں ذوق ورجحان بھی خاصا بدل گیا تھا، اب وہ اس کو محض ایک علمی ادارہ اور پڑھنے پڑھانے اور علوم جدیدہ سے بقدرِ ضرورت واقفیت کا مرکز سمجھنے پر قانع نہیں تھے، دوسرے مختصر وبلیغ الفاظ میں وہ لسان العصر اکبر الہ آبادی کی اس تعریف کو پسند نہیں کرتے تھے جو انھوں نے فضلائے ندوہ کا امتیاز بیان

کرنے کے لئے خود سید صاحب کی نوجوانی میں کی تھی۔

ع اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

وہ ندوہ کو قلب دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند، تینوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے تھے اور اسی ترتیب و تناسب کے ساتھ کہ پہلا مقام قلب دردمند ہو، دوسرا ذہن ارجمند کا اور اس کے بعد ان کی ترجمانی کے لئے زبانِ ہوشمند ہو۔

وہ چاہتے تھے کہ فرزندانِ ندوہ کے سامنے وہی شخصیتیں قابل تقلید اور منتہائے کمال نہ ہوں جو علم و ادب اور تاریخ کے لئے ایک رمز و علامت بن گئی ہیں، بلکہ وہ اپنی تحریک کے داعیوں اور اپنی درسگاہ کے بانیوں میں سے ان لوگوں کو بھی مثالی نمونہ کے طور پر سامنے رکھیں اور ان کی پیروی کی کوشش کریں جو اپنی دینداری وصلاح اور اپنی دینی و دنیوی اور علمی و ادبی جامعیت خاص کے مالک تھے۔

سید صاحب کے ان نئے رجحانات نے طلبہ میں وہ مقبولیت اور کامیابی حاصل نہیں کی جو ان کے مقام کے لحاظ سے متوقع تھی بلکہ اس سے ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوئی، اس کا نقطۂ عروج و ارتقاء طلبہ کی وہ اسٹرائک تھی جو ۱۹۴۳ء میں پیش آئی، آغاز اس کا اگرچہ کچھ انتظامی معاملات سے ہوا لیکن اس کے اندر بے اطمینانی اور کشمکش کی یہی روح کام کررہی تھی۔ (پرانے چراغ: ۱/۴۱)

سید صاحب بعض خاص سبب کی بنا پر جولائی ۱۹۴۶ء میں قاضی ریاست امیر دارالعلوم احمدیہ اور دینی اُمور تعلیم کے مشیر ہوکر ریاست بھوپال چلے گئے اور اکتوبر ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے، انہوں نے بھوپال سے دارالعلوم کے ساتھ تعلق

قائم رکھا اور اس کی یاد کو کسی وقت دل سے جدا نہ کر سکتے تھے، شفقت ناموں سے کارکنانِ ندوہ کا حوصلہ بڑھاتے اور تعلیمی رہنمائی فرماتے تھے۔ (ص ر ۴۳)

سید صاحب بھوپال کچھ دن قیام کر کے حج کے لئے روانہ ہو گئے، ان کا دوسرا یا تیسرا حج تھا جو ۱۹۴۹ء میں ہوا، حجاز کی تبلیغی جماعت نے سید صاحب کے قیام سے فائدہ اٹھایا اور ان کی ترجمانی اور تائید سے حجاز سعودی عرب کے علمی و دینی حلقوں نیز باہر سے آئے ہوئے اہل علم حجاج میں اس دعوت کی وقعت اور وزن پیدا ہوا۔ (ص:۴۸)

سید صاحب کو اسی سفر حج ہی میں پاکستان آنے کی دعوت پاکستان کی بعض نہایت ذمہ دار شخصیتوں کی طرف سے بعض موقر شخصیتوں کے ذریعہ پہونچی پھر مسلمانوں کا ایک خیر سگالی کا وفد روانہ ہونے والا تھا جس میں مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی پیش پیش تھے، سید صاحب سے بھی اس وفد میں شرکت کی درخواست کی گئی تو انہوں نے منظور فرمالیا ۔ ۱۴؍جون ۱۹۵۰ء کو صبح کراچی پہونچے، سید صاحب کی واپسی طے شدہ تھی، اور اس بارے میں ان کے ذہن میں کوئی تردد نہ تھا لیکن بعض وجوہ سے وہاں مستقل قیام کا فیصلہ فرمالیا۔ ص ر ۵۰

ارشادات

شریعت وطریقت کی عینیت: حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں:

”جاہل پیروں اور دوکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ گھڑا ہے کہ شریعت وطریقت دو الگ چیزیں ہیں اور اس زور وشور سے اس کو شہرت دی

ہے کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے، حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنی ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے، احکام الٰہی کی باخلاصِ تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے دگر ہیچ، اور یہی خواصِ امت کا مذہب ہے، اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے نا آشنا ہے۔ (ج ر ۱، ص ر ۱۶۱)

سیرۃ النبی جلد پنجم میں ''عبادات قلبی'' کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:

''اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے، اس لئے تمام امور خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہاء نے صرف جسمانی اور مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیہ نے جسمانی اور مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ فقہاء نے اپنا فرضِ منصب جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے، اور صوفیہ نے اس سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے۔''

یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصل جوہر ہیں، جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے جسد بے روح بن جاتے ہیں، فقہ و تصوف کی ایک

دوسرے سے علٰحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔ (ص: ۱۶۳)

ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمارہے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیوض وبرکات ہر وقت جاری ہیں، اپنے میں استفادہ کا مادہ ہونا چاہئے اور اس کی صورت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت عقلی ہے جس کا مظہر اتباع احکام وسنت ہے۔

(ص: ۱/ ۱۶۴)

ظاہر و باطن کی یکجائی: مصنف سلوک سلیمانی تحریر فرماتے ہیں: ہمارے حضرت والا سید الملۃ قدس سرہ اس دور میں ظاہر و باطن کی یکجائی کا عملی نمونہ اور اسکی وحدت کے داعی تھے، چنانچہ ارقام فرماتے ہیں:

رسول کریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم نے (نبوت کے) ان تینوں فرائض (تلاوتِ کتاب، تعلیم قرآن وحکمت اور تزکیہ) کو بحسنِ خوبی انجام دیا، لوگوں کو احکام الٰہی اور آیات قرآنی پڑھکر سنائے اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمت ربّانی کی باتیں سکھائیں اور اسی پر اکتفانہ کی بلکہ اپنی صحبتِ فیض تاثیر اور طریق تدبیر سے پاک وصاف بھی کیا، نفوس کا تزکیہ فرمایا، قلوب کے امراض کا علاج کیا اور برائیوں اور بدیوں کے زنگ ومیل کو دور کر کے اخلاق انسانی کو نکھارا اور سنوارا، یہ دونوں ظاہری وباطنی فرض یکساں اہمیت سے ادا ہوتے رہے، چنانچہ صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کے تین دور تک یہ دونوں ظاہری وباطنی کام اسی طرح قائم رہے جو استاد تھے وہ شیخ تھے، اور جو شیخ تھے وہ استاد تھے جو مسندِ درس کو جلوہ دیتے تھے وہ خلوت کے شب زندہ دار، اور اپنے ہمنشینوں کے تزکیہ

وتصفیہ کے بھی ذمہ دار تھے، ان تینوں طبقوں میں استاد اور شیخ کی تفریق نظر نہیں آتی، اس کے بعد وہ دور آنا شروع ہوا جس میں مسندِ ظاہر کے درس گو باطن کے کورے، اور باطن کے روشن دل ظاہر سے عاری ہونے لگے، اور عہد بہ عہد ظاہر و باطن کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی، تا آنکہ علوم ظاہر کے لئے مدارس کی چہار دیواری اور تعلیم وتزکیہ باطن کے لئے خانقاہوں اور رباطوں کی تعمیر عمل میں آئی اور وہ مسجد نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علمائے دین کی جگہ علمائے دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار وکمالات سے جاہل ہوکر رہ گئے۔

تاہم ہر دور میں بھی ایسی مستثنیٰ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں جن میں نور نبوت کے یہ دونوں رنگ بھرے تھے اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جن بزرگوں سے فیوض پہونچے اور پھیلے وہ وہی تھے جو ان دونوں کے جامع تھے، امام غزالیؒ جن سے علم منقول ومعقول نے جلوہ پایا، علم حقیقت نے بھی ان ہی کے ذریعہ ظہور پایا، حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردی ایک طرف شیخ طریقت ہیں تو دوسری طرف مدرسہ نظامیہ کے مدرس، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ امام وقت اور شیخ طریقت دونوں ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ جن کو علماء ظاہر سمجھا جاتا ہے جیسے حضرات محدثین امام بخاری، ابن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ وغیرہ وہ بھی اس جامعیت سے سرفراز تھے۔ (نیز امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ سب اس میدان کے شہسوار نظر آتے ہیں۔ مرتب)

متوسطین میں علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالی کو ناواقف باطن سے خالی سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے احوال وسوانح ان برکات باطنی سے لبریز ہیں، ابن قیمؒ کی مدارج السالکین وغیرہ کتابیں پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ وہ آرائش ظاہر اور جمال باطن دونوں سے آراستہ تھے۔

(سلوک سلیمانی: ج ر ۱، ص ر ۲۰۳)

ف: سبحان اللہ! کیا خوب بات ارشاد فرمائی، ہمارے حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ ہمارے فقہاء ومحدثین باطنی دولت سے عاری تھوڑے ہی تھے، اس لئے کہ بغیر اس کے علم دین کی اتنی اہم خدمت انجام دے ہی نہ سکتے تھے۔ (مرتب)

ظاہر وباطن بیک وقت دونوں کی اہمیت وضرورت پر یوں تحریر فرمارہے ہیں:

ہندوستان میں جن بزرگوں کے دم قدم سے اسلام کی روشنی پھیلی وہ حقیقت میں وہی تھے جن کی ذات میں مدرسہ وخانقاہ کے کمالات کی جامعیت تھی کہ وہ اسوۂ نبوت سے قریب تر تھے، اس لئے ان کا فیض بعید سے بعید تر حصہ تک پھیلتا چلا گیا، آسمان دلی کے مہر وماہ اور تارے شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے لے کر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تک کو آپ ایک ایک کر کے دیکھیں تو ظاہر وباطن کے علوم والوں کی یکجائی کا نظارہ آپ کو ہوگا، اور اس سے ان کے علمی وروحانی برکات کی وسعت کی حقیقت آشکارہ ہوجائے گی، وہ علوم کی تدریس کے وقت **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** کا جلوہ دکھاتے تھے اور حجروں میں بیٹھ کر **يُزَكِّيهِمْ** کی جلوہ

ریزی فرماتے تھے، پھر ان کے بعد ان کے فیوض و برکات کے جو حامل ہوئے جن کی نشاندہی چنداں ضروری نہیں کہ **سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ**، ان سے دنیا کو فیض پہونچا، اور دین کی اشاعت و تبلیغ اور قلوب و نفوس کے تزکیہ و تصفیہ کا جو کام انجام پایا وہ بھی ظاہر و باطن کی اسی جامعیت کے آئینہ دار تھے، اور آئندہ بھی سننِ الٰہیہ کے مطابق دین کا فیض جن سے پھیلے گا وہ وہی ہوں گے جن کے اندر مدرسیت اور خانقاہیت کی ''دوسوتیں ایک چشمہ بن کر بہیں گی''۔ **مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ**، آنکھوں کا نور شب بیداری سے بڑھتا اور زبان کی تاثیر ذکر کی کثرت سے پھیلتی ہے، رات کے راہب ہی اسلام میں دن کے سپاہی ثابت ہوئے ہیں، سوانح و تراجم کا سیزدہ صد سالہ دفتر اس دعویٰ کا شاہد ہے، زبان کی روانی اور قلم کی جولانی، دل کی تابانی کے بغیر سراب کے نمو سے زیادہ نہیں، خواہ وہ اس وقت کتنا ہی تابناک نظر آتا ہو، مگر وہ مستقل اور مستقبل کے وجود سے محروم ہے۔

(مقدمہ سوانح مولانا محمد الیاسؒ، سلوک سلیمانی: ج ۱/ص ۲۰۴)

اعتدال: تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں بھی اعتدال تھا، چنانچہ ایک صاحب کو جنھوں نے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا تھا ان کو یوں تحریر فرمارہے ہیں:

خود مسلمان بننا، دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی اہم پکار ہے اور اس فرض کو نفرت کے بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے، جس کے سامنے آپ دعوت پیش کرتے ہیں اس پر شفقت اور اس سے محبت دعوت کا محرک ہو، تب ہی وہ کامیاب ہوسکتی ہے جیسا کہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں ہے۔ (ص ۳۵۰)

نیز اس سلسلہ میں فرماتے تھے کہ ''دین کی خدمت کی راہیں مختلف ہوسکتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اخلاص ہو اور سلف کی راہ سے سر مو تجاوز نہ ہو، گو قدیم جوہر کی بقا کے ساتھ جدید نقش ونگار سے پرہیز نہیں لیکن اگر یہ جدید نقش ونگار اصل قدیم جوہر کو فنا کردے تو اس نقش ونگار سے بے نقش ہی رہنا اچھا ہے۔ فرماتے تھے، یہی اپنی وصیت ہے اور یہی زندگی کی آخری فرمائش۔ (ص ۳۵۱)

ف: سبحان اللہ! حضرت سید صاحبؒ کے اندر علماً وعملاً کس قدر اعتدال وانصاف تھا جو آپ کے کمال علم ومعرفت پر دال ہے، چنانچہ حضرت سید صاحب تبلیغی جماعت کو سراہتے بھی تھے اور متوسلین کو شرکت کی ترغیب بھی دیتے تھے مگر اس سے جو خود انفرادی طور پر ضرر پہونچ سکتا ہے اس سے متنبہ وآگاہ بھی فرماتے رہتے تھے چنانچہ ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

اس تبلیغی سلسلہ میں صرف ایک احتیاطی تنبیہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ غیر کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح اور حصول اجر کی خاطر ہو، تفوق اور دینی بڑائی کا خیال بھی نہ آئے۔

نیز ایک صاحب کو تحریر فرمایا کہ: آپ جماعت کے ساتھ کام تو کریں مگر نظر اپنے اوپر ہو اور اپنی درستی کی نیت ہو۔ (ج/۱، ص/۳۴۸)

اخلاص جو دین حنفی کی اصل ہے اور تصوف کی روح، اس کے متعلق ایک طالب کو یوں تحریر فرمارہے ہیں:

اخلاص کے بغیر تو اعمال مردہ ہیں، مگر اخلاص وریا کی حقیقت سمجھ لیں، اخلاص

نام ہے خالق کی رضا کے لئے کام کرنے کا، اور ریا نام ہے مخلوق کی رضا کے لئے کام کرنے کا، اب آپ اس روشنی میں اپنے اعمال پر نگاہ رکھیں، نفس کا جائزہ لیتے رہیں اور حسن نیت کی کوشش میں لگے رہیں۔

نیز ارشاد فرماتے ہیں کہ:

فضائل وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے ہوں، اور ایمان کے بعد ہوں، یعنی جن کی بنیاد ایمان صحیح پر ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ظاہری فضائل درحقیقت فضائل نہیں، اصل شئی احکام الٰہی کی کلی اطاعت، حلال وحرام کا خیال، معاملات میں صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباع نبوی کا دھیان، اور تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب ہے، ان امور کی طرف توجہ فرمائیں کہ یہ اصل اور باقی سب فروع وتدابیر ہیں، ذکر کے اثر کا ظہور یہی ہے کہ طاعات ومرضیاتِ الٰہی کا ذوق بڑھے، خلق میں شہرت اور مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو، عُجب، ریا اور کبر رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ سالک کے لئے سخت خطرناک ہیں اس لئے ان سے احتراز کا اہتمام ضروری ہے۔ (سلوک سلیمانی: ج/۱، ص/۱۶)

تصوف کے متعلق ۱۹۲۵ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

تصوف سرتاپا عمل ہے، اور قلب وروح کے علم وعمل اور مغز شریعت کی اصل تعلیم وتعمیل ہے۔

(معارف ۵، ج/۱۵، ص/۳۹۴)(سلوک سلیمانی: ج/۱، ص/۶۳)

نیز تحریر فرمارہے ہیں کہ:

حقیقی اور شرعی تصوف جس کا صحیح نام احسان ہے روحِ دین اور جانِ ایمان ہے۔ یہ اخلاص فی اللہ، تزکیۂ قلب، حصولِ تقویٰ اور علم کا نام ہے۔ اور ۱۹۲۹ء میں لکھتے ہیں کہ:

حقیقی تصوف جس کی نسبت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ اس کا نام احسان ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے، وہ تو درحقیقت مذہب کی روح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے۔ (سلوک سلیمانی: ج ر ۱ ص ر ۶۴)

ڈھاکہ کا کربناک سفر: مارچ ۱۹۵۳ء میں سید صاحب ایک بار (اور آخری بار) ہندوستان تشریف لائے، سید صاحب ڈھاکہ کی ہسٹری کانگریس کی صدارت کے لئے تشریف لے گئے تھے جو اسی مہینہ کی کسی تاریخ میں ہوئی تھی، وہاں انہوں نے اپنا وہ فاضلانہ اور فکرانگیز خطبۂ صدارت پڑھا جس میں بنگالی مسلمانوں کومشورہ دیا تھا کہ وہ بنگالی اسی طرح فارسی رسم الخط میں لکھیں جیسے وہ انگریزوں کے دور سے پہلے لکھی جاتی تھی۔

بنگالیوں نے بالخصوص یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ نے اس مخلصانہ مشورہ کا جس طرح استقبال کیا وہ تاریخ میں افسوس ناک واقعہ کی طرح ہمیشہ یادگار رہیگا، وہ اس طوفان کی خبر دیتا تھا، جوخون برساتا ہوا اور پورے ملک کو زبر وزیر کرتا ہوا سروں [1] پر سے گذر گیا۔

---

(۱) حضرت مولانا ندویؒ کا اشارہ اس قیامت خیز ہنگامہ اور دردانگیز قتل وقتال کی طرف ہے جس کے نتیجہ میں دسمبر ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کا وجود ہوا۔ فیاحسرتاہ۔ اور یہ سب اعدائے دین کی تحریک اور لسانی وصوبائی عصبیت کی بنا پر ہوا جس کی اسلام کسی حال میں اجازت نہیں دیتا۔ بقیہ اگلے صفحہ پر

طلبہ اور نوجوانوں نے اس فاضل یگانہ اور پیر کہن پر جو ملت اور اسلامی علم وثقافت کی آبرو تھا، بے تحاشہ سنگ باری شروع کردی، ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب اور ان کے چند رفقاء نے سید صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کسی نہ کسی طرح انہیں موٹر پر سوار کیا اور کھڑکیاں بند کردیں، اس طرح ان کا جسم محفوظ رہا لیکن ان کا دل چکنا چور ہو گیا، اس کے بعد ہی وہ ہندوستان آئے، ہم لوگوں نے دیکھا تو وہ بالکل بجھ کر رہ گئے تھے، ان میں کوئی اُمنگ شوق اور امید پائی نہیں جاتی تھی۔

وفات: پاکستان پہونچ کر سید صاحب زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے، ان کو قلب کی شکایت پرانی تھی، مئی ۱۹۴۵ء میں ان پر استسقاء قلبی کا حملہ ہوا تھا، حوادث اور زندگی کے ان تجربوں نے اور زیادہ دل شکستہ اور نیم مردہ کردیا تھا، بالآخر ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو آخری ساعت آپہونچی اور ہم نے ہندوستان میں دفعۃً سنا کہ انہوں نے اس دنیا سے رحلت فرمائی اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔**

(پرانے چراغ: ۱/ ۵۳)

گذشتہ کا بقیہ۔ مگر افسوس کہ یہ عصبیت اور جماعت بندی صرف زبان وصوبہ ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ دینی اور علمی حلقوں وسلسلوں میں اس کا نفوذ ہی نہیں بلکہ شیوع ہو رہا ہے جو اہل بصیرت پر مخفی نہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ (مرتب)

حضرت السید محی الدین قلیبی تیونسی المتوفی ۱۳۹۳ھ

ولادت: محی الدین قلیبی ۱۸ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ء میں تیونس کے شہر قلیبیہ میں پیدا ہوئے۔

خدمات: جامعہ الزیتونہ میں تعلیم پائی، صحافت کا پیشہ اختیار کیا، مختلف خبر ناموں میں مثلاً روزنامہ ''**الارادہ**'' ہفت روزہ ''**الصواب**'' ہفت روزہ ''**لسان الشعب**'' کے ایڈیٹر اور تیونس کے سب سے قدیم عربی خبر نامہ '**الزھرۃ**' کے چیف ایڈیٹر رہے۔

قلیبی کے اوصاف: محی الدین قلیبی بے نظیر شخصیت، حقیقی لیڈر، مخلص مجاہد اور قول وعمل کے پابند تھے۔ مشرق ومغرب میں اسلامی ممالک میں اپنے مسلم ملک تیونس کے مسائل کا تعارف کراتے ہوئے سفر کرتے رہے، جس پر فرانسیسی سامراج غالب آچکا تھا۔

عظیم تیونسی لیڈر قلیبی قول وعمل اور اخلاق وکردار میں اسلامی پابندیوں کو اختیار کرتے تھے۔ وہ ان مسلمانوں کے لئے سچا نمونہ تھے، جن کو اپنے دین پر فخر ہوتا ہے اور جو اپنے ایمان کی وجہ سے غالب رہنا چاہتے ہیں۔

قلیبی کے اسفار: چالیس کے عشرے کے اواخر اور پچاس کی دہائی کے اوائل میں محی الدین قلیبی نے مصر، شام، عراق، اردن اور دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ اس دوران انہوں نے اسلامی شخصیات اور اسلامی تحریکات کے ممتاز رہنماؤں مثلاً مصر میں امام حسن البنا شہیدؒ، عراق میں شیخ صوافؒ، شام میں ڈاکٹر سباعیؒ جیسے قائدین، داعی شخصیات اور مغرب کے عرب

رہنماؤں سے ملاقاتیں کی۔

مسلم لیڈروں کے ساتھ قلیبی میں ملاقاتوں کے خوش گوار نتائج برآمد اور نفع بخش اثرات مرتب ہوئے۔ کانفرنسیں منعقد کی گئیں، مذاکرات اور ہنگامہ خیز مظاہرے ہوئے۔

سادگی اور زہد: استاذ قلیبی کی ذات انتہائی سادہ تھی۔ حتی کہ شام کے ایک اخوانی نے، جو ان کے ہم سفر بنائے گئے تھے، ان کو مشورہ دیا کہ وزیر اعظم سے ملنے کے لئے، جو وقت طے ہے۔ نئے کپڑے زیب تن کر کے چلیں۔ اس بات سے قلیبی بہت ناراض ہوئے اور اس اخوانی رفیق سے کہا ''ہم اپنے لباس کے ذریعے لوگوں سے نہیں ملتے بلکہ اپنے دلوں کے ذریعے ملا کرتے ہیں، لوگ اپنے علم سے پہچانے جاتے ہیں نہ کہ ظاہری ٹیپ ٹاپ سے۔

وزیر اعظم نے استاذ قلیبی کا پوری عزت و احترام، اہمیت اور وقار کے ساتھ استقبال کیا۔ ان کے نمایاں کردار اور بلند اخلاق کی وجہ سے وزیر اعظم نے ان کی ان تمام باتوں کو سنا، جو وہ تیونسی مظلوم عوام کے حالات، فرانسیسی سامراج کے ظلم کی مشقتوں اور ان کے لقموں پر پلنے والے ایجنٹوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔

ہدایات: قلیبی مصر، شام، عراق، اردن اور فلسطین میں ملنے والے نوجوانوں کو اپنی بات چیت میں اسلامی شخصیت کی تعمیر کی ضرورت پر زور دیتے تھے، جو پاکیزہ عقیدہ، مضبوط شخصیت، سنجیدہ اخلاق، باوزن عقل و حکمت، مسائل و واقعات کے جائزے میں غور و فکر میں ممتاز ہوتی ہے۔ ان ملاقاتوں میں اسلام اور امت مسلمہ کی طرف انتساب پر فخر کو ابھارتے تھے، جو بہترین امت ہے اور جس کا وجود تمام انسانوں کی بھلائی کے

لئے ہے۔ نیز اسلام کی عالمگیریت، اسلامی اقوام کے اتحاد اور ان کے ایک سانچے میں ڈھل جانے پر زور دیتے تھے تاکہ یہ نوجوان توحید کا علم بلند کریں، اسلام کے زیر سایہ رہیں اور انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرسکیں۔ اسی طرح وہ واضح کرتے تھے کہ اس کے حصول کا راستہ محض ایسی مضبوط شخصیات کی تعمیر اور ان افراد کی تیاری ہے، جو صحابہ، تابعین اور ان کے متبعین کے راستے کو اختیار کریں۔ کیونکہ زندگی حق و باطل اور کفر وایمان کے درمیان کشمکش کا نام ہے اور اسلام وہ دین ہے، جو کبھی شکست نہیں کھاتا۔ البتہ مسلمان اللہ کی راہ اور سنت کو چھوڑ دینے کی وجہ سے شکست سے دوچار ہوتے ہیں۔ جب کتاب اللہ اور سنت رسول کو تھام لیتے ہیں تو غالب ہوجاتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ کے قوانین جاری وساری ہیں۔ یہ کسی کی طرف داری نہیں کرتے۔ لہٰذا آدمی جو بوئے گا وہ کاٹے گا اور جس چیز کی کوشش کرے گا اسے پالے گا۔

نوجوانوں کی عقیدت: مصر، عراق، شام اردن اور فلسطین میں نوجوانوں کے ساتھ قلبی کے جلسے، عشائیے۔ بات چیت، مذاکرے، انٹرویو، اور مباحثے ہوئے، جن میں انھوں نے ان کے علم، تجربات، ہدایات اور نصیحتوں سے استفادہ کیا اور اس محبت کا مظاہرہ کیا، جو بیٹا اپنے باپ سے اور شاگرد اپنے استاذ سے کرتا ہے اور عہد کیا کہ وہ اسلامی دعوت کے علمبردار بنیں گے۔ ان میں سے بیشتر نے اپنے باتوں پر عمل کرکے دکھایا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ نے اپنا عہد پورا کردیا اور کچھ انتظار میں ہیں۔

وفات: آپ کی وفات نومبر ۱۹۵۴ء بمطابق ۱۳۷۴ھ میں تیونس میں ہوئی اور وہیں مدفون ہیں۔ **نور اللہ مرقدہٗ**۔ (عالم اسلام کی عالمی شخصیات صفحہ:۱۱)

حضرت مولانا شاہ حلیم عطا سلونی رائے بریلویؒ المتوفی سنہ ۱۳۹۵ھ

نام ونسب: مولانا شاہ حلیم عطا، خالص علم ومطالعہ اور علمی ذوق کے آدمی تھے، وہ صاحب جائداد تھے، اور ایک بڑے ذی وجاہت اور محترم ذی علم خاندان کے رکن رکین، ان کے والد شاہ مہدی عطا صاحب ایک بڑی خانقاہ کے سجادہ نشین اور سلون ضلع رائے بریلی کے نامی رؤساء اور زمینداروں میں تھے، اس سلسلہ کے اگلے سجادہ نشینوں کی طرح وہ مشیخت کے ساتھ صاحب علم وفضل، عالی طبع اور کریم النفس بزرگ تھے، شاہ صاحب ان کے چھوٹے بیٹے تھے۔

خانقاہ سلون کے بانی: اس خانقاہ کی بنیاد گیارہویں صدی کے نامور چشتی شیخ حضرت مولانا پیر محمد سلونی (سنہ ۱۰۹۹ھ) نے ڈالی، اس وقت سے یہ قصبہ چشتی نظامی سلسلہ کا ایک عظیم روحانی مرکز رہا ہے، اس خانقاہ کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ خانقاہ ومدرسہ اور علم وادب تجرد وتفرید اور تصنیف وتالیف، تعلق وبے تعلقی اور فقر وغنا دونوں کا مرکز رہا ہے۔

شیخ پیر محمد صاحبؒ کے حالات مولانا سید عبدالحی صاحب حسنی نے ''نزھۃ الخواطر'' میں جو کچھ بھی تحریر فرمایا ہے اس کو بعینہ نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

محترم، صالح، پیر محمد بن، عبد الغنی بن ابی الفتح بن الہٰ داد بن من اللہ بن بہاء الدین عمری جون پوری، پھر سلونی، مشہور مشائخ میں تھے۔ آپ کی ولادت سنہ ۹۹۶ھ میں ''سلون'' شہر میں ہوئی۔ اور حصول علم کیلئے مانک پور گئے۔ مناظرہ

اور اشتغال میں پوری کوشش کی یہاں تک کہ شیخ عبدالکریم بن سلطان مانک پوری سے اچانک اس وقت ملاقات ہوگئی جبکہ یہ اپنے مدرسہ جارہے تھے۔تو شیخ نے ان سے سوال کیا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔تو یہ کہا کہ میں تفسیر بیضاوی اور ھدایۃ الفقہ پڑھ رہا ہوں۔تو شیخ نے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو تاکہ میں تم کو وہ سکھاؤں جو تم چاہ رہے ہو۔چونکہ یہ پیر محمد ان شیخ کے بلند مرتبہ کو نہیں جانتے تھے اس لئے اپنے راستہ پر چلتے رہے۔جب یہ پیر محمد صاحب اپنے استاد کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے بیٹھے تو بالکل بھی پڑھ نہیں سکے۔اور نہ وہ استاد ان کو پڑھا سکے۔ایسا ہونے سے استاد کو سخت تعجب ہوا اور ایسا ہونے کی استاد نے وجہ پوچھی تو پیر محمد صاحب نے ان سے وہ بات کہہ دی جو ان کے اور شیخ عبدالکریم صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔تو آپ کے استاذ آپ کو لیکر پیر محمد صاحب کو لے کر شیخ عبدالکریم صاحب کے پاس پہنچے اور بہت زیادہ معذرت خواہی کی۔اور پیر محمد صاحب ان کے ساتھ چھ مہینے مستقل ساتھ رہے اور ھدایۃ اور بیضاوی بھی ان سے پڑھ لی اور علم طریقت بھی حاصل کرلیا۔جب یہ ارشاد وتلقین کے مرتبہ کو پہنچ گئے تو شیخ عبدالکریم نے ان کو اپنا خلیفہ بنادیا اور ان کو شہر جانے کی اجازت دے دی۔اور اس کے بعد وہیں ارشاد وتلقین کا فریضہ انجام دیتے رہے اور ۱۰۹۹ھ میں سلون میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

(گیارہویں صدی کے علماء برصغیر ج:۵ ص:۱۵۴ ترجمہ نزھۃ الخواطر)

اب حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ کے حالات وکمالات ملاحظہ کریں جس کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ”پرانے چراغ“ میں

نقل کیا ہے۔

فضل وکمال: شاہ حلیم عطا صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کے کمالات واوصافات سے واقف ہونے کا موقع حقیقتاً اس وقت ملا جب میں اپنے دو بزرگوں ابوحمزہ سید زبیر حسنی صاحب اور ان کے بھائی مولانا سید طلحہ صاحب کی ہمرکابی میں پہلی بار سلون گیا، زمانہ غالباً ۱۹۳۱ء کا تھا، میری عمر ۱۷ رسال رہی ہوگی۔

ہم لوگوں کے پہونچنے سے گویا شاہ صاحب کی عید ہوگئی وہ اس بھرے پرے قصبہ میں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پورے ضلع میں، اپنے ذوق، اپنے مطالعہ، کتابوں کے ساتھ عشق، حدیث وسنت کے ساتھ شغف اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اوران کے تلامذہ ومنتسبین کے ساتھ والہانہ تعلق میں بالکل نرالے تھے، اور اپنے وطن، اہل قصبہ اور افراد خاندان کے غربت ومسافرت اور عزلت وخلوت کی زندگی گزار رہے تھے، اور اقبالؔ کا یہ شعر بالکل ان کے حسبِ حال تھا۔

من مثالِ لالۂ صحرا ستم درمیان محفلے تنہا ستم

ہم لوگ پہنچے تو معلوم ہوا کہ جیسے وطن سے کوئی ہم زبان آیا وہ خود پڑھتے تھے، اور خود مزا لیتے تھے، کوئی ایسا ہم نفس اور ہم مذاق نہ تھا، جس سے وہ ان مضامین کا تذکرہ بھی کرتے، اب مولانا سید طلحہ صاحب جیسا ہم مشرب اور ہم مذاق مل گیا، معلوم ہوا کہ فہرست ابن الندیم اور کشف الظنون کے اوراق کھلے ہوئے ہیں، ابھی کسی مصنف کی خصوصیات کا تذکرہ ہے، اور ابھی کسی تصنیف کی منفرد تحقیقات کا، ان کے دونوں صاحبزادے شاہ ہادی عطاء مرحوم اور شاہ حسن عطا سلمہٗ ۸،۸۔۱۰،۱۰ سال کے بچے تھے۔

کتابوں کا شوق: شاہ صاحب خود اٹھ اٹھ کر کتابیں لاتے، ان کی زندگی کا سب سے بڑا شوق اور ان کی آمدنی کا سب سے محبوب مصرف کتابوں کی خریداری تھی، وہ بمبئی اور سورت کے کتب خانوں کو برابر آڈر دیتے رہتے۔

ندوۃ میں تدریسی خدمت: شاہ حلیم عطا صاحب کا حافظہ غیر معمولی تھا، اور سلف کے حافظہ کی ایک نشانی تھے، اسلئے متون وشروح حدیث میں انہوں نے جو کچھ پڑھا تھا، وہ بہت کچھ ان کے حافظہ میں محفوظ تھا، پھر امام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور حافظ ابن حجر کی کتابوں کے بار بار مطالعہ سے ان کے اندر حدیث کی گہری مناسبت پیدا ہو گئی تھی، غرض یہ کہ ۱۹۳۹ء میں شاہ صاحب دارالعلوم میں بحیثیت استاد حدیث شریف لے آئے، مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ کے تشریف لے جانے کے بعد صحیحین کا درس بھی ان کے متعلق ہوا، شاہ صاحب کو اس سے پہلے درس دینے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کا اصل ذوق، مطالعہ اور کتابوں سے تمتع ولطف اندوزی کا تھا، لیکن ان کا قوی حافظہ، علمی استحضار، مطالعہ کی وسعت اور معلومات کی فراوانی طلباء کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی، وہ بعض اوقات اتنی معلومات مہیا فرما دیتے تھے، اور نقول وحوالوں کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ طلباء ان کو اخذ وہضم نہیں کر پاتے تھے، تعلیم کا یہ تجربہ ہے کہ بعض اوقات ایک ایسا معلم جس کا مطالعہ تو زیادہ وسیع نہیں، لیکن وہ اپنے فن اور مضمون یا کتاب پر حاوی ہے، زیادہ وسیع المطالعہ اور کثیر المعلومات استاذ سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اور طلباء اس کو ترجیح دیتے ہیں، یہ آزمائش جو کسی نقص کا نتیجہ نہیں بلکہ کمال کا نتیجہ تھی، شاہ صاحب کو بھی پیش آئی، یوں کہنا چاہئے کہ یہ ان کے کمال کا تاوان تھا، جو ہر صاحبِ کمال کو ادا کرنا پڑتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ ان کا درس

زیادہ مفید اور طلبہ زیادہ مطمئن ہوتے گئے اور خاص طور پر علم کا ذوق، مطالعہ کا شوق، متقدمین کی تصنیفات تحقیقات کی قدر، ہر موضوع پر بنیادی کتابوں اور صحیح ماخذ کی واقفیت، جو علمی ترقی اور کمال کا بہت بڑا زینہ، اور علوم دینیہ کے وسیع کتب خانہ کی ''شاہ کلید'' ہے، طلباء کو حاصل ہوئی اور اس سے طلباء نے بقدر استعداد فائدہ اٹھایا۔

قرآن سے شغف: شاہ صاحب کو قرآن مجید بڑا پختہ اور مستحضر تھا، مجھے معلوم نہیں کہ وہ روزانہ دور کرتے تھے، یا نہیں، لیکن جب چاہے جہاں سے چاہے سنا دیتے تھے، رمضان المبارک میں ختم کا اہتمام تھا، اس استحضار اور قرآنی ذوق کی وجہ سے وہ برموقع آیات پڑھتے، طبیعت میں شگفتگی اور شعریت تھی کبھی کبھی بڑا لطف ومزاح فرماتے، اور قرآنی آیات یا قدیم ابیات کے پردے میں پوری حقیقت کہہ جاتے، ایک مرتبہ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کے رہنے کی اور سونے کی کوئی اور موزوں جگہ نہ تھی، مولانا سید سلیمان ندوی جو ہمیشہ مہمان خانہ میں ٹھہرتے تھے، تشریف لانے والے تھے، ان کی آمد آمد سن کر دفتر اہتمام نے کئی بار اشارۃً پھر صراحۃً شاہ صاحب سے کہا کہ وہ کہیں دوسری جگہ منتقل ہو جائیں، اسلئے کہ مہمان خانہ میں سید صاحب اور ان کے رفقاء کا قیام رہے گا شاہ صاحب کو کسی قدر گرانی ہوئی، ایک دن ہم لوگوں سے فرمانے لگے کہ آج کل یہ آیت میرے حسب حال ہے، '' **یاأیھا النمل ادخلوا مساکنکم لایحطمنکم سلیمٰن وجنودہ وھم لایشعرون** '' ایک روز عزیز گرامی مولانا عبداللہ عباس ندویؒ اپنے زمانہ تدریس میں درجہ میں گئے اور دیکھا کہ طلباء ابھی تک نہیں آئے تھے، اسی اثناء

میں جب وہ طلبہ کے انتظار میں کھڑے تھے، شاہ صاحب تشریف لائے شاہ صاحب ان کے استاد تھے، اور شاہ صاحب نے ان کا دور طالب علمی بھی دیکھا تھا، اور جانتے تھے کہ ہر دور کے طالب علم ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

مولوی عبداللہ صاحب نے ان سے طلباء کی بدشوقی اور کم ہمتی کی شکایت کی، شاہ صاحب نے برجستہ فرمایا، **"کذلک کنتم من قبل فمنّ اللہ علیکم"**

بیعت: شاہ صاحب ہمارے شیخ و مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری سے لکھنؤ میں بیعت ہوئے تھے، ان کی مجلسوں میں بڑے اہتمام اور ادب سے شرکت کرتے تھے، حج کی بڑی تمنا تھی، اور ۱۹۵۵ء میں اس کی تیاری بھی کرلی تھی، مجھے بھی یہ شوق تھا کہ وہ علمائے حجاز اور اطراف عالم سے آئے ہوئے مختلف اصحاب علم وفن (جو زمانہ حج میں مکہ معظّمہ میں جمع ہوجاتے ہیں) سے ملیں اور ان سے علمی مذاکرات ہوں، اور یہ عرب علماء بھی دیکھیں کہ ہمارے ہندوستان میں کیسے کیسے وسیع النظر اور قوی الحافظہ عالم ہیں، لیکن یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور شاہ صاحب کا جانا نہ ہوسکا۔

وفات: شوال ۱۳۷۴ھ مطابق جون ۱۹۵۵ء میں ان پر دماغی فالج کا حملہ ہوا اور زندگی وموت کی کشمکش میں کئی مہینے مبتلا رہنے کے بعد جس میں علاج وتدبیر کی کوئی کمی نہیں کی گئی تھی، ۲۰ رصفر ۱۳۷۵ھ کو اس دارِ فانی سے رحلت کی، الہ آباد (جہاں وہ تبدیل آب وہوا کیلئے گئے تھے) سے لاش سلون لائی گئی اور خانقاہ سلون ضلع رائے بریلی میں اپنے کتب خانہ کے سامنے آسودۂ خاک ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ۔ (پرانے چراغ جلد:۱۔ صفحہ: ۲۴۵)

حضرت مولانا عبدالمجید کوٹھیاوی اعظمی رحمہ اللہ متوفی ۱۳۹۷ھ

نام ونسب وولادت: حضرت مولانا سید عبدالمجید بن بدر علی بن سیّد نظر علی بن سیّد تاج الدین بن سیّد مصلح الدین بن سیّد شمس الدین بن سیّد بخارا بن سیّد حبیب بن سیّد مجید بن سیّد حمید الدین۔ یہ سید حمید الدین حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد سے ہیں، اسی وجہ سے سیّد کاظمی کی نسبت سے مشہور تھے۔ سیّد حمید الدین اولاً ملک عرب سے ہندوستان آئے اور موضع بہاریو پرگنہ سکندر پور ضلع بلیا میں آباد ہوئے، پھر یہاں سے کچھ لوگ موضع کوٹھیا ضلع اعظم گڑھ میں منتقل ہو گئے، اسی موضع کوٹھیا میں ۱۳۲۶ھ میں مولانا عبدالمجید صاحب کی ولادت ہوئی۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم اپنے دیار کے مشہور عالم مولانا علی احمد صاحب کوئریاپاری سے حاصل کی اور تکمیل دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندی رحمہ اللہ، مولانا اعزاز علی امروہی رحمہ اللہ اور علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ سے کی، فراغت غالباً ۱۳۵۰ھ میں ہوئی۔

تدریسی خدمت: فراغت کے بعد مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور عرصہ تک وہاں تعلیمی خدمت انجام دی، بعد ازاں یہاں سے علیحدہ ہو کر ۱۳۶۶ھ میں محلہ قاضی پورہ قصبہ گھوسی میں قاسم العلوم کے نام سے خود ایک درس گاہ قائم کی اور تا مدّتِ حیات اس میں درس دیتے رہے، حضرت مولانا عبدالمجید رحمہ اللہ یوں تو جملہ علوم میں مہارت رکھتے تھے، لیکن

امتیازی فن آپ کا حدیث اور فقہ تھا، افتاء کا کام شروع ہی سے انجام دیتے رہے، کثرت سے فتاویٰ آپ کے پاس آتے تھے جو رجسٹر میں درج بھی ہوتے تھے۔ مکرم مولانا وقار احمد صاحب گھوسویؒ آپ کے شاگرد خاص تھے اور آپ کے علم کے بہت معتقد اور مداح تھے۔

تدریس کے ساتھ تالیف وتصنیف میں بھی آپ کو دستگاہ حاصل تھی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کی فرمائش پر متعلقات قرآن کے موضوع پر ایک رسالہ ''حمائل المرجان والزھر فی فضائل القرآن والسور'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔

ف: مگر شاید اب دستیاب نہیں ہے کاش یہ رسالہ دستیاب ہو جاتا تو تشنگان علوم اس سے استفادہ کرتے (مرتب)

انہماک مطالعہ: مولانا مطالعۂ کتب کے بہت شائق تھے، آپ کا اکثر وقت اسی میں گزرتا تھا، مطالعہ میں حدیث اور فقہ کی کتابیں زیادہ رہتی تھیں، کتاب اٹھا لیتے تو نہ کھانے کا خیال آتا نہ پینے کا اور نہ سونے کا جس کا انجام یہ ہوا کہ آپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے، مگر مطالعہ اور شب بیداری میں فرق نہ آیا، دوست واحباب نے لاکھ کوشش کی کہ آپ مطالعہ نہ کریں، لیکن اس کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں اور آپ بسترِ علالت پر پڑ گئے، جب حالت زیادہ نازک ہوگئی تو حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری قدس سرّہ کی وساطت سے شہر اعظم گڑھ میں ڈاکٹر حفیظ اللہ بکھراوی کی زیر نگرانی علاج شروع ہوا، لیکن مرض علاج کی حد سے آگے بڑھ چکا تھا۔

حضرت مولانا تھانویؒ سے تعلق: مولانا مرحوم نہایت متقی اور متورع اور عابد وزاہد عالم تھے، درس ومطالعہ سے جو وقت بچتا وہ عبادت وریاضت میں صرف کرتے تھے، حضرت تھانویؒ سے بیعت وارادات کا تعلق تھا اور ان کے مجاز صحبت بھی تھے۔ اسکے بعد حضرت مصلح الامت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے تعلق قائم فرمایا اور ہر جمعہ کو حضرت مصلح الامتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری قدس سرّہ آپ سے بیحد محبت کرتے تھے، حضرت پھولپوریؒ کی اس محبت وشفقت کا انھیں بھی بڑا خیال رہتا تھا اور جب تک سفر کے قابل رہے ہمیشہ مہینے میں دو تین بار پھولپور حضرت کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری سمجھتے رہے، لیکن جب مرض نے شدت اختیار کر لی اور آپ سفر سے معذور ہو گئے تو یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، اس زمانہ میں حضرت پھول پوری خود مہینے میں کم از کم دو تین بار ان کے یہاں ضرور آتے تھے۔

اڑتیس (۳۸) سال کی قلیل مدت میں مولانا نے علمی میدان میں جو گرانقدر خدمات انجام دیں ان کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگر انھیں طویل عمر ملتی تو ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

پھول تو کچھ دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(تذکرہ علماء اعظم گڑھ صفحہ ۲۶۳)

ف: چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے دارالعلوم میں تدریسی خدمت کیلئے دعوت دی مگر علالت کی وجہ سے نہیں جا سکے۔

آپ کی زیارت سے بار بار مشرف ہوا ہوں چونکہ آپ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ کی خدمت میں فتحپور تال نرجا جمعہ کے روز جاتے تھے حضرت ان کی ملاقات کے مشتاق رہتے، اور جب بھی جاتے تو ہماری بستی موضع ''کاری ساتھ'' ہوتے ہوئے ہمارے پھوپھا قاری امین اظہر صاحب اور والد سلطان احمد صاحب سے ملکر جاتے، گاہے ان کی خدمت کا بھی موقع ملتا، کبھی مولوی عمار احمد صاحب کے والد صاحب بھی ساتھ ہوتے۔ ماشاء اللہ آپ کے صاحبزادے مولانا قمر الدین صاحب باحیات ہیں ان سے ملاقات ہے اور ان کے صاحبزادے عزیزم مولانا عبداللہ بن قمر قاسمی سے تو خاص محبت و تعلق ہے۔ جو دار العلوم وقف دیوبند سے متعلق ہیں۔ **اللھم زدفزد** (مرتب)

وفات: بالآخر ۱۴۱۷ھ میں طویل علالت کے بعد اعظم گڑھ ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں قریب کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ اسی قبرستان میں بعد میں آپ کے معالج ڈاکٹر حفیظ اللہ مرحوم اور ڈاکٹر عبدالقادر خاں خلیفہ حضرت پھول پوری بھی دفن ہوئے۔ نور اللہ مراقدہم۔

حضرت مولانا عبدالرشید مسکین صاحب بھوپالؒ المتوفی ۱۳۷۵ھ

نام ونسب: نام عبدالرشید، لقب مسکین، والد کا نام فضل احمد ہے۔ آپ قدوائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے مورث اعلیٰ ”قاضی قدوہ“ عرب سے جب ہندوستان آئے تو اس وقت ان کو قاضی بنایا گیا اور عرصہ تک سلسلۂ قضاء ان کے خاندان میں رہا۔

ولادت: آپ کی ولادت ۱۳۰۲ھ میں اپنے وطن بڑا گاؤں ضلع بارہ بنکی یوپی میں ہوئی چونکہ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا اس لئے آپ کے بڑے بھائی عبدالرؤف نے اولاد کی طرح پرورش کی مولانا نے بھی ان کو والد کی طرح سمجھا ابتدائی تعلیم مڈل تک وطن میں حاصل کی۔

قیام بھوپال: آپ کے بھائی مع متعلقین تلاش معاش کے سلسلہ میں ۱۹۱۲ء میں بھوپال پہونچے اور ایک حیرت انگیز واقعہ نے اس قافلہ کو بھوپال کے مستقل سکونت کی دعوت دی جو مولانا نے راقم الحروف (سید عابد علی حسینی) کو سنایا جب بھوپال میں ٹھہرے تو گھر والوں کے وقتی انتظام کے لئے گھر والوں کا زیور لے کر فروخت کے لئے ایک بنئے کے پاس پہونچے زیور دیکر جب رقم وصول کرنا چاہی تو اس صراف نے کہا میاں صاحب اس زیور کے ساتھ تانبے کے کچھ سکے بھی

آپ کے حالات سید عابد علی وجدی حسینی قاضی شہر بھوپال نے اپنی تصنیف ”تاریخ قضاۃ ومفتیان بھوپال“ میں تحریر فرمایا ہے اسی سے یہ مضمون ماخوذ ہے۔ (مرتب)

دے دیجئے تا کہ بیاج نہ ہو جائے چونکہ اس وقت چاندی کے سکہ چلتے تھے مولانا اوران کے بھائی ایک غیر قوم کے انسان کی اس دینی حس سے بے حد متاثر ہوئے اور طے کرلیا کہ اس جگہ کو نہیں چھوڑنا چاہئے، جہاں کے بنئے بھی دینی مسئلہ جانتے ہیں، پھر پختہ عمری کے باوجود علوم دینی کی تکمیل کا جذبہ مولانا مسکین کے اندر پیدا ہوا، اور قاضی محمد یحییٰ صاحب کا دامن اس قدر مضبوطی سے پکڑا کہ آخر تک نہیں چھوڑا اور یہ علم کا مسافر آخر عمر تک طالب علم بنا رہا قاضی صاحب نے ان کی سادگی اور مسکینی کی وجہ سے مسکین کا لقب دیا جو نام سے زیادہ مشہور ہوا۔

علمی خدمات: بعد فراغت مدرسہ احمدیہ کے مدرس ہوئے، راقم الحروف (عابد حسینی) کو حروف شناسی اور عربی تعلیم کی ابتدائی تحصیل کی سعادت اسی بزرگوار ہستی سے حاصل ہوئی مولانا اپنی تدریسی زندگی میں طلبہ کی اخلاقی نگرانی اصلاح وتربیت اور نماز باجماعت کا اہتمام کرتے تھے وہ ایک مصلح امت تھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا خصوصی شعار تھا بھوپال میں جب مغربی لعنت سنیما کا آغاز ہوا تو اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس کے خلاف وعظ فرماتے بعض اوقات موافقین ومخالفین ایک دوسرے سے الجھ جاتے تب مولانا صلح کے علم بردار بن کر فریقین میں میل ملاپ کراتے اپنی اصلاحی کوششوں کے سلسلہ میں انجمن ہدایت الاسلام کی داغ بیل ڈالی اور غیر شرعی رسم ورواج کے خلاف پوسٹروں اور پمفلیٹوں کے ذریعہ اصلاح کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ ان کی مساعی جمیلہ سے بھوپال میں شب برأت کی آتشبازی کی رسم کا خاتمہ ہوا ایک موقع پر مشہور مناظر غازی محمود دھرم پال کو تقریر کے دوران ان کی غلطی پر

بے جھجھک ٹوک دیا وہ ششدر ہو کر رہ گیا کہ آج تک مجھ کو ٹوکنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی تھی مولانا مسکین بھوپال کے قدیم علماء میں اس خصوصی امتیاز کے مالک تھے کہ وہ عالم اسلام کے کوائف اور دینی تحریکوں یعنی خلافت وغیرہ سے دل چسپی رکھتے تھے اور مخلصین میں اسلامی ہمدردی کے جذبات کو تازہ فرماتے حکومت سعودیہ کے حمایت میں ایک رسالہ اثبات ملوکیت تحریر کیا تھا جب کہ قبور کی قبہ شکنی پر ملک میں ہیجان برپا ہوا تھا۔

اہل اللہ سے خصوصی ربط: حضرت شیخ الہندؒ کے مرید تھے، حضرت مولانا تھانویؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا عبدالشکور صاحبؒ سے خصوصی ربط وضبط اور خط وکتابت تھی جب حضرت مولانا الیاس کی تبلیغی دعوت کا ظہور ہوا تو اس کو بھوپال میں پھیلانے کے لئے بے تاب ہو گئے مولانا سے خط وکتابت فرمائی چنانچہ سرزمین بھوپال کو مولانا مرحوم کی بدولت یہ فخر حاصل ہوا کہ ۱۹۴۴ء میں موتی مسجد کے وسیع صحن میں بعد مغرب دعوتی سلسلہ کا افتتاح ہوا مولانا کی خوشی ومسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، مولانا اس کے امیر اور خاکسار (سید عابد علی) نائب امیر ہوا، بڑے زور وشور سے محلہ محلہ گھر گھر دعوت کا کام شروع ہوا بعض اوقات چند مخلصوں کے سوا مسجد کے در و دیوار مخاطب ہوتے بھوپال کی داعی اول کی حیثیت سے ان کا نامۂ اعمال روشن رہے گا۔ اسی طرح جب ۱۹۴۹ء میں ریاست انڈین یونین میں ضم ہوئی یہاں کے دینی ادارہ شکست کر دئے گئے عام مسلمانوں میں سراسیمگی پیدا ہوئی اس وقت جمیۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، مولانا اس خاکسار سے آخر وقت تک ان قومی وملی کاموں میں

مصروف رہنے کا حکم دیتے اور وضع داری و مستعدی کے ساتھ ہم جیسے غفلت شعاروں کو اداءفرض کے لئے جگاتے رہتے اسی طرح جامعہ احمدیہ سلیمانیہ کی شکستگی کے بعد تاج المساجد سے تدریسی تعلق آخر وقت تک رہا۔

نائب مفتی کی ذمہ داری: مولانا رضوان الدین کے انتقال کے بعد ان کو نائب مفتی بنایا گیا۔ جزئیات پر زبردست عبور تھا مجاہدات میں بھی عدیم النظیر تھے۔

عبادت: راحت و آرام کرنے کے بجائے بیٹھے لیٹے مسلسل نمازیں ادا کرتے رہتے برسوں ایک قرآن پاک کا ختم روزانہ کا معمول تھا جسم زار نزار چلت پھرت کا دارومدار روحانیت پر رہ گیا تھا گویا ایک روح تھی جو اس عالم مادی میں چمکتی پھرتی دکھائی دیتی تھی۔

وفات: بالآخر مسافر آخرت پر وطن اصلی کا شوق غالب آیا اور ایمان واخلاص علم ومعرفت ریاضت ومجاہدہ کا پیکر ۲ ؍اکتوبر ۱۹۵۷ء مطابق ۱۳۷۵ھ میں عالم جاودانی کی طرف سفر کر گیا، **انا للہ و انا الیہ راجعون**، غسل وغیرہ کی سعادت بندہ کے حصہ میں بھی آئی، ان کے انتقال سے مدرسہ مسجدیں وخانقاہیں مرثیہ خواں بن گئیں۔ نور اللہ مرقدہ (تاریخ قضاۃ ومفتیان بھوپال ص ۳۵۳)

مداح رسول جناب اقبال احمد سہیل[1] خان صاحب اعظمی متوفی ۱۳۷۵ھ

نام ونسب: والد نے آپکا نام ابو الظفر حامد رکھا لیکن دادا ان کو اقبال کہہ کر پکارتے تھے بعد میں یہی نام مشہور ہوا۔ آپکا تخلص سہیل ہے۔

پیدائش: سہیل ۱۱؍ربیع الآخر ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء کو ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں ''برھرہ'' (المعروف بڈھیریا) میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم: اس وقت کے دستور کے مطابق خوشحال زمیندار اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے اتالیق رکھتے تھے، جیسے علامہ شبلی نعمانی کی تعلیم کیلئے مولانا فاروق چریا کوٹی بلائے گئے تھے۔ اس لئے ایک جلیل القدر عالم اور عربی کے فاضل مولانا محمد شفیع مرحوم کی خدمات حاصل کی گئیں، مولانا شفیع صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، یہی مدرسہ الاصلاح سرائمیر کے بانی بھی ہیں اور یہی خلیل الرحمن اعظمی اور عبدالرحمن پرواز اصلاحی کے والد ماجد بھی ہیں، ان کی پرہیز گاری، عظمت علمی، ایثار وکرم، شرافت نفس اور پاکی طینت اعظم گڈھ کے اطراف میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔

تعلیم کی خصوصیت: سہیل کے والد فارسی کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے

---

[1] ''کلیات سہیل'' کے شروع میں آپ کے حالات لکھے گئے ہیں جو مرتب کردہ ہے مکرم عارف رفیع صاحب کا جسکو دار المصنفین اعظم گڈھ نے شائع کیا ہے نیز ماہنامہ'' الرشاد اعظم گڈھ بابت نومبر، دسمبر ۱۹۷۱ء میں بھی آپ کے محامد وفضائل درج ہیں۔ یہ تحریر ان دونوں مضامین سے ماخوذ ہے (مرتب)

روزانہ کا دستور تھا کہ سہیل فارسی میں خط لکھکر اپنے والد کو بغرض اصلاح دکھلاتے تاکید یہ تھی جو اصلاحیں دی جائیں انہیں مکمل یاد کیا جائے بعض اوقات اصلاح کی شکل میں مستقل مضامین ہوتے جنہیں حفظ کرنا پڑتا۔سعدی شیرازی کی گلستاں بوستاں اپنی والدہ ام کلثوم سے پڑھیں۔بارہ برس کی عمر تک سہیل فارسی میں لکھنے اور بولنے کی خاصی استعداد پیدا کر چکے تھے۔

سہیل کی شاعری: سہیل کے والد ایک بار اپنے مکان میں کچھ ملول و افسردہ بیٹھے ہوئے تھے سکوتِ شب نے دل شکستگی پر تازیانہ کیا، ایسے میں بے اختیار یہ مصرعہ ان کی زبان سے ادا ہوا

ع **ترحّم علیٰ حامدٍ یاالٰہیٰ**

سہیل قریب ہی تھے برجستہ یہ مصرعہ سن کر دوسرا مصرعہ ادا کردیا

ع طفیل جناب رسالت پناہیؐ

اس وقت سہیل کی عمر ۹ سال کے قریب تھی، وفورِ شفقت سے باپ نے بیٹے کو گلے لگالیا۔فطرت فیاض نے سہیل کو جو ادبی اور علمی ذوق بخشا تھا اس کی تربیت انکے والد کے دامنِ عاطفت میں ہوئی اور اسلام سے گہری شیفتگی وہ مولانا شفیع مرحوم کی بے پایاں نوازشوں کا اعجاز ہے۔

اعظم گڈھ میں جب وہ اپنے نانا کے پاس مقیم تھے، سہیل کو علامہ شبلی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا، سہیل اس وقت چودہ یا پندرہ برس کے تھے۔تاریخ کے اس معلم اول کے یہاں اس وقت دیوان حماسہ، شرح مسلم، بحر العلوم، عقد الفرید وغیرہ زیرِ درس تھیں، درس کے علاوہ بھی وہ استاد کی

بزم شرف میں حاضر رہتے۔

علی گڑھ کالج: ۱۹۱۴ء میں علی گڈھ بغرض تعلیم تشریف لے گئے ۱۹۱۸ء میں ایم اے او کالج سے ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے اپنے وطن واپس آ گئے۔

دورِ وکالت: علی گڈھ سے قانون کی سند حاصل کرنے کے بعد سہیل نے اعظم گڈھ میں وکالت شروع کی یہ سلسلہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔

آپ کے اخلاق: نوکروں کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے انکی ہر طرح دلجوئی کرتے، انہیں اپنے خاندان کا ایک جز سمجھتے تھے، دشمن بھی اگر گھر آ جاتا تو نہایت مروت و شرافت سے پیش آتے، پذیرائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ تصنع کا گذر نہ تھا، ان کی گفتگو ہمیشہ کیفِ تازہ سے معمور ہوتی تھی انکی معصومانہ اور شاعرانہ بیخودی وابستگی نے انکی شخصیت کو اور بھی پر کشش بنا دیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ رحمت دو عالم سے گہری شیفتگی سچی وارفتگی اور حقیقی وابستگی نے انکی ذات اور اخلاق میں وہی خصوصیات پیدا کر دی تھی جو ایک مومن کے خلوص وشان بے نیازی اور اعتماد سے عبارت ہے۔ ان کا یہ شعر خود انکی زندگی کا ترجمان ہے۔ ؎

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال　　　راحت، اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر

(کلیات سہیل ص ۱۱)

فضل وکمال: آپ کے فضل وکمال کو مولانا محمد نعیم صدیقی ندوی نے یوں تحریر کیا ہے جو ماہانہ ''الرشاد اعظم گڈھ'' ماہ نومبر، دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع

ہوا ہے اقبال احمد خاں سہیل بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کی طرح خطہ اعظم گڈھ کی مردم خیز خاک سے اٹھے اور اپنی غیر معمولی علمی و ادبی صلاحیتوں سے ایک عرصہ میں عالم پر چھا گئے چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ''حیاتِ شبلی'' کے مقدمہ میں دیار پورب میں علمی و ادبی سرگرمیوں کی ایک نہایت مؤثر اور جگمگاتی بلکہ چمچماتی تصویر کشی کی ہے، اس طویل ترین فاضلانہ مقدمہ میں حضرت سید صاحبؒ نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس دیار میں علم و ادب کی شمع روشن کرنے والے فضلاء کی علمی دینی اور سماجی خدمات کا نہایت معلومات افزا جائزہ لیا ہے۔

ف: ماشاء اللہ قابل دید ہے (مرتب)

اشعار: فی البدیہ شعر گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا آپ کے کلام کا ایک مجموعہ ''کلیاتِ سہیل'' کے نام سے دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہو چکا ہے اس میں آپ کی کہی ہوئی شہرہ آفاق نعت پاک ہے اس کو بطور نمونہ مختصراً پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں (مرتب)

موجِ کوثر

احمد مرسل، فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جسم مزکی، روح مصور، قلب مجلی نور مقطر

حسن سراپا خیر مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

طینت جس کی سب سے مطہر بعثت جس کی سب سے مؤخر

خلقت جس کی سب پہ مقدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جس کی ہر اول فوج سلیماں جسکے منادی موسیٰ عمراں

جس کے مبشر عیسیٰ مریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

برمغ فارس قدس کے رہباں کشور بابل وادی کنعاں

سب کی زباں پر مژدۂ مقدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کفر کی ظلمت جس نے مٹائی، دین کی دولت جس نے لٹائی

لہرایا توحید کا پرچم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

باغ جہاں کا حارس نامی جس نے مٹائی رسم غلامی

سنوارا پھر سے گلشن آدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بزم ملل تھی نظم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق کے لآلی

اس نے کئے سب آکے منظم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بچھڑے ہوئے گلے کو ملایا، نسل ووطن کا فرق مٹایا

رہ نہ گیا کچھ تفرقہ باہم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وہم کی ہر زنجیر کو توڑا، رشتہ ایک خدا سے جوڑا

شرک کی محفل کردی برھم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فرد وجماعت، امر واطاعت، کسب وقناعت، عفو وشجاعت

حل کئے جو اسرار تھے مبہم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ربط وتصادم، طوع وتحکم، فقر وتنعم، عدل وترحم

سب کے حدود بتائے باہم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حفظ مراتب، پاس اخوت، سعی وتوکل، رفق وفتوت

تلک حدود اللہ میں منتظم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الفت قربی، قطع علائق حب وطن اور حب خلائق

کر دیئے سب توحید میں مدغم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جس پہ تصدق وحی الہی کنکریاں دیں جس کی گواہی

جس کا تفوق سب پہ مسلم، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وفات: آپ کی وفات ۷/نومبر ۱۹۵۵ء مطابق ۱۳۷۵ھ میں ہوئی۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔نور اللہ مرقدہ۔(کلیات سہیل ص ۲۰)

حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی المتوفی ۱۳۷۵ھ

نام نسب : مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی کے والد کا نام عنایت الرحمٰن تھا۔ آپ کی ولادت کاندھلہ میں ہوئی۔

تعلیم : حفظ قرآن کے بعد مولانا اشفاق الرحمٰن نے کاندھلہ ہی میں مولانا عبداللہ خلیفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے فارسی وعربی کہ کتابیں پڑھیں اس کے بعد آپ کے بڑے بھائی حافظ فضل الرحمٰن آپ کو اپنے ساتھ بھوپال لے گئے جہاں آپ نے مدرسہ سلیمانیہ میں داخلہ لیا اور پیر ابو احمد سے چند کتابیں پڑھیں چونکہ بھوپال میں آپ کا دل نہیں لگا اس لئے واپس کاندھلہ تشریف لے آئے۔

خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں داخلہ: بھوپال سے جس چیز نے آپ کو کھینچا وہ غیبی طور سے اس آفتاب رشد وہدایت سے فیض یاب ہونا تھا جس کے وجود سے خانقاہ امدادیہ کی زینت تھی۔ آپ کی تعلیم وتربیت کا اصل دور یہیں سے شروع ہوتا ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس نے آپ کی زندگی پر نہایت ہی گہرا اثر ڈالا۔ بعد میں آپ کی زندگی مستقلاً اسی شمع ہدایت کے زیر اثر ہوکر رہ گئی۔ خانقاہ تھانہ بھون میں ہدایہ اور مشکوٰۃ کے درجہ تک کی تمام کتابیں حضرت تھانوی سے پڑھیں۔ پھر حضرت تھانوی ہی کی منشا سے مظاہر علوم سہارن پور میں دورہ حدیث میں داخلہ لے لیا۔ جہاں مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی سے حدیث پڑھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ مقام ''خرجو'' تشریف لے گئے اور کچھ زمانہ تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔اس کے بعد مدرسہ مظاہر علوم میں مفتی کے عہدہ پر فائز ہوئے کیونکہ ابتداء ہی میں آپ کو افتاء اور حدیث سے خاص شغف تھا۔آپ نے اپنے فرائض کونہایت خوبی سے انجام دیا۔

حضرت حکیم الامت سے تعلق: حضرت حکیم الامت سے تعلق پیدا ہونے کا اصلی سبب خانقاہ امدادیہ میں داخلہ ہے جہاں آپ کی ظاہری اور باطنی تربیت کا اصلی دور شروع ہوا یہیں آکر آپ کے علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل ہوئی۔کیونکہ آپ نے اکثر کتابیں حضرت تھانوی یا آپ کے زیر تربیت حضرات سے پڑھی تھیں جس سے تعلیمی دور ہی میں آپ کو حضرت تھانوی سے گہری عقیدت پیدا ہوگئی جس نے آپ کی زندگی کا نقشہ ہی بدل کرر کھ دیا۔اور یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ آپ کی نظر میں حضرت تھانوی سے تعلق اور آپ کے یہاں حاضری سے بڑھ کر کوئی مہتم بالشان چیز ہی نہیں تھی۔بار بار حضرت کی خدمت میں حاضر ہونا اور وہاں قیام فرمانا آپ کا شیوہ اور حضرت کی منشاء کے مطابق مراحل زندگی طے کرنا آپ کا خاصہ بن گیا آپ کے اس تعلق اور جذب وکیف علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی بناء پر حضرت تھانوی نے مجاز صحبت ہونے کا شرف بخشا۔آپ حضرت کی مجالس اور وعظ وتقریر میں شرکت فرمایا کرتے اور حضرت حکیم الامت کے مواعظ بھی قلم بند کرتے۔چنانچہ وعظ تاسیس البیان جو کاندھلہ میں اپنا مکان بنوانے پر افتتاح وبرکت کے لئے کرایا تھا۔وہ بھی آپ ہی کا ضبط کردہ ہے اور اسی طرح اعانتہ النافع بھی آپ نے ہی قلم بند کیا تھا۔آپ کو حضرت تھانوی سے

خصوصی تعلق تھا۔اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ آپ جس وقت حضرت تھانوی کا تذکرہ فرماتے تو آپ کے جذبات قابو میں نہ رہتے اور نہایت ہی آبدیدہ ہوکر جذب وکیف میں یہ شعر پڑھا کرتے۔ ؎

أولٰئک آبائی فجئنی بمثلهم اذا جمعتنایا جریر المجامع

حضرت تھانوی کے ایماء پر مدرسہ اشرفیہ دہلی تشریف لے گئے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد دہلی ہی کے مدرسہ عالیہ فتح پوری چلے آئے اور اپنی زندگی کے اٹھارہ سال اس مدرسہ میں گذارے۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کی دعوت پر بھوپال تشریف لے گئے جہاں جامعہ احمدیہ میں محدث اول کے عہدہ پر فائز ہوئے۔آپ نے ہدایت المسلمین بھوپال کے زیر اہتمام پوری ریاست کے تبلیغی دورے کئے۔فرمایا کرتے تھے کہ دہلی کے قیام میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے شدید اصرار کے باوجود میں اپنے درسی اور تصانیفی مشاغل پر تبلیغ کو ترجیح نہ دے سکا لیکن اب تجربے نے مجھے اس کی ہمنوائی پر مجبور کر دیا ہے۔ انجمن ہدایت المسلمین کے رسالہ ''نشان منزل'' کی ادارت بھی آپ ہی کے سپرد تھی۔اس میں آپ تفسیر قرآن کریم کے زیر عنوان مسلسل مضمون تحریر فرمایا کرتے تھے۔

اخلاق وعادات: آپ حضرت حکیم الامت کے مجاز صحبت اور خانقاہ امدادیہ کے خاص تربیت یافتہ تھے۔علم وفضل کے باوجود زہد واتقاء، دنیا سے بے رغبتی اور عمل پر استقامت آپ کو کمال درجہ میسر تھی۔تسلیم ورضا آپ کا شیوہ، صبر وشکر آپ کی صفت اور مہمان نوازی آپ کا خاصا تھا۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی کے ہر معاملہ میں ریا ونمود اور دکھلاوے سے بالکل پاک تھے۔فرمایا کرتے تھے کہ ہم

کو خانقاہ میں خود کو مٹانے ہی کی تعلیم دی گئی ہے۔ بازار سے سودا سلف وغیرہ آپ خود ہی لے آتے تھے علمی فخر ونخوت سے یکسر دور تھے۔ سچائی وراستی آپ کی فطرت تھی۔ کسی بات کی کتنی ہی مصلحت کیوں نہ سمجھائی جائے آپ کے منہ سے سچ کے علاوہ کوئی اور بات دھرائی نہ جاتی تھی مگر اس کے باوجود تواضع وانکسار کی یہ شان تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے بھی نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا کرتے تھے۔ چنانچہ دکاندار کاروبار میں برکت کیلئے آپ کو اپنی دکانوں میں بٹھالیا کرتے تھے تو آپ قصائی کے یہاں بیٹھنے سے بھی عار نہ کرتے۔ لباس کے معاملہ میں ابتداء میں نہایت خوش پوش تھے مگر آخر زندگی میں سادگی اختیار کرلی تھی۔

ف: سبحان اللہ! یہ تھی باوجود ظاہری وجاہت کے آپ کی سادگی اور باہم رواداری وغیرہ جو اس زمانہ میں عنقاء ہو رہی ہے۔ (مرتب)

تصانیف: آپ کی کل تصانیف بائیس کے لگ بھگ ہیں جن میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں۔ (۱) حاشیہ سنن نسائی (مطبع رحیمیہ دہلی) (۲) کشف المغطاء عن وجہ الموطاء (۳) مراۃ التفسیر (۴) احسن البیان فی مقدمہ القرآن (۵) تفسیر سورۂ فاتحہ (۶) تنبیہ الوسنان فی احکام رمضان۔

وفات: سندھ کی آب ہوا آپ کو راس نہ آئی ۱۹۵۵ء میں پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا لیکن کچھ عرصہ بعد صحتیاب ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں دو مرتبہ حملہ ہوا اور آخری حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ جنوری ۱۹۵۸ء مطابق ۱۳۷۵ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا ظفر عثمانی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی، **رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ**۔ (بزم اشرف کے چراغ صفحہ: ۱۳۷)

حضرت مولانا حکیم سید محمد فخر الدین جعفری زینبی الہ آبادیؒ المتوفی سنہ ۱۳۷ھ

نام ونسب: آپ کا اسم مبارک سید محمد فخر الدین اور والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد محی الدین ہے۔آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

تعلیم: سات سال کی عمر میں آپ حافظ قرآن ہو گئے تھے،۸۶ سال کی عمر پائی اور ہر سال رمضان شریف میں قرآن شریف سناتے تھے، درسی کتابیں اپنے والد بزرگوار اور جناب مولانا حکیم حافظ صوفی محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ سے پڑھی، اور علم طب بھی مولانا موصوف ہی سے حاصل کیا، اور تصوف کی تعلیم بھی مولانا ہی سے لی۔

بیعت وتعلیم: ظاہری علوم سے فراغت کے بعد پہلی بیعت حضرت مولانا صوفی محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ سے کی، آپ کے وصال کے بعد حضرت مولانا نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو خط لکھا کہ ہماری تعلیم باقی رہ گئی ہے، تکمیل کیلئے آپ کی خدمت میں آنا چاہتا ہوں، ابھی حضرت مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ مولانا گنگوہیؒ کا وصال ہوگیا۔ اس کا بہت صدمہ ہوا۔اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد افضل صاحب بخاریؒ سے بیعت کی اور تعلیم مکمل کی ۔آپ (حضرت مولانا افضل بخاریؒ) بخارا کے رہنے والے تھے، حج کیلئے تشریف لے گئے تو قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

مہاجر مکیؒ سے بیعت کی اور عرصہ دراز تک رہ کر تعلیم مکمل کی، اور خلافت سے بہرہ ور ہو کر بحکم مرشدؒ آگرہ میں مقیم ہو گئے، آپ کا مزار چھم چھم گلی آگرہ میں ہے۔

ارشادات: فرمایا کہ دین پر قائم رہو، تفریق نہ پیدا کرو، علمائے حق کے اختلاف کو موجبِ رحمت سمجھو، ہر کام میں اللہ پر بھروسہ رکھو، زنا سے بچو اس لئے کہ اس کی وجہ سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں، اچھے لوگوں کے پاس اٹھو بیٹھو، برے لوگوں کی صحبت سے بچو، سلام کی عادت ڈالو، اپنے بھائیوں کی ضرورت پر نظر رکھو، یہ مومن کی شان ہے، پڑوسیوں کے حقوق پر نگاہ رکھو، لوگوں کو بھلائی کی طرف نصیحت کرنے میں دریغ نہ کرو، تواضع کو لازم کرو، تفاخر بالانساب شانِ جاہلیت ہے، اس سے بچو، صبح وشام اپنے اعمال کا خیال رکھو، چار چیزیں بڑے فتنہ کی ہیں، عورت، مال، اولاد، جاہ، اس لئے ان سے بچنا چاہئے، قرآن شریف کی تلاوت لازم سمجھو، اور اس کے معنی پر غور کیا کرو۔

ف: مطلب یہ ہے کہ لفظی تلاوت کے ساتھ ساتھ قرآن کے معنی مطلب کے سمجھنے کا بھی اہتمام کرنا چاہئے تاکہ لطف دوبالا ہو جائے اور عمل کرنا آسان ہو جائے۔ (مرتب)

درود شریف اور کلمہ شریف کا ورد رکھو، اللہ کے سوا کسی سے خوف نہ کرو، سچ بولو، جھوٹ سے بچو، بیوی سے اچّھا برتاؤ کرو، اس کی بھول چوک کو معاف کرو، فروع کے اختلاف سے ایک دوسرے کو برا نہ کہو، شرع کی پابندی کے بغیر کوئی شخص نہ تو اللہ تک پہونچ سکتا ہے اور نہ مرتبہ ولایت حاصل کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شریعت کا پابند نہ ہو تو کیسے ہی اس سے خوارقِ عادات ظاہر ہوں وہ ولی

نہیں زندیق ہے، اللہ تعالیٰ تک رسائی بغیر اتباع رسول کے محال ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت رسول کے اتباع سے ہوتی ہے، حلال روزی حاصل کرو اس سے نورانیت حاصل ہوتی ہے، مشتبہات سے بچو اس سے دل میں کثافت پیدا ہوتی ہے، فرائض پورا کرنے کے بعد نوافل کی کثرت سے اللہ تعالیٰ کی قربت ڈھونڈھو۔

ف: غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ یہ جملہ ارشادات کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں جو قابل عمل ہیں، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین! (مرتب)

وفات: آپ کا وصال ۱۵، ۱۶/رجب ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۷/فروری ۱۹۵۷ء کی درمیانی شب میں ساڑھے تین بجے ہوا، آپ کا مزار محلہ ہمّت گنج، الہ آباد میں ہے۔ نوّر اللہ مرقدہ۔

ف: آپ کے حالات وارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہایت متبع سنت اور صاحب نسبت بزرگ تھے، حضرت مرشدی مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ ۱۹۵۱ء میں تین دن کے لئے بغرض علاج نزلہ الہ آباد تشریف لائے، حکیم صاحبؒ نے آپ کا نہایت اکرام فرمایا اور عقیدت کا اظہار فرمایا۔ حضرتؒ نے بھی تحسینی کلمات فرمائے اور باہم غایت درجہ مناسبت ہوگئی، یہاں تک کہ حضرت حکیم صاحبؒ بھی خانقاہ فتح پور تال نرجا ضلع مئو تشریف لے گئے تو حضرت مرشدیؒ نے بھی ان کی ضیافت کا بے حد اہتمام فرمایا، اور بہت مسرور ہوئے۔

اپنے علاج کے سلسلہ میں یہ حقیر بھی مہینوں کے لئے وطن سے الہ آباد آیا، حکیم صاحبؒ نے بڑی توجہ سے علاج فرمایا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ (مرتب)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانیؒ بہار المتوفی ۱۳۷۵ھ

سادات کا ایک کنبہ آج سے تقریباً دوصدی قبل عرب سے نکل کر ایران اور ایران سے گذر کر ہندوستان پہنچا اور صوبہ بہار کی زمین کو ان کے قدوم نے پُر بہار کر دیا، اسی قبیلہ کی ایک شاخ نے ضلع پٹنہ میں ایک مختصر سی بستی گیلان کے نام سے بسائی۔ یہ حضرات مولانا سید مناظر احسن صاحبؒ کے اجداد تھے۔ مولانا کے والد کا نام ابوالخیر ہے۔

ولادت: مولانا ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں بمقام گیلان پیدا ہوئے، وہ قصبۂ گیلانی جو برسہا برس گمنام رہا اور آج بھی وہاں ڈاکخانہ تک موجود نہیں، مولانا کا مولد و مدفن بن کر اب شہرت اور تاریخی حیثیت حاصل کر گیا ہے۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ لفظ گیلانی سے اسی وطنی نسبت کا اظہار فرماتے ہیں جس پر بہت سوں کو نسبت باطنی (یعنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبت) کے اظہار کا گمان ہوتا رہا جو صحیح نہ تھا۔ گو مولانا اس نسبت قادریہ کے بھی باضابطہ حاملین میں سے تھے۔

ابتدائی ماحول: مولانا نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں فارغ البالی اور علم پروری ہم آغوش تھی۔ آپ کے والد ماجد ابوالخیر صاحب تو زیادہ تر زمینداری میں مشغول رہے مگر مولانا ابونصر جو حقیقی چچا تھے علم و فضل اور شعر و سخن میں ایک مقام رکھتے تھے۔ اور جدامجد مولانا سید محمد احسنؒ تو اس اطراف کے جید عالم مشہور تھے۔

تعلیم: مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا ہی کے زیر نگرانی ہوئی۔ پھر وہ ٹونک بھیج

دیئے گئے جہاں تقریباً نو برس تک امام معقولات مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی کے حلقہ درس میں شامل رہے، اور استاذ کی نظر میں امتیازی مقام حاصل کرلیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اجمیر میں قیام فرمایا جہاں حکیم صاحب موصوف ہی کے شاگرد خاص مولانا معین الدین اجمیریؒ سے بھی مذاکراتی استفادہ فرمایا۔ اور ان کے کمال کے اس قدر معترف ہوئے کہ ان کو بھی اپنا استاذ ہی سمجھتے رہے۔

اس کے بعد منقولات کی تکمیل کے لئے مولانا دارالعلوم دیوبند پہنچے اور یہاں سے دوسال میں سند فراغت حاصل فرمائی، یہاں مولانا کو ان اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل رہا جن پر مدرسہ کی عظمت ختم تھی یعنی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ۔

قیام دیوبند: ٹونک کی طرح دارالعلوم دیوبند میں بھی مولانا اپنی ذہانت اور شوق مطالعہ کی وجہ سے اساتذہ کے منظور نظر بن گئے تھے اور جوں ہی فارغ التحصیل ہوئے مسند درس ان کو عطا کی گئی اور دارالعلوم دیوبند کے رسالہ ''القاسم'' کی ادارت بھی ان کے سپرد کردی گئی۔ جو وہاں کا بڑا اعزاز تھا۔ مولانا ان دونوں حیثیتوں میں کامیاب رہے اور اہل نظر سے داد حاصل کی۔

قیام حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ سے تعلق: دیوبند میں شاید دوبرس رہنے پائے تھے کہ جامعہ عثمانیہ نے ان کو اپنی طرف کھینچا جہاں پہنچ کر مولانا کے امتیازی جوہر خوب کھلے۔

بات یہ ہوئی کہ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کی روز افزوں وسعت و ترقی کے ساتھ شعبۂ دینیات میں ایک ٹھوس عالم کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی، اتفاقاً

۱۹۱۹ء میں مولانا گیلانیؒ کا حیدرآباد آنا ہوا اور یہاں علامہ حمید الدین فراہیؒ سے ان کی ملاقات ہوگئی، علامہ فراہیؒ اس جوہر قابل کو پہچان گئے، مولانا سے خواہش کی کہ وہ جامعہ میں لیکچرری کے لئے درخواست دیں، مگر دیوبند سے مولانا کو اس قدر انس ہوگیا تھا کہ اس مشورہ کی تکمیل میں ان کو تامل ہی رہا۔ لیکن جب خود حضرات دیوبند نے اس مشورہ کی تائید فرمائی تو مولانا کو اس کی تعمیل کرنی پڑی اور ۱۹۲۰ء میں بحیثیت لیکچرار دینیات جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوگئے، پھر کچھ عرصہ بعد شعبۂ دینیات میں منتقل کئے گئے اور ریڈر بنے، پروفیسر ہوئے اور بالآخر اس شعبہ کی صدارت کو کئی سال تک زینت بخش کر ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہوگئے۔ وہ شعبۂ دینیات کی جان تھے اور شعبۂ دینیات ان کا مجسم ارمان۔

مولانا گیلانیؒ کی دقت فکر، وسعت نظر، علوم دینی میں ان کا تبحر اور مسائل حاضرہ پر ان کی دسترس ان کی علمی دیانت اور مجتہدانہ جرأت، ان کی بے لوث خدمت اور جامعہ سے ان کی شیفتگی نے ان کی شخصیت کو ہر دور کے طلباء اور ہر شعبہ کے اساتذہ میں وہ عظمت ومحبوبیت عطا کردی تھی جو ان سے پہلے یا بعد کسی کو نہ مل سکی۔ ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"۔

واپسئ وطن: مولانا کی وقعت یونیورسٹی سینٹ کی نظروں میں ایسی تھی کہ وہ ضابطہ کی میعاد ختم کرنے پر بھی اپنی خدمت سے سبکدوش نہ ہوسکتے تھے اور خود مولانا کو بھی جامعہ اور حیدرآباد سے گوناگوں وجوہ کی بناء پر اس درجہ الفت ہوگئی تھی کہ سرکاری تعلق ختم ہونے پر بھی وہ حیدرآباد سے مفارقت کا ارادہ نہ رکھتے تھے لیکن سقوط حیدرآباد نے دنیا ہی بدل ڈالی۔ نیا اقتدار اپنی اندھی عصبیت میں شعبۂ

دینیات کو برداشت نہ کرسکا، اس شعبہ کو فوراً ختم کردیا گیا اور دنیا کی آنکھ میں خاک جھونکنے کے لئے نئے غیر دینی نصاب کے ساتھ ایک ''شعبۂ اسلامیات'' قائم کیا گیا، اس صورت حال سے حضرت الاستاذ کے دل پر جو گذری ہوگی اس کا اندازہ کسی غیر کو کیا ہوسکتا ہے لاچار ملازمت کے دن پورے ہوتے ہی افسردہ وشکستہ اپنے مولد گیلان لوٹ گئے مگر جو زخم دل نے کھایا تھا وہ ناسور بنتا چلا گیا۔

تصنیف وتحریر: مگر ان سارے کمالات کے ساتھ طبیعت پر جذب کا اثر کچھ اس درجہ غالب تھا کہ مولانا کی کوئی تحریر کامل طور پر مرتب ومربوط نہیں ملتی، علوم کا ورود اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ متعلق وغیر متعلق کا انتخاب ان کے لئے محال ہوجاتا تھا۔ وہ تیزی سے قلمرانی فرماتے، فقروں کی تقسیم اور عنوانات کے قیام کا ان کو مطلق شعور نہ رہتا تھا اور قلم روکنے سے پہلے ان کو خود اندازہ نہ ہوتا تھا کہ جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ مضمون ہوگا یا کتاب بن جائے گی۔ اور اس سب کے باوجود اپنے مسودات پر دوبارہ نظر کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہ فرماتے تھے۔ ان مسودوں کی ترتیب وتدوین ان کے معتمد علیہ شاگردوں اور عقید تمندوں کے سپرد ہوتی تھی یا ناشروں کے رحم وکرم پر منحصر رہتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ''النبی الخاتم'' اور ''الدین القیم'' کو مولانا کے شاگرد رشید ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (پروفیسر فارسی نظام کالج حیدرآباد دکن) نے مرتب فرمایا ہے۔ سورۂ کہف، تدوین حدیث اور مقالات احسانی کی ترتیب کا شرف مجھے ملا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور بعض کتابوں کی تنظیم ناشر کتب نے اپنے طور پر کروائی ہے۔ البتہ مولانا کے ہزارہا ہزار صفحات کے مسودوں کی تبییض ان کے ایک عزیز اور خاص شاگرد

جناب مخدوم محی الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) کیا کرتے تھے جن کی زودنویسی اور خوش نویسی حیرت انگیز ہے۔

مذکورہ صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات جدید طرز تصنیف کے معیار کو نہیں پہنچتیں مگر بقول عہد حاضر کے مشہور محقق محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ان تصانیف کو اسلوب نگارش اور ربط تحریر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ ان میں علوم وحقائق اور استنباط واستخراج مسائل کا کس قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

تصانیف: مولانا کی تصانیف میں سے یوں تو ہر تصنیف گراں بہا ہے مگر مندرجہ ذیل تصانیف کو امتیازی اہمیت حاصل ہے:

النبی الخاتم، الدین القیم، تدوین قرآن، تدویں حدیث، تدوین فقہ، اسلامی معاشیات، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور سورۂ کہف۔

مولانا کی کتابوں کے علاوہ ان کے بیسوں مضامین ہیں جو اہمیت وافادیت کے اعتبار سے ان کتابوں سے کسی طرح کم نہیں مثلاً الفرقان (لکھنؤ) کے مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر ہی میں جو مضامین آ گئے ہیں وہ مولانا کی جامعیت علمی اور ذہانت وفطانت کی انمٹ یادگاریں ہیں کاش مولانا کے کل مضامین فنی تقسیم کے ساتھ مرتب ہو جاتے۔

حسن خلق: مولانا کے فضائل اخلاق میں ''بے نفسی'' کو سب سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ دوسرے کی غلطی پر خود معافی خواہ ہو جانا، کوئی کھچنا چاہے تو خود بڑھ کر اس سے قریب ہو جانا اپنے تسامح کا علم ہونے پر علی الاعلان سراپا معذرت بن

جانا، اپنے دامن کو ہمیشہ طبقاتی ادارتی تعصب سے پاک وصاف رکھنا اور اظہار حق میں تحسین وملامت کی قطعاً پروانہ کرنا مولانا کا شعار تھا۔

اپنے معاصرین کی قدر کرنا اور ان کے کمال کا اعتراف کرنا وہ وصف عالی ہے جو ہر زمانہ میں نادر رہا ہے مگر مولانا میں یہ نادر وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اپنے چھوٹوں کے کمالات کو بھی بڑی فراخدلی سے تسلیم کرتے اور علانیہ اس کا اظہار فرماتے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے مولانا سے لڑکپن میں کچھ پڑھا تھا اس لئے وہ ہمیشہ مولانا کی ایسی ہی عزت وعظمت کرتے تھے جیسے ایک سعادتمند خصوصی شاگرد کو کرنی چاہئے لیکن چونکہ وہ ایک بڑے خطیب اور مخلص قائد ملت تھے اس لئے مولانا کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی کہ خود عوام کی سطح پر اتر کر ان کی عزت کریں۔ وہ مناظر اب تک آنکھوں میں پھر رہے ہیں جب استاذ شاگرد کی بھری محفلوں میں تعظیم وتکریم میں مسابقت کی کوشش ہوتی اور بالآخر استاذ گرامی کو اپنا منصب قبول ہی کرنا پڑتا۔

مولانا اپنے سارے علمی انہاک اور خشیت باطنی کے باوجود نہایت ظریف اور بذلہ سنج انسان تھے اور اسی لئے ہر محفل کو بآسانی اپنا لیتے اور سب کی نظروں میں محبوب بن جاتے تھے۔

مولانا کے قلب اطہر میں امت محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کی فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا ہو۔ وہ مشرباً پکے حنفی تھے مگر یہ ان کے جذبۂ شفقت کا اثر تھا کہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات

میں علمائے کرام کو عام مسلمانوں کے لئے سہولت ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہئے خواہ اس میں مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتدا کیوں نہ کرنی پڑے؟ کیونکہ فقہاء کے اجتہادات کو بہر حال منصوصات کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

طلباء پر مولانا کی شفقت، عہد قدیم کے اساتذہ کے لطف وکرم کی ایک زندہ یادگار تھی ان کی شفقت افادۂ علم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اپنے شاگردوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ جامعہ کے اندر اور باہر ہمیشہ پوری قوت صرف فرماتے رہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کے نجی معاملات مثلاً شادی بیاہ میں بھی مولانا کے پدرانہ الطاف برابر شامل رہتے تھے۔

مولانا کی تنخواہ معقول تھی، آخر زمانہ میں ہزار بارہ سو تک پہنچ گئی تھی لیکن اس کا خاصا حصہ اعزا و اقارب کی امداد اور عام دینی امور کی معاونت میں صرف فرماتے رہے۔ خود اپنی ذات کے لئے سادگی ہی پسند فرمالی تھی۔ ایک عاشق نبویؐ کا طرز اس کے سواء اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

حضرت گیلانی: ”مجذوب سالک تھے یعنی جذب الٰہی کی دولت پہلے ملی تھی پھر مقامات طے فرمائے تھے اور اس غرض کے لئے دوران طالب علمی ہی میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے دست گرفتہ ہو گئے تھے مگر علمی مشاغل کی وجہ سے اس وقت روحانی استفادہ کا موقع نہ مل سکا اور حضرت شیخ الہندؒ رحلت فرما گئے۔ اس کے بعد ہادی مطلق جل شانہ نے ان کو ایک چشتی بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی کی خدمت میں پہنچایا جو شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے حالاً و قالاً ترجمان تھے اور شیخ اکبرؒ ہی کی طرح حضرت ممدوح کا قال بھی

دراصل ع نبود بر سر آتش میسرم کہ نجوشم

والے حال ہی کا ایک اثر تھا اسی لئے ان کی صحبت میں بیٹھ کر اٹھنے والا ایمان وایقان اور رحمت حق کی امید سے مالا مال ہو جاتا تھا۔

حضرت گیلانیؒ کو یہاں مناسبت تامہ مل گئی اور شیخ عالی مقام کی توجہات خصوصی ان کے شامل حال رہیں یہاں تک کہ وہ اس بارگاہ فیض سے بھی خلافت کا شرف پا گئے اور تادم آخر اسی رنگ میں مسرور و مطمئن رہے۔

عجب بات یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ اور حضرت گیلانیؒ پر اس دار فانی سے رخصت ہوتے ہوئے مسرت اور شوق لقائے الٰہی کا ایک ہی حال طاری رہا جو شیخ و مرید کی یک رنگی کی کھلی دلیل ہے۔ اعلی اللہ مقامہما۔

منصب ارشاد سے گریز: فنائیت کے غلبہ اور طالبعلمانہ مذاق سے دلچسپی کی وجہ سے حضرت گیلانیؒ دوہری خلافت رکھنے اور خود صاحب معرفت ہونے کے مسند ارشاد کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ گریزاں ہی رہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا۔ ورنہ وہ اگر اس طرف توجہ فرماتے تو فیوض علمی کی طرح فیضان روحانی کا بھی دریا بہہ نکلتا مگر جو مقدر نہ تھا وہ ہو کیسے جاتا۔

عرض احسن

باستانہ نبوت کبری علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

ہر ایک سے ٹکرا کر، ہر شغل سے گھبرا کر ہر فعل سے شرما کر، ہر کام سے پچھتا کر

آمد بدرت بسنگر

اے خاتم پیغمبر، یا قاسم الکوثر اے سرور ہر سرور، اے رہبر ہر رہبر

اے آں کہ توئی افسر، ہر کہتر و ہر مہتر فی المبدأ والمحشر، اے ہستئ تو محور

للاکبر و الاصغر، اے طلعت تو مظہر للاول و الآخر، اے رحم جہاں پرور

آقائے کرم گستر، آمد بدرت بنگر

امروز چہ مہمانے، ناکارہ و نادانے آلودۂ عصیانے، آغشتہ دامانے

بازیچۂ شیطانے، از کردہ پشیمانے آمد بدرت بنگر نے مونس و نے یاور

نے ساز نہ سامانے، نے علم نہ عرفانے نے دین نہ ایمانے، نے فضل نہ احسانے

از خانہ ویرانے وز کلبۂ احزانے وز محبس وزندانے، ناشکری و کفرانے

آمد بدرت بنگر کالحائر و المضطر

با چاک گریبانے، با سینۂ بریانے با دیدۂ گریانے، با اشک فراوانے

با نالہ و افغانے، با شورش پنہانے با دانش حیرانے، با عقل پریشانے

در صورت عطشانے، در گریۂ درمانے خواہد ز تو فرمانے، پروانۂ غفرانے

آمد بدرت بنگر، البائس والمعتر

شاہا توبہ من منگر بر رحمت خود بنگر انصاف تو کن آخر غیر از تو مرا دیگر

من ناظر و الناصر، و الشافع و مستغفر

تو جوشش رحمانی، تو سایۂ یزدانی تو شاہد ربانی، تو جلوۂ سبحانی

تو مرکز اعیانی، تو جوہر فراوانی تو مبدءِ اکوانی، تو مقصد امکانی

تو مرجع و پایانی، تو جانی و جانانی ہم روحی و روحانی، تو زبدۂ انسانی

تو نیرِ فارانی تو درۂ عدنانی

تو مہبط قرآنی

تو خاتم ادیانی، ہاں دینی و ایمانی

اے آنکہ تو درمانی، ہر رنج و پریشانی بنگر کہ مسلمانی، تورانی و ایرانی

ہم ہندوی وافغانی، ہم مصری وسوڈانی از نزغۂ شیطانی، و ز جذبۂ حیوانی

و ز دانش نفسانی، وز شورش عمرانی یونانی و رومانی، افرنجی و برطانی

در سکرت و ہیمانی، در لطمۂ نادانی

در ورطۂ ظلمانی

در فتنہ و طغیانی، **فی البغی** و عدوانی

ہاں دست دعا بکشا از ذروۂ او ادنیٰ وز قبۂ **ما اوحیٰ**، اے مرضئ **تو ترضیٰ**

اے ملت تو بیضاء **فالليل لقد يغشىٰ** **والكفر قد استعلىٰ ذا امتک الضعفیٰ**

فی سيطرة الاعداء، ہاں **سهمک لايطفیٰ**

ورميتک لايخفیٰ

والله هو الاعلیٰ والحق فلا يُعلیٰ

سفر آخرت: وطن کی قصباتی غیر علمی زندگی مولانا کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی، بارہا تحریر فرمایا ہے اور جگہ جگہ اس کا اظہار کیا ہے کہ

''آج کل ایک گاؤں اور وہ بھی ایسے گاؤں میں آ کر مقیم ہو گیا ہوں کہ جہاں شریف مسلمانوں کے صرف دو خاندان باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے سواء عام ہنود اور عام طبقہ کے کچھ مسلمان ہیں۔ ان سے کسی قسم کی ایمانی گفتگو کا موقع ہی نہیں ملتا نہ سننے کا نہ سنانے کا''۔

وفات: تقریباً تین سالہ علالت کے بعد ۵ر جون ۱۹۵۶ء والی شب کو ہشاش بشاش بستر خواب پر لیٹ کر چپ چاپ ''دارالسرور'' کو سدھار گئے۔ اور اس خاموشی سے رخصت ہو گئے کہ پاس ہی چارپائی لگائے مولانا کے چہیتے بھائی مکارم احسن صاحب لیٹے تھے مگر وہ بھی اس کوچ کی آہٹ تک نہ پا سکے اور صبح جب انھوں نے اپنے محبوب بھائی کو جگانا چاہا تو خود اپنی غفلت پر کف افسوس مل کر رہ گئے۔ یعنی دار آخرت کی طرف رحلت فرما چکے تھے۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون۔**

اور اپنے وطن گیلان پٹنہ بہار میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ونور اللہ مرقدہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ المتوفی ۱۳۷۷ھ

خاندان: آپ نسباً حسینی سید ہیں، آپ کے والد محترم کا اسم گرامی سید حبیب اللہ صاحب ہے۔

ولادت وتعلیم وتعلم: حضرت مولانا مدنیؒ کی ولادت ۱۹/شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۶/اکتوبر ۱۸۷۹ء کو دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی شب میں بوقت ۱۱ بجے بمقام بانگر مئو ضلع اناؤ میں ہوئی، جہاں آپ کے والد ماجد مدرس تھے، آپ کے والد محترم حضرت مولانا فضل رحمن صاحب گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ مجاز تھے، اور نہایت ذاکر شاغل مستجاب الدعوات تھے۔

والدہ محترمہ بھی پابندِ شریعت، صابرہ اور قانعہ خاتون تھیں، سارے اوقات کو ذکر وشغل سے معمور رکھتی تھیں، آپ ۳/سال کے تھے کہ آپ کے والد محترم پنشن لے کر اپنے وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کی، ابتدائی تعلیم انہیں سے حاصل کی، تیرہ/۱۳ سال کے ہوئے تو آپ کو دارالعلوم دیوبند حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ہونہار شاگرد کو پہلی نظر میں پہچان لیا کہ جوہر قابل ہے، لہذا حضرت شیخؒ نے ابتدائی کتابیں بھی مولانا مدنیؒ کو خود پڑھائیں، اب ایک شوقین اور ذہین طالب علم کو شروع ہی سے لائق وفائق استاذ مل جائیں تو کیا کہیے، سونے پر سہاگہ، چنانچہ تعلیم کے درمیان آپ ہمیشہ اعلیٰ نمبرات سے پاس

ہوتے رہے۔

سنہ ۱۳۱۶ھ میں والد ماجد بقصد ہجرت مع اہل وعیال عازم حجاز ہوئے تو حضرت مولانا مدنیؒ کو بھی اپنی معیت سے سرفرازی بخشی اور اس قافلۂ مہاجرین نے حجاز مقدس پہونچ کر رحمۃ اللعالمین کے جوارِ رحمت کو اپنے لئے فلاحِ دارین کا ذریعہ سمجھا اور وہیں پر اقامت فرمائی، اس طرح حضرت مدنیؒ کو اللہ رب العزت نے فیض نبوت کے اکتساب اور مجد وشرف کی تحصیل کا موقع نصیب فرمایا۔

اس وقت مدینہ منورہ میں دو کتب خانے غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے، ایک کتب خانہ شیخ الاسلام، اور دوسرا محمودیہ، ان دونوں ہی کتب خانوں میں علاوہ مطبوعات کے مختلف علوم وفنون پر نایاب قلمی کتابیں بھی موجود تھیں جن سے حضرت مدنیؒ کو استفادہ کا پورا پورا موقع ملا، عسرت اور معیشت کی تنگی قیام مدینہ میں آپ کے شامل حال رہی اس لئے بیشتر ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کتابیں نقل کر کے اپنی معیشت کے سامان مہیا کئے مگر کوئی ذریعہ معاش اختیار نہ فرمایا جس سے خودداری اور عزتِ نفس کو ٹھیس لگے، مدینہ منورہ میں آپ کا خانوادہ تیرہ افراد پر مشتمل تھا مگر صرف بارہ چھٹانک مسور کے پانی پر یہ تمام حضرات قناعت فرماتے تھے۔

ادبیات کی تکمیل آپ نے مدینہ منورہ کے معمر ادیب مولانا الشیخ آفندی عبدالجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائی جو علمائے حجاز میں اپنی ادبیت کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

تکمیل علوم کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے مدینہ منورہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا، شوال ۱۳۱۸ھ تک آپ کا درس امتیازی حیثیت سے لیکن ابتدائی پیمانہ پر رہا، ۱۳۱۸ھ میں آپ ہندوستان تشریف لائے اور ماہ محرم ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ واپس حاضری ہوئی، اس کے بعد آپ کا حلقہ درس بہت وسیع ہوگیا، اور طلبہ کا ایک جم غفیر آپ کے پاس جمع ہوگیا، یہاں تک کہ مشرق وسطی، افریقہ، چین، الجزائر تک کے تشنگانِ علم کھنچے کھنچے آنے لگے۔

آپ کوئی سبق بغیر مطالعہ کے نہ پڑھاتے تھے، دن رات کے ۲۴ ر گھنٹوں میں صرف تین گھنٹہ آرام کرتے اور بقیہ درس وتدریس مطالعۂ کتب اور ذکر وشغل میں گزارتے، اس طرح آپ روزانہ چودہ پندرہ اسباق کا درس دیتے اس بناء پر حق تعالی نے حجاز میں وہ عزت ووجاہت عطا فرمائی کہ علمائے ہند کو تو کیا یمنی، شامی اور مدنی علماء کو بھی حاصل نہ تھی اور آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی، اور آپ کو ۲۴ ر سال کی عمر میں شیخ العرب والعجم کے معزز القاب سے سرفراز کیا گیا، اور آپ ان القاب سے مشہور ومعروف ہوگئے۔ (بیس بڑے مسلمان: ص ر ۴۶۶)

راہ سلوک وتزکیۂ نفس: ۱۸۹۸ء کو ماہ شعبان میں کتب درسیہ اور ان کے امتحان سے فراغت کے بعد مولانا مدنیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے اشارے پر اپنے برادر بزرگ مولانا محمد صدیق صاحبؒ کے ساتھ آستانہ عالیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں استدعاء بیعتِ طریقت پیش کی، حضرتؒ نے بلا تکلف درخواست قبول فرما کر سلاسل اربعہ میں بیعت فرمالیا، ان دنوں میں مولانا مدنیؒ

کے والد ماجد نے ہجرتِ حجاز کا قصد فرمالیا تھا اس لئے فرمایا: چونکہ تم مکہ معظمہ جارہے ہو لہٰذا وہاں حضرت مرشد حاجی امداد اللہ صاحبؒ موجود ہیں ان ہی سے ذکروشغل کی تلقین حاصل کرلینا، چنانچہ مکہ معظمہ پہونچ کر حسب ارشاد شیخ طریقت حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مولانا گنگوہیؒ کی تلقین وارشاد والی بات نیز ان کا سلام و پیام پہونچایا، حضرت حاجی صاحبؒ نے نہایت شفقت فرمائی، اور فرمایا: ہر روز صبح یہاں ہمارے پاس آکر یہ عمل کیا کرو چنانچہ مولانا مدنیؒ روز حاضر ہوتے رہے، اسی سال حج وعمرہ اور دیگر مناسک سے فارغ ہونے پر حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اگرچہ وقت عام ملاقات کا نہ تھا تاہم باریاب ہوئے، باوجود ضعف ونقاہت کے بیٹھ گئے اور بغایت شفقت سے مولانا مدنیؒ اور ان کے برادر خورد مولانا سید احمد صاحبؒ کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، اس پر مولانا اور ان کے بھائی خاموش رہے، فرمایا: کہو میں نے قبول کیا، چنانچہ دونوں بھائیوں نے حسب ارشاد یہ کلمات کہے، اسی سال ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۱۷ھ میں حضرت حاجی صاحبؒ کا انتقال ہوگیا، رحمہ اللہ تعالیٰ، اس کے بعد حضرت مولانا گنگوہیؒ سے برابر اصلاحی رابطہ رہا، آخر آپ نے اپنا خلیفہ ومجاز قرار دیا۔ **فهنيألهم**۔

اسارت مالٹا اور حضرت شیخ الہندؒ کی معیت: حضرت شیخ الہندؒ کے تذکرہ میں بیان ہوچکا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کو انگریزوں کے کہنے پر شریف حسین کے ذریعہ مکہ معظمہ میں مع ان کے رفقاء حضرت مدنیؒ، مولانا عزیرگل اور دیگر ساتھیوں کے گرفتار کرکے جزیرہ مالٹا بھیج دیا گیا، یہ حضرات وہاں تقریباً

ساڑھے چارسال مقید رہے ، ان حضرات کے تقویٰ وزہد اورصبرواستقامت کا دوسرے قیدیوں پر بہت اچھا اثر پڑا،حضرت مدنیؒ نے بزمانۂ اسارت قرآن پاک حفظ کیا اور حضرت شیخ کے ساتھ شب و روز گذار کر کندن بن گئے،اور حضرت شیخ الہندؒ نے اس دوران قرآن پاک کا ترجمہ مکمل کرلیا، اورسورۂ مائدہ تک حواشی تحریر فرمائے، چنانچہ یہ ترجمۂ قرآن پاک اپنی افادی حیثیت سے اپنی مثل آپ ہے ،شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ان حضرات کو سیاسی ودرسی مشاغل سے دور کرکے کہیں دور بھیج دیا جائے تاکہ ترجمہ قرآن پاک مکمل ہوسکے کہ جس سے مسلمان عالم تاقیامت مستفید ہوتے رہیں۔

بالآخر ۲۲؍جمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہندؒ مع اپنے خدام کے مالٹا سے رہا کئے گئے ،یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں تحریک خلافت اور استخلاص وطن (یعنی تحریک آزادیٔ ملک) شروع ہوچکی تھی، چنانچہ آپ نے اس میں جہد ومشقت کے ساتھ علی الاعلان حصہ لیا، آخر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوگیا،مگر افسوس کہ اس ظاہری آزادی کے باوجود ہمارا ملک انگریزوں کی خاص صفت نفاق وفساد اور مکروخداع کے ناسور سے تاہنوز آزاد نہ ہوسکا جس کی وجہ سے اب تک امن وسکون سے محروم ہے۔

فالعیاذ باللہ والیہ المشتکی۔

صدارت دارالعلوم دیوبند: آپ شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں دارالعلوم کی صدارت تدریس کے منصب پر فائز ہوئے جن کے علم وفضل اور اخلاق فاضلہ سے ہزاروں تشنگان علوم نے ظاہری وباطنی تکمیل کرکے اپنی علمی

وروحانی پیاس بجھائی، آپ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء تک اس عہدہ پرفائز رہے، اس دوران میں آپ سے ۴۴۸۳ طلبہ نے بخاری وترمذی پڑھ کرفراغت حاصل کی۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔

حضرت مدنیؒ کے مکارم اخلاق: حضرت مدنیؒ کی زندگی کا یہ باب بہت وسیع ہے، اس سلسلہ میں آپ کے فضائل ومحاسن کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں، حضرت مدنیؒ نے لمبی عمر پائی اور اتنے لمبے عرصہ میں کروڑوں انسانوں سے ملاقات ہوئی مگر ہرکہ ومہ آپ کے حسن اخلاق کا مداح نظر آتا ہے اور ہرکوئی حضرت کی تواضع، انکساری اور حسن خلق کا نیا قصہ سناتا ہے، اور اگران تمام واقعات کوجمع کیا جائے جومختلف لوگ بیان کرتے ہیں توصرف ان کوقلم بند کرنے کیلئے ایک دفتر چاہیئے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا تاثر ملاحظہ فرمائیے:

فضل وکمال: ’’شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے فضل وکمال، مرتبہ ومقام پرگفتگو تووہ کرے جوخود بھی کچھ ہو، مجھے ذاتی تجربہ اورعینی مشاہدہ تومولانا کے ایک ہی کمال اورایک ہی کرامت کا ہے اوروہ آپ کی بےنفسی، سادگی، تواضع اورانکساری اورخدمتِ خلق کا عشق ہے، کہتا ہوں اورگویا خانہ شہادت میں کھڑا ہوا بیان دے رہا ہوں کہ وہ بہترین دوست ہیں، بہترین رفیق سفرہیں، مہمان ہوں توآپ کی میزبانی میں اپنے معمولات کوترک کردیں گے، روپیہ پیسہ کی ضرورت پیش آئے توخود قرضدار ہوجائیں گے لیکن آپ کی حاجت ضرور پوری کردیں گے، خدانخواستہ بیمار پڑجائے توتیمارداری میں دن

رات ایک کر دیں گے، نوکری کی ضرورت پیش آئے، کوئی مقدمہ کھڑا ہو، کسی امتحان میں بیٹھ جائیے تو سفارش ناموں میں اور عملی دوڑ دھوپ میں نہ اپنے مرتبہ کا لحاظ کریں گے نہ اپنی صحت کا اور نہ خرچ کا، جس طرح بھی ہوگا آپ کا کام نکالنے پر تل جائیں گے، اپنے بزرگوں کے ساتھ جو معاملہ بھی رکھتے ہوں، اپنے خوردوں، شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ یہ روش رکھتے ہیں کہ خادم کو مخدوم بنا کر ہی چھوڑتے ہیں۔ حالی کے شعر کے معنیٰ اب جا کر روشن ہوئے ہیں ؎

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا　　خاکساری اپنی کام آئی

بہت سنا ہے کہ یہ شان محمود حسن شیخ الہندؒ دیوبندی کی تھی، اگر یہ صحیح ہے تو جانشینی کا حق ان سے زائد کسی کو نہیں پہونچتا، فرصت میسر آتی تو متن کی شرح بھی اپنے قلم سے کرتا اور پھر نوبت شرح پر حواشی کی آتی اور ایک مختصر المعانی پر کئی کئی مفصل اور مطول تیار ہو جاتے'' ؎

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ف: سبحان اللہ! مولانا دریابادیؒ نے کیا ہی خوب اور جامع تاثر ارقام فرمایا ہے، جو حضرت مدنیؒ کے اخلاق اور مکارم مدنیہ کے سلسلہ میں مولانا دریابادی کی صحیح معرفت اور کامل عقیدت پر دال ہے۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ (مرتب)

خوش نصیبی: ہماری خوش نصیبی ہے حضرت مولانا مدنیؒ الہ آباد کے قصبہ چائل میں مسلسل کئی سال ۱۹۵۶ء تک مخدومی حاجی محمد شفیع صاحبؒ کی دعوت پر تشریف لاتے رہے اور اپنے مواعظ و مجالس سے اہل الہ آباد کو مستفیض فرماتے رہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ حضرت مدنیؒ کے اقوال واحوال سے ہم لوگوں کو عبرت ونصیحت حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین (مرتب)

مکتوبات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی تالیف لطیف مسمی بہ ''شریعت وطریقت'' سے حضرت مولانا مدنیؒ کے مکتوبات عالیہ کے کچھ اقتباسات نقل کئے جائیں، امید ہے کہ سالکین کرام ان کو شمع رہنما پائیں گے۔وباللہ التوفیق۔

ایک طویل مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہوا تباع سنت اور سنن نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تابعداری ہمیشہ ملحوظ قلب وبصر رکھئے، ذکر میں غفلت مت کیجئے، اپنی غفلات اور معاصی پر ہمیشہ تائب ومستغفر رہیئے، عمر گرانمایہ کو ضائع مت کیجئے۔

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع ست جز سرِ عشق ہر چہ بخوانی بطالت ست

ترجمہ: دوست کی یاد کے سوا جو کچھ کرے سب بیکار ہے، عشق کے اسرار کے علاوہ جو کچھ پڑھے بیکار ہے۔(مکتوبات شیخ الاسلام:۳/۶۹،۷۰ ۲)

سعدی بشو لوحِ دل از نقش غیر حق علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت ست

ترجمہ: اے سعدی! غیر حق کو دل کی تختی سے دھو دے جو علم اللہ کا راستہ نہ دکھائے جہالت ہے۔

اس سے اگلے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ بتلائے ہوئے اذکار چھوڑ بیٹھے ہیں، کبھی جوش

آیا مہینہ دو مہینہ کیا پھر چھوڑ بیٹھے، کیا واقعہ نہیں ہے کہ آپ پنجگانہ نمازِ جماعت کی پابندی نہیں کرتے، کیا یہ واقعہ نہیں کہ نماز فرض کو آپ قضا کر دیتے ہیں، صبح کو اس قدر سوئے کہ آفتاب نکل آئے، کیا اس قسم کے واقعات سے آپ کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کے دل پر صدمہ نہ ہوگا، بہرحال آپ کو لازم ہے کہ اپنی اصلاح کریں، اتباعِ شریعت اور احیائے سنت میں کوشاں ہوں، جب آپ پر مصائب کی بوچھار ہوتی ہے تو متنبہ ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ فارغ البالی عطا فرماتا ہے تو بالکل بے فکر بن جاتے ہیں، جس قدر بھی ممکن ہو اپنے کو ذکر کا عادی بنائیے۔

(مکتوب: ۲ر ۷۰)

ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

جو احوال جناب نے تحریر فرمائے ہیں اطمینان بخش اور امید افزا ہیں، (الاستقامۃ فوق الکرامۃ) خواب یا انوار یا الہامات وغیرہ صرف دل بڑھانے کے لئے سالک کو پیش کئے جاتے ہیں، جیسے بچے کو لبھانے کے لئے گھنگھنا دے دیا جاتا ہے، اکابر کا مقولہ ہے **"تلک خیالات تربی بھا اطفال الطریقۃ"** یعنی یہ سب خیالات ہیں جن سے سلوک کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔ عبادت، ذکر پر مداومت، اتباع سنت اور شریعت پر قیام یہی امور ہیں جن کے ہم مکلف ہیں اور جن پر استقلال سے عمل پیرا ہونا اور درجات احسان کا حاصل ہونا کمال ایمانی ہے خوف خداوندی اور رجاء دونوں ایمان کے کمال کی نشانیاں ہیں، بکاء اور گریہ کا غلبہ چشتیہ نسبت کا ظہور ہے۔ اللھم زد فزد۔

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم: ص ر ۱۶۸ مکتوب: ص ر ۵۷، شریعت وطریقت: ص ر ۱۱۰)

نیز ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ: غرض کہ یہ عالم امتحان کی جگہ ہے اور طرح طرح سے امتحانات کا سلسلہ جاری ہے، اس میں پاس ہونے کی فکر ہونی چاہیئے، اور بجز مالک حقیقی دائم و باقی کسی چیز اور کسی شخص سے دل نہ لگانا چاہیئے، جو کام کیجئے حسنِ نیت کے ذریعے سے عبادت بنا لیجئے، **اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتُ** حتیٰ کہ سونا کھانا، پینا اور حاجات بشریہ کا بجالانا سب عبادت ہوسکتا ہے، ذریعہ اور وسیلۂ عبادت یقیناً عبادت ہے، ذکر اور فکر سے مقصد اصلی رضائے محبوب حقیقی ہے، کسی لذت کا حاصل ہونا قلب کا صاف ہونا، کشف و کرامات کا مل جانا، انوار و برکات کا محسوس ہونا، فنا و بقا، قطبیت و غوثیت، سب کے سب غیر مقصود ہیں، ان کی طرف توجہ اور قصد خطرناک چیزیں ہیں ۔

فراق و وصل چہ خواہی رضائے دوست طلب

کہ حیف باشد ازو غیر ازیں تمنائے

ترجمہ: فراق و وصل کیا ڈھونڈھتا ہے محبوب کی رضامندی ڈھونڈھ کہ محبوب سے محبوب کے سوا کی تمنا بڑے افسوس کی بات ہے ۔

مذکورہ بالا اشیاء وسائل و ذرائع ہیں، مقصد اصلی صرف رضائے الٰہی ہے، بندہ کا فریضہ آداب عبودیت بجالانا ہے، اس میں جدو جہد جاری رکھئے اور اخلاص وللّٰہیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھئے ۔ (مکتوبات شیخ الاسلام: ص ر ۱۲۹)

ف: اس کے علاوہ بھی حضرت الشیخ نے مکتوبات کے اقتباسات نقل فرمائے ہیں، جن میں شریعت و طریقت پر چلنے اور ذکر و فکر اور نسبت احسان کی تحصیل کی طرف ترغیب ہے جو سالکین راہ کے لئے بیحد مفید ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو پڑھنے

اور عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (مرتب)

اب "معارف وحقائق" مؤلفہ مولانا سید رشید الدین صاحبؒ (جو مکتوبات شیخ الاسلام کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے) چند مضامین نقل کرتے ہیں:-

بیعت توبہ اور بیعت ارشاد میں فرق: بیعت توبہ اور بیعت ارشاد میں فرق ہے، بیعت توبہ یہ ہے کہ کسی شخص کو الفاظ توبہ تلقین کرائے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ الفاظ ایمان کہلوائے جائیں اور اس کو اتباع شریعت کی تاکید کی جائے، یہ توبہ کرانا ہر شخص کیلئے صحیح ہے جو عالم باعمل ہو، خواہ اس نے کسی مجاز طریقت کے ہاتھ پر بیعت کی ہو یا نہیں، خواہ اس نے سلوکِ تصوف طے کیا ہو یا نہیں، خواہ اس کو مرشد سے اجازت ہو یا نہیں۔

بیعت ارشاد اس شخص کا حق ہے جس نے کسی مجاز طریقت کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد منازل سلوک طے کر کے ملکۂ یادداشت حاصل کرلیا ہو اور مجاز بیعت ہوگیا ہو۔ (معارف وحقائق: ص/۱۳۳)

ذکر پر مداومت کیجئے چاہے جی لگے یا نہ لگے: آپ کا ذکر کرنا باعثِ شکر ہے خواہ جی لگے، حضور قلبی ہو یا نہ ہو۔ **انا مع العبد ماتحرکت بی شفتاہ** حدیث قدسی کے الفاظ ہیں، اگر قلب ذاکر نہ ہو تو جسم اور زبان تو ذاکر ہیں، اگرچہ ذکر لسانی ذکر قلبی کے سامنے نہایت کمزور نسبت رکھتا ہے جیسے کہ ذکر قلبی ذکر روحی کے سامنے کمزور ہے مگر تاہم اس ذکر لسانی کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے، بسا غنیمت ہے، بہت سے اشخاص اس سے بھی محروم ہیں، اگرچہ ضروری ہے کہ حتی الوسع کوشش کی جائے کہ حضور قلب ہو، سیلاب میں دریا کا پانی بہتا ہے اور اس پر جھاگ

اور کوڑا کرکٹ ہوتا ہے تاہم پانی اپنے فوائد زمینوں ،کاشت کے رقبوں اور حیوانات وغیرہ کو پہنچاتا رہتا ہے، خدا کی اس نعمت کا کفران نہ ہونا چاہئے،ازدیاد کی فکر کرنی چاہئے۔(معارف وحقائق:ص ر ۱۴۰)

ابتداء میں سالک کے لئے تنہائی ضروری ہے: سالک کے لئے بالخصوص ابتدائی ایام میں تنہائی نہایت ضروری ہے تمام لوگوں سے دور رہنا ہی مفید تر ہے ،قرب وجوار میں کسی کمرے کا انتظام کر لیجئے ،حالت بحمداللہ امید افزا ہے مگر ذکر کی مداومت شرط ہے۔

تضرع وزاری مطلوب ہے: بارگاہ الٰہی میں جس قدر رونا اور سوز وگداز ہو بہتر ہے، مایوسی نہ ہونی چاہئے،نسبت چشتیہ کا ظہور ہے،اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، اس کا خیال رکھئے کہ بجز محبوب حقیقی کچھ مقصود نہیں ،احوال وکیفیات ذرائع ہیں مقاصد نہیں ہیں۔(معارف وحقائق:ص ر ۱۰۷)

ملفوظات

(۱) فرمایا: سالک کو جو واقعات پیش آئیں ان کو نامحرموں سے ہرگز ظاہر نہ کرنا چاہئے ،اپنے شیخ سے ظاہر کرے یا ایسے شخص سے جو طریقت کا ہمراز ہو اور سالک کا ہمدرد ہو، اور بس، یہ چیز سالک کے لئے ضرر رساں ہوتی ہے اور بسااوقات فیض ربانی کے انقطاع بلکہ کبھی کبھی سلب کا باعث بن جاتی ہے۔

(۲) فرمایا: محبوب حقیقی ہر چیز کو جانتا ہے، ہر چیز کو دیکھتا ہے، ہر چیز کو سنتا ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، وہ شدید الغیرت ہے اس کے سامنے بجز خشوع وخضوع اور رازہائے سربستہ کے اخفاء اور اظہار عبودیت کاملہ اور اتباع سید العشاق علیہ السلام

کے کوئی چیز کارآمد نہیں ہے۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْلِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا۔ (کھف)

سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مَاشَغَلَكَ عَنِ الْحَقِّ فَهُوَ طَاغُوْتٌ۔ یعنی جو چیز تم کو حق سے باز رکھے وہ تمہارا طاغوت ہے۔ (بلیس بڑے مسلمان)

(۳) فرمایا: اگر آپ کو اپنی دعاؤں اور اذکار میں نقصانات نظر آرہے ہیں تو ان کو مکمل کرنے کی جدوجہد رکھنی چاہئے مگر واقعہ یہی ہے کہ ہم کتنی ہی کامل عبادت کریں شان الٰہی کے سامنے وہ نہایت حقیر اور ناقص ہے۔

جب کہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

وَمَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ۔

اے اللہ! ہم نے آپ کی عبادت کا حق ادا نہ کیا اور نہ آپ کی کما حقہ معرفت حاصل کی۔

تو ہم کس قطار میں ہیں؟ اس لئے اپنے آپ کو ہمیشہ ذلیل وخوار سمجھنا اور اپنے اعمال واخلاق کو ناقص سمجھنا ضروری ہے، اور اس پر ناز کرنا اور کامل سمجھنا خوفناک ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پاک ہے:

لَنْ يَّنْجُوَ اَحَدُكُمْ بِعَمَلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَهُ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ۔ (او کما قال علیہ السلام)

یعنی کوئی شخص اپنے عمل سے نجات نہیں پا سکتا جب تک کہ اللہ تعالی ہی اپنی رحمت میں نہ چھپالے۔

ف : سبحان اللہ! کیا ہی خوب صوفیانہ تعلیم وتربیت ہے، یہی اصل طریق بلکہ روح دین ہے، اور یہی درحقیقت معرفت نفس ہے جس پر معرفت حق مرتب ہوتی ہے چنانچہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: **مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ عَرَفَ رَبَّهٗ** یعنی جس نے اپنے نفس کو (ضعف وذلت وجہالت سے) پہچان لیا اس نے اپنے رب کو (قوت وعلم اور عزت سے) پہچان لیا۔ (مرتب)

(۴) فرمایا: ہم عَبِید ہیں (یعنی بندے ہیں) ہمارا کام عبودیت (بندگی) اور امتثال حکم ہے، عاجزی اور نیازمندی ہے، خواہ ہمت افزائی اور اجابت ہو یا نہ ہو۔ ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم   بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

ترجمہ: یعنی اپنے محبوب کو پائیں یا نہ پائیں طلب وتلاش تو جاری رکھیں گے اور وہ ہماری بات سنے یا نہ سنے ہم اپنی بات تو کرتے ہی رہیں گے۔

ف : بندے کا کام عجز ونیاز ہی ہے نہ کہ فخر وناز، اس لئے اپنی سرحد میں رہنا چاہئے ورنہ سوائے ضلالت وہلاکت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ (مرتب)

(۵) فرمایا: اثنائے ذکر میں ہر پندرہ یا بیس یا پچیس مرتبہ کے بعد "سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کہنا چاہئے کہ اللہ تعالی ہمارے محبوب حقیقی ہیں، اس حد تک پہونچنے کے لئے وسیلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اس لئے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے لئے درود شریف بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں۔

ف :- ماشاء اللہ! کیا خوب بات ارشاد فرمائی کہ دراصل اللہ ہی مقصود ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسیلہ اور طریق ہیں، مگر افسوس کہ اب تو مشائخ تک کو مقصود بنالیا

جاتا ہے یعنی ان کے اقوال کے سامنے شریعت کے احکام تک کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ (مرتب)

(۶) فرمایا: واقعہ یہ ہے کہ حضرات چشتیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی خاص نسبت گریہ وبکا، تڑپ و بے قراری، عشق وولولہ ہے جب اس کی نسبت کا کسی پر اثر پڑتا ہے تو بے اختیار گریہ کا غلبہ ہوتا ہے اور جس قدر زیادہ ہوتا ہے وہی مفید سمجھا جاتا ہے۔

ف: چنانچہ حضور ﷺ نے رونے والی آنکھوں کی دعا فرمائی ہے **اللھم ارزقنی عینین ھطالتین الخ**۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی آنکھیں او چشتیہ کی اس نسبت خاص سے بہرہ ور فرما کر اپنے خواص میں سے بنائیں۔ آمین (مرتب)

(۷) فرمایا: وساوس گذرتے ہیں، آپ اپنا کام جاری رکھیں، سیلاب چلتا ہے اور اس پر خس وخاشاک چھائے رہتے ہیں اس لئے پروا نہ کیجئے۔ ہاں نماز میں یہ کوشش کیجئے کہ جو کچھ زبان سے پڑھا جارہا ہے وہ کیا ہے؟ اس کے مطابق دھیان رکھتے ہوئے جناب باری عز اسمہ کو سامنے سننے والا دیکھنے والا تصور کیجئے۔ (ص ۵۲۹)

ف: سبحان اللہ! وسوسہ اور نماز دونوں ہی کے متعلق نہایت کارآمد نصیحت فرمائی، فجزاہم اللہ احسن الجزاء (مرتب)

(۸) فرمایا: متصوفین پر کنٹرول کرنا اور ان کو قیود شرعیہ اور کتاب وسنت کی حدود میں رکھنا ازبس ضروری ہے ورنہ عام مسلمانوں میں سخت گمراہی اور الحاد کے پھیل جانے کا قوی امکان ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ جوشِ عشق خداوندی اور غلبۂ سکر میں صوفیہ سے ایسے افعال واقوال صادر ہوجاتے ہیں جن کی شریعت کے

احاطہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی تو انتہائی فتنوں کا سامان ہوگا، علماء کا فریضہ ہے کہ ظاہری شریعت کی مکمل حفاظت کریں۔ (ص ر ۵۳۰)

ف: سبحان اللہ! حضرت مدنیؒ کا کیا ہی خوب مجاہدانہ کلام ہے جو بغیر خوف **لَوْمَةَ لَائِم** ارشاد فرمایا، ایسا ہی امیر الروایات میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی ارشاد فرمایا ہے، اس لئے صوفیہ کو بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ ان کے کسی قول و فعل یا حال سے کسی بدعت کا شیوع نہ ہو۔ (مرتب)

(۹) فرمایا: دعا میں دل لگنا ضروری ہے، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "**اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ الدُّعَاءَ بِقَلْبٍ لَاهٍ**" یعنی اللہ تعالیٰ غافل قلب سے نکلی ہوئی دعا کو قبول نہیں فرماتے۔ لہٰذا دعا میں دل لگانا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ مظلوم (اسی طرح والدین) کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے (اسی طرح بد دعا بھی) کیوں کہ وہ خلوصِ دل سے نکلتی ہے، تاہم اگر دل نہ لگے تب بھی فائدے سے خالی نہیں، لیکن کوشش کرنا ضروری ہے۔

(۱۰) فرمایا: ائمہ اہل سنت والجماعت مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خطاء اجتہادی قرار دیتے ہیں، اگر حضرت آدم علیہ السلام کے ارتکاب اکل شجرہ (درخت کھانے) کو ارشاد باری تعالیٰ **فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا** ذنب خفیف اور غیر موجب مواخذہ اور داخل فی العصمت قرار دیتا ہے تو حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مشاجرات کو ان کے مناقب کی آیات اور احادیث صحیحہ کیوں نہ ہلکی اور غیر قابل مواخذہ اور داخل فی المحفوظیت قرار دیں گی؟ اور کیوں نہ ان کے دامن کو خطائے اجتہادی قرار دے کر منزّہ و پاک سمجھا جائے گا۔

ف : ماشاءاللہ تعالیٰ! کیا ہی خوب استدلال فرمایا جو عوام وخواص سبھی کو پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔(مرتب)

(۱۱) فرمایا: اگر کوئی رسول یا نبی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنے کلام قطعی وقدیم میں اس شخص کے متعلق خبر دیتا ہے کہ ہم اس سے راضی ہیں تو یقینی بات ہے کہ اس سے قصداً کوئی گناہ سرزد نہ ہوگا ورنہ اس کے علم قدیم میں جو کہ **لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ** کا مصداق ہے خلل لازم آئے گا یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ قصداً گناہ کرنے والے سے بھی راضی ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے **لَا یَرْضٰی لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ** یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں فرماتے، اس لئے کسی ایسے شخص کے معیارِ حق ہونے پر تامل کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ میں اپنے راضی ہونے کی خبر دی ہو جیسے سابقین اولین، مہاجرین، انصار اور تابعین بالاحسان کیلئے سورہ توبہ میں اور اصحاب حدیبیہ کے لئے سورہ فتح میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ (بیس بڑے مسلمان: ص ر ۵۳۳)

ف : چونکہ ایک بڑی جماعت کے سربراہ نے یہ لکھا تھا کہ صحابہ معیارِ حق نہیں، میرا خیال ہے اسی مسئلہ کی توضیح بلکہ تفہیم کے لئے یہ کلام فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو زیغ وضلال سے محفوظ رکھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی عظمت وفضیلت کو ذہن نشین کردے۔ آمین۔ (مرتب)

(۱۲) فرمایا: عشاء کے بعد کسی وقت نماز پڑھنا تہجد ہے کیونکہ اس میں ترک نوم ہے اگر مطالعہ سے فراغت پانے کے بعد قبل استراحت دو رکعت پڑھ لیں تو یہ بھی تہجد ہو جائے گی۔

ف : ماشاء اللہ! تہجد کا مرحلہ کتنا آسان فرمادیا جس پر عمل کرنا اب کچھ مشکل نہ رہا۔ (مرتب)

(۱۳) فرمایا: حضرت امام شافعیؒ سے جب پوچھا گیا کہ عمر ابن عبدالعزیزؒ افضل ہیں یا معاویہ رضی اللہ عنہ؟ تو فرمایا کہ امیر معاویہ کے اس گھوڑے کی نتھنوں کی خاک جس پر سوار ہو کر انہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کیا ہے، عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔ (بیس بڑے مسلمان: ص/۵۳۸)

ف : حضرت امام شافعیؒ کی یہ بات حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی غایت معرفت وعقیدت پر دال ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ کسی صحابیؓ کے بارے میں ایسی بات ہرگز ہرگز نہ کہے نہ لکھے جس سے کسی قسم کی تحقیر وتصغیر کا بھی شائبہ لازم آئے، واللہ ولی التوفیق۔

اس قسم کے بہت سے ملفوظات درج کئے گئے ہیں جن کا مطالعہ یقیناً مؤثر ومفید ثابت ہوگا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو پڑھنے اور عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

سفرِ آخرت : ۱۹۵۷ء گرمی کا موسم تھا کہ حضرت مدنیؒ ڈیڑھ ماہ کے دورے پر مدراس کی طرف روانہ ہوئے مگر بیس دن کے ہی بعد واپس آگئے، مولانا اسعد میاں جو رفیق سفر تھے ان سے معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت زیادہ تکلیف ہوگئی تھی کہ آئندہ سفر جاری رکھنا خطرناک تھا، زیادہ چلنے یا تقریر سے سانس پھول جاتا تھا جس سے مجبور ہو کر بیٹھ جاتے تھے، دیوبند میں تشریف آوری کے بعد اس خطرناک بیماری میں بھی باوجود منع کرنے کے آٹھ نو دن سبق پڑھاتے رہے بالآخر مجبور ہو کر سبق بند کیا اور بڑے دکھ کے ساتھ باضابطہ دارالعلوم سے رخصت لے لی اور

سہارنپور جا کرا ایکسرے کرایا اور سفر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری ؒ سے رائے پور جا کر ملاقات کی، ایکسرے سے پتہ چلا کہ گردے میں خرابی ہے ،تاہم مطالعہ کتب فرماتے اور اپنے حجرے میں نماز باجماعت ادا کرتے،فرائض تو ایک طرف سنن ونوافل بھی کھڑے ہو کر پڑھتے اور تہجد بھی ادا فرماتے،ایک دن خود ہی ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر باہر تشریف لے گئے، اس دوران حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب ؒ تشریف لائے تھے،ان سے مسئلہ پوچھا کہ یہ لوگ چار پائی پر نماز پڑھنے کے لئے کہتے ہیں، مسجد چھڑا دی ،باہر جانا چھڑا دیا، بتائیے کیا کروں؟ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ چار پائی کی سطح برابر ہے لہذا اس پر پڑھ لینی چاہئے، البتہ تیمم کی جگہ وضو ہی کیا کریں اور حضرت وضو ہی کیا کرتے تھے، اللہ اللہ الحب للہ کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے۔

ایک دن حضرت ؒ کو معلوم ہوا کہ ارشد سلّمہٗ (صاجزادہٗ حضرت مدنی ؒ) روزے رکھتے ہیں اور چار بجے مخلصین کے ساتھ دعائے صحت کرتے ہیں، اس پر مولانا اسعد (صاجزادۂ حضرت مدنی ؒ) کو بلا کر ڈانٹا کہ میری صحت کے لئے یہ لوگ اپنی صحت کیوں خراب کرتے ہیں، ایک رات ترنّم سے یہ شعر گنگناتے رہے ؎

الٰہی میری زندگی ہے کیسی   نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

(بیس بڑے مسلمان: ص ر ۹۰۵)

وصال : وصال کی آخری شب تھی، عشا کی نماز پڑھ کر تخت پر بیٹھ گئے حالت بہت اطمینان بخش تھی، نہایت اطمینان وسکون سے باتیں بھی کر لیتے تھے، پھر آپ بستر پر تشریف لے جا کر لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے، فجر کی نماز اول وقت میں

ادا فرمائی اور کچھ وظیفے پڑھتے رہے، دن کافی نکل آنے پر صحن میں نکلنے کی خواہش ظاہر فرمائی، آپ کو صحن میں چارپائی پر لٹا دیا گیا، بظاہر اطمینان کی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔

اسی دن اہلیہ محترمہ کو یہ نصیحت فرمائی:

نصیحت: سب سے حسن خلق کا معاملہ ہونا چاہئے، چند دن کی زندگی میں کسی سے ناراض ہونا ٹھیک نہیں، ہر ایک کے کام آنا چاہئے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی سے توقع اور امید نہ رکھنی چاہئے، اگر کسی سے امید نہ رکھو گی تو کسی سے شکایت نہ ہوگی اور نہ کبھی کسی سے تکلیف پہونچے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو۔

نصیحت کے بعد خود ہی بستر پر تشریف لے گئے اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے اسی اثناء میں روح پرفتوح دارِ آخرت کی طرف پرواز کرگئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آپ کی وفات ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵/ نومبر ۱۹۵۷ء بروز جمعرات بعد نماز ظہر تقریباً ڈھائی بجے ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ورحمہ اللہ تعالیٰ۔

عجب اتفاق کہ ۱۲/ جمادی الاولیٰ ہی کو جمعرات کے دن بعد نماز ظہر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کا بھی وصال ہوا تھا۔ آپ کی تدفین مزار قاسمی قصبہ دیوبند ہی میں ہوئی۔ نوراللہ مرقدہٗ

(ماخوذ از مآثر شیخ الاسلام تالیف مولانا اسیر ادروی زید مجدہٗ)

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد متوفی ۱۳۷۷ھ

نام وولادت: مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی نام فیروز بخت ہے، مولانا کی ولادت مکہ معظّمہ میں ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۶ھ میں ہوئی۔ والد کا نام مولانا خیرالدین ہے۔

ہندوستان کا سفر: سات آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آ گئے اور اسی زمانہ میں آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔

بسم اللہ کی رسم شیخ عبد اللہ مرداد نے صحن حرم میں ادا کرائی اور قرآن شریف اپنی خالہ سے پڑھا جو بڑی خوش آوازی سے تلاوت کرتی تھیں۔ اور اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ مکہ معظّمہ کی روانگی سے قبل قرآن پاک ختم کرلیا تھا، اور حرم کے سب سے بڑے قاری شیخ حسن سے قرأت سیکھ رہے تھے کہ اتنے میں ہندوستان کا سفر پیش آ گیا۔ (بیس بڑے مسلمان ص۱۶۷)

ابتدائی تعلیم: مشرقی علوم کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا خیر الدین سے حاصل کی، ابتدائی معلموں میں دلّی کے ایک فاضل مولوی محمد یعقوب اور مولوی عبدالحق خیر آبادی کے ایک شاگرد مولوی نذیر الحسن مرحوم امیٹھی کا نام بھی شامل ہے۔ لیکن تحصیل علم کا حقیقی ذریعہ خود حضرت مولانا کے والد تھے۔

بچپن میں شوق مطالعہ: حضرتؒ مولانا کے والد کی زندگی چونکہ بزرگی، عظمت اور عوام پر ان کے غیر معمولی اثر سے مرکب تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر بچوں

کی زندگی بھی اسی سانچہ میں ڈھل گئی اور طبعی طور پر کھیل کود کے جذبات اس قدر افسردہ ہو گئے کہ تھے ان کی جگہ قبل از وقت سنجیدگی نے لے لی، کتابیں کھلونا بن گئیں، اور مطالعہ کھیل کود کے جذبات پر غالب آ گیا۔ چنانچہ دس برس کی عمر میں حضرت مولانا کو کتابوں کا اتنا شوق ہو گیا تھا کہ ناشتے کے جو پیسے ملتے تھے ان کو جمع کیا کرتے تھے اور ان سے کتابیں خرید لیا کرتے تھے۔

تحریر وتقریر اور ترجمہ: تحصیل علم کے اس ذوق وشوق کے ساتھ تحریر وتقریر اور اردو ترجمہ کی مشق بھی جاری رہی، سب سے پہلا رسالہ جو حضرت مولانا نے ترجمہ کیا وہ علامہ کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں جمعہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اسی طرح ۱۹۰۱ء میں تحریر وتقریر کے ذوق کی ترویج وترقی کیلئے مولوی رضا علی وحشتؔ نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام انیس الاسلام تھا۔

الہلال کا اجراء: ۱۹۰۶ء کے موسم گرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں حضرت مولانا کی چشم بیداری نے یہ خواب دیکھا اور کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس وقنوطہ کا ہجوم بارہا حوصلہ وعزم پر غالب آ گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں اس خواب عزیز کی تعبیر ملی اور الہلال عالم وجود میں آیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔"

ملت اسلامیہ کی بیداری: ملتِ اسلامیہ کی روح افراد کی غفلت میں سو رہی تھی، ذہن ودماغ کے تغیرات میں خواب دیکھ رہی تھی جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدل رہی تھی۔ الہلال کی تحریک ودعوت پر بالآخر وہ جدوجہد کے

میدان میں اٹھ کھڑی ہوئی ۔ یہ جدو جہد ایسا سفر تھی جس کی بندھی ہوئی منزلیں تھیں، ٹھہرائی ہوئی رسم و راہ تھی ۔ حضرت مولانا نے الہلال کے ذریعہ ملتِ اسلامیہ کو اس سفر کی بندھی ہوئی منزلوں کی طرف رہنمائی کی، ٹھہرائی ہوئی رسم و راہ سے آگاہ کیا۔ بے شمار رکاوٹوں کی نشان دہی کی اور ناگزیر مشکلات سے مقابلہ کی سکت اور برداشت کی توانائی پیدا کی۔ الہلال درحقیقت نالہ جرس تھا۔ لوگ آتے گئے کارواں بنتا گیا۔

سیاست سے کنارہ کشی کا ارادہ: جس وقت حضرت مولانا رانچی سے واپس تشریف لائے تو یہ ارادہ کر کے آئے تھے کہ وہ خالص علمی زندگی بسر کریں گے اور سیاسی ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جائیں گے لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ حضرت مولانا کو پھر اس آگ میں کودنا پڑا۔ حضرت مولانا نے اپنے خالص انداز میں اس وقت کے حالات کے متعلق اپنے قلب کی کیفیات کو واضح فرمایا ہے۔

شکست عزائم: لیکن **عرفت ربی بفسخ العزائم** بالآخر مجھے سیلاب میں بہنا ہی پڑا! مگر الحمد اللہ کہ یہ حوادث و واقعات کے سیلاب کی مخالفانہ رو نہ تھی جو عزائم کو بہا لے جاتی اور قصد کو تاراج کر دیتی ہے، بلکہ خود عزم و عمل ہی کی ایک رو تھی جس کے اندر سے مشیت الٰہی کی صدا اٹھتی ہے اور انسان کو اس کے فیصلہ کی جگہ اپنے فیصلہ کی طرف بلاتی ہے۔

وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْماً حَکِیْماً۔

(بیس بڑے مسلمان ص: ۳۴۷)

مولانا ابوالکلام اور علامہ اقبال: مولانا ابوالکلامؒ اور اقبال دونوں کے اعتقادی مسلک میں عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ اقبال نے اپنے محبوب نمونے اہل طریقت سے حاصل کئے ہیں۔ مثلاً رومی، سنائی وغیرہ اور مولانا ابوالکلام کے نمونے اہل دین میں سے ہیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہ۔ اس سے تو یہ ظاہر ہو ہی جاتا ہے کہ ان کے درمیان تھوڑی حد تک وہ فاصلہ ضرور ہے جو مسجد وخانقاہ میں ہونا چاہئے۔ ان میں سے ایک براہ راست مسجد سے فیضیاب ہو رہا ہے اور دوسرا براہ راست خانقاہ سے استفادہ کرتا ہے۔ مگر جذب وجنوں کی حد تک دونوں مذہب عشق کے معترف ومعتقد ہیں۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ ص:۱۴۷)

خرمن علم پر بجلیاں: مولانا کیلئے یہ مصیبت کم نہ تھی کہ قید وبند کے سلسلے میں پیش آنے والی تلاشیوں اور ہر قسم کے کاغذات کی ضبطی کے باعث ان کی گراں بہا علمی متاع بری طرح تلف ہوئی۔ ان میں مسودے بھی تھے، ادھوری چھپی ہوئی کتابوں کے فرمے بھی۔ کتابت شدہ کتابیں بھی اور بے شمار یادداشتیں بھی جو زندگی بھر کے مطالع کا نچوڑ تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز سلامت واپس نہ ملی۔ جو کاغذات سالہا سال کے بعد ہاتھ آئے، وہ کسی بھی کام کے نہ تھے۔ مولانا نے خود اس افتاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ پنبہ وآتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا، دونوں کو بہ یک وقت جمع

کروں، میں نامراد ایک طرف متاع فکر کے انبار لگاتا رہا۔ دوسری طرف برق خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرف شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا:

زاں شکستم کہ دنبال دل خویش مدام
ورنشیب شکن زلف پریشاں رفتم

معروف تصانیف: مولانا کی تصانیف میں سے مندرجہ ذیل کتابوں کا علم سب کو ہے۔

(۱) ترجمان القرآن جلد اول و دوم مع تفسیر فاتحہ، جسے اب الگ بھی چھاپ دیا گیا ہے۔

(۲) قول فیصل، جو سیاسی مقدموں کی سرگزشت میں بے مثال ہے۔

(۳) مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب۔

(۴) جامع الشواہد۔

(۵) غبار خاطر وغیرہ۔

مولانا کا یقین محکم: مولانا کا قلب صافی ایسے ہی یقین و ایمان کے نور سے معمور تھا۔ اور ان کی پوری زندگی اس کی ایک سراپا روشن شہادت ہے۔ انہوں نے اسی طرح حق کو محکم و استوار اور باطل کو راکھ کی دیوار سمجھا اور ویسے ہی یقین کے ساتھ جس طرح صبح کو سورج کے طلوع اور شام کے غروب کا یقین ہوتا ہے۔ بلکہ مولانا کا عقیدہ یہ تھا، کہ طلوع وغروب آگے پیچھے ہوسکتا ہے مگر حق کی کامیابی اور باطل کی شکست آگے پیچھے نہیں ہوسکتی تھی۔

(بیس بڑے مسلمان ص: ۷۵۳)

جامع مسجد دہلی میں تاریخی تقریر

(اگست ۱۹۴۷ء کو جامع مسجد دہلی میں مولانا آزاد کا ایک شاہکار)

عزیزان گرامی! آہ جانتے ہیں کہ وہ کونسی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانے میں جس پر لیل ونہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کے بجائے اعتماد، اور آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانی یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا تو تم نے میرے ہاتھ قلم کردیئے، میں چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینی چاہی تو تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرہ کی ہر راہ پر جھنجوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے۔ اس پر غور کرو۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جارہے ہو اور کیوں جارہے ہو؟

یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔ عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش وخروش بیجا تھا اسی طرح آج یہ تمہارا خوف وہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کو نہ تو کوئی طمع بلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔

اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہے تو اسے خدا کی جلوگاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امّیؐ کی معرفت فرمایا تھا۔ ”جو خدا پر ایمان لائے، اور اس پر جم گئے تو پھر ان کیلئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔“ ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے، میں کہتا ہوں جو اجلے نقش ونگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کیلئے تیار نہیں تو

پھر کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود اک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ پانی کی سیل کیا ہے کہ تم بھیک جانے کے ڈر سے پائیچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ یہ تمہارا راستہ نہیں۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبان سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان **لاتھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین**۔ آج کی صحبت ختم ہوگئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کیساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گردو پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کرلادوں۔ یہ تو دل ہی کی دکان سے اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ والسلام۔ (بیس بڑے مسلمان ص ۷۵۸)

ف: احقر نے بغرض اختصار تقریر کے اقتباس نقل کیا ہے۔ پوری تقریر کیلئے اصل کا مطالعہ کریں۔ یقیناً یہ تقریر دل سوز ہے، مردہ دلوں میں روح پیدا کرنے والی ہے، اللہ تعالیٰ مولاناؒ کو جزائے خیر مرحمت فرمائے۔ جنھوں نے اس وقت اہل وطن کو ایک اہم سبق دیا۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**۔ (مرتب)

شان استقامت: عزیمت واستقامت مولانا کے آئینہ طبع کے درخشاں ترین جوہر تھے۔ انہوں نے جن اصول مقاصد کی دعوت کیلئے زندگی وقف فرمائی ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا۔ ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہو گئے۔ انہوں نے علمی یاداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے لیکن ان کی شان عزیمت ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

دلی تقاضا تھا کہ حضرت مولانا ابوالکلام صاحبؒ کی کوئی بھی تحریر درج ہو جائے تو مناسب ہوتا۔ چنانچہ انھیں کی تالیف ''انسانیت موت کے دروازے پر'' سے بعض خاص اور اہم مضامین پیش خدمت ہیں۔ واللہ الموفق

حضرت ابوبکر الصدیقؓ کا اہم وصیت نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ابوبکر بن ابو قحافہؓ کا وصیت نامہ ہے۔ جو اس نے آخری وقت دنیا میں جب کہ وہ اس جہاں سے کوچ کر رہا ہے اور شروع وقتِ آخرت میں جب کہ وہ عالم بالا میں داخل ہو رہا ہے قلم بند کرایا۔ یہ ایسے وقت کی نصیحت ہے جس وقت کافر ایمان لے آتے ہیں بدکار سنبھل جاتے ہیں اور جھوٹے حق کے روبرو گردن جھکا دیتے ہیں۔ ''میں نے اپنے بعد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو تم پر امیر مقرر کیا ہے۔ لہذا تم ان کا حکم سننا اور اطاعت کرنا۔ میں نے اس معاملے میں اللہ تعالیٰ

کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، اسلام کی خود اپنی اور آپ لوگوں کی خدمت کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اور کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اب اگر عمر عدل کریں گے تو ان کے متعلق میرا علم اور حسن ظن ہی ہے، اگر وہ بدل جائیں تو ہر شخص اپنے کئے کا جواب دہ ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے نیک نیتی سے کیا ہے اور غیب کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے۔ "**وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ**" جو لوگ ظلم کریں گے وہ اپنا انجام جلد دیکھ لیں گے۔"

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آخری وصایا اور دعا: اس کے بعد آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلوت میں بلایا اور مناسب وصیتیں کیں۔ پھر ان کے لئے بارگاہ خداوندی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا:

خداوندا! میں نے یہ انتخاب اس لئے کیا ہے تاکہ مسلمانوں کی بھلائی ہو جائے۔ مجھے یہ خوف تھا کہ وہ کہیں فتنۂ نفاق وفساد میں مبتلا نہ ہو جائیں، اے مالک! جو کچھ میں نے کیا ہے تو اسے بہتر جانتا ہے۔ میرے غور وفکر نے یہی رائے قائم کی تھی۔ اور اس لئے میں نے ایک ایسے شخص کو والی مقرر کیا ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ مستقل مزاج ہے اور سب سے زیادہ مسلمانوں کی بھلائی کا آرزومند ہے۔ اے اللہ! میں تیرے حکم سے اس دنیائے فانی کو چھوڑتا ہوں اب تیرے بندے تیرے حوالے، وہ سب تیرے بندے ہیں۔ ان کی باگ تیرے ہاتھ میں ہے۔ یا اللہ! مسلمانوں کو صالح حاکم عنایت فرما۔ عمرؓ کو خلفائے راشدین کی صف میں جگہ عطا کر، اور اس کی رعیت کو صلاحیت سے بہرہ مند فرما۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ولایت وقبولیت کا اعجاز تھا کہ اس قدر اہم کٹھن اور پیچیدہ معاملہ اس قدر سہولت اور خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔ پہلے اور پچھلے مسلمانوں کا یہ فتویٰ ہے کہ خلافت پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تقرر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اسلام اور اس امت پر اس قدر بڑا احسان ہے کہ قیامت تک اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خلافت کے چند سالوں میں جو کچھ کیا اس کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ اسلام کی طاقت فرشِ زمین پر بکھری پڑی تھی آپ نے اسے جمع کیا اور پھر عرش عظیم تک پہنچا دیا۔

حساباتِ دنیا کی بے باکی

حضرت ابوبکرؓ کی جانب سے حضرت عائشہؓ کو ہدایت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غابہ کی ۲۰ روسق کھجوریں مجھے ہبہ کردی تھیں۔ جب مرض کا غلبہ ہونے لگا تو ارشاد فرمایا بیٹی! میں تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے افلاس سے مجھے دکھ ہوتا ہے اور تمہاری خوش حالی سے مجھے راحت ملتی ہے۔ غابہ کی جو کھجوریں میں نے ہبہ کی تھی اگر تم نے ان پر قبضہ کرلیا ہو تو خیر، ورنہ میری موت کے بعد وہ کھجوریں میراترکہ ہوں گی۔ تمہارے دوسرے دو بہن بھائی ہیں ان کھجوروں کو ازروئے قرآن ان سب میں تقسیم کردینا۔ حضرت صدیقہؓ نے فرمایا: اے بزرگ باپ! میں حکم والا کی تعمیل کروں گی، اگر اس سے بہت زیادہ مال بھی ہوتا تو میں آپ کے ارشاد پر اسے چھوڑ دیتی۔

ف: خاص طور سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کو نقل کرنا

تھا کہ آپ کو وراثت کے سلسلہ میں کس قدر فکر تھی کہ قرآن پاک کے اس حکم وراثت پر ضرور عمل ہونا چاہئے۔ مگر افسوس کہ اس معاملہ میں خواص سے بھی کوتاہی ہو رہی ہے۔ العیاذ باللہ (مرتب)

وفات سے کچھ عرصہ پہلے ارشاد فرمایا: بیت المال کے وظیفہ کا حساب کیا جائے جو میں نے آج تک وصول کیا ہے۔ حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کل ۶؍ہزار درہم یا ۱۵؍سو روپیہ دیا گیا ہے۔

ارشاد فرمایا: میری زمین فروخت کر کے یہ تمام رقم ادا کر دی جائے، اسی وقت زمین فروخت کی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یار غار کے ایک ایک بال کو بیت المال کے بار سے سبکدوش کر دیا گیا۔ جب یہ ادائیگی ہو چکی تو ارشاد فرمایا:

تحقیقات کی جائے کہ خلافت قبول کرنے کے بعد میرے مال میں کیا کچھ اضافہ ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلا اضافہ ایک حبشی غلام کا ہے جو بچوں کو کھلاتا ہے اور مسلمانوں کی تلواروں کو صیقل بھی کرتا ہے، دوسرا اضافہ ایک اونٹنی کا ہے جس پر پانی لایا جاتا ہے۔ تیسرا اضافہ ایک سو روپیہ کی چادر ہے۔ ارشاد فرمایا کہ میری وفات کے بعد یہ تینوں چیزیں خلیفۂ وقت کے پاس پہنچا دی جائیں۔

رحلت مبارک کے بعد جب یہ سامان خلیفہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا تو آپ رو پڑے اور کہا: ''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ تم اپنے جانشینوں کے واسطے کام بہت دشوار کر گئے ہو''۔ (انسانیت موت کے دروازے پر: ۴۱)

آخری سانس میں ادائے فرض: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی

حیات پاک کا آخری دن تھا کہ حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ نائب سالار عراق آپہنچے، اس وقت حضرت امیر المومنینؓ جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہے تھے۔ مثنیٰ رضی اللہ عنہ کی آمد معلوم ہوئی تو کسی خطرے کا احساس کر کے انہیں اسی وقت بلا بھیجا۔ انھوں نے محاذ جنگ کے تمام حالات تفصیل سے بیان کئے اور کہا کہ کسریٰ نے اپنی تازہ دم فوجیں محاذ عراق پر بھیج دی ہیں۔ حالات سن کر اسی حال میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو طلب کر کے ارشاد فرمایا:

عمرؓ! جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنو اور اس پر عمل کرو، مجھے امید ہے کہ آج میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ اگر دن میں میرا دم نکلے تو شام سے پہلے، اور اگر رات میں نکلے تو صبح سے پہلے مثنیٰؓ کے لئے کمک بھیج دینا۔ پھر فرمایا: عمرؓ! کسی بھی مصیبت کی وجہ سے دین اسلام کی خدمت اور حکم ربانی کی تعمیل کو کل پر ملتوی نہ کرنا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کون سی مصیبت ہو سکتی تھی۔ مگر تم نے دیکھا کہ اس روز بھی جو کچھ مجھے کرنا تھا میں نے کر دیا۔ خدا کی قسم! اگر میں اس روز حکم خداوندی کی تعمیل میں غافل ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ ہم پر تباہی کی سزا مسلط کر دیتا اور مدینہ کے گوشے گوشے میں فساد کی آگ بھڑک اٹھتی، اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو شام میں کامیابی عطا فرمائے تو پھر خالد رضی اللہ عنہ کی فوجوں کو عراق کے محاذ پر بھیج دینا اس لئے کہ وہ آزمودہ کار بھی ہیں اور عراق کے حالات سے باخبر بھی ہیں۔

عائشہ صدیقہؓ کی دردمندیاں: انتقال کے روز دریافت فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کس روز رحلت فرمائی تھی۔ لوگوں نے کہا: دوشنبہ کے

روز۔ ارشاد فرمایا: تو میری آرزو بھی یہی ہے کہ میں آج رخصت ہو جاؤں۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دے تو میری قبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرقد مبارک کے پاس بنائی جائے۔ اب وفات کا وقت قریب آ رہا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا؟ عرض کیا تین کپڑوں کا، ارشاد فرمایا: میرے کفن میں بھی تین کپڑے ہوں۔ دو یہ چادریں جو میرے بدن پر ہیں دھولی جائیں اور ایک کپڑا بنالیا جائے۔

حضرت صدیقہؓ نے دردمندانہ کہا: ابا جان ہم اس قدر غریب نہیں ہیں کہ نیا کفن بھی نہ خرید سکیں، ارشاد فرمایا:

بیٹی! نئے کپڑے کی مردوں کی نسبت زندوں کو زیادہ ضرورت ہے۔ میرے لئے یہی پھٹا پرانا ٹھیک ہے۔

موت کی ساعتیں لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس ڈوبتے ہوئے چاند کے سرہانے بیٹھی تھیں اور آنسوں بہا رہی تھیں، غم آلود اور حسرت انگیز خیالات آنسوؤں کے ساتھ ساتھ دماغ کی پہنائی سے اتر رہے تھے اور زبان سے بہ رہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک شعر پڑھا، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

بہت سی نورانی صورتیں ہیں جن سے بادل بھی پانی مانگتے تھے وہ یتیموں کے فریادرس تھے اور بیواؤں کے پشت پناہ تھے۔

یہ سن کر حضرت صدیقؓ نے آنکھیں کھول دیں اور فرمایا: بیٹی! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی۔

حضرت عائشہؓ نے دوسرا شعر پڑھا، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

قسم ہے تیری عمر کی جب موت کی ہچکی لگ جاتی ہے تو پھر کوئی زرومال کام نہیں دیتا۔ ارشاد فرمایا: یہ نہیں، اس طرح کہو:

''وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ''

موت کی بے ہوشی کا صحیح وقت آ گیا۔ یہ وہ ساعت ہے جس سے تم بھاگتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نزع کے وقت میں اپنے باپ کے سرہانے گئی تو یہ شعر پڑھا، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

جس کے آنسو ہمیشہ رکے ہیں ایک دن وہ بھی بہ جائیں گے، ہر سوار کی ایک منزل ہوتی ہے اور ہر پہننے والے کو ایک کپڑا دیا جاتا ہے۔

فرمایا: بیٹی! اس طرح نہیں، حق بات اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔

''وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ''

ترجمہ: موت کی بے ہوشی کا وقت آ گیا، یہ وہی وقت ہے جس سے تم بھاگتے تھے۔

انتقال پاک: پاک زندگی کا خاتمہ اس کلام پر ہوا **"رَبِّیْ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ"** اے اللہ! مجھے مسلمان اٹھا اور اپنے نیک بندوں میں شامل کر۔ جب روح اقدس نے پرواز کی تو ۲۲ رجمادی الآخر ۱۳ھ تاریخ تھی دوشنبہ کا دن، عشاء اور مغرب کا درمیانی وقت، عمر شریف ۶۳ رسال تھی۔ ایام

خلافت ۲ ؍برس ۳ ؍مہینے اور ۱۱ ؍دن۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ جسم اطہر پر پانی بہاتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مبارک کے ساتھ قبر شریف اس طرح کھودی گئی تھی کہ آپ کا سر مبارک حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک کے ساتھ رہے۔ اور قبروں کی تعویز برابر برابر آجائیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے میت پاک کو آغوش لحد میں اتارا اور ایک ایسی برگزیدہ شخصیت کو جو رسول دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت مسلمہ کی سب سے زیادہ مقبول بزرگوار اور صالح شخصیت تھی ہمیشہ کے لئے چشم جہاں سے اوجھل کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(انسانیت موت کے دروازے پر، مؤلفہ مولانا ابوالکلام آزاد: ۴۴)

سفر آخرت: ۱۹ ؍فروری ۱۹۵۸ء مطابق ۱۳۷۷ھ کو پانچ بجے صبح حسب معمول امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد چائے پی کر غسل خانہ میں گئے کہ یکایک جسم کے دائیں حصہ میں فالج نے حملہ کیا اور بے بس ہوگئے اور بالآخر ۲۱ ؍اور ۲۲ ؍فروری کی درمیانی شب میں دو بج کر دس منٹ پر موت نے اس عظیم انسان کیلئے اپنا دامن وا کر دیا جو اس دور میں سب سے بڑا ہندوستانی، سب سے بڑا انسان اور سب سے بڑا مسلمان تھا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**۔ اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ۔ (بیس بڑے مسلمان ص: ۶۷۷)

حضرت شیخ محمد خضر حسین تیونسی متوفی ۱۳۷۸ھ

نام ونسب ولادت: بزرگ عالم شیخ امام محمد خضر بن حسین بن علی بن عمر حسینی تیونسی ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں تیونس کے صوبہ الجرید کے شہر نفطہ یا ایک روایت کے مطابق قفصہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔

تعلیم: انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا پھر بارہ سال کے ہوئے تو اپنے والد کے ساتھ راجدھانی تیونس چلے گئے اور جامعہ زیتونہ میں داخل ہو گئے اور اساتذہ ومشائخ سے علم حاصل کیا۔ مشہور اساتذہ میں شیخ سالم بوحاجب، شیخ محمد نجار، شیخ مصطفیٰ رضوان اور ان کے ماموں علامہ شیخ محمد مکی بن عزوز ہیں۔ وہ حصول علم میں لگے رہے اور عربی زبان وعلوم دینیہ میں عالیہ کی سند حاصل کی۔ وہ دین کے سلسلہ میں غیور، وطن کے لیے مخلص اور استعماری طاقتوں کے دشمن تھے۔ ۱۳۲۱ھ بمطابق ۱۹۰۳ء میں اسلام کے محاسن کی اشاعت اور سامراج کے اسالیب کی پردہ دری کے لیے مجلہ **السعادة العظمی**، جاری کیا، سامراجی طاقتوں نے ان کو پھانسی کی سزا سنائی، اس لیے کہ وہ سیاست میں مصروف ہو گئے تھے اور جہاد وآزادی کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ چنانچہ ۱۳۳۰ھ بمطابق ۱۹۱۱ء میں اہل خانہ کے ساتھ دمشق ہجرت کر گئے، عرصۂ دراز تک یہاں مقیم رہے اور مدرسہ سلطانیہ میں درس دینے لگے، اس کے بعد استنبول اور جرمنی کا سفر کیا دوبارہ پھر دمشق واپس آگئے تاکہ مدرسہ سلطانیہ میں تدریسی کام جاری رکھ

سکیں، جب فرانسیسیوں نے شام پر قبضہ کر لیا تو اس کو چھوڑ کر ۱۳۳۹ھ بمطابق ۱۹۲۰ء میں مصر آ گئے۔ (عالم اسلام کی عالمی شخصیت صفحہ ۶۲۵)

مصر کی طرف ہجرت: سید محمد خضر حسین کی تشریف آوری مصر میں اس وقت ہوئی، جس وقت مصر کو ان کی شدید ضرورت تھی، تاکہ تحریک اسلامی کے حامیوں کے ساتھ داعیان الحاد اور مصر میں تہذیبی استعمار کے متبعین کے سامنے کھڑے ہو سکیں۔ ابتدا میں دار الکتب المصریہ میں **مصحح** کی حیثیت سے پانچ سالوں تک معمولی اجرت پر کام کیا۔ بڑے بڑے علماء سے ملاقات کی اور استاذ احمد تیمور پاشا سے خاص دوستانہ مراسم قائم کیے۔

دفاع اسلام کے سلسلے میں آپ کی صلاحیت: اسلام، اصول اسلام اور اقدار اسلام کے دفاع کے سلسلہ میں شیخ محمد خضر حسین کی صلاحیت قابل تحسین تھی۔ چنانچہ ازہر میں عالمیت کے امتحان کے لیے کمیٹی کے صدر شیخ عبد الحمید لبان تھے شیخ خضر حسین نے علوم میں بے حد رسوخ اور قدرت کا مظاہرہ کیا حتی کہ شیخ لبان نے ان کے بارے میں کہا ''یہ تو ایک سمندر ہے جس کا کوئی ساحل ہی نہیں ہے۔'' اس طرح انہوں نے ازہر سے عالمیت کی سند حاصل کی اور ازہر ہی میں استاذ بن گئے اور کلیہ اصول الدین میں مدرس ہو گئے۔

شیخ الازہر کی ذمہ داری: ۱۳۷۱ھ کے اواخر میں شیخ الازہر کی ذمہ داری سنبھالی ۱۳۷۳ھ بمطابق ۱۹۵۳ء میں اس کو خوشی سے ترک کر دیا۔ اس لیے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ قوم نصیحت کو نہیں سن رہی ہے اور اہل علم کے ساتھ ادب کے ساتھ پیش نہیں آتی ہے۔ لہذا انہوں نے دور رہنے کو ترجیح دی اور ازہر کی

صدارت ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو جابر حاکم اور ڈکٹیٹر کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے منصب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

تالیفات: شیخ محمد خضر حسین کی کتابیں، دروس، لکچرس، تحقیقات اور مضامین کا دین کی معرفت، عقیدہ کو اپنانے، توحید کے پرچم کو بلند کرنے اور اسلام کے کلمہ کی سربلندی کی خاطر پیہم جد وجہد کرنے کے لیے امت کی رہنمائی میں بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں۔

آپ کا فضل وکمال

بلاشبہ علامہ محمد خضر حسین دشمنان اسلام کی طرف سے تمام جیلوں پر اپنے ایمان کے ذریعہ حاوی رہے، نہ لچک پیدا کی اور نہ ہی کسی منصب کی خواہش کی بلکہ منصب کو اپنے پیروں سے ٹھکرادیا جب انہوں نے دیکھا کہ یہ محض تصویر ہے حقیقت نہیں ہے اور قابض حاکم کے ہاتھوں کا کھلونا ہے، وہ اس کو جیسے چاہے گا استعمال کرے گا۔ بڑے عالم کا یہ عظیم موقف، ممتاز علامت، روشن اور تابناک تصویر ہے اس بات کی جس پر ہر دور اور ہر زمانے میں علماء اسلام اور داعیان اسلام کا ہونا ضروری ہے۔

ف: سبحان اللہ! اہل حق علماء کی کیسی علامت عیاں فرمائی۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ (مرتب)

غیر ملکی طلبہ جو مصر میں تعلیم کی غرض سے آئے تھے ذی علم شخصیات اور فقیہ مجاہدین کی اس ٹیم کو تعظیم وتکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی سیرت کے ذریعہ ہمارے سامنے ان سلف صالح علمائے اسلام کی سیرت کو

زندہ کر دیا تھا جنہوں نے علم کی کرامت اور علماء کے مرتبہ کو محفوظ رکھا اور راعی ورعیت دونوں کی خیر خواہی کا حق ادا کیا۔

علمائے حق کے اوصاف جمیلہ: شیخ عبدالعزیز بدری اپنی قیمتی کتاب **"الاسلام بین العلماء والحکام"** میں کہتے ہیں:

''لوگ بغیر علماء کے جاہل ہیں۔ انہیں شیاطین انس وجن ہر طرف سے اچک لیتے ہیں، گمراہیوں اور خواہشوں کی آندھیاں انہیں ہر جانب سے اڑا لے جاتی ہیں، اسی وجہ سے علماء زمین میں اللہ کی نعمت ہیں۔ وہ تاریکی کے چراغ ہیں، ہدایت کے امام ہیں، زمین پر اللہ کی حجت ہیں، ان کے ذریعے گمراہ کن افکار کا خاتمہ ہو جاتا ہے، دلوں اور نفوس سے شک کی بدلیاں چھٹ جاتی ہیں۔ اسلئے وہ شیطان کا غضب، ایمان کا مرکز اور امت کو درست رکھنے کا ذریعہ ہیں، زمین پر ان کی حالت آسمان میں تاروں کے مانند ہے۔ بحر وبر میں زندگی کی تاریکیوں میں ان سے راستہ معلوم کیا جاتا ہے، جیسا کہ امام احمد کی روایت کردہ حدیث میں وارد ہے'' بلاشبہ زمین پر علماء کا حال آسمان میں تاروں کے مانند ہے، بحر وبر کی تاریکیوں میں ان سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔'' تو جب تارے ہی بے نور ہو جائیں گے تو ہدایت حاصل کرنے والے بھٹک جائیں گے۔ یہ انبیاء کے وارث اور اسلام کے محافظ ہوتے ہیں۔ اللہ کے دین کے امین، حکام کو اس کے نفاذ کی دعوت دینے والے ہوتے ہیں۔ ظالموں سے کہتے ہیں کہ تم ظلم کر رہے ہو، مفسدوں سے کہتے ہیں تم فساد پھیلا رہے ہو۔ فساد کی اصلاح کرتے ہیں، کجی کو درست کرتے ہیں، ظالم بادشاہ سے نہیں گھبراتے، نہ

جابر حاکم سے ڈرتے ہیں اور اس حق سے خاموشی نہیں اختیار کرتے جس کا عام کرنا واجب ہے“۔

اسی طرح پوری اسلامی تاریخ میں ان ممتاز علماء کے نمونوں کا اعادہ ہوتا رہتا ہے جو علم کی امانت کے حامل ہوتے ہیں اور عام لوگوں تک اسلام کے پیغام پہنچاتے ہیں اور اس راہ میں پیش آنے والے حکام کے ظلم، عوام کی جہالت کو اللہ کے یہاں اجر وثواب کی امید میں برداشت کرتے ہیں۔

ف: سبحان اللہ! علماء حق کی کیسی تحسین وتوصیف فرمائی جس سے علماء حق کی صحیح معرفت نصیب ہوئی۔(مرتب)

وفات: ہمارے شیخ محمد خضر حسین چوراسی (۸۴) برس تک باحیات رہے۔ ۱۳۷۸ھ بمطابق ۱۹۵۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔ قاہرہ کے قبرستان آل تیمور میں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ اپنے علمی ذخیرے اور عمدہ سیرت کے ذریعہ انھوں نے علماء، طلبہ اور داعیان حق پر غیر معمولی اثر ڈالے ہیں۔ **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**

اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگ شیخ محمد خضر حسین تیونسی کو غریق رحمت کرے، انھیں وسیع وعریض جنت میں ٹھکانا عطا فرمائے اور ہمارا اور ان کا حشر اپنے صالح بندوں کے ساتھ فرمائے۔ الحمد اللہ، آمین۔(عالم اسلام عالمی شخصیات صفحہ ۶۲۵)

حضرت مولانا مفتی شمس الدین صاحب بڑودویؒ المتوفی ۱۳۷۸ھ

اسم گرامی: آپ کا اسم گرامی شمس الدین ہے، والد کا نام بدرالدین اور دادا کا نام بہاءالدین ہے۔

خاندان: آپ خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کا خاندان گیارہویں صدی ہجری میں بڑودہ گجرات آیا اور چھٹی پشت میں آپ کے جدامجد سید بہاءالدین سب سے پہلے بڑودہ آکر آباد ہوئے اس سے پہلے آپ کا خاندان احمد آباد میں تھا۔

ولادت: حضرت مولانا کی ولادت ۱۹۰۲ء میں شہر بڑودہ میں ہوئی۔

ابتدائی حالات: آپ کے دادا سید بہاءالدینؒ بڑے صاحب نسبت بزرگ گذرے ہیں جس کی وجہ سے گھر کے ماحول میں تدین وتقویٰ غالب تھا ایسے ماحول کا اثر آپ کی طبیعت میں بھی فطری طور پر تھا۔

ابتدائی تعلیم: آپ کی ابتدائی تعلیم بڑودہ شہر میں ہوئی، گجراتی تعلیم کے بعد آپ نے انگریزی تعلیم شروع کردی، مزاج میں بچپن ہی سے شرافت اور تدین غالب ہونے کی وجہ سے طبیعت کا میلان دینی تعلیم کی طرف تھا، اور انگریزی تعلیم کے ساتھ ہی مولانا نے از خود اپنے طور پر قرآن کریم حفظ کرنا شروع کردیا، اور تقریباً انیس پارے حفظ کرچکے تھے مگر جب حق تعالیٰ شانہ کسی بندے کو نوازنا چاہتے ہیں اور اس سے اپنے دین حنیف کی خدمت لینا چاہتے ہیں تو

غیب سے اسباب پیدا فرما دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا بچپن میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے زمانہ میں کسی جگہ کا سفر کر رہے تھے، دوران سفر ٹرین میں کسی نے مولانا سے ان کا نام دریافت کیا نیز والد اور دادا کا نام بھی دریافت کیا، مولانا نے اپنے والد اور دادا کا نام بتلایا، پھر اس شخص نے دریافت کیا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ مولانا نے جواب دیا کہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہا ہوں، یہ سن کر اس شخص نے مولانا سے ناگواری کے انداز میں کہا، اچھا ایسے بزرگوں کی اولاد ہو کر انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہو؟ افسوس کی بات ہے، اس شخص کے اس جملہ سے مولانا کے قلب پر سخت چوٹ لگی، اور یہی جملہ ان کی زندگی میں انقلاب کا ذریعہ ثابت ہوا۔

چنانچہ انھوں نے اسی وقت انگریزی تعلیم چھوڑ کر کسی دینی مدرسہ میں داخل ہو کر دینی تعلیم حاصل کرنے اور مکمل کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا۔

گھر واپس آکر اپنے والد سے اظہار خیال کیا، والد صاحب نے درمیان سال میں تعلیم کو چھوڑنے کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا کہ اچھا سال پورا کرلو، پھر مدرسہ چلے جانا، مگر مولانا قطعی فیصلہ کر چکے تھے اس لئے عذر خواہی کی۔ والد صاحب نے کچھ سختی بھی کی مگر مولانا نے فرمایا ''اب یہ قدم کسی بھی اسکول کی طرف نہ چلیں گے، میں اب تو عربی پڑھنے ہی جاؤں گا۔

مولانا کی طبیعت کا انداز اور تحصیل علم دین کا جذبہ اور داعیہ دیکھ کر بخوشی اجازت دیتے ہوئے والد ماجد نے دریافت کیا کہ کہاں جاؤ گے؟ مولانا کے کان میں کسی طرح مدرسہ اشرفیہ، راندیر سورت کا نام پڑ چکا تھا، اس لئے انھوں

نے جواب دیا کہ میں مدرسہ اشرفیہ راندیر سورت پڑھنے کے لئے جاؤں گا۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے مگر مدرسہ حسینیہ راندیر میں داخلہ لیا۔

اس وقت جامعہ حسینیہ میں درجۂ حفظ میں حضرت تنہا ایک طالب علم تھے، حفظ کی تکمیل کے بعد حضرت مولانا نے جامعہ حسینیہ ہی میں دیگر کتب درسیہ کی تعلیم جاری رکھی اور دوران طالب علمی اپنی ذہانت، ذکاوت، محنت و جفاکشی، خوش اخلاقی، سلامتی طبع وغیرہ خوبیوں کی وجہ سے تمام اساتذہ کرام خصوصاً بانیٔ جامعہ حضرت مولانا محمد حسین راندیریؒ کی خصوصی عنایات وتوجہات کا مرکز بن گئے۔

فراغت: حفظ کی تکمیل کے بعد حضرت مولاناؒ نے بڑی محنت وجانفشانی کے ساتھ از اول تا آخر درس نظامی کی تکمیل کر کے ۱۳۶۱ھ میں جامعہ حسینیہ سے سند فراغت ودستار فضیلت حاصل کی۔

تدریس: حضرت مولاناؒ نے جامعہ حسینیہ راندیر سورت میں دومرتبہ تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ مزید جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ۱۳۶۵ھ سے ۱۳۶۷ھ تک تین سال حضرت مولانا اسماعیل صاحب بسم اللہ صاحب کے زمانۂ اہتمام میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

حضرت مولانا افریقہ بھی تشریف لے گئے، چنانچہ وہاں کے دوران قیام ترویج واشاعت سنت، ردبدعات، علمائے دیوبند کا تعارف اور ان کے مسلک حق کی صحیح ترجمانی اور دیگر فرق باطلہ کے رد کے سلسلہ میں بڑی مستعدی اور مجاہدہ کے ساتھ قابل قدر خدمات انجام دیں۔ یقینا عالم کی ایسی ہی شان ہوتی ہے۔

کثر اللہ امثالہم۔

طلبہ پر شفقت: حضرت مولانا نے جس لگن اور دھن، جانفشانی اور مجاہدہ سے علم حاصل کر کے اپنے اندر اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت پیدا کی طلبہ کے بارے میں بھی ان کا ہمیشہ یہ جذبہ رہا کہ طلبہ کے اندر بھی علمی قابلیت پیدا ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ طلبہ پر بڑی محنت فرماتے تھے اور ان پر کڑی نظر رکھتے تھے اور امتحان میں ہرگز مروت اور رعایت کا معاملہ نہ فرماتے تھے۔

مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت کا پرخلوص جذبہ: بلاتفریق وامتیاز ہر طبقہ وگروہ کے نادار، غریب ویتیم بچوں کی تعلیم وتربیت سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اس لئے چاہتے تھے کہ ہر مکتبہ فکر اور ہر برادری کے بچے زیادہ سے زیادہ علم دین حاصل کریں اور علوم دینیہ کی تکمیل کر کے عالم دین بنیں، اس کی ان کو بڑی فکر تھی۔

تصنیف وتالیف: ''گجراتی ترجمہ قرآن پاک'' گجراتی زبان میں آپ کا سب سے اہم تصنیفی کارنامہ قرآن مجید کا گجراتی ترجمہ ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا اردو ترجمہ قرآن جو ان کے اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے فوائد وحواشی سے مزین ہے۔ حضرت مولانا شمس الدین صاحبؒ نے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

اتباع سنت اور معمولات: حضرت مولانا شمس الدین صاحبؒ کی طبیعت میں اتباع سنت کے ساتھ آداب ومستحبات کی پابندی کا بھی بڑا اہتمام والتزام تھا، اس زمانہ میں بڑودہ میں رمضان شریف کے عشرۂ اخیرہ کے مسنون

اعتکاف کا رواج تھا۔ حضرت مولاناؒ زندگی بھر اس پر عمل پیرا رہے، کبھی اعتکاف مسنون فوت نہیں ہوا۔ اس زمانے میں پورے بڑودہ شہر میں غالباً صرف مولاناؒ ہی کی شخصیت معتکف ہوا کرتی تھی۔ اب تو الحمدللہ یہ سنت بہت اچھی طرح بڑے پیمانے پر زندہ ہو چکی ہے۔ عشرۂ اخیرہ میں اب تو ہر محلہ کی مسجد میں کئی کئی معتکف ہوتے ہیں۔

اسی طرح عشرۂ ذی الحجہ کے نو دن روزوں کا بھی زندگی بھر اہتمام رہا۔ کبھی فوت نہ ہوئے۔ آپ کے صبر و تحمل، استقلال، جفاکشی وغیرہ اوصاف حمیدہ کے تذکرہ میں ایک مرتبہ سید الملت حضرت مولانا سید میاں صاحبؒ نے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند سے فرمایا کہ ضلع کھیڑا گجرات کے بعض علاقوں میں فتنۂ ارتداد وسندھی تحریک کی سرکوبی وانسداد کے سلسلے میں بعض دیہاتوں کا سفر ہوا جس میں احقر بھی حضرت مولانا کا رفیق تھا۔ اس سفر میں سخت گرمی و تیز دھوپ میں پیدل چلنا ہوا، حضرت مولانا روزہ رکھے ہوئے تھے، اس لئے طبیعت کچھ متاثر ہوئی، میں نے ان سے کہا کہ ''اس سفر اور گرمی میں روزہ نہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں، مگر مولانا نے ہنس کر بات ٹال دی۔

گجرات کے دور افتادہ اور پسماندہ جاہل علاقوں میں تبلیغی و اصلاحی کاموں کی دشواری بلکہ اس زمانے میں ان بستیوں میں داخلہ تک کی مشکلات اور صعوبتوں کے دوران تذکرہ حضرت مولانا احمد اشرف راندیری مہتمم دارالعلوم اشرفیہ راندیر نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اسی قسم کے ایک دیہات میں وعظ و نصیحت اور اصلاحی سلسلہ میں جانا طے ہوا۔ مگر وہاں موجودہ ہیئت، وضع قطع اور شکل

وصورت کے ساتھ داخل ہونا بھی مشکل تھا۔ اس لئے حضرت مولانا شمس الدین صاحب اور احقر نیز حضرت مولانا عبدالرحیم صادق صاحبؒ ہم تینوں بالکل خالص دیہاتی وضع قطع، اپنے سروں پر دیہاتی وضع کی پگڑی باندھ کر ہاتھوں میں موٹی لاٹھی لے کر اس دیہات میں گئے۔ وہاں جا کر ان کو جمع کیا اور مانوس کر کے عام لوگوں کے انداز میں ان کی فہم کے مطابق ان کے سامنے دینی باتیں، وعظ ونصیحت کے انداز میں بیان کیں۔

ف: دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب امتیوں کے اندر ایسا ہی جذبہ پیدا فرمادے تو بہت کچھ امت کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ (مرتب)

وفات: ایک خالص دینی سفر میں وطن سے دور فی سبیل اللہ ۸ / ۷ ۱۳ ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ چنانچہ وفات کے بعد آپ کی نعش کو مغرب کے بعد آپ کے آبائی وطن شہر بڑودہ لائی گئی۔ آپ کی وفات کی خبر شہر اور اطراف وجانب میں پھیل گئی۔ (اس اچانک انتقال پر ملال سے سب پر حزن وغم کی کیفیت طاری ہوگئی۔ مختلف مقامات سے نماز جنازہ میں شرکت کی اطلاعات نیز مقامی اخبارات اور روزناموں میں وفات کی خبر شائع ہونے کی بناء پر) باہر سے لوگوں کی نماز جنازہ میں شرکت متوقع ہونے کی وجہ سے دوسرے روز صبح ساڑھے دس بجے نماز جنازہ وتجہیز وتکفین کا وقت طے کیا گیا۔ نماز جنازہ میں اہل شہر کا بیان ہے کہ بڑودہ شہر میں کسی جنازہ میں عوام وخواص ہر طبقہ کے لوگوں کی اتنی کثیر تعداد میں شرکت کی مثال نہیں ملتی۔

نماز جنازہ: بڑودہ شہر میں اجوہ روڈ پر حضرت مولانا کا آبائی موروثی خاندانی

قبرستان ہے۔ اسی قبرستان کے وسیع احاطے میں نماز جنازہ حضرت مولانا الحاج احمد اللہ راندیریؒ سابق شیخ الحدیث جامعہ حسینیہ راندیر سورت نے پڑھائی اور پھر اسی قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کردیا گیا۔ رحمہ اللہ ونور اللہ مرقدہ۔

پسماندگان: حضرت مولانا شمس الدین صاحبؒ کے چار صاحبزادے تھے اور ایک صاحبزادی صالحہ بیگم تھیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے مولانا بہاء الدین صاحب مولانا کی حیات ہی میں گم ہوگئے اور اب تک لاپتہ ہیں، مگر تین صاحبزادے باحیات ہیں، جن کے اسماء بالترتیب یہ ہیں۔ مولانا مفتی سید مصلح الدین احمد صاحب، مولانا قمر الدین محمود صاحب، مولانا مفتی محمد محی الدین صاحب۔ تینوں ہی صاحبزادے ماشاء اللہ حافظ وقاری ذی استعداد عالم وفاضل ہیں۔ مولانا مصلح الدین احمد صاحب تو ماشاء اللہ جامعہ تعلیم الاسلام ڈیوزبری انگلینڈ میں شیخ الحدیث ہیں اور اس حقیر کی طرف سے مجاز بیعت ہیں۔ اور جب تشریف لاتے ہیں تو اکثر بڑودہ سے خانقاہ کنتھاریہ بھروچ بغرض ملاقات تشریف لاتے ہیں۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

حضرت شیخ بدیع الزماں سعید نورسی المتوفی ۱۳۷۹ھ

نام ونسب وولادت: شیخ سعید مرزا نورسی مشرقی اناضول کے صوبہ بدلیس کے ایک گاؤں ''نورس'' کے ایک کرد خاندان میں ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت: ان کا گھرانہ کاشتکار تھا دیندار اور علم آشنا تھا اپنے والد مرزاؒ کے آغوش تربیت میں چند سال گزارے اس کے بعد اپنے بھائی ملا عبد اللہؒ سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کی بناء پر بہت جلد اتنی صلاحیت پیدا کرلی جس سے علوم فنون کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ اصول فقہ کی کتاب ''جمع الجوامع'' اور نحو کی کتاب '' حل المعاقد'' ایک ہفتہ میں یاد کرلی، اس کے بعد ترکی کے شہر ''سعرت'' جاکر ملا فتح اللہؒ سے دو ماہ اور ''مکس'' میں ملا عبد الکریمؒ سے دوبارہ پڑھا، پھر بایزید پہنچ کر باقاعدہ تعلیم شروع کی، شیخ محمد جلالیؒ سے عربی زبان وعلوم کی کتابیں پڑھیں، اپنے اطمینان قلب کیلئے متعدد علماء ومشائخ کے حلقوں اور مدرسوں مین حاضری دی جب اطمینان ہوگیا کہ جو کچھ سیکھا ہے وہ درست اور صحیح ہے تو ان کے استاذ شیخ محمد جلالیؒ نے سند فراغ عطا کی، اپنے بھائی ملا عبد اللہؒ سے ملاقات کے لئے شیروان گئے ایک سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ملا عبد اللہؒ نے اپنے چھوٹے بھائی سعیدؒ کے علم وفضل اور ذہانت وصلاحیت کو دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار کیا، ان کی بڑی ہمت افزئی

کی، بھائی کی صحبت میں دو ماہ گزار کر پھر حصول علم کے لئے ''سعرت'' روانہ ہو گئے، اور ملا فتح اللہ کے حلقہ میں شریک ہوئے، ان کے استاذ اور دیگر علماء نے انھیں تدریس اور وعظ و ارشاد کی اجازت دی۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۹۲ء میں شہر ''ماردین'' کی جامع مسجد میں پڑھانا اور لوگوں کے مسئلوں اور فتووں کا جواب دینا شروع کیا، بعض حاسدوں نے ان کی مقبولیت کو دیکھ کر حاکم شہر سے ان کی شکایت اور بدگوئی کی، حاکم نے ان کو شہر بدر کر کے ''بدلیس'' روانہ کر دیا۔

ف: علماء راسخین کے ساتھ ہم عصروں کے طرف سے حسد اور حکومت کی طرف سے عداوت کا سلسلہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے اسلئے علماء کو خاص طور سے نہایت زیرکی اور ہوشیاری سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کسی بلا اور مصیبت کے شکار ہو سکتے ہیں (مرتب)

وہاں پہنچ کر وہ مزید علمی مطالعہ میں منہمک ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں ''شیروان'' منتقل ہوئے اور عصری علوم ریاضی فلکیات، کیمیاء، فزکس، جیالوجی، فلسفہ اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا، اس سے انہیں علمی و فکری امتیاز حاصل ہو گیا۔

ف: یہ تھی علم کے حصول کی حرص جس کی وجہ سے اس کے لئے محنت اور مشقت برداشت کرتے تھے جو آج کل عنقاء ہے۔ واللہ الموفق (مرتب)

برطانوی وزیر کا بیان: اسی دوران انہوں نے برطانوی نوآبادیوں کے وزیر مسٹر گلادستن کا ایک بیان مقامی اخبارات میں پڑھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ ''جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے پاس موجود ہے ہم ان کے ملکوں میں اپنی حکمرانی قائم نہیں کر سکتے، اس لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم یا تو

قرآن مجید کو غائب کر دیں یا اس سے مسلمانوں کا رشتہ توڑ دیں'' اس بیان نے ان کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا اور ان کی نیند حرام کر دی انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت سے محسوس کیا کہ معاملہ انتہائی سنگین ہے، مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھرپور اور مکمل منصوبہ تیار کر لیا ہے ان کے عقیدہ و دین اور مقدسات پر حملہ آور ہونے کے لئے سازش تیار کر رہا ہے، وہ ۱۸۹۶ء میں استنبول گئے اور مشرقی اناضول میں الزہرا کے نام سے ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کا جامع منصوبہ پیش کیا، یونیورسٹی کے نظام تعلیم اور نصاب درس میں اسلامی علوم کی تعلیم کے علاوہ اسلامی حقائق کی نشر و اشاعت کو شامل کیا، اور مسلمانوں کی سائنس وٹکنالوجی میں ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ افسروں اور حکمرانوں نے اس بارے میں ان کا کسی قسم کا تعاون نہیں کیا اس کی ایک وجہ جنگ عظیم کا آغاز بھی ہے وہ مایوس ہو کر مشرقی علاقہ میں واپس آ گئے اور زیادہ وسیع پیمانے پر علمی و اصلاحی کام شروع کیا۔

۱۹۰۷ء میں دوبارہ استنبول کا رخ کیا اس وقت تک ان کے علم و فضل اور اصلاحی سرگرمیوں کی شہرت عام ہو چکی تھی، علماء اور عوام نے ان کا زبردست استقبال کیا ان سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کے بعد ایک عالم نے کہا کہ ''شیخ سعید کا علم کسبی نہیں بلکہ لدنی ہے'' استنبول میں انہوں نے سلطان عبدالحمید سے ملاقات کر کے دینی مدرسوں کے قیام کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے اسکول و کالج قائم کرنے کا مشورہ دیا، اور اس کی بڑی پرزور وکالت کی، اسلامی شوریٰ کے قیام اور شریعت کے مکمل نفاذ کا مطالبہ کیا اس سلسلہ میں ذمہ داروں

سے ملاقاتوں کے علاوہ اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے اور عوام میں تقریریں کیں۔ (جو اصل کتاب میں پڑھے جاسکتے ہیں)

کارنامہ: آپ نے اپنی محنت وجد و جہد کے ذریعہ ایک ''جماعت نور'' قائم کیا جماعت نور، عالم اسلام کی ایک ایسی منفرد جماعت تھی جس نے اپنی تحریک کا آغاز سیاست سے کیا مگر آخر میں سیاست کو شیطانی عمل قرار دے کر تعلیم وتربیت اور خانقاہی طریقہ اختیار کیا۔ شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کی وفات کے بعد جماعت نور آزمائشوں اور اختلافات کا شکار ہوگئی۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**

ارشادات

۱۔ حقیقی سعادت۔ مکمل مسرت اور نعمت اور خالص مزہ ولذت صرف اللہ تعالیٰ کی محبت ومعرفت سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ میں بغیر روٹی کے تو زندہ رہ سکتا ہوں مگر آزادی کے بغیر زندگی گزارنا دشوار ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ونعمت کا بدلہ شکر گزاری ہے۔

۴۔ جاہل دوست، دشمن سے زیادہ نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

۵۔ اگر تم اپنے دشمن کو شکست دینا چاہتے ہو تو اس کی برائیوں کا جواب اچھائیوں سے دو۔

۶۔ جو سنت شریفہ پر عمل کا عادی بن گیا تو اپنی عادتوں کو عبادت بنالے گا اور درازی عمر کو ثواب اور خوش گوار انجام کا سبب پالیگا۔

۷۔ اخلاص عمل کا ایک ذرہ، اخلاص سے خالی ڈھیروں عمل سے بہتر

ہے۔

۸۔نام تبدیل ہونے سے حقیقت نہیں بدلتی ہے۔

۹۔سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قصوروار نہ سمجھے۔

۱۰۔اسلام تو سورج کے مانند ہے پھونکوں سے نہیں بجھایا جاسکتا، اور دن کی طرح ہے جو پلک جھپکانے سے تاریک نہیں ہوسکتا، اور اگر کسی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تو تاریکی صرف اسی کے حصہ میں آئے گی۔

ف: ماشاء اللہ کیا خوب ارشادات ہیں جو ہم سب کے لئے موجب عبرت و نصیحت ہیں۔(مرتب)

وفات: آپ کی وفات ۲۵/رمضان ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۳/ مارچ ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون۔**

(تاریخ فکر اسلامی صفحہ ۲۱۳)

حضرت مولانا عبدالحمید صاحب بھاگلپوریؒ المتوفی ۱۳۹۷ھ

نام ونسب مع ولادت: مولانا عبدالحمید ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔آپ کے والد مولوی مولا بخش مرحوم فارسی کے ایک جید عالم تھے۔اور چچا حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن فاضل دیوبند ایک باصلاحیت متقی عالم تھے۔

تعلیم: آپ کے خاندان کے ہر دو بزرگوار کی آغوش تربیت میں مکتب کا آغاز فرمایا۔ سات سال کی عمر میں مدرسہ نعمانیہ میں حضرت شیخ الادب مولانا محمد علی امروھویؒ کے سامنے بیٹھا دیئے گئے۔شفیق استاذ کی نگرانی میں مولانا کی صلاحیت اور علمی استعداد روز بہ روز بڑھتی چلی گئی ۔سات برسوں تک مدرسہ نعمانیہ میں تحصیل علم کے بعد شیخ الادبؒ کے ساتھ مدرسہ افضل المدارس شاہجہاں پور گئے۔ پھر تین سال کے بعد جب شیخ الادب دارالعلوم تشریف لے گئے ،تو مولانا عبدالحمید بھی ان کی ہمراہی میں دارالعلوم دیوبند پہنچ کر داخلہ لیا۔

۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۳ھ کے شعبان تک دارالعلوم دیوبند میں رہ کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (م ۱۳۳۹ھ) علامہ انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۴ھ) علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (م ۱۳۶۹ھ) میاں سید اصغر حسین محدثؒ (م ۱۳۶۴ھ) مفتی عزیز الرحمٰنؒ (م ۱۳۴۷ھ) وحضرت شیخ الادبؒ کے پاس درس نظامی کے جملہ علوم فنون کی کتابیں پڑھیں، اور ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء میں

فراغت حاصل کیا۔

مدرسہ محمودیہ کا قیام: دار العلوم کے دور طالب علمی میں حضرت مولانا اور ان کے دو عظیم رفقاء حضرت مولانا دیانت احمدؒ (م ۲۴ رشوال ۱۳۰۹ھ) اور حضرت مولانا محمد غنیؒ (م ۱۳۸۶ھ) کا پروگرام بنا کہ اپنے علاقہ میں مدرسہ نعمانیہ پورینی کے طرز پر ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ فراغت کے بعد تینوں بزرگوں نے وطن پہنچ کر اس کی تحریک شروع کردی۔ اور بڑی حد تک کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اور شوال ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں شیخ الادب کی تجویز سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر مدرسہ محمودیہ کا قیام عمل میں آیا۔ ۲۰ صفر ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء کو مدرسہ محمودیہ کا افتتاح حضرت مولانا دیانت احمد کے ہاتھوں کر دیا گیا۔ چند ماہ کے بعد مدرس دوم کی حیثیت سے حضرت مولانا غلام محمد غنی کی تقرری عمل میں آئی۔ مولانا عبدالحمید نے ایک سال کے لئے دار العلوم کے شعبۂ افتاء میں داخلہ لے لیا، ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء میں فارغ ہوکر جب وطن واپس آئے، تو مدرسہ کے لئے آپ کا تقرر بھی عمل میں آیا۔

مدرسہ محمودیہ سمریا ان تینوں بزرگوں کے اخلاص اور جدو جہد کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کو ایک مثالی اور مرکزی ادارہ بنانے میں مولانا عبدالحمیدؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ انتھک کوشش کی۔ تعلیم معیار کو اس حد تک پہنچا دیا کہ طلبہ اپنی علمی استعداد مین ایک عرصہ تک دار العلوم دیوبند مین وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔

مولانا ایک جید عالم تھے۔ ضلع بھاگلپور میں آپ کا دائرہ اثر بہت وسیع تھا۔ قرب وجوار میں لوگ آپ کو بڑے مولانا یا بڑے مولوی صاحب کے نام سے یاد

کرتے ہیں۔

بیعت: آپ کو بیعت کی اجازت حضرت مولانا محمد سہول عثمانیؒ سے تھی، مگر کبھی کسی کو بیعت نہیں فرماتے۔

تلامذہ: آپ کے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد ہے۔ جن میں مولانا احمد بن مولانا محمد سہول عثمانیؒ، مولانا محمد حسین، مولانا محمد خلیل، مولانا عبد السلام، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا ابوالحسن سرمد پوری، مولانا حسین احمد منظر، مولانا حکیم جمیل احمد، مولانا حکیم فدا حسین، مولانا قمر الحسن، مولانا ریاض احمد، مولانا محمد مشتاق، مولانا حافظ محمد ہاشم، مولانا محمد مستغنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آپ نے دو حج کئے۔ پہلا ۱۹۳۴ء میں اپنے مخلص ساتھی حافظ دیانت احمد کے ساتھ اور دوسرا ۱۹۵۵ء میں۔

وفات: مولانا کی وفات ۳ فروری ۱۹۶۰ء مطابق ۶ شعبان ۱۳۷۹ھ کو کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے ہوئی۔ دوسرے دن ظہر و عصر کے درمیان اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ نماز جنازہ حضرت مولانا دیانت احمد نے پڑھائی۔

نور اللہ مرقدہ۔ (تذکرہ علماء بہار صفحہ: ۱۷۰)

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رح[1] متوفی ۱۳۷۹ھ

نام ونسب: نام مولانا احمد سعید، خطاب سحبان الہند اور تخلص اسیر ہے، والد کا نام حافظ نواب مرزا ہے جو زینت المساجد میں امام تھے اور مکتب میں پڑھاتے تھے۔

ولادت: آپ کی ولادت ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں دریا گنج دہلی میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم: آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفی آبادی سے حاصل کی اور تکمیل حفظ قرآن کی دستار بندی مدرسہ حسینیہ بازار مٹیا محل میں ہوئی۔

ابتدائی مشاغل: شروع شروع میں مولانا کو وعظ کی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ بعد میں کوچہ چیلاں کی مسجد جو اب مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ کی مسجد کہلاتی ہے اس میں بھی مولانا نے ہر جمعرات کو وعظ کہنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا:

''بھئی! ہماری زندگی تو شروع سے ہی قلندرانہ زندگی ہے۔ جب ہم کسی کے گھر پر جا کر وعظ کہتے تھے تو دو روپئے نذرانہ ملتا تھا۔ کچھ تارکشی کا کام کر لیتے تھے اس طرح عسرت کے ساتھ گزر بسر ہوتی تھی''۔

---

[1] آپ کے حالات وخیالات اور کارنامے کو بہت سے اہل قلم نے تحریر کیا ہے۔ ان سب کو ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے یکجا کر دیا ہے اسی سے یہ مضمون ماخوذ ہے۔ (مرتب)

عربی تعلیم کی ابتدا: غالباً ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک کا زمانہ تھا مولانا کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی۔ آپ کبھی کبھی فوارہ پر تقریر کرتے تھے۔ سامنے نواب روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ تھا اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ اس کے صدر مدرس تھے۔ مدرسے کے طلبہ بھی ان تقریروں میں آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ انھیں میں سے حضرت مفتی اعظمؒ کے ایک ہونہار ذی استعداد اور منتہی شاگرد مولانا قاری حافظ محمد یاسین سکندرآبادی بھی تھے۔

مدرسے میں مولانا کا داخلہ شوال ۱۳۲۸ھ میں ہوا اور شرح مائۃ عامل مفید الطالبین وغیرہ اسباق شروع ہوئے مولانا کی سند میں مندرجہ ذیل کتابیں درج ہیں۔

تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، قدوری وغیرہ وغیرہ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب کے حکم سے وعظ کا نذرانہ لینا بالکل بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد کٹرہ ہدو محلہ فراش خانہ کی مسجد میں آپ نے ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ روزانہ صبح کو آپ وہاں جا کر ترجمہ بیان کرتے تھے۔

عربی تعلیم سے فراغت: تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کو حضرت مفتی صاحب نے بطور معین مدرس کے مدرسے میں مقرر کیا اور کچھ ابتدائی کتابیں پڑھانے کیلئے دے دیں۔

فضل وکمال: محترم حاجی انیس دہلوی آپ کے فضل وکمال کو یوں نقل کرتے ہیں مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ حافظ قرآن تھے،

عالم وفاضل تھے، مفسر قرآن تھے، زیارت بیت اللہ شریف سے کئی بار فیضیاب ہوئے، صوفی منش، ارباب تصوف کے قدرداں، اہل فقر سے ایسی محبت کہ اپنے آپ کو فقیر لکھنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ ادیب، سخن داں، سخن شناس، نازک خیال شاعر، دلی کی ٹکسالی زبان کے ماہر، وعظ فرماتے تو روزمرہ کی زبان اور محاورے کا استعمال فرماتے تو مزا آجاتا۔

نثر نگاری میں یکتا، موقع محل اور مخاطب کے فہم وشعور کے مطابق نپی تلی بات کہنا، اپنے دل کی بات دلوں پر نقش کردیتے تھے۔ میر کی طرح میاں اور بھائی کہہ کر مخاطب کرتے، دلی کی تاریخی شائستگی اور تہذیب کے امین، غرضیکہ مولانا اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

مولانا شاعر بھی تھے اور اسیر تخلص فرماتے تھے۔ غالباً یہ تخلص مولانا کے زمانۂ اسیری کی یادگار ہے۔ شعر گوئی کے ساتھ حضرت مولانا کو شعر فہمی کا بھی خاص ملکہ تھا۔ چنانچہ جب کوئی شاعر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنا کلام سناتا تو پورے انہماک کے ساتھ اُسے سنتے اور داد سے بھی نوازتے۔ مستند اساتذہ کے بے شمار اشعار آپ کو یاد تھے۔ اکثر برمحل اور برجستہ انہیں پڑھ دیا کرتے تھے۔

سحبان الہند: ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری صاحب آپ کے اوصاف یوں نقل کرتے ہیں۔ مولان احمد سعید دہلویؒ کا علمی تبحر بے مثال تھا۔ وہ فاضل اجل تھے، بہترین خطیب تھے، انتہائی خوش گفتار تھے۔ جب خالص دہلی کی ٹکسالی زبان میں گفتگو فرماتے تو معلوم ہوتا کہ دہن مبارک سے گل پاشی فرمارہے ہیں۔ جب تقریر فرماتے تو سامعین اتنے دم بخود اور ہمہ تن گوش ہوجاتے کہ معلوم ہوتا

جیسے ان پر کسی نے سحر کر دیا ہو۔ مولانا شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی ۔ ان کی تحریریں شگفتگی اور چاشنی سے لبریز ہوتیں، ان میں اختصار اور جامعیت بھی پائی جاتی۔

ہر لفظ ناپ تول کر استعمال کرتے۔ جملوں کی بندش ایسی کہ ان میں نہ کسی لفظ کے اضافے کی گنجائش ہوتی نہ تخفیف کی۔

مولانا کی فصاحت و بلاغت اور خوش گفتاری و شیریں مقالی ضرب المثل تھی۔ اسی لئے ان کو 'سحبان الہند' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نسبت کی صحیح قدر و قیمت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ 'سحبان الہند' کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے۔ سحبان نامی حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں مشہور شاعر گزرا ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت میں بے نظیر و بے عدیل تھا۔ اس کے باپ کا نام وائل تھا۔ اس لئے 'سحبان وائل' مشہور ہوا۔ اس کی فصاحت نے ضرب المثل کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

تصانیف : آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں مگر سب سے اہم اور علمی کار نامہ آپ کی عام تفسیری کلام ہے۔ جسے آپ نے ۱۸ سال کی شب و روز محنت اور عرق ریزی کے بعد ۱۹۵۶ء میں شعبان کی ۱۴ رتاریخ کو پورا کیا۔ مولانا کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ اتنی زندگی دے کہ میں تفسیر مکمل کرلوں۔ الحمدللہ یہ خواہش پوری ہوئی۔ مولانا کی وفات کے بعد مولوی محمد سعید نے تفسیر کشف الرحمٰن کے نام سے شائع کی۔ بعد میں پاکستان سے بھی طبع ہوئی۔

ف : علماء نے آپ کے ترجمہ و تفسیر کو بہت پسند فرمایا ہے، خصوصاً حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ترجمہ کی بڑی

تعریف فرمائی ہے، چنانچہ ہم سب کو اس کے پڑھنے کا شوق ہوا مگر افسوس کہ اب وہ نایاب ہے اس لئے اس کی تحصیل میں بڑی دقت ہوئی مگر کنتھاریہ بھروچ گجرات کے بعض مخلص کی وجہ سے اس کا عکس موصول ہوا۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ (مرتب)

مولانا کی شاعری: مولانا شاعری بھی کرتے تھے۔ اسیر تخلص تھا۔ افسوس کہ اب ان کا کلام دستیاب نہیں۔ ذوقِ سخن بہت اعلیٰ اور پاکیزہ تھا۔ ان کو ادبی محفلوں اور شعری نشستوں سے بڑی رغبت تھی۔

جناب انیس دہلوی نے مولانا کے متعلق ایک مضمون میں ان کی ایک مناجات بھی نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ "شبِ قدر میں اس رات کی فضیلت کچھ اس طرح بیان کرتے کہ مغفرت کی دعا کرتے وقت لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اور رات کے پچھلے پہر اندھیرا کر کے بڑے جذباتی انداز میں دعا کرتے تھے اور اپنی لکھی ہوئی یہ مناجات بھی پڑھتے تھے۔

منتظر ہیں آنے کی آنکھیں ہماری دیر سے
آنے والے آ، یہ مجمع طالب دیدار ہے
جلوہ دکھلا کر تمنا پوری کر دے دید کی
اپنی چشم شوق پورے سال سے بیدار ہے
کچھ سنے تو عرض کر دیں دردِ دل کا مدعا
گرچہ قابو میں نہیں دل اور زباں بیکار ہے
سخت طوفان ہے، ہوائیں ہیں خلاف
اس پہ آفت یہ کہ کشتی بر سرِ منجدھار ہے

تنگ جینے سے ہوئے ہیں جینے والے اے کریم
زندگی سے اپنے ہر اِک باحیا بیزار ہے
بخشنے سے گر گناہوں کے تجھے کچھ عذر ہے
پھر بتا جائیں کہاں وہ کون سی سرکار ہے
پھیر جا، اپنی معافی کا قلم بس پھیر جا
کہنے والا کہہ گیا ہے تو مرا ستار ہے

ف: ماشاء اللہ بہت ہی رقت آمیز اور موثر مناجات ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو دل سے یہ مناجات پڑھنے کی توفیق دے آمین۔(مرتب)

وفات: مولانا نے ۴؍دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ ساڑھے سات بجے شب اچانک داعی اجل کو لبیک کہا، اگلے دن درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے باہری حصہ ظفر محل کے قریب خود ان کی وصیت کے مطابق مفتی کفایت اللہ صاحب کی دائیں جانب تدفین عمل میں آئی۔ نمازِ جنازہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ امیر جماعت تبلیغ نے پڑھائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

حضرت مولانا مفتی اسماعیل کاسوجی کفلیتوی رحمہ اللہ المتوفی ۱۳۸۰ھ

نام ونسب: آپ کا اسم گرامی اسماعیل ہے۔ والد کا نام محمود ہے، ان کا پیشہ کاشتکاری تھا، بڑے دیندار اور دیانتدار انسان تھے۔

ولادت: آپ کی پیدائش ۳۰ / جون ۱۹۰۱ء میں اپنے وطن کفلیتہ ضلع سورت میں ہوئی، کفلیتہ یہ ایک مسلمانوں کی بستی ہے جو سورت سے جانب جنوب واقع ہے۔

جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں داخلہ: آپ مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل (جو جامعہ ڈابھیل سے مشہور ہے) میں داخل ہوئے حفظ کیا، اور عربی کے پہلے درجہ تک پڑھا۔

(چند روشن ستارے بر مالک میں مؤلفہ مولانا محمد یونس ابن قاری بندہ الٰہی سورتی)

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ: ۱۲ / شوال المکرم ۱۳۳۸ھ کو دارالعلوم دیوبند میں عربی کے دوسرے درجہ میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۴ھ کو تمام علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کی، اس چھ سالہ مدت میں آپ نے کافیہ اور کنز الدقائق سے لے کر دورۂ حدیث تک کی ہی تمام کتابیں پڑھیں اس کے علاوہ فنون ومعقولات کی انتہائی دقیق کتابیں بھی پڑھیں، آپکی سند پر اس وقت کے اکابر اساتذہ وعلماء محققین نے ان وقیع الفاظ میں آپ کے علم کی شہادت دی ''**وهو عندنا جيد، سليم الفكر، له مناسبة تامه بالعلوم**'' اس سند پر

خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحبؒ ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ (مہتمم دار العلوم، دیوبند)، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ نائب مہتمم، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب ، حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ وغیرہ اساطین علم وفضل کے دستخط ثبت ہیں۔فراغت کے بعد افتاء کا نصاب بھی پورا فرمایا۔

برما میں خدمات: برما میں مانڈلے شہر کی سورتی جامع مسجد میں آپ کی آمد غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں بعمر چوبیس سال ہوئی ، آپ کے ذمہ جامع مسجد کی خطابت وامامت اور مکتب کی تعلیم تھی ،مکتب میں اس وقت آپ کے علاوہ دو ہی مدرس تھے ایک مولانا فتح محمد صاحبؒ دوسرے حافظ محمود احمد خاں میرٹھیؒ ، امامت وتدریس کے علاوہ ہر جمعہ کو قبل خطبہ بیان فرماتے تھے،کبھی کبھی عشاء کے بعد عام بیان فرماتے یہ بیان عموماً دو ڈھائی گھنٹہ کا ہوا کرتا تھا۔

تعلیم بالغاں: امامت وخطابت اور مکتب کی تعلیم کے علاوہ ذاتی طور پر اپنے گھر (مسجد ہی کے وسیع احاطہ میں مسجد ہی کا مکان جو حضرت مفتی صاحب کو رہائش کے طور پر دیا گیا تھا) کے نیچے صحن میں مختلف اوقات میں تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، صحن میں کرسیاں بچھی رہتی تھیں جوان اور بڑے عمر کے حضرات آکر استفادہ کرتے تھے،عربی پڑھنے والے طلباء بھی ہوتے تھے،مفتی صاحب ابتدائی عربی درجہ سے مشکوٰۃ شریف تک کتابیں پڑھاتے رہے ہیں نیز مدرسہ مفتاح العلوم کی سرپرستی فرماتے تھے۔

افتاء: سورتی جامع مسجد ’مانڈلے‘ کی طرف سے آپ افتاء کا کام بھی کیا کرتے تھے نیز تبلیغی کام بھی کرتے تھے اور عملیات کا سلسلہ بھی رکھتے تھے جس سے لوگوں کا نفع

ہوتا تھا۔

دینی وملی خدمات: آپ مرکزی علماء برما کے رکن اعلیٰ بھی تھے، دینی وملی خدمات میں بھی شریک رہتے تھے۔مساجد و مدارس کے مہمانوں کی مہمان نوازی فرماتے تھے۔

خدمت اہل مدارس: مساجد ومدارس سے چندہ والے جتنے اندرون ملک اور بیرون ملک سے آتے آپ کا گھر مرکز اور آپ ان کی مہمان نوازی فرماتے اور حتی الامکان تعاون بھی فرماتے ضرورت پر مختلف جگہ اپنے متعلقین کے نام رقعہ لکھ کر بھیجتے۔

خدمت غرباء: غرباء،یتیم اور بیواؤں کا خیال رکھتے اور انکا تعاون فرماتے، اپنی جان پہچان والوں کے پاس رقعہ لکھ کر بھیجتے جس سے ان کا کام بن جاتا۔

جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں درس تدریس: کفلیۃ میں تین سال قیام کرنے کے بعد جامعہ' ڈابھیل' کے مہتمم مفتیٔ گجرات حضرت مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہ صاحبؒ کی دعوت پر جامعہ ڈابھیل تشریف لائے اور تدریس کا کام شروع فرمایا۔

بیعت: شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں زیارت وملاقات وبیعت کی غرض سے پہنچے،حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ تمہارا رجحان یہاں نہیں تم گورکھپور مولانا وصی اللہ صاحب کے پاس چلے جاو۔

مفتی صاحب گورکھپور کیلئے نکلے مگر گورکھپور کا راستہ نہیں جانتے تھے اتفاق سے سرائے میرؔ میں حافظ رفیق برمی سے ملاقات ہوئی جنہوں نے مفتی صاحب

سے برما میں پڑھا تھا اور جاپان کی لڑائی کے وقت ہندوستان میں سرائے میر پہنچ کر وہیں کسی مسجد میں امام رہ چکے تھے اور حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں آتے جاتے تھے، وہ مفتی صاحبؒ کو گورکھپور لے گئے اور حضرت سے بیعت کی درخواست کی حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس ایک چلہ رہو چنانچہ ایک چلہ رہے۔

وفات: آپ کی وفات ۱۳۸۰ھ مطابق ۳۰؍جنوری ۱۹۶۰ء کو برما میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ **نور اللہ مرقدہ۔**

(چند روشن ستارے برما ملک میں صفحہ: ۱۴)

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری ؒ م: ۱۳۸۰ھ

نام ونسب وولادت: حضرت مفتی صاحب غلام اٹک کے قصبہ واہ کے قریبی گاؤں موضع ملپور میں پیدا ہوئے، مشہور تاریخی مقام حسن ابدال سے آپ کا گاؤں کوئی دس گیارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، جس وادی میں یہ گاؤں واقع ہے اس کو دریائے ہرو کی وادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا اللہ داد صاحبؒ بھی اپنے وقت کے ایک معروف محدث، خادم دین اور اپنے گردونواح میں ایک معزز ہستی اور جانی پہچانی شخصیت تھے، اور خاندان کے بیشتر افراد دین سے خصوصی تمسک رکھنے والے تھے، آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں پائی اور تکمیل علوم ودورۂ حدیث امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں کیا، اور وہیں اقامت فرمائی۔

چونکہ آپ نہایت ذہین وفطین طالب علم تھے، مزید محنتی بھی حد درجہ کے تھے اس لئے اسباق پر ایسے حاوی ہوتے تھے کہ گویا ان اسباق کے متعلم نہیں بلکہ معلم ہیں چنانچہ آپ نہایت ذی استعداد عالم ہو کر نکلے، اور تعلیمی وتدریسی کام بھی بدرجہ اتم انجام دیا۔

بیعت وخلافت: امرتسر کو وطن ثانی بنانے کے بعد حضرت کو محسوس ہوا کہ کسی مردِ حق آگاہ سے اصلاح باطن کے لئے خصوصی تعلق اور قلبی رابطہ قائم کرنا ضروری ہے، چنانچہ آپ کے قلب مبارک میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ حکیم الامت حضرت مولانا

شاہ اشرف علی تھانویؒ سے نسبت پیدا کی جائے، اور اسی غرض سے حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور بے تکلف اپنی حاضری کا مقصد عرض کر دیا۔

اُس ملاقات میں حضرت حکیم الامتؒ نے تین شرطیں درمیان میں رکھ دیں کہ انہیں پورا کیا جائے تو تعلق قائم ہے، پہلی شرط یہ کہ کسی قاری سے فن قرأت حاصل کیا جائے، دوسری یہ کہ کسی استاذ الحدیث سے جو حنفی مسلک کا ہو دورۂ حدیث کیا جائے، تیسری یہ کہ ہمارے دوست حکیم غلام مصطفی صاحب بجنوری سے اصلاح کا تعلق پیدا کر کے پورے پچیس مرتبہ خط و کتابت کر کے حکیم صاحب موصوف کی طرف سے وہ پورے پچیس خط مجھے دکھائے جائیں، حضرت مفتی صاحب نے امرتسر میں مدرسہ غزنویہ میں دورۂ حدیث تو کیا تھا مگر وہاں اہل حدیث مسلک کے اساتذہ تھے، چنانچہ حضرت مفتی صاحب نے تینوں شرطیں دو سال میں پوری فرمادی، دیوبند میں حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ سے دورۂ حدیث کا فیضان حاصل کیا، حضرت مولانا کریم بخش صاحب سے فن قرأت کی سند حاصل کی اور پورے دو سال میں حکیم غلام مصطفیٰ صاحبؒ سے پچیس خطوط بھی وصول فرمالئے، اس طرح آپ کو حضرت حکیم الامتؒ کی نسبت و رفاقت کا شرف نصیب ہوا اور آپ کو ۱۱رذی الحجہ ۱۳۴۳ھ کو طریقت کے چاروں سلسلوں میں بیعت فرمالیا گیا، اور کل تین سال کی محنت و ریاضت اور تزکیۂ نفس پر خلعت خلافت عطا فرمادی گئی، چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ:

''میرے قلب میں بار بار اس کا تقاضہ ہوتا ہے کہ میں آپ کو

توکلاً علی اللہ بیعت و تلقین کی اجازت دوں، اگر کوئی طالبِ حق
درخواست کرے انکار نہ کریں، اور اپنے خاص دوستوں کو اس کی
اطلاع کردیں۔ اور مجھ کو اپنا پتہ جس سے ڈاک پہونچ سکے لکھ
بھیجیں، میں اپنی یادداشت میں درج کرلوں گا۔ فقط"

اس کے بعد کیا پوچھنا ہے، مفتی صاحب نے ماشاء اللہ دین وطریق کی خوب ہی خوب خدمت انجام دی، ہزارہا ہزار اشخاص کو آپ کی ذات گرامی سے فیض پہونچا۔ **ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ** ۔

ارشاد: اکثر آپ فرمایا کرتے تھے کہ زحمت، زحمت نہیں ہوتی بلکہ رحمت ہوتی ہے اور پھر فرماتے کہ اللہ رب العزت جس وقت جیسا بھی بظاہر ناگوار کوئی تصرف اپنے کسی بندہ پر فرمائیں اس میں بندہ کے لئے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں رحمتیں ہوتی ہیں، چنانچہ حضرت مفتی صاحب کی حیات طیبہ اس کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔

مرض: حضرت کو ۵۸ سال کی عمر میں دائیں پاؤں پر فیل پاؤ کی بیماری لاحق ہوگئی اور آپ کے پاؤں ہی میں ایک ایسا پھوڑا نکل آیا جو اتنا بڑھ گیا کہ بالآخر ستر برس کی عمر میں حضرت کو ساری ٹانگ کٹوادینی پڑی، نہایت اذیت رساں اور سخت قسم کا بدبودار پھوڑا تھا، حضرت اس کی بدبو کی وجہ سے اس کی مرہم پٹی خود ہی فرمالیا کرتے تھے اور آپ پسند نہیں فرماتے تھے کہ ان کی وجہ سے کسی کو تھوڑی بہت بھی اذیت پہونچے۔

ف: سبحان اللہ! کیسی رعایت اپنے اہل وعیال اور متعلقین کی تھی جو ہمارے لئے موجب عبرت ونصیحت ہے۔ (مرتب)

آپریشن : ڈاکٹر حضرات کا اصرار تھا کہ کوئی بے ہوش کرنے والی دوا سے حضرت کو بے حس اور بے ہوش بنا دیا جائے، اس کے بعد عمل جراحی شروع کیا جائے، اِدھر حضرت مفتی صاحب کو اپنے آپ پر بے ہوشی کا غلبہ طاری کر کے اللہ رب العزت کے ذکر سے غافل رہنا ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں تھا، نیز یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ بے ہوشی کے عالم میں روح پرواز کر جائے، اس لئے جب ڈاکٹر حضرات نے بہت اصرار کیا تو ارشاد فرمایا کہ آپ اپنے کام میں لگے رہئے، میں اپنے کام میں لگا رہوں گا۔

بالآخر ڈاکٹر حضرات نے کاٹی جانیوالی جگہ کو ایک ٹیکہ سے معمولی سا بے حس کر کے ران مبارک کو اوپر سے کاٹنا شروع کیا، پورے ایک گھنٹہ تک یہ عمل جراحی جاری رہا اور جب ڈاکٹر حضرات فارغ ہو چکے تو حضرت مفتی صاحب نے الحمدللہ فرمایا۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ بس میری تو آج عید ہوگئی۔

ف : ظاہر ہے کہ اس صبر آزما آپریشن کے بعد اللہ کی معیت اور صبر کے اجر و ثواب کو مستحضر کر کے یہ بات فرمائی ہوگی کہ اس رضوانی و احسانی خزانوں کے سامنے یہ زخم اور آپریشن کی اذیت و تکلیف کچھ بھی نہیں، ہیچ در ہیچ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَاب** (مرتب)

مدارس : حضرت مفتی صاحب امرتسر میں رہے تو جامعہ نعمانیہ میں قیام فرمایا اور بہت سی عمارات تعمیر فرمائی، پھر جب لاہور میں ورود فرمایا وہاں بھی جدید اشرفیہ کی تعمیرات کا ایسا سلسلہ قائم فرمایا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(ماخوذ از "بیس بڑے مسلمان" مولفہ مولانا عبدالرشید ارشد صاحب)

ف: ان تعمیرات کو دیکھ کر مولانا عبدالباری ندویؒ نے حضرت مولانا کو ایک خط تحریر کیا۔

مولانا عبدالباریؒ کا مکتوب: عمارت کے اسی سلسلے کو حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے دیکھ کر مولانا مفتی صاحبؒ کو لکھا تھا کہ ''آخر اس عمارت کا کیا حاصل؟'' تو مفتی صاحب نے اس کا جواب یوں تحریر فرمایا: ''حاصل تو نہ عمارت کا ہے نہ عبارت کا''، چونکہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ زبردست ادیب ومصنف تھے اس لئے ادبی انداز میں جواب دیا، مطلب یہ ہے کہ ہر کام میں اصل تو صدق واخلاص ہے پس اگر یہ ہے تو خیر ورنہ تو جیسے تعمیر کا کچھ حاصل نہیں ایسے ہی تصنیف وتالیف کا بھی کچھ نفع نہیں۔ (مرتب)

تواضع وفنافی الشیخ: آپ کے مخلص احباب نے آپ کے ملفوظات کے قلمبند کرنے کی اجازت طلب کی تو فرمایا: حضرت حکیم الامتؒ مولانا تھانویؒ کے ملفوظات کی موجودگی میں میری کوئی بات قلم بند ہو یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں۔

اور آخر عمر میں کمزوری کے باعث جب خود کلام کرنے سے عاجز ہوگئے تو حضرت مولانا تھانویؒ کے ملفوظات کے پڑھوانے کا اہتمام فرمایا اور مجلس میں وہی سنائے جاتے تھے۔

ف: چنانچہ اسی ادب وتواضع کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دینی ودنیوی ہر قسم کی رفعت عطا فرمایا، طریق کی بھی خوب ہی خوب خدمت لی، مدارس قائم کرائے اور مفتی پاکستان کا منصب عطا فرمایا۔ **ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔**

مرشدی مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ

حضرت مولانا کے یہاں خانقاہ میں علماء میں حضرت مولانا محمد حسن صاحب امرتسریؒ صاحب حال عالم تھے، چنانچہ خود فرماتے تھے کہ جب اذان ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صور پھونکا جا رہا ہے اور پیشاب خطا کر جائے گا۔

نیز مفتی صاحبؒ فرماتے کہ جب اللہ تعالیٰ کا ارشاد **نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَة** پڑھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قلب پر آگ دھک رہی ہے۔ (ترجمہ آیت) وہ اللہ کی آگ ہے جو (اللہ کے حکم سے) سلگائی گئی ہے جو (بدن کو لگتے ہی) دلوں تک جا پہونچے گی۔

ف: سبحان اللہ! آخرت کا کیسا استحضار تھا، اگر یہ حال تھوڑا سا بھی کسی کے قلب پر طاری ہو جائے تو آدمی گناہ کبیرہ تو بڑی بات ہے صغیرہ کے پاس بھی نہ پھٹکے۔ **(مرتب)**

وفات: ۱۶/ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ مطابق یکم جون ۱۹۶۱ء کو بروز جمعرات کراچی میں انتقال ہوا، اور وہیں مدفون ہوئے۔ نور اللہ مرقدہ۔

(بزم اشرف رص ر ۱۵۸)

محترم جناب نواب حمید اللہ خان بھوپال المتوفی ۱۳۸۰ھ

سلطان جہاں بیگم کے تین صاحبزادے نواب نصر اللہ خاں، نواب عبید اللہ خاں اور نواب حمید اللہ خاں تھے۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے نواب حمید اللہ خاں کی ولادت ۸/ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء آصف جہاں بیگم کے انتقال کے بعد ہوئی اور غمزدہ ماں کے لئے سرمایۂ تسکین بنی۔ نواب صاحب کی تربیت بہ نفس نفیس ان اصولوں پر فرمائی جن کا ان کو ذاتی تجربہ تھا، چنانچہ چارسال چار ماہ چاردن کے ہونے پر بسم اللہ کی تقریب کی گئی۔ اردو، فارسی مولوی محمد حسین خاں سے سیکھی اور ناظرہ قرآن کا لفظی ترجمہ سرکار عالیہ نے خود شروع کرایا، انگریزی کے لئے پہلے پنڈت دیودت کو پھر ماسٹر سید لیاقت علی صاحب کو مقرر کیا گیا۔ سرکار عالیہ نے عصری تقاضوں کے مطابق ایسا نصاب تیار کرایا جو قدیم وجدید علوم وفنون کا جامع ہو چنانچہ الیکزینڈر ا ہائی اسکول ۱۹۰۳ء میں ایک لاکھ ۵۳/ ہزار ۶۴/ روپیہ لاگت سے قائم کیا گیا جس کے اندر نواب صاحب اور اخوان ریاست کی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ پھر ۱۹۱۰ء میں علی گڈھ تعلیم کے لئے نواب صاحب بھیج دیئے گئے اور ۱۹۱۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی، اے کیا۔ ایک سال تک قانون کا مطالعہ کیا اور جب علی گڈھ یونیورسٹی کے چانسلر ہوئے تو اس نے ایل ایل بی کی ڈگری دی۔

اعلیٰ حضرت اپنی خاندانی خصوصیات سادگی، فیاضی اور مخلوق خدا کی

ہمدردی کے پیکر تھے، زمانۂ طالبعلمی میں ان کے دست سخاوت سے کتنے فیضیاب ہوتے، اسی دور میں قومی تحریکات سے دلچسپی پیدا ہوئی اور ملک کے اعلیٰ لیڈروں سے ذاتی تعلقات کے رشتے قائم ہوئے، چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے قبضۂ نامرضیہ میں جب کہ حکومت نے ایک مفلوج یونیورسٹی مسلمانوں کے سر تھوپ دی اور احرار اسلام نے اس کی مخالفت کی تو نواب صاحب حکومت کے مخالف گروپ میں تھے اس لئے سرکار عالیہ کو اس کی صفائی کے لئے (جب ان کو نواب بنائے جانے کی تجویز بھیجی تھی) تو لندن جانا پڑا۔ بچپن ہی سے ہر قسم کی رفاہی و اصلاحی، قومی و ملی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، چنانچہ جب وہ گیارہ سال کے تھے اور بھوپال میں آصفیہ ٹیکنیکل اسکول قائم ہوا تو اس کی امداد کے لئے سب سے پہلے ہاتھ بڑھایا اسی طرح ۱۹۱۷ء میں انجمن تعلیم نسواں لاہور کی صدارت کی اور نسواں کالج کے لئے دس ہزار عطیہ دیا اور اٹھارہ سو روپیہ سالانہ مقرر کیا۔ (تاریخ ریاست بھوپال: ص/۱۰۸)

نواب صاحب کی تخت نشینی اور ان کی والدہ محترمہ کی تقریر دلپذیر

نواب حمید اللہ خاں کی تخت نشینی کے وقت ان کی والدہ محترمہ نے جو تقریر کی وہ ان کی حیات دینی کی آئینہ دار ہے۔ اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے اور آپ کی والدہ کے حالات و کمالات جلد دہم میں انشاء اللہ لکھے جائیں گے۔

"آج ۲۵/سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ مالک حقیقی نے بھوپال کی حکومت میرے سپرد کی تھی میں نے خود کو ریاست کا امین سمجھا اور رعایا کی فلاح کو مآل زندگی بنایا تاہم یہ امکان باقی ہے کہ حکومت کی اہم ذمہ داریوں میں مجھ سے

کوئی فروگذاشت ہوئی ہو جس سے کسی کے دل کو کچھ تکلیف پہنچی ہو اس کے لئے میں آج اس موقع پر ان لوگوں سے معافی چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ مجھے معاف کر کے عند اللہ ماجور ہوں گے اس دو سال کے عرصہ میں جو متصل اور پیہم صدمات مجھے برداشت کرنا پڑے اگرچہ ان کو مشیت الٰہی سمجھ کر انتہائی صبر و سکون سے کام لیا مگر آخر کار میرے دل پر ایک خاص حالت پیدا ہو گئی ہے جس سے مجھے یقین ہے کہ اس کا اثر حکومت پر پڑے گا اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حکومت کے بارگراں سے سبکدوشی حاصل کروں اور عنانِ حکومت اپنے وارث اور جانشین کو تفویض کر کے بقیہ عمر یاد خداوندی اور صنف ضعیف کی خدمت میں بسر کروں۔ اب میں آپ لوگوں سے بحیثیت حکمران بھوپال رخصت ہوتی ہوں اور مجھے بے انتہاء مسرت ہے کہ آج اپنے ہاتھ سے اپنے عزیز فرزند کو انتقال حکومت کر رہی ہوں۔ نواب سکندر صولت افتخار الملک بہادر اب میں اپنی خوشی سے آپ کو صدر نشین کرتی ہوں اور امید رکھتی ہوں کہ آپ کلام مجید کے تمام احکام و مسائل پر کاربند ہوں گے بالخصوص اس آیت شریفہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔ **ان اللہ یامر بالعدل۔ الخ**

چنانچہ نواب صاحب نے برسر اقتدار آتے ہی سب سے پہلے عصری تقاضوں کے ماتحت مختلف محکمہ جات اور ہر محکمہ کے لئے وزیر مقرر کئے جن کو اختیارات دے کر وزراء کے باہمی مشورہ کے لئے ایک کمیٹی اسٹیٹ کونسل کے نام سے قائم کی۔ (ص ر ۱۱۳)

سیاسی کارنامے: شروع میں کچھ اہم باتیں درج کرنے کے بعد حضرت

علامہ سید عابد علی وجدی الحسینی صاحبؒ یوں رقمطراز ہیں:

ہم یہاں اس یادگار معاہدہ کو نقل کرتے ہیں جو حکومت ہند سے نواب صاحب اور وی پی مینن کے درمیان ہوا جس کا آغاز اس طرح ہوا:

''اب ریاست کا نظم و نسق حکومت ہند کے ذریعہ ہوگا جو منتقلی اختیارات کے بعد آئندہ پانچ سال تک چیف کمشنری کے صوبہ کے طور پر رکھا جائے گا یعنی انڈیپنڈ اسٹیٹ مانا جائے گا۔ یہ بھی مزید طے کیا گیا کہ پانچ سال گزرنے کے بعد انتظامیہ پر نظر ثانی کی جائے گی معاہدہ ہذا کے ذریعہ جو اختیارات اور مالکانہ حقوق فرماں روائے بھوپال کو حاصل ہوں گے ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ذیل شرائط طے پائی ہیں۔

ا:۔ نواب صاحب بھوپال اپنے تمام کمال و اقتدار حکومت و اختیارات حدود ریاست کی حکمرانی سے متعلق یکم جون ۱۹۴۹ء کو حکومت ہند کو منتقل کرتے ہیں اور یہ تاریخ منتقلی کی تاریخ سمجھی جائے گی۔

۲:۔ نواب صاحب بھوپال اپنے ذاتی حقوق و مراعات جو بھوپال کے فرماں روا ہونے کی حیثیت سے انھیں ۱۵ ؍اگست ۱۹۴۷ء سے قبل حاصل تھیں بدستور حاصل رہیں گی۔

۳:۔ موجودہ نواب صاحب تاریخ منتقلی اقتدار سے گورنمنٹ آف انڈیا سے گیارہ لاکھ روپئے سالانہ بلا کسی محصول کے وصول کرنے کے حقدار ہوں گے، وہ رقم جو نواب بھوپال اور ان کے بعد ان کے وارثوں کو تحت دفعہ (۱) ادا کی جائے گی۔ اس پر نواب صاحب بھوپال اور ان کے خاندان کے جملہ مصارف

رہائش شادی و دیگر تقریبات کا خرچ شامل ہوگا۔ اور کسی سبب سے بھی رقم مذکورہ میں کمی بیشی نہیں کی جائے گی یہ طے شدہ رقم جاری مساوی اقساط میں ماہ گزرنے پر پیشگی نواب صاحب کے مقررہ بینک میں جمع کی جائے گی۔

۴:۔ تحت دفعہ ۱۸/ وہ آمدنی جو ہر سال نواب صاحب بھوپال کے اس حصہ سے جو قدسیہ بیگم نے بھوپال اسٹیٹ ریلوے میں لگایا تھا حاصل ہوگی اسے ساڑھے پانچ لاکھ سالانہ طے کیا جاتا ہے۔ اور یہ آمدنی نواب صاحب کی ذاتی آمدنی شمار کی جائے گی اور حکومت ہند نواب صاحب اور ان کے وارثوں کو ادا کرے گی۔

۵:۔ دفعہ ۱۱۵/ کے ماتحت نواب صاحب کی اپنی ذاتی جائیداد یعنی مختلف ریاستی جائیدادوں کے مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے جو انھیں تاریخ منتقلیٔ اقتدار سے قبل حاصل تھے۔

۶:۔ تمام منقولہ جائداد، کفالت نامے اور نقد نامے ایک فہرست کی شکل میں مرتب ہو کر نواب صاحب بھوپال کی ذاتی ملکیت و استعمالی اشیاء جس طرح تاریخ منتقلی سے قبل فریقین کے درمیان طے پا کر مختتم سمجھی جائے گی اور اس بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا جائے گا۔

۷:۔ دفعہ ۱/ کے تحت نواب صاحب بھوپال کے خاندان کے افراد کے جملہ ذاتی مراعات و اعزازات و القاب خواہ اندرون ریاست ہوں یا بیرونی جو انھیں ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو حاصل تھے بدستور رہیں گے۔

۸:۔ دفعہ ۱۱۷/ کے ماتحت حکومت ہند اس امر پر متفق ہے کہ ریاست بھوپال کی تخت نشینی کا معاملہ قانون وراثت و تخت نشینی ۱۹۴۷ء کے ماتحت طے ہوگا۔

۹:۔ حکومت ہند مزید اس پر بھی متفق ہے کہ جو حقوق و مراعات نواب بھوپال کو حاصل ہیں ان کے وارث کو بھی حاصل ہوں گے۔

۱۰:۔ حسب دفعہ ۱۱۸/نواب صاحب کے کئے ہوئے کسی کام کی بابت جو انھوں نے معاہدہ ہذا سے قبل انتظام ریاست کے بارے میں کیا ہو خواہ وہ ذاتی حیثیت سے ہو یا فرماں روا کی حیثیت سے ہو اس کے متعلق کسی قسم کی کارروائی یا باز پرس نہیں کی جائے گی۔

۱۱:۔ حکومت ہند جملہ مستقل عملہ ملازمانِ ریاست کو سابقہ شرائط و مراعات کے ساتھ جو انضمام سے قبل حاصل تھے ملازمت میں رکھے گی اور اگر کسی وجہ سے تخفیف ضروری ہوئی تو انھیں معاوضہ قانون نافذ الوقت کے تحت دیا جائے گا اور جو مراعات انھیں ریاست بھوپال میں حاصل تھیں بدستور رہیں گی۔

۱۲:۔ حکومت ہند اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ جملہ پینشن رخصتی مشاہرات منظور شدہ افسران ملازمان ریاست کو جو ریٹائر ہو چکے ہیں یا پینشن سے قبل رخصت پر ہیں باقاعدگی سے ادا کی جائیں گی اور مرحوم ملازمان ریاست کے پسماندگان کو بدستور معاوضہ جو تاریخ انضمام ریاست سے قبل دیا جاتا تھا جاری رہے گا۔

۱۳:۔ تاریخ انضمام ریاست سے قبل کی کسی کارروائی کی بابت جو دوران ڈیوٹی کسی ملازم نے نیک نیتی سے کی ہو یا کرنے سے رہ گئی ہو کوئی باز پرس، تحقیقات یا کارروائی نہیں کی جائے گی۔

مذکورہ معاہدہ کی توثیق کے لئے مسٹر وی پی مینن (مشیر حکومت ہند) کی

جانب سے اور نواب صاحب بھوپال نے اپنی اور اپنے وارثوں کی جانب سے دستخط کیے۔

اس موقع پر نواب صاحب کی اولوالعزمی اور امانت ودیانت کے لئے اس واقعہ کا اظہار ضروری ہے جو ریاست کے ایک ذمہ دار نے راقم الحروف کو بتایا۔ جب ریاستیں انڈین یونین میں ضم ہونے لگیں تو اکثر راجوں، مہاراجوں اور حکمرانوں نے ریاستی خزانوں پر جھاڑو لگادی جو کچھ زر، نقد وغیرہ سرکاری خزانوں میں جمع تھا اس کو اپنے تصرف میں لے آئے، حکومت ہند نے جب ان ریاستوں کو قبضہ یا تو ان خزانوں میں خاک اڑ رہی تھی لیکن نواب صاحب بھوپال نے جب ریاست کا چارج دیا تو خزانے جوں کے توں تھے بلکہ اعلیٰ حضرت نے اپنی ریاستی جاگیر جو فرماں روا کی حیثیت سے ان کی ملکیت تھی وہ بھی حکومت کو دیدی۔ صدر منزل جو ان کی ذاتی جائیداد تھی بحق گورنمنٹ واگذاشت کیا البتہ اپنی قدیمی وفاداران ریاست کو بہت سے مکانات بہ مراحم خسروانہ بخش دیئے۔

عہد حمیدی کے علماء: جب نواب صاحب تخت نشین ہوئے تو مفتی محمد یحییٰ، قاضی ریاست اور مولوی عنایت اللہ خلف مولانا لطف اللہ علی گڈھی مفتی تھے، ان کے انتقال پر نواب صاحب کے استاد قاضی محمد حسن مراد آبادی قاضی ریاست اور مفتی عبدالہادی خانصاحب مفتئ ریاست ہوئے، آخر میں پیرانہ سالی سے جب قاضی صاحب سبکدوش ہوئے تو علامہ سید سلیمان ندوی قاضی القضاۃ وامیر الجامعہ بن کر ۱۹۴۵ء میں تشریف لائے، دور حمیدی میں بھی ریاست علمائے حق کا مرکز رہی۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب سیوہاروی عربی ادیب مہتمم مدرسہ

احمد یہ (عم محترم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب) مولانا بشیر احمد صاحب محدث شاگرد حضرت گنگوہیؒ، مولانا نظام الدین منطقی شاگرد مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، امام ہیئت غلام محی الدین قندھاری علامہ خالد انصاری، مولانا ابراہیم خلیل، قاضی رضوان الدین صاحب، قاضی محمد شعیب صاحب، مولانا عبدالرشید مسکین وغیرہ جیسے اہل علم وفضل سے اہل دین کی گرم بازاری رہی۔

شاہ محمد یعقوب مجددی خانقاہ مجددیہ میں اور حضرت شیریں رقم صاحب کے خلیفہ حافظ ظہور احمد صاحب نور محل اور مولانا ضیاء الدین سے روحانیت کی شعاعیں پھیلتی رہیں۔

وفات: نواب صاحب نے ۲ر فروری ۱۹۶۰ء مطابق ۱۳۸۰ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا ان کے انتقال سے پوری ریاست میں غم وماتم کی صف بچھ گئی بلاتفریق مذہب وملت ہر شخص نے آخری فرماں روا کا آخری دیدار کیا اور پورے فوجی اعزاز سے مسجد صوفیہ احمد آباد بھوپال میں اپنی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ نور اللہ مرقدہما۔

اولاد: نواب صاحب کے تین صاحبزادیاں ہوئیں عابدہ سلطان جو نواب سرور علی خاں نواب کوروائی سے اور ساجدہ سلطان جو نواب افتخار علی خاں نواب پٹودی سے اور رابعہ سلطان جو ان کے بھتیجے رشید الظفر خاں سے اولاً منسوب ہوئی اور پھر آغا نادر مرزا سے شادی ہوئی۔

(تاریخ ریاست بھوپال، مؤلفہ علامہ سید عابد علی قاضی بھوپال: ص ر ۱۰۷)

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ م ۱۳۸۱ھ

نام ونسب وولادت: آپ کا آبائی وطن قصبہ جلال ضلع گوجرانوالہ ہے، تاریخ ولادت جمعہ ۲؍رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ ہے، آپ کے والد ماجد شیخ حبیب اللہ نومسلم تھے مگر کامل دیندار اور نسبت چشتیہ کے حامل تھے، غیر مسلم اعزہ واقارب کی دشمنی کی بناء پر قصبہ جلال کی سکونت ترک کر کے موضع ''باہو چک'' میں رہائش اختیار فرمائی۔

تعلیم: آپ کی والدہ ماجدہ پیدائشی مسلمان اور پابند صوم وصلوٰۃ تھیں، چنانچہ آپ کو قرآن پاک آپ کی والدہ محترمہ ہی نے پڑھایا۔ اس کے بعد آپ کے والد ماجد نے مولانا عبدالحق خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ کے حلقۂ درس میں داخل کیا جہاں نصاب فارسی سے آپ کی دینی تعلیم کی ابتدا ہوئی، اس کے بعد والدِ محترم نے آپ کو مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے سپرد فرمایا اور مولانا نے بخوشی قبول فرمایا اور اپنے ساتھ سندھ لے گئے، اور بہترین تعلیم وتربیت کر کے درس نظامی کی تکمیل فرمائی اور غالباً ۱۳۲۶ھ یا ۱۳۲۷ھ میں دستار بندی ہوئی۔

روحانی سلسلہ: آپ ابھی نو سال ہی کے تھے کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ساتھ

---

(۱) آپ کی مفصل سوانح ''مردِ مومن'' کے نام سے مکرم مولانا عبدالحمید خان صاحب نے لکھی ہے نیز حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے ''پرانے چراغ'' حصہ اول میں مبسوط مضمون تحریر فرمایا ہے، اور اس میں اپنے تلمذ واصلاحی تعلق کو بھی لکھا ہے غرض ہم انہیں دونوں سوانح کو سامنے رکھ کر آپ کے کسی قدر حالات وارشادات نقل کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ مفید بنائے۔ آمین (مرتب)

۱۸۹۵ء میں حضرت شاہ خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوری [1] کی زیارت کے لئے گئے جو اپنے زمانہ کے عارف اور ولی کامل تھے، توانہوں نے نورِ فراست سے آپ کی صلاحیت اور استعداد کو معلوم کر کے خود سلسلۂ قادریہ میں بیعت فرمالیا اور اللہ کے نام کی تلقین فرمائی، اس طرح ظاہری تعلیم کے ساتھ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔

ف: اس سے معلوم ہوا کہ طالب علمی کے زمانہ میں بھی رشتۂ بیعت قائم کیا جاسکتا ہے اور شیخ ذکر کی تلقین کرسکتا ہے، ہاں مگر اتنا خیال رہے کہ اس کی وجہ سے ظاہری تعلیم میں حرج واقع نہ ہو۔ (مرتب)

حضرت کا روحانی تعلق علاوہ خلیفہ دین پوری کے حضرت مولانا ابوالحسن شاہ تاج محمد امروٹی سے بھی تھا اور یہ دونوں حضرات شیخ طریقت حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی ؒ کے خلیفہ ومجاز تھے۔

مگر اولاً آپ کو حضرت امروٹی ؒ ہی نے بیعت وتلقین کی اجازت دی اور حضرت خلیفہ دین پوری نے تصویب وتصدیق فرمائی، کچھ عرصہ کے بعد آپ نے بھی خرقہ خلافت سے مشرف فرمایا۔

ف: اس طرح مولانا ظاہری وباطنی جملہ علوم وکمالات کے جامع ہوگئے، جس کی وجہ سے جیسے کتاب وسنت کی تعلیم سے مسند درس وتدریس کو رونق بخشی ویسے ہی ذکر وفکر اور تزکیۂ نفوس سے خانقاہ کو منور ومعمور فرمایا، جس کی تفصیل ان کی سوانح بنام ''مردِ مومن'' میں دیکھی

---

(۱) آپ کی خدمت میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ تشریف لے گئے ہیں نیز شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب ؒ حاضر ہوئے ہیں اور تحسینی کلمات فرمائے ہیں۔ (مرتب)

جاسکتی ہے،آج بھی ایسے حضرات کاملین کی امت کو ضرورت ہے،اللہ تعالیٰ اس کی صورت پیدا فرمائیں،اس لئے کہ وہی حقیقی مربی اور بہترین کارساز ہیں۔(مرتب)

طریقہ بیعت: آپ اپنے مریدین سے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیعت لیتے تھے،اوراپنے خلفاء کو بھی اسی کی ہدایت فرماتے تھے،وہ الفاظ یہ ہیں:

توبہ کی میں نے شرک سے،کفر سے،تیری نافرمانی سے،اے اللہ! تیرے دروازہ پر آیا ہوں،تو مجھے اپنا شوق نصیب فرما،اپنا نام نصیب فرما،مجھ سے وہ کرا جس میں تو راضی ہو،میں آپ سے بیعت کرتا ہوں اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جو حکم آپ بتائیں گے اس پر صدق دل سے عمل کروں گا،اور اس پر میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کرتا ہوں۔(مردِ مومن:ص/۷۷)

عمومی تعلیمات: آپ ہر بیعت ہونے والے سے تین باتوں کا اقرار لیتے تھے:

(۱) روزانہ کم از کم ایک ہزار بار ذکر اسم ذات اللہ جل جلالہ،کروں گا۔

(۲) نماز پنجگانہ کی پابندی کروں گا۔

(۳) کسی کو دُکھ نہ دوں گا۔

ف: یہ تعلیمات بظاہر سادہ اور معمولی نظر آتی ہیں مگر سارے تصوف وطریقت کا نچوڑ اور اسلام وانسانیت کا خلاصہ ہے۔کاش ہم لوگ اتنے ہی پر عمل کر لیتے،تو خالق ومخلوق دونوں سے تعلق استوار ہوجاتا اور دین ودنیا کی خیروبرکت نصیب ہوجاتی،وباللہ التوفیق۔(مرتب)

مولانا کی حقانیت: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا اگرچہ اپنے استاذ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو اپنا سب سے بڑا محسن سمجھتے تھے،

اور اپنے کو ان کا ساختہ و پرداختہ سمجھتے تھے، ان سے اخذ کئے ہوئے طرز تفسیر کو انہوں نے پورے طور پر اپنا لیا تھا اور اس کی اشاعت و تعلیم کو وہ اپنے فرائض زندگی میں سے سمجھتے تھے [1] لیکن ان کا یہ سارا تعلق دین کے تابع تھا اور وہ اپنی اس نیازمندی وفاداری میں عقیدۂ اہلِ سنت اور مسلک سلف سے بال برابر بھی ہٹنا گوارا نہیں فرماتے تھے، چنانچہ جب مولانا سندھیؒ طویل مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور انہوں نے بعض اپنے خیالات و افکار کا اظہار فرمایا جو مولانا کے نزدیک صحیح الخیال علماء اور راسخ العقیدہ جماعت کے عقائد و افکار و مسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے تو مولانا نے ان کے خیالات میں متابعت نہیں فرمائی بلکہ صاف اپنے اختلاف کا اظہار کر دیا، جس سے مولانا سندھیؒ کو رنج بھی ہوا اور شکایت بھی پیدا ہوئی اس لئے کہ وہ مولانا سے اس کی بالکل توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن مولانا احمد علیؒ نے اس کی بالکل پرواہ نہیں کی اور پوری نیازمندی اور سعادت مندی کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہے۔ (پرانے چراغ، حصہ اول، ص ر ۱۵۸)

ف: ۔ اس لئے کہ مطاع مطلق تو بس اللہ تعالی اور رسول پاک کی ذات پاک ہے، نہ کہ کوئی استاذ و مرشد، لہذا اگر کسی کا بھی کوئی عمل یا عقیدہ خلاف شریعت وسنت ہوگا تو اس کی اطاعت نہ کی جائے گی اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صریح ارشاد ہے: **"لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق"** یعنی اللہ تعالی کی معصیت کی صورت میں کسی بھی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ (مرتب)

---

[1] مولانا نے اس درس قرآن کی ابتداء ۱۹۱۷ء سے کر دی تھی اور وہ اخیر دم تک قائم رہا۔
(حاشیہ پرانے چراغ)

ارشادات

(۱) فرماتے تھے کہ قرآن مجید کا خلاصہ ہے، بندے سے توڑ خدا سے جوڑ۔

ف: سبحان اللہ! قرآن مجید کا کیا ہی خوب خلاصہ بیان فرمایا ہے، جو مستحضر رکھنے کے قابل ہے۔ (مرتب)

(۲) اگر کوئی شخص آسمان پر اُڑتا ہوا آئے، لاکھوں مرید پیچھے لگا لائے، دریا پر سے گذرتا ہوا آئے مگر اس کا مسلک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے خلاف ہو تو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا گناہ ہے، اس کی بیعت حرام ہے، اگر ہو جائے تو توڑنا فرض عین ہے ورنہ خود بھی جہنم میں جائے گا اور اپنے پیچھے چلنے والوں کو بھی جہنم رسید کر دے گا۔

(۳) جب مسلمان کو اخلاص اور توکل کے دو پر لگ جاتے ہیں تو پھر وہ روحانیت کے آسمان پر اُڑنے لگتا ہے۔

(۴) طلب صادق ہو تو کچھ عرصہ کے بعد شیخ کامل کی صحبت میں اس کا عکس ظاہر ہونے لگتا ہے۔

(۵) مسجدیں ہدایت کی منڈیاں ہیں، اور علمائے ربانی دکان دار، اور دکان ان کا سینہ ہے اور مال ہے قرآن، خریدار ہے مسلمان اور پونجی ہے ایمان۔ جو خالص نیت سے ایمان خریدنے یہاں آتا ہے، خالی ہاتھ نہیں جاتا۔

ف: سبحان اللہ! ان حقائق کو کیسی عمدہ مثالوں سے واضح فرمایا جو اہل اللہ ہی کا حصہ ہے۔ (مرتب)

(۶) دنیا میں سب طمع کے یار ہیں، بے طمع کا یار صرف اللہ ہے جو سب

کچھ دیتا ہے لیکن کچھ نہیں لیتا، پھر بے طمع کے یار حضرت محمد ﷺ ہیں کہ شفاعت کئے بغیر چین نہیں لیں گے، یا پھر بے طمع کے یار اللہ والے ہیں، باقی سب طمع کے یار، بیوی، اولاد اور برادری۔ اور برادری تو ایسی ہے کہ اگر اپنے بدن کے گوشت کا قیمہ بنا کر انہیں کھلا دیں تو بھی خوش نہ ہوں۔

(۷) موتی ملنے ارزاں مگر اللہ والے ملنے اس سے بھی گراں۔

(۸) عقیدت، ادب اور اطاعت سے فیض آتا ہے، ان میں سے ایک تار بھی ٹوٹ جائے تو کنکشن ٹوٹ جاتا ہے۔

(۹) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کامل ہوگیا ہوں۔ اس لئے کہ قبر میں داخل ہونے سے پہلے ہر وقت خطرہ ہے۔ ف:۔ بیشک! (مرتب)

(۱۰) میرے دوستو! طبیعتوں پر قابو رکھو، جبر وصبر کی عادت ڈالو، خدا کو یاد رکھو، یہ دنیا فانی ہے، اپنے معاملات درست کرو، رزق حلال کما کر کھاؤ۔

ف: سبحان اللہ! کیسی عمدہ نصیحتیں ہیں جو لائق عمل ہیں۔ (مرتب)

(۱۱) مرد کام کے لئے اور عورت اس کے آرام کے لئے ہے۔

ف: کاش دونوں اپنے اپنے وظیفہ کو پورا کریں تو دونوں آرام سے رہیں، ورنہ تو گھر جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ (مرتب)

(۱۲) حدیث کا انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے اور قرآن سے انکار کرنے والے کا ایمان سلب ہوجاتا ہے۔

(۱۳) جو شخص کسی کو فریب نہیں دیتا وہ ہر کسی کے نزدیک عزت حاصل کرلیتا ہے۔ (مرد مومن از ص: ۲۰۷ تا ۲۱۲)

صحبت صالحین کی فضیلت اور ضرورت:

(۱) امراض روحانی کا علاج صحبتِ شیخ کے سوا کچھ نہیں، کتابیں پڑھنے سے یہ دور نہیں ہوتے، دینی مدارس میں کتابوں پر عبور ہو جاتا ہے مگر تکمیل نہیں ہوتی، اس لئے علماء کی بھی کما حقہ اصلاح نہیں ہوتی، امراضِ روحانی جسمانی امراض سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ جسمانی بیماریاں قبر کے وَرے ختم ہو جاتی ہیں، روحانی بیماریاں ساتھ ساتھ جاتی ہیں، زمینداروں، سرکاری ملازمین، تاجروں کو تو جانے دیجئے، اہل علم بھی ان روحانی بیماریوں سے نجات نہیں پاسکتے جب تک کہ اصلاح کا خاص اہتمام نہ کریں۔

ف: سبحان اللہ! کیسی واضح حقیقت بیان فرمادی ہے، مگر افسوس کہ اس کی طرف بہت سے خواص کی بھی توجہ نہیں۔ (مرتب)

(۲) مدارس عربیہ میں طلبہ کو علم دانستن کے درجے پر حاصل ہو جاتا ہے، داشتن کے درجہ پر نہیں، یعنی دین سمجھ کر آتے ہیں لیکن اکثر ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جن پر عملی رنگ چڑھا ہوا نہیں ہوتا۔ اس لئے علماء کے اندر بھی روحانی بیماریاں باقی رہتی ہیں جب تک اللہ والوں کی صحبت نصیب نہ ہو۔

(۳) نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اس کے سوا باقی تمام کمالات نبوی کے حاملین اب تک رہے ہیں، اب بھی موجود ہیں اور قیامت تک رہیں گے، انہیں کی صحبت میں اصلاحِ حال ہوتی ہے، اللہ والے موتیوں سے بھی گراں قیمت ہیں، موتی ملنے ارزاں لیکن اللہ والے ملنے گراں، وہ نایاب نہیں کمیاب ہیں، اگر کامل مل جائے تو اس کے قلب سے ادب، عقیدت اور اطاعت کے تین تار

جوڑنے سے فائدہ ہوتا ہے، اس کے بغیر حضور نبی کریم ﷺ کے حضور میں بھی رہنے والے محروم رہے جن کو آنحضرت ﷺ کا نہ پاس ادب تھا اور نہ عقیدت تھی اور نہ وہ اطاعت کرتے تھے۔ (مردمومن: ص ر ۱۴۰)

ف: اب بغیر ان شرائط پر عمل کئے بزرگوں سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں تو بتلائیے، آخر فیض کیسے حاصل ہوگا؟ اور عدم حصول کی صورت میں بزرگوں ہی سے بدعقیدہ و بدگمان ہوتے ہیں، العیاذ باللہ تعالی، سچ کہا گیا ہے ؎

خود فراموشی کند تہمت دہد استاد را

غریب کی آہ: میں کہا کرتا ہوں کہ امیر سے مت ڈریئے، اس کو اپنی دولت، پارٹی اور راثر ورسوخ پر ناز ہوتا ہے، وہ غیر کے دروازہ پر جاتا ہے، وہ پولیس اور عدالت میں جائے گا، اس کا آپ مقابلہ کرسکیں گے، غریب سے زیادہ ڈرنا چاہئے، اگر اس کو آپ نے ستایا تو وہ غیر کے دروازے پر نہیں جائے گا، وہ صرف بارگاہ الٰہی میں فریاد کرے گا، اور دو آنسو بہا کر خاموش ہو جائے گا۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

مظلوموں کی آہ سے ڈرو کیونکہ جب وہ بددعا کردیتے ہیں تو اللہ تعالی کی جانب سے قبولیت استقبال کے لئے آتی ہے۔

اس کے (یعنی غریب کے) دو قطرہ آنسو بربادی کے لئے کافی ہیں۔

(ص ر ۱۴۲)

آخری ایام اور وفات: آپ کی قبولیت و مرجعیت برابر بڑھتی گئی، اور آخری

زندگی میں تو یہ حال ہوگیا کہ لوگ دور دور سے پروانہ وار آتے اور ایک ہجوم رہتا، بعض اوقات ملاقات اور زیارت کے لئے آنے والوں کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا اور بہت دیر میں باری آتی۔

بالآخر وہ وقت آگیا کہ نصف صدی پُرمشقت اورطویل مجاہدہ کا سفر طے کرنیوالا اپنی آخری آرام گاہ پر پہونچے اور اپنی محنت ووفاداری کا انعام پائے، ۱۳۸۱ھ کے رمضان المبارک کی ۱۸/تاریخ مطابق ۲۳/فروری ۱۹۶۲ء کو حاضری کا پیام آگیا، اور نماز عشا میں بحالتِ سجدہ انتقال ہوا اور خادم قرآن، قرآن کے نازل کرنے والے کے جوار رحمت میں پہونچ گیا۔

مولانا جب لاہور آئے یا لائے گئے تو تن تنہا تھے، اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا تھا لیکن جب اس شہر کو داغِ مفارقت دیا تو خدا کے ہزاروں بندے سوگوار اور ان کے فراق میں اشکبار تھے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (پرانے چراغ: ج/۱، ص/۱۶۳)

یہ آخرت کا گھر یعنی جنت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد پھیلانا، اور آخر میں انہی لوگوں کا بھلا ہوتا ہے جو پرہیزگار ہیں۔

حضرت مولانا عبدالشکورؒ صاحب لکھنویؒ م: ۱۳۸۱ھ

ولادت: آپ کی ولادت ۲۳/ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۷۶ء میں قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: ابتدائی تعلیم آپ نے فتحپور ہنسوہ میں حاصل کی، پھر لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ کی خدمت میں رہ کر بقیہ کتب درسیہ پڑھیں، طب حکیم عبدالولی مرحوم سے پڑھی۔

درس وتدریس: فراغت کے بعد مولانا محمد علی مونگیریؒ کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بحیثیت مدرس تشریف لے گئے، لیکن کچھ ہی دنوں بعد اس سے ترک تعلق کرلیا اور دہلی تشریف لے گئے، اسی زمانہ میں لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ میں ایک شیعہ مولوی مقبول احمد نے علی الاعلان تبرّا کی مجلسیں پڑھنا اور سنّیوں کو مناظرے کے چیلنج دینا شروع کردیا، مولانا عین القضاۃ نے شیعوں کے دفاع کیلئے آپ کو دہلی سے لکھنؤ بلایا، پھر آپ نے دشمنان صحابہؓ کے خلاف اپنے آپ کو وقف کردیا۔

آپ کا کارنامہ: آپ نے حسب ضرورت عیسائیوں، آریہ سماجیوں، قادیانیوں اوران کے علاوہ دوسرے فرقہائے ضالہ سے مناظرہ کیا، لیکن آپ کا خاص موضوع

---

(۱) آپ اہل سنت والجماعت کے جلیل القدر ربانی عالم اور نقشبندی مجددی سلسلہ کے صاحب مقام اور صاحب ارشاد شیخ، اپنے وقت کے ایک مشہور صاحب لسان اور صاحب قلم عالم، ہفتہ وار ''النجم'' لکھنؤ کے ایڈیٹر اور شاہ ابواحمد مجددی بھوپالیؒ کے مرید تھے۔

شیعی حملوں سے صحابہ کرامؓ اور مسلک اہل سنت کی حفاظت اور ان کا دفاع اور مذہب تشیع کی ضلالتوں کو واضح کر کے حجت قائم کرنا تھا، چنانچہ آپ نے اسی مقصد کے لئے ایک ادارہ ''دارالمبلغین'' کے نام سے لکھنؤ میں قائم فرمایا جو آپ کا اہم کارنامہ ہے۔

آپ نے بہت ساری کتابیں تصنیف فرمائیں جو آپ کی علمی یادگار ہیں۔ مثلاً ترجمۂ قرآن، ترجمہ اسد الغابہ، ترجمہ فقہ اکبر، سیرت خلفاء راشدین وغیرہ آپ کی علمی یادگار ہیں۔

اب حضرت مولاناؒ کے ان علمی کارنامے اور خصوصیات کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیں جن کو پروفیسر عبدالحیؒ نے اپنی کتاب ''عہد رفتہ کے چند نامور علماء ومشائخ'' میں ذکر کیا ہے۔

ماہنامہ ''علم الفقہ'' کا اجراء: مولانا لکھنویؒ نے ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد فوراً تدریسی مشاغل کے ساتھ ساتھ ایک ماہوار فقہی رسالہ ''علم الفقہ'' کے نام سے لکھنؤ سے جاری کیا تھا، جو پورے چھ سال تک پابندی کے ساتھ نکلتا رہا، یہ رسالہ خالص فقہی مضامین پر مشتمل تھا۔

''علم الفقہ'' کی خصوصیت: ''علم الفقہ'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فقہی مسائل کو آسان اردو زبان میں مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف فیہ مسائل میں فقہاء کے اختلافات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور ہر ایک کی رائے لکھ کر آخر میں کسی ایک کی رائے کی تائید کر کے اپنی تصدیق وترجیح بھی بیان کر دی گئی ہے، جس سے کتاب میں ایک خاص علمی شان پیدا ہو گئی ہے۔

حضرت لکھنویؒ کی تصنیفات وتالیفات مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں، آپ نے

سیرتِ مقدسہ پر بھی کتابیں لکھی ہیں، تاریخ وسیر، فضائل ومناقب، فقہی مسائل، ترجمہ قرآن مجید، احادیث وتفسیر، شیعیت، رضاخانیت، قادیانیت اور آریہ سماجیت کی تردید میں بھی آپ نے قلم اٹھایا اور پھر اس کا حق ادا کردیا۔

آپ نے اپنی کتابوں اور ترجموں کی بدولت اُردو زبان کے نثری ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، بعض موضوعات میں تو آپ کو اولیت حاصل رہی ہے، جس کا اعتراف اُردو کے محققین نے بھی کیا ہے، مثلاً عام مسلمانوں کے لئے فقہی مسائل پر ''علم الفقہ'' کی تالیف اُردو زبان میں سب سے پہلے آپ ہی نے لکھی تھی، خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے حالات میں ''اسد الغابہ'' جیسی کتاب کو اُردو میں سب سے پہلے آپ ہی نے منتقل کیا، کم خواندہ لوگوں کے لئے سیرتِ مقدسہ پر رسائل اُردو میں سب سے پہلے آپ ہی نے مرتب کئے تھے، اُردو کی مذہبی صحافت کے میدان میں بھی آپ کا منفرد مقام رہا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ شعری ادب میں صحابہ کرام کی مدح وثناء میں آپ ہی کی تحریرات اور تحریکات سے ایک نئی صنفِ شاعری ''مدحِ صحابہ'' کے نام سے فروغ پائی، اس طرح نعت اور منقبت کے ایک حسین امتزاج اور عمومی رواج نے ادبِ لطیب میں جگہ پائی، انہی اسباب سے لکھنؤ میں کئی بار خالص مدحِ صحابہ کے مشاعرے نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئے اور اس کا سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔

بیعت وخلافت: زندگی کے آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے خاندان کی ایک عظیم الشان شخصیت اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا شاہ عبداللہ ابو احمد صاحب بھوپالیؒ

(م ۱۹۲۳ء) سے آپ بیعت ہوئے اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد شیخ طریقت نے آپ کو خلافت سے بھی سرفراز کر دیا، حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی ساری زندگی میں غالباً صرف پانچ چھ اصحاب کو خلافت سے نوازا تھا جن میں سے ایک خوش نصیب آپ بھی تھے۔

کچھ اور اہم خصوصیات: امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی اودھ کے مخصوص ماحول میں اپنی دینی وعلمی خدمات کی وجہ سے اللہ کی بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، آپ نے اسلام کے صاف وشفاف دھارے میں مقامی اثرات کی وجہ سے جو خس وخاشاک اور نامحمود اجزا شامل ہو گئے تھے انہیں دور کر کے پھر سے اُسے صاف ستھرا اور پاک وصاف بنانے کی سعی پیہم کی جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی، آپ سے پہلے اسی نہج پر ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے بھی بڑے عظیم کارنامے انجام دیے تھے، پھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے بھی اپنی بھرپور توانائی اسی موضوع پر صرف کی۔

چنانچہ اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی بھی تھے، جنہوں نے مذکورہ بالا بزرگوں کے کاموں کو اپنی تحقیقات کی روشنی میں پایۂ اختتام تک پہنچا دیا اور پھر اس سلسلہ میں اپنا حتمی فیصلہ بھی اُمت کے سامنے رکھ دیا، جس کو زمانہ کے ہر نبض شناس عالم دین نے نہ صرف قبول ہی کیا

بلکہ اسے بہ نظرِ تحسین بھی دیکھا، اس طرح اپنے مخصوص میدان میں آپ نے ایک تجدیدی کارنامہ انجام دیا۔

آپ کی ان تعمیری مساعی میں جو بنیادی مقصد کارفرما تھا وہ یہی تھا کہ صحابہ کرامؓ کی محبت وعظمت لوگوں کے دلوں میں پیدا کی جائے، اور دین کی تبلیغ واشاعت میں ان کی جانی ومالی خدمات سے عام مسلمانوں کو واقف بنایا جائے کیونکہ یہی وہ مقدس طبقہ ہے جس نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براہ راست ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخذ کر کے امت کے ہاتھوں تک پہنچایا ہے، اگر خدانخواستہ یہ طبقہ بے اعتبار قرار پا جائے تو دین کی ہر چیز بے اعتبار ہو جائے گی۔

مولانا لکھنویؒ صحابۂ کرام کی بے پناہ محبت وعظمت کے باوجود اہل بیت رسالت کے مرتبہ اور بزرگی کا بھی پورا لحاظ رکھتے تھے، کسی موقع پر بھی ان کی عظمت وشان میں ادنیٰ سی بھی کمی انہیں برداشت نہ تھی؛ چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ فرماتے ہیں: ”تصوف کا اثر کہیئے یا مولانا کی سلامت طبع اور حقیقت پسندی کہ فرقۂ اثنا عشریہ سے طویل مناظروں کے باوجود حضرت علی مرتضیٰؓ اور امیر معاویہؓ کے بارے میں انہوں نے ہمیشہ فرق مراتب کا لحاظ رکھا، وہ بڑے جوش کے ساتھ حضرت علیؓ کی فضیلت وعظمت سے معمور بلکہ مخمور تھے، اہل بیت کرام کے بھی پورے مرتبہ شناس اور ان کی محبت میں سرشار تھے۔

سب سے بڑا امتیاز: مولاناؒ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے حبِّ صحابہ اور حبِّ اہل بیت دونوں کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے، انہوں نے جہاں اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی مرتضیٰ کرّم اللہ وجہہ کے فضائل ومناقب کو

محبت واحترام کے ساتھ بیان کیا ہے وہیں اُسی پاس ولحاظ کے ساتھ آنحضرتؐ کے عظیم المرتبت صحابی اور کاتبِ وحیِ الٰہی حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ کے بھی فضائل بیان کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دونوں بزرگوں میں جو فرق مراتب تھا اس کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے؛ چنانچہ جنگ صفین کے سلسلہ میں ان دونوں بزرگوں کے منصب ومرتبہ کے بارے میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''اس لڑائی کے متعلق اہل سنت کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ خلیفۂ برحق تھے اور حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھ والے باغی اور خاطی مگر اس خطا پر اُن کو برا کہنا جائز نہیں، کیونکہ وہ بھی صحابی ہیں اور صاحبِ فضائل ہیں، ان کی یہ خطا غلط فہمی کی وجہ سے تھی اور غلط فہی کے اسباب موجود تھے، ایسی خطا کو خطائے اجتہادی کہتے ہیں جس پر عقلاً وشرعاً مواخذہ نہیں ہوسکتا۔''

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہؓ ابتداءً تو باغی تھے مگر حضرت حسن ابن علیؓ کی صلح وبیعت کے بعد وہ بلاشبہ خلیفۂ برحق ہو گئے تھے''۔

حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اسی فرقِ مراتب کے متعلق حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے بھی حضرت لکھنویؒ سے خود اپنی سنی ہوئی ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ:

''حضرت علی مرتضیٰؓ سابقین اولین کی پہلی صف کے اکابر میں ہیں اور حضرت معاویہؓ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج

ہیں، لیکن حضرت علی مرتضیٰ ؓ سے اُن کو کیا نسبت؟ اُن کی مجلس میں اگر صفِ نعال میں بھی حضرت معاویہ ؓ کو جگہ مل جائے تو اُن کے لئے سعادت اور باعث فخر ہے۔"

مذکورہ بالا دونوں شہادتوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مولانا ؒ نے مشاجرات صحابہ اور دیگر اختلافی اُمور میں کبھی جادۂ حق سے انحراف نہیں کیا اور ہمیشہ اسی مسلکِ وسط کو ہی اختیار کیا ہے، یہی مسلک ہمارے اکابر اہل سنت کا طرۂ امتیاز ہے اور سوادِ اعظم کا متفقہ عمل ہے۔ (عہد رفتہ کے نامور علماء: ص ۱۷۰)

تعلیمات

دلی تقاضا ہے کہ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی ؒ کے کتابچہ بنام "پیغام" سے کچھ باتیں نقل کروں جسے "برادران ایمان کے نام ایک ضروری پیغام" کے عنوان سے بطور خط تحریر فرمایا ہے۔

دین الٰہی کا پہلا سبق، ایمان کے بعد نماز ہے: قرآن مجید کے دیکھنے سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ہماری شریعت میں بلکہ پیغمبروں کی شریعت میں ایمان کے بعد پہلا سبق نماز ہے۔ اس مقام پر اپنی شریعت کے مطابق دو آیتیں لکھی جاتی ہیں:

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ۔ (ابراھیم)	اے نبی! میرے ان بندوں سے جو ایمان لاچکے ہیں کہہ دیجئے کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے ان میں سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کریں، قبل اس کے کہ

وہ دن آئے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی نہ دوستیاں ہوگی یعنی قیامت کے دن۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ (بینه)

اور نہیں حکم دیا گیا لوگوں کو مگر اس بات کا کہ عبادت کریں اللہ کی، اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوں اس کیلئے عبادت کو اور نماز کو قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ اور یہ دین ہے ملت قیّمہ یعنی ملت جمیع انبیاء کا۔

ف: اس آیت سے علاوہ اس کے کہ دین الٰہی کا پہلا سبق ایمان کے بعد نماز ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پاک کی اصل بنیاد یہی تین چیزیں ہیں، اول عقیدہ توحید، دوم نماز، سوم زکوۃ، ان تین چیزوں کے سوا جس قدر چیزیں آپ نے تعلیم فرمائیں وہ انہی کے تابع ہیں۔

نمازیوں سے مالکِ عرش کے وعدے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى۔ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔

بہ تحقیق فلاح پا گیا وہ شخص جس نے پاکی حاصل کی اور اپنے رب کا نام لیا پھر نماز پڑھی (فلاح کا لفظ ہر قسم کی نعمت کو شامل ہے۔)

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بہ تحقیق میں تمہارے ساتھ ہوں بشرطیکہ تم نماز قائم کرو اور زکوۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور انکی مدد کرو اور اللہ کو اچھا قرض دو، ضرور

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ	ضرور تم سے تمہاری برائیاں مٹادوں گا اور
لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ	ضرور ضرور تم کو باغوں میں داخل کروں گا جن
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (مائدۃ)	کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

ف: اہل ایمان ذرا غور سے دیکھیں کہ کتنا سستا سودا ہے، خدا کا بندے کے ساتھ ہونا کتنی بڑی دولت ہے، اور یہ دولت صرف تین چیزوں کے عوض میں مل رہی ہے، ایمان، نماز، زکوۃ، یقینا مفت ہے اور مفت ہے۔ ؏

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یعنی قیمت اور بڑھائیے کہ ابھی سودا سستا ہے۔ (مرتب)

نماز نہ قائم کرنا مشرکوں اور کافروں کا کام ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا	نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے مت
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الروم: ۳۱)	بنو۔
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو
لَا يَرْكَعُوْنَ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ	یعنی نماز پڑھو تو نہیں پڑھتے۔ خرابی ہے
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔	قیامت کے دن جھٹلانے والوں کیلئے۔

ف: معلوم ہوا کہ نماز کی نصیحت پر عمل نہ کرنا خدا اور رسول کے جھٹلانے والوں کا کام ہے۔ (مرتب)

بے نمازیوں سے دوستی رکھنا اور انکو دینی بھائی سمجھنا جائز نہیں:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	سوائے اس کے نہیں کہ دوست تمہارا اللہ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ	ہے اور اس کا رسول، اور وہ ایمان والے

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ۔(المائدة:۵۵) جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبة: ۱۱) ترجمہ: پس اگر وہ لوگ کفر وشرک سے توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے بھائی ہیں۔

ف: پہلی آیت سے نمازیوں میں دوستی کا انحصار اور دوسری آیت سے دینی برادری کا انحصار ثابت ہوا، لہٰذا معلوم ہوا کہ بے نمازیوں سے دوستی یا دینی برادری کا برتاؤ جائز نہیں ہے۔ **(مرتب)**

اپنے متعلقین بیوی بچوں کو نماز کی تاکید کرنا ہر شخص پر فرض ہے:

وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔(طٰه:۱۳۲) اے نبی! اپنے اھل کو نماز کا حکم دیجئے، اور خود بھی نماز کی پابندی میں جو مصیبت پیش آئے اس پر صبر کیجئے۔

ف: اہل سے مراد بیوی اور ہوسکتا ہے کہ تمام متعلقین مراد لئے جائیں۔ (مرتب)

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ط اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (لقمان:۱۷) اے میرے چھوٹے بیٹے! نماز قائم کرو اور لوگوں کو اچھی بات کا حکم دو اور بری بات سے منع کرو۔ اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو۔ بہ تحقیق یہ ہمت کے کام ہیں۔

ف: یہ حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحت ہے جو انہوں نے اپنے فرزند کو کی، اللہ تعالیٰ

نے ہم کو اس لئے سنائی کہ ہم کو بھی ایسا ہی کرنا لازم ہے، چھوٹی عمر میں اپنی اولاد کو نماز کا عادی بنانا چاہئے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اپنی اولاد کو سات برس کی عمر میں نماز کا حکم دو اور جب وہ دس برس کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھیں تو ان کو مارو۔

نماز کو اچھی پڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اور خدا سے دعا مانگنا چاہئے کہ توفیق دے

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ۔(ابراھیم ۴۰)

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھ کو نماز قائم کرنے والا بنادے اور میری اولاد میں سے بھی۔

ف: اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی گئی ہے، خدا نے ہم کو یہ دعا سنائی کہ دیکھو ہمارے مقبول بندے نماز کو ایسی بڑی چیز سمجھتے تھے کہ عمدہ سے عمدہ نماز پڑھتے تھے پھر ہم سے دعا مانگتے تھے کہ اے مالک! ہم کو نماز قائم کرنے والا یعنی اچھی نماز پڑھنے والا بنادے، تم بھی ایسا ہی کرو، نماز اچھی پڑھو اور اچھی نماز پڑھنے کی توفیق ہم سے مانگتے رہو۔ (کتابچہ "پیغام")

وفات: آپ کی وفات ۱۷/ ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳/ اپریل ۱۹۶۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی، محلہ چکمنڈی، چپ شاہ میں مدفون ہیں۔

سعادت: الحمدللہ کہ آپ کی تقریر غالباً ۱۹۴۴ء میں قصبہ گھوسی محلہ مداپور میں سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ (محمد قمر الزماں عفی عنہ)

حضرت مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ متوفی ۱۳۸۱ھ

نام ونسب : سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری بن سیّد ضیاء الدین احمد بن سیّد نور الدین احمد کے آباءواجداد بخارا سے ترکِ سکونت کر کے برصغیر پاک وہند میں وارد ہوئے ۔ اس خانوادے کے کئی افراد نے علمی اور دینی حلقوں میں نام پیدا کیا ہے۔ اس خاندان کے پیش روسیّد عبد الغفار بخاری، سلطان زین العابدین والیٔ کشمیر کے مرشد تھے۔ آپ نسباً حسنی ہیں۔

ایک دوسرے فرد سیّد اکمل الدین بخاری متوطن دہلی، حضرت شاہ غلام علی دہلوی (م ۱۲۴۰ھ) کے خلیفہ ومجاز تھے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں دہلی سے ضلع سرہالی گجرات آئے تھے۔ انہوں نے سرہالی میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور ان کے پسماندگان یہیں آباد ہو گئے۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے دادا، سیّد نور الدین احمد، خواجہ شمس الدین سیالویؒ کے ارادت مند تھے۔ وہ سرہالی کے ایک دوسرے گاؤں ناگڑیاں منتقل ہوئے۔ سیّد نور الدین احمد کے فرزند سیّد ضیاء الدین احمد پشمینے کا کاروبار کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں ان کی پٹنہ میں آمد ورفت رہتی تھی۔ اُنہوں نے پٹنہ کے حکیم سیّد احمد اندرابی کی دُختر نیک سے شادی کی۔

ولادت : سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری یکم ربیع الاولیٰ ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ننھال پٹنہ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت: شاہ صاحب کی عمر ابھی تین چار سال سے زیادہ نہ تھی کہ ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا، ان کی پرورش اور ابتدائی تعلیم ننھیال میں ہوئی۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے نانا حکیم سید احمد اندرابی (جو طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے اور علومِ دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے) سے پڑھیں۔ شاہ صاحب سن بلوغت کو پہنچے تو پنجاب کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں انہیں کافی مشکلات ومصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ امرتسر آئے اور اساتذہ وقت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مولانا نور احمد امرتسری (م ۱۳۴۸ھ) سے تفسیر قرآن، مولانا مفتی محمد حسن سے حدیث اور مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی (م ۱۳۵۲ھ) سے فقہ کے اسباق پڑھے۔

عملی زندگی: مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ نے عملی زندگی کا آغاز امرتسر کی ایک چھوٹی سی مسجد میں فرائض امامت کی انجام دہی سے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آواز اور زبان میں بے پناہ تاثیر رکھی تھی۔ بحیثیت واعظ ان کی شہرت امرتسر سے پھیل کر ملک گیر ہوگئی۔ اپنے دور کے عظیم مقرر تسلیم کئے گئے۔ شاہ صاحب کے سوانح نگار آغا شورش کاشمیری مرحوم نے بجا طور پر لکھا ہے:

''جس طرح ہر بڑے آدمی کی خصوصیت اس کا نام لیتے ہی حافظہ کی لوح پر آجاتی ہے۔ مثلاً غالب کا نام لیتے ہی ایک عظیم شاعر کا تصور بندھتا ہے۔ اسی طرح شاہ جی کے ذات خطابت سے مختص ہوگئی ہے۔ وہ سراپا خطابت ہیں۔''

آپ کی خطابت: ۱۹۲۶ء مطابق ۱۳۴۴ھ میں ایک جلسہ عام دہلی دروازہ لاہور کے باغ میں مولانا محمد علی جوہر (م ۱۳۴۹ھ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کے ایک مقرر شاہ صاحب تھے۔ مولانا جوہر نے اپنے

تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ ''کامیابی کا سہرا اس بے مثال مقرر کے سر رہا۔ جن کا اسم گرامی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہے۔ ان کی قرآن خوانی، ان کی اردو، ان کی پنجابی، ان کی متانت، ان کی ظرافت، غرض ہر چیز نے سامعین کو مسحور کئے رکھا۔ لوگوں کا تقاضا تھا کہ شاہ صاحب اپنی تقریر جاری رکھیں۔ شاہ صاحب بھی تیار تھے مگر میرے کہنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جلسہ غالباً دو بجے شب کو ختم ہوا۔ ورنہ وہیں صبح ہو جاتی۔،،

سیاست میں شرکت: مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تحریکِ خلافت کے زمانے میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور قید و بند زندگی کے معمولات میں شامل ہو گئے۔ جس کی تفصیل اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

بیعت: مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری ابتداء میں پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوئے بعد میں مولانا عبد القادر رائے پوری (م ۱۳۸۲ھ) کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ (تذکرہ علماء پنجاب ص ۷۹۳)

حاضر جوابی: حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی پاکستانی حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''بیس بڑے اولیاء'' میں اپنے استاذ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے حاضر جوابی کے چند واقعات نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

نبوت کے بہترین گواہ: شاہ جی نے مختلف اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کا دو صحابہؓ کبارؓ کو بہترین گواہ قرار دیا۔ پہلے جناب حضرت عمر بن خطابؓ اور دوسرے حضرت خالد بن ولیدؓ کو، تو کسی نے سوال کیا اور ابوبکر صدیقؓ؟ ارشاد فرمایا ان کی

اس مقدمے میں سرکاری گواہ کی حیثیت تھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے سے دوست تھے لیکن یہ دونوں بہادر دشمن اور سخت دشمن تھے لیکن نبوت کی صداقت کو یقین کر کے شرف ایمان سے مشرف ہوئے۔

ف: سبحان اللہ! کیا ہی خوب نکتہ بیان فرمایا اللہ سمجھنے کی توفیق دے آمین (مرتب)

کھاتے رہو پیتے رہو روزہ نہیں ٹوٹے گا: شاہ جی کی علمی عظمت سیاسی منزلت، مذہبی جاہ وجلال اور خطابت کی شہنشاہیت کا جواب نہیں، محفل احباب میں بھی تو وہ سب کے دلوں کی دھڑکن ہوا کرتے تھے جس محفل میں ہوتے میرِ مجلس ہوتے لطائف کا دور چلتا تو محفل کشت زعفران بن جاتی۔

ایک وکیل نے رمضان کے دنوں میں شاہ جی سے بزعم خویش مذاق کرتے ہوئے کہا کہ حضرت علماء تعبیر و تاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمایئے کہ آدمی کھاتا پیتا رہے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے فرمایا سہل ہے، قلم کاغذ لے کر لکھو!

"ایسا مرد چاہیے جو اس وکیل صاحب کو صبح صادق سے مغرب تک جوتے مارتا جائے یہ جوتے کھاتے جائیں اور غصے کو پیتے جائیں اسی طرح کھاتے جائیں اور پیتے جائیں۔"

فرمایا! جاؤ اس طرح کھاتے پیتے رہو روزہ کبھی نہ ٹوٹے گا۔

ف: سبحان اللہ! کیسا دندان شکن جواب دیا۔ (مرتب)

بشریتِ رسولﷺ: آج ملک میں نور و بشر کے جھگڑے نے جو طوفان مچا رکھا ہے کسی بھی ذی ہوش سے مخفی نہیں دونوں طرف کتابوں اور دلائل کے انبار لگ

رہے ہیں جب شاہ صاحب نے دیکھا کہ لوگ اس موضوع پر ملت کی کشتی ڈبونا چاہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے منکرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''بھائی لوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی نسل ہو اور بٹیروں کی بھی لیکن ایک ہم سید ایسے ہیں کہ جن کی نسل نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تم بشر نہیں مانتے ہو تو پھر ہم کس کی اولاد ہوئے؟''

ف: سبحان اللہ! کیا ہی خوب حقیقت آشکارا فرمایا۔ (مرتب)

جب روٹی مقصد ہو تو کتا اور انسان برابر ہیں: بعض اوقات ان کا ایک ایک جملہ، ضخیم کتابوں اور عظیم ڈکشنریوں پر بھاری ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔

''جو لوگ روٹی کے لئے جد و جہد کرتے اور اسی کے لئے جیتے ہیں ان میں اور ایک کتے میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی روٹی کیلئے بھونکتا ہے اور دُم ہلا کر مالک کے پیچھے چلتا ہے۔ روٹی کوئی چیز نہیں اصلی چیز عقیدہ اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دھن ہے۔

ف: بہت عمدہ مثال دی جو حقیقت کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ شاہ صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (مرتب)

ختم نبوت کی حفاظت: تحفظ ختم نبوت حضرت شاہ صاحب کی زندگی کا مشن تھا اور پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنی تمام تر مساعی اس کے لئے وقف کر دی تھیں، ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''ختم نبوت کی حفاظت میرا جزء ایمان ہے جو شخص بھی اس رداء

کو چوری کرے گا، جی نہیں چوری کا حوصلہ کرے گا میں اس کے گریبان کی دھجیاں پھاڑ دونگا میں میاں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہ جیؒ میاں کہا کرتے تھے) کے سوا کسی کا نہیں، نہ اپنا نہ پرایا میں انہیں کا ہوں وہی میرے ہیں۔ جن کے حسن و جمال کو خود رب کعبہ نے قسمیں کھا کھا کر آراستہ کیا ہو میں ان کے حسن جمال پر نہ مرمٹوں تو لعنت ہے مجھ پر اور ان پر جوان کا نام لیتے ہیں لیکن سارقوں کی خیرہ چشمی کا تماشا دیکھتے ہیں''۔

دولت انسان کی خدمت کے لئے: یورپ کے صنعتی انقلاب اور مادی تہذیب نے اگرچہ ساری دنیا کا رخ ''من'' سے ''تن'' کی طرف پھیر دیا ہے اور دلوں کی انگیٹھیاں عرصہ سے سرد ہو چکی ہیں۔ سچ ہے ع

دل کے ہنگامے مۓ مغرب نے کر ڈالے خموش

مگر حضرت شاہ صاحب من کی دنیا اور استغنا کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ دولت سے بے رغبتی آپ کی طبیعت ثانیہ تھی۔

وفات: آخری ایام حیات میں ملتان منتقل ہو گئے تھے وہیں ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ راگست ۱۹۶۱ء کو وفات ہوئی، **رحمہ اللہ تعالیٰ**

(بیس بڑے اولیاء ص ۲۰۵)

حضرت مولانا شیخ حماد اللہ صاحب [1] ہالیجوی رح متوفی ۱۳۸۱ھ

نام ونسب: نام مولانا حماد اللہ اور والد کا نام میاں محمود ہے۔ آپ سندھ کے ضلع سکھر کے "ہالجی" نامی گاؤں کے رہنے والے تھے۔

ولادت: مقامی مدرسہ میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے والدہ ماجدہ تعلیم کا اہتمام نہ کرسکیں پھر آپ کے ماموں حبیب اللہ صاحب رح اپنے ساتھ لے گئے اور آپ کی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اور سندھ کے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کر کے آپ ایک زبردست عالم ہوئے۔ جن کے متعلق حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رح نے ارشاد فرمایا، حضرت مولانا حماد اللہ کو عارف باللہ تو سارا عالم تسلیم کرتا ہے مگر ظاہری علوم میں بھی انکے پائے کا کوئی عالم نہیں ہے۔

تدریسی خدمات: تحصیل علم سے فراغت کے بعد حضرت اقدس نے اپنی بستی میں مدرسہ قائم کر کے فی سبیل اللہ درس دینا شروع کردیا۔ پھر ایک دوسرے بزرگ قاضی عبداللہ صاحب نے اپنے گاؤں قاضی وھن میں حضرت والا کو مدرس مقرر کیا۔ آپ نے یہاں درس وتدریس کا سلسلہ قائم فرمایا۔ چند سال تک آپ یہاں مقیم رہے اور کئی جید الاستعداد علماء نے آپ کے درس سے استفادہ کیا۔

---

[1] آپ کے حالات وتعلیمات کو مولانا اعجاز احمد اعظمی رح نے تذکرہ شیخ ہالیجوی کے نام سے لکھا ہے اسی سے یہ مضمون ماخوذ ہے (مرتب)

کچھ دنوں کے بعد آپ نے اوقات تقسیم کر دئے۔ گرمیوں میں قاضی وھن میں قیام کرتے اور تعلیم دیتے اور سردیوں میں اپنی بستی ہالجی شریف میں درس وافادہ کی مجلس کرم کرتے۔ کئی سال تک یہی طریقہ چلتا رہا، بہت سے طلبہ نے جن میں مولانا حبیب اللہ صاحب بھی شامل تھے آپ کے درس سے فراغت حاصل کی۔

تلاش مرشد: حضرت والا کئی سال کے عرصہ تک درس وتدریس میں مشغول رہے۔ تاکہ علم میں پختگی اور رسوخ علی وجہ الکمال حاصل ہو جائے لیکن آپ کے دل اور آپ کی روح کو کچھ اور ہی پیاس تھی۔ آپ ظاہری احوال کے لحاظ سے کوہ قار تھے اس لئے باطنی کیفیات اور دل کی شورش کا دریافت کرنا ایک دشوار امر تھا۔ اندر قلب مصفی میں محبت الٰہی اور عشق نبوی کا دریا موجزن تھا مگر اس پر ضبط کا بند بندھا ہوا تھا، اس لئے دیکھنے والے آپ کو ایک خشک ملا دیکھ رہے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ بند ٹوٹنے لگا اور قلبی کیفیات کا جوش ابلنے لگا دیکھنے والے جسے خشک ملا دیکھ رہے تھے اس کے قلب کی طراوت وشادابی چھلکنے لگی۔ حضرت اقدس کے ایک خاص مرید حضرت حاجی گلاب دین سومرہ نے حضرت والا کا ایک ارشاد نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ: "جس وقت میں حدیث کا درس دیا کرتا تھا۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اس قدر تھی کہ سبق کے دوران آنکھوں سے آنسو جاری ہو کر کتاب پر ٹپکتے رہتے۔ (تجلیات شیخ ہالیجوی ص ۱۸)

حضرت امروٹی کی بارگاہ میں: حضرت مولانا سید تاج محمود امروٹی علیہ الرحمۃ صاحب تذکرہ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ، کے شیخ اور پیرومرشد تھے۔ حضرت والا امروٹ شریف پہونچے اس وقت حضرت امروٹی

نماز تراویح سے فارغ ہو کر مسجد کے دروازے سے باہر تشریف لا رہے تھے چونکہ موسم سردی کا تھا آپ دونوں بازوؤں میں اچھی طرح دبا کر فرمایا کہ ”مرحبا مولوی صاحب“ مولانا فرماتے ہیں کہ معانقہ کی حالت میں میری طبیعت مین تغیر پیدا ہو گیا۔ میں نے حضرت امروٹی کو نہیں پہچانا مگر جب میرے رفیق فقیر عبدالغنی نے حضرت صاحب کہہ کر مرحبا کہا تو میں سمجھا کہ یہی حضرت امروٹی ہیں۔ میں وہاں مقیم ہو گیا۔ عید کا چاند ۲۹ کو نظر آ گیا۔ حضرت امروٹی نے مجھے خطاب کر کے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ کو گھر کی محبت اس قدر ہے کہ چاند بجائے ۳۰ کے ۲۹ کو نظر آ گیا۔ صبح کو نماز عید ادا کی گئی اور عید ہی کے دن شام کے وقت حضرت امروٹی نے میرے سر پر دستار جو تار کشی کی تھی باندھی۔

(تجلیات ہالیجویؒ)

یہ حضرت اقدس کے علوئے استعداد کا ثمرہ تھا کہ پہلی ملاقات میں آپ کو شیخ نے خلافت عطا فرمادی حالانکہ ابھی ظاہری طور پر کچھ تعلیم بھی نہیں فرمائی تھی مگر صفائے قلب اور پاکیزگی باطن کی جو کیفیت تھی اس نے اسی وقت اہلیت واستحقاق پیدا کر دیا تھا اور حضرت والا کو بھی شیخ سے اول ملاقات میں ہی اس قدر مناسبت اور عقیدت پیدا ہو گئی تھی کہ بعضوں کو وہ بات مدتوں میں حاصل نہیں ہوتی۔

مرید کی طرف سے عقیدت ومحبت اور انقیاد و اعتماد ہو اور شیخ کی طرف سے شفقت ومہربانی اور توجہ والتفات ہو تو راہ سلوک طے ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ آدمی یکا یک حق تعالیٰ کے دربار میں واصل ہو جاتا ہے اس کے بعد بقدر

مجاہدہ وریاضت درجات میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

اتباع سنت: آپ سنتوں کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے مستحبات تک کا ترک کرنا گوارہ نہ تھا۔ اپنے مریدین ومتوسلین کو بھی اس کی تاکید بلیغ فرماتے تھے تمام اعمال میں سنت کا خود اہتمام کرتے اور اپنے متعلقین کو بھی تاکید فرماتے بالخصوص بدعات وخرافات سے بچنے کی بہت تاکید فرماتے۔

اخیر عمر میں صرف ایک دانت باقی رہ گیا تھا مگر مسواک کی پابندی فرماتے جب بھی کوئی ملاقات کے لئے حاضر ہوتا تو مصافحہ ومعانقہ فرماتے، نام وقوم اور وطن دریافت فرماتے اور خیریت معلوم کرتے کیونکہ یہ مسنون طریقہ ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا؛

"اذا اٰخی الرجل الرجل فلیسالہ عن اسمہ واسم ابیہ وممن ھو فانہ اوصل للمودۃ" (ترمذی شریف ابواب الزہد ۶۵ ج ۲)

جب آدمی کسی سے تعلق پیدا کرے تو چاہئے کہ اس کا نام، اس کے والد کا نام پوچھ لے اور یہ کہ وہ کس قبیلے اور وطن کا ہے۔ اس سے محبت کامل ہوتی ہے۔ حضرت اقدس کا اس حدیث پر دائماً عمل تھا۔ اس سے ملاقات کرنے والے کو انس ہوتا ہے۔ اس کو بے اعتنائی اور اعراض کی کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

ف: ماشاء اللہ! آپ کی برکت سے ایک سنت نبوی کا علم ہوا اللہ تعالی عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (مرتب)

کمالات علمیہ: حضرت والا کو اللہ رب العزت نے علوم متعارفہ بالخصوص قرآن وحدیث میں وہ کمال عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے علماء نے آپ کے علم

وفضل کا اعتراف کیا۔حضرت اقدس کی ایک کتاب الفاظ قرآنی کے معانی کی تشریح وتبین پر **"الیاقوت والمرجان"** کے نام سے ہے۔اس کے مقدمے میں محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اور یہ نہایت حیرت انگیز اور تعجب خیز بات ہے کہ ایک شخص اس دیار (سندھ) میں پیدا ہوا تعلیم بھی یہیں کے مدارس دینیہ میں حاصل کی اور زندگی ایسے لوگوں کے درمیاں بسر کی جنہیں نہ عربی ادب کا کوئی ذوق ہے نہ لغات عربی سے کوئی مس ہے، اور پھر اسے کتب ادبیہ سے کچھ زیادہ اشتغال بھی نہ رہا، اس کے باوجود اس درجہ اور خصوصیات کا مالک ہوا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک عبقری اور نادرہ روزگار شخصیت ہے۔" **ذلک فضل اللہ یوءتیہ من یشاء۔**

تقویٰ اور خوف الٰہی: اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم کا مطالعہ کرے اور اس میں تلاش کرے کہ اوامر نواہی میں اللہ تعالیٰ نے کس چیز کی تکرار سب سے زیادہ کی ہے۔تو وہ تقویٰ ہی کو پائیگا اسی لئے حضرت اقدس ہالیجوی قدس سرہ کا قلب اطہر تقویٰ کے جذبات سے معمور تھا اور اس کا اثر آپ کے تمام شئون واحوال میں نمایاں تھا۔احکام شریعت کی تابعداری کا اہتمام تو آپ کو جس قدر تھا سب دیکھتے تھے۔مشکوک ومشتبہ چیزوں سے حد درجہ محترز اور مجتنب رہا کرتے تھے۔بازار کی مٹھائی نہ تو استعمال کرتے تھے اور نہ کسی سے قبول فرماتے تھے۔ایسی مٹھائی پیش کرنے والوں سے صاف فرمادیا کرتے کہ بازار کی مٹھائی نہ میں خود استعمال کرتا ہوں اور نہ کسی کو دے سکتا ہوں۔

فکر خاتمہ: حضرت کے دل میں اللہ کے خوف کا کس قدر غلبہ تھا۔

اس کو حضرت ہی کے ایک بیان کردہ واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اہل اللہ کا دستور ہے کہ اپنے احوال و مقامات کا ممکن حد تک اخفا فرماتے ہیں لیکن کبھی کبھی دوسروں کے واقعات واحوال کے ضمن میں ان کے بھی سربستہ احوال کا سراغ مل جاتا ہے۔ ؎

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید درحدیث دیگراں

حضرت کا ایک عام طریقہ یہ تھا کہ اکثر دین حنیف پر استقامت اور خاتمہ بالخیر کی دعا مانگا کرتے تھے۔ اپنے متعلقین سے بھی بکثرت خاتمہ بالخیر کی دعا کے لئے ارشاد فرماتے اور ان کے لئے بھی اسی کی دعا کیا کرتے۔

تعلیمات وملفوظات

ضرورت شیخ: کسی سائل نے پوچھا کہ اس شعر کا مطلب کیا ہے۔ ؎

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(اولیاء کے ساتھ تھوڑی دیر کی صحبت سو سال کی بے ریا طاعت سے بہتر ہے۔)

حضرت نے ارشاد فرمایا کہ بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں ایک آدمی آتا تھا اسنے کہا کہ حضرت ستر سال ہوئے ہیں میں ساری رات عبادت کرتا ہوں، اور دن میں روزہ رکھتا ہوں میری حالت آپ جیسی کیوں نہیں ہوتی۔ آپ کی یہ حالت عبادت کی وجہ سے ہوئی اور اس عبادت کی وجہ سے اتنے مراتب اور مقام پیدا ہوئے ہیں مگر مجھے کوئی مرتبہ اور مقام حاصل نہ ہوا۔

حضرت نے اس کو جواب دیا کہ تو نے جو عبادت کی ہے وہ شیطان کی غذا بن گئی ہے۔ خدا کا مقبول بندہ جو عبادت کرتا ہے وہ روح کو پہونچتی ہے لیکن جو تو نے عبادت کی ہے وہ نفس تک پہونچی، روح تک نہیں پہنچی۔ اسلئے کہ وہ عبادت تم نے خود اپنے طور پر کی ہے کسی اہل اللہ سے پوچھ کر نہیں کی ہے جو تجھے نفس کے مکر سے بچاتا ہے۔ شیخ کے کہنے سے جو عبادت کرو گے اس میں روح آئیگی۔

خدمت دین کے بنیادی ارکان: فرمایا کہ دین کی خدمت کے بنیادی ارکان تین ہیں۔ اول یہ ہے کہ دین کی خدمت اور دینی امور آدمی کے اپنے ذاتی کام بن جائیں۔ یعنی دین کا کام اس کے حق میں اجنبی نہ رہے بلکہ آدمی اسے خاص اپنا کام سمجھ کر کرے۔

دوسرے یہ کہ اسے مخلوق سے کسی طرح کی امید اور طمع نہ ہو جو کچھ امید اور طمع ہو، صرف خالق تعالیٰ سے ہو۔ یعنی وہ اپنے تمام امور میں حق تعالیٰ ہی کو وکیل و کارساز جانے کسی مخلوق کے سامنے نہ ہاتھ پھیلائے اور نہ دل میں کوئی امید رکھے اور نہ دینی خدمت کو حصول دنیا کا ذریعہ بنائے۔

تیسرے یہ کہ حق کہے یعنی حق کہنے میں کسی سے نہ ڈرے خواہ اس سے لوگ راضی ہوں یا ناراض۔ (الاشارات الحمادیہ ص ۱۰)

قلب سلیم: فرمایا کہ اصل مطلوب یہ ہے کہ بندہ ہر وقت حق تعالیٰ کو یاد کرے۔ خواہ قلب اور لسان دونون سے یا کسی ایک سے اور دنیاوی علائق و روابط کچھ نہیں ہیں۔ **"اَلْاَخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین"** (تمام دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ سوائے اہل تقویٰ کے) قلب سلیم وہ ہے

جس میں غیر اللہ کا گزر نہ ہو۔

تعلیم و تعلم اور اخلاص: فرمایا کہ علم حاصل کرنا مشکل ہے، تعلیم دینا اس سے مشکل ہے اور ایک چیز ان دونوں سے بھی دشوار ہے، وہ ہے اخلاص۔

(الاشارات ص ۱۰)

ف: امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ ساری عمر میں اگر مخلص ایک لمحہ کو بھی اللہ کے لئے خالص کر لے تو نجات پا جائیگا۔ (مرتب)

خدمت دین: فرمایا کہ آدمی یہ کبھی نہ کہے کہ میں پڑھنے کے بعد تعلیم دوں گا بلکہ یہ کہے کہ میں دین کی خدمت کروں گا۔ خواہ مسجد میں جھاڑو ہی لگانا ہو۔ **وبنعمۃ اللہ تتم الصالحات**۔ (الاشارات الحمادیہ ص ۱۰)

وفات: ۱۲/ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ چہار شنبہ کے دن نماز صبح کے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر واصل محبوب حقیقی ہوئے **"انا للہ وانا الیہ راجعون"** اور ہانسی شریف میں مدفون ہوئے نور اللہ مرقدہ۔ (تذکرہ شیخ ہانسوی)

حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رائے بریلوی رحؒ[1] المتوفی ۱۳۸۱ھ

مولانا ڈاکٹر سید عبدعلی صاحبؒ ۲۲/ جمادی الاولی ۱۳۱۱ھ (۱) مطابق یکم دسمبر ۱۸۹۳ء کو اتوار کے دن ضلع فتحپور (یوپی) کے ایک تاریخی قصبہ ہنسوہ میں پیدا ہوئے، جو آپ کا نانیہال تھا، آپ نسباً حسنی تھے۔

آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ مصنف ''گل رعنا'' اور ''نزہۃ الخواطر'' عالم زاہد وصالح شخص تھے۔ والدہ ماجدہ مولانا سید عبدالعزیز صاحبؒ کی صاحبزادی تھیں، جن کا سلسلہ نسب حضرت سیدنا حسین سبط الرسول رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے، ابھی ڈاکٹر صاحب کی عمر آٹھ سال کی ہی تھی کہ والدہ مخدومہ سیدہ زینب بی بی رحلت فرما گئیں، رحمہا اللہ تعالیٰ وغفرلہا۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے بچپن کا بیشتر حصہ نانیہال (ہنسوہ ضلع فتحپور) میں اور پھر دادیہال (تکیہ دائرہ شاہ علمؒ اللہ رائے بریلی) میں گذرا۔

تسمیہ خوانی ہنسوہ میں ہوئی، قرآن کریم اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں حاصل کی، جہاں مولانا عبدالحکیم کیرانوی صاحب (جن کا روحانی تعلق حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے اور شرف تلمذ حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی، علامہ کیرانویؒ بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے تھا) قیام فرماتے تھے، ان کے پاس مکتب نشینی کی،

---

[1] آپ کے حالات وکمالات حضرت مولانا عبدلباری ندویؒ نے ''فرشتہ صفت انسان'' قلمبند کیا ہے اسی سے یہ ماخوذ ہے۔ (مرتب)

چنانچہ آپ کو ان دونوں جگہ علمی وروحانی ماحول میسر آیا، جہاں آپ نے نیک صحبتوں اور سنجیدہ وسبق آموز مجلسوں کے مواقع سے خواطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کیں جو ایک مومن کامل کی شایان شان اور ایک عالم ربانی کے لئے ضروری ہوتی ہیں، آپ کے والد ماجدؒ جو ایک بڑے نباض، عالم، عارف، حکیم تھے، برابر آپ کو خطوط کے ذریعہ تعلیمی ہدایات کرتے رہتے اور ایک ایک چیز کی برابر خبر رکھتے، پھر والد صاحب کے پاس لکھنؤ آ گئے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے کسب فیض کیا، تمام اساتذہ آپ کا بڑا خیال رکھتے، یہاں سے تکمیل تعلیم کے بعد والد صاحبؒ کی ایما پر دار العلوم دیوبند گئے، جو اس وقت درس حدیث کا ایک بڑا مرکز تھا، اور ہے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے۔ ایک طرف شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اسیر مالٹا مسند آرا تھے، تو دوسری طرف علم حدیث کے امام وقت علامہ انور شاہ کشمیری رونق افروز تھے، اول الذکر سے آپ نے صحیح بخاری اور سنن ترمذی کا درس لیا، اور ثانی الذکر سے ابو داؤد شریف پڑھی، اور دونوں ماہرین فن شیوخ کے درس کی تقریریں بحسن وخوبی عربی زبان میں قلمبند کرتے جاتے تھے، افسوس کہ کسی نے استفادہ کے لئے لیا اور پھر واپس نہیں کیا جس کا حضرت ڈاکٹر صاحب کو صدمہ رہا۔

علم دین کی تکمیل کے بعد طب کی طرف میلان ہوا، والد صاحب کی بھی خواہش تھی اور آپ کیلئے یہ ایک خاندانی علم تھا، چنانچہ آپ نے والد صاحب سے طب کے تمام متداول کتابیں پڑھیں، پھر والد ماجد کے ایما سے ہی حاذق الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں دہلی گئے اور جلد ہی ان کے یہاں اعتماد پیدا کرلیا، اس کے ساتھ ساتھ نامور ڈاکٹر اور عظیم مجاہد آزادی وقائد ملت ڈاکٹر مختار احمد انصاری

سے بھی استفادہ کرتے جاتے تھے۔ وہاں سے واپسی پر انگریزی کا شوق پیدا ہوا۔

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے سانحۂ ارتحال سے جہاں آپ کو عظیم صدمہ سے دو چار ہونا پڑا، وہیں آپ پر ایک ساتھ دوہری ذمہ داریاں آپڑیں، آپ پر بوجھ اس بات سے اور بڑھا کہ والد علیہ الرحمہ نے ترکہ میں صرف ایک روپیہ چھوڑا، جو ان کے زہد عن الدنیا اور دین کے کاموں میں لوجہ اللہ خدمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کو ایک طرف اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر اور ذمہ داری اور دوسری طرف اپنی چھوٹی بہنوں اور عزیز بھائی (یہ تینوں مولانا عبدالحی کی زوجۂ ثانیہ سے ہیں) کی فکر اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری، اسے کس طرح ادا کریں اور نبھائیں ڈاکٹر صاحب ہر معاملہ میں پہلے دین و شریعت کو دیکھتے تھے، اور اسوۂ نبویہ کو نمونہ جانتے تھے، چنانچہ آپ نے جس انداز و طریقہ سے یہ عظیم ذمہ داری نبھائی اور یہ مشکل کام بحسن خوبی انجام دیا، کہ یہ چھوٹے بھائی جن کا نام ابوالحسن علی تھا، وہ اس وقت اسلام کے عظیم مفکر مصلح اور داعی، عالم ربانی اور امام کی حیثیت سے عالم اسلام میں متعارف ہیں، اور صرف متعارف ہی نہیں بلکہ عرب و عجم ان کے گرویدہ ہیں، اور ان کی تحریر و تقریر کا لوگوں پر گہرا اثر ہے، دونوں بہنیں بھی اپنے خانوادہ میں علم و فضل اور صلاح و تقویٰ میں ممتاز رہیں۔

تعلیم و تربیت و مردم سازی کا ایک دوسرا حیرت انگیز نمونہ خود ان ہی کے فخر ہند فرزند مولانا سید محمد الحسنی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے، جن کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر بعض اہل نظر نے **"رجل موھوب"** کہا اور جن کی بے نفسی، صلاح و تقویٰ کو دیکھ کر بعض اہل علم نے ''فرشتہ صفت انسان'' کہا، ان کے علاوہ

خواہرزادگان میں مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی ومظاہری، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کے وہ مبارک اسماء ہیں کہ جن کے فیوض و برکات سے بھی ایک عالم مستفید ہورہا ہے، دین اور دین کا علم خود ہی سکھایا، انہیں اس مسئولیت کا ہر ہر لمحہ پورا خیال رہا، جس کا حدیث نبویؐ میں ذکر آیا ہے کہ **"الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ"**۔

اصلاحی تعلق: ڈاکٹر صاحب کا روحانی واصلاحی تعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے تھا، اور یہ تعلق بڑا عقیدت مندانہ اور والہانہ رہا، حضرت مدنی کو بھی آپ سے بڑا خصوصی تعلق اور آپ پر بڑا اعتماد تھا، چنانچہ جب بھی لکھنؤ تشریف آوری ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے ہی مکان پر قیام فرما ہوتے، ڈاکٹر صاحب کے یہاں قیام کا سلسلہ ۱۹۲۸ء سے تا وفات رہا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا طریقہ کار: مطب میں تنگدست مریضوں کو دوا تک مفت دی جاتی، اس سے بڑھ کر یہ کہ مستحق مریضوں کی دوا کے علاوہ بھی مدد فرماتے، اور کس کس طرح فرماتے، اس کی ایک شہادت ایک غیر مسلم مسٹر ناتھ کی طرف سے وفات کے بعد ہی اخبار میں یہ چھپی تھی کہ:

''اس کے یہاں کسی مریض کو دیکھنے گئے تو فیس لینے کے بجائے دس روپیہ کا نوٹ چھوڑ کر آئے، وہ سمجھ گئے کہ یہ کام تو ڈاکٹر صاحب ہی کا ہے، واپس کرنے لوٹے، جواب کچھ اس قسم کا ملا کہ ''یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ نوٹ کس کام کے لیے اس نے آپ کے پاس بھیجا ہے، مجھ کو اس سے کوئی مطلب نہیں''۔

اوصاف و کمالات: **اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمآءُ** کی صحیح

تصویر ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹری اور غیر ڈاکٹری کی اندرونی و بیرونی پوری زندگی دراصل سرتاپا خشیتی علم یا ''علم رابر دل زنی یارے بود'' کی آئینہ دار تھی۔

صبر ورضا، توکل اور اصابت رائے اور حزم واحتیاط: رزق ومعاش کے معاملہ میں حضرت مرحوم کا خالص ایمانی واسلامی رنگ ان کا بڑا متوازن توکل ہی تھا، کہ ایک طرف جائز ظاہری اسباب کی ضرورت کی فکر وتدبیر فرماتے، ان میں کوئی کمی وکوتاہی ہو جاتی تو اس کا تدارک فرماتے۔ مگر دوسری طرف ہر حال میں مسبب الاسباب پر ہی نظر رہتی کہ بڑے سے بڑے نقصان کی صورت میں بھی قلب وقالب پر کبھی کوئی نمایاں اثر نہیں دیکھا۔

اولاد کے عقد نکاح میں سنت نبویؐ کا پاس ولحاظ: صاحبزادیوں کے عقد سب کے سب خاندان میں اور قریب ترین عزیزوں ہی سے ہوئے اور لکھنؤ ہی میں دعوت واطلاع کیا معنی ذکر بھی بے ضرورت خاص طور پر شاید ہی کبھی کسی خاص عزیز ودوست سے فرماتے ہوں۔

لکھنؤ میں مجالس تھانویؒ میں شرکت: ڈاکٹر صاحب پر اعتدال وتوازن پسندی کا خالص تھانوی رنگ زیادہ نکھر کر اس وقت سے آگیا، جب حضرت تھانویؒ کا علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ میں طویل قیام ہوا، اور ڈاکٹر صاحب قریب قریب بلا ناغہ ہی حاضر ہوتے، پھر تو مجلس سے اٹھ کر ایسی باتوں تک کو عین عقل ونقل کے مطابق پاتے جو بہتوں کے نزدیک دونوں کے خلاف ہوتیں۔

وفات: آپ کی وفات ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء کو ہوئی انا للہ وانا الیہ راجعون، اور تکیہ رائے بریلی یوپی میں مدفون ہوئے، نور اللہ مرقدہ۔ (فرشتہ صفت انسان، مولفہ مولانا عبدالباری ندوی)

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری[1] المتوفی ۱۳۸۲ھ

نام ونسب وولادت: آپ کا نام عبدالقادر ہے، آپ ۹۱ ۱۲۹۰ھ مطابق ۷۴۔۱۸۷۳ء میں پنجاب کے ایک دوردست گاؤں ڈھڈیاں ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے، آپ جب ۲۳۔۱۳۲۲ھ میں رائے پور آئے تو اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری (م ۱۹۱۹ء) کے استفسار پر اپنا نام غلام جیلانی بتلایا، اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ آپ تو عبدالقادر ہیں چنانچہ اسی وقت سے آپ کا نام عبدالقادر مشہور ہوا۔

تعلیم وتربیت: آپ نے ابتدائی تعلیم مختلف حضرات سے حاصل کی، انتہائی تعلیم اور تکمیل تعلیم کیلئے مختلف جگہوں کا سفر کیا اور سہارنپور، رامپور، دہلی اور بریلی وغیرہ میں مختلف صاحب علم حضرات سے متعدد کتابیں پڑھیں اور تکمیل نصاب کیا۔

(حیات عبدالرشید مؤلف مولوی مسعود عزیزی ندوی: ص ر ۵۱)

شاید تعلیم کا سلسلہ بریلی میں تمام کو پہونچا اور وہیں سے پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اور بریلی میں حکیم مختار احمد صاحب سے طب کی کتابیں شرح اسباب تک پڑھیں، آپ کی نیت یہ تھی کہ معاش کے لئے کوئی ایسا سلسلہ اختیار کرلیا جائے جس میں تھوڑا وقت صرف کرکے گذارے کا انتظام کرلیا جاے، غالباً کسی دوست یا رفیق درس

---

(۱) حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری کے نام سے آپ کی مفصل سوانح لکھی ہے اسی کو سامنے رکھ کر کچھ باتیں لکھ رہا ہوں اللہ تعالیٰ اس کو بھی قبول فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

کے تعلق سے آپ نے افضل گڑھ ضلع بجنور کا سفر کیا اور وہاں چھ مہینے کے قریب مطب کا سلسلہ جاری رہا۔ (اقتباس از سوانح شاہ عبدالقادر صاحب ؒ ص ر ۵۳)

انجذاب الی اللہ: اس اثناء میں آپ پر انجذاب الی اللہ کا غلبہ ہوا، قلب نے محبوب حقیقی کی تلاش میں لگ جانے کا فیصلہ کرلیا جس کے بغیر علم بے معنی اور زندگی بے حاصل ہوتی ہے۔

شاہ عبدالرحیم ؒ سے تعلق: اس وقت حضرت عالم ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ؒ کا آفتابِ رشد و ہدایت اپنے عروج پر تھا اور وہی شیخ الکل کی حیثیت رکھتے تھے، اور اسی زمانہ میں آپ کے ممتاز خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری ؒ کے دورے مشرقی پنجاب میں ہوا کرتے تھے، اس لئے آپ نے افضل گڑھ سے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ؒ کی خدمت میں خط لکھا اور عرض کیا کہ میں آپ سے بیعت ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ حدیث میں آتا ہے: **"اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ"** میں آپ کو لکھتا ہوں کہ میں کوئی چیز نہیں ہوں، آپ میں تو طلب ہے، مجھ میں یہ بھی نہیں، آپ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ؒ کی طرف رجوع کریں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں یہ خط پڑھ کر پھڑک گیا کہ اخلاص و بے نفسی اس کو کہتے ہیں۔ (حوالہ بالا: ص ر ۵۸)

اس لئے حضرت کو پھر خط لکھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو جو کچھ ملا حضرت مولانا گنگوہی ؒ سے ملا مگر میرا رجحان آپ کی طرف ہے۔ میری طرف سے اگر مہمانداری کی فکر ہے تو میرے حقوق حضرت کے ذمہ نہیں ہیں، اپنے قیام و طعام کا خود ذمہ دار ہوں، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ؒ یہ خط دیکھ کر خوش ہوئے اور

لوگوں کو یہ خط دکھایا اور فرمایا دیکھو یہ ہیں طالب۔

اس کے بعد آپ رائے پور حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا: جلدی کیا ہے، استخارہ کرلو، چونکہ آپ کو گھر جانا تھا اس لئے فرمایا کہ گھر ہو آؤ، پھر بیعت کرلینا، اس کے بعد حضرتؒ نے آپ کو یکسوئی کے ساتھ کچھ پڑھنے کو بتلا دیا، جس کی آپ نے تعمیل فرمائی۔

اس اثناء میں آپ کو عجیب وغریب کیف وسرور اور لذت وحلاوت نصیب ہوئی، اس کے بعد دوبارہ رائے پور حاضر ہوئے، تو حضرت رائے پوریؒ نے ذکر کی کیفیت دریافت فرمائی، آپ نے کسر نفسی سے فرمایا "الحمدللہ" اور اسی حاضری میں آپ کو بیعت فرمالیا، اس کے بعد آپ نے شیخ کی خدمت میں قیام کا ارادہ فرمایا اور مدّتوں رہے اور سخت سے سخت مجاہدات وریاضات کئے اور مقامات سلوک طے کئے اور حضرت رائے پوریؒ کی خاص عنایات اور اجازت وخلافت سے مشرّف ہوئے۔ **ذَلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ**۔

ارشادات

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ کے چند ارشادات نقل فرمائے ہیں جو یقیناً نہایت مفید اور بصیرت افروز ہیں، اس لئے ان میں سے بعض کو نقل کرتا ہوں۔

مقصود کار: فرماتے تھے کہ اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے۔

ذکر وسلوک کی ضرورت: ایک مرتبہ فرمایا: اللہ کی محبت اور ہر وقت اس کا اور اس کی رضا کا دھیان وفکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت غافل نہ ہونا یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر

ایمان واسلام کامل ہی نہیں ہوتا،لیکن رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دین کی تعلیم وتربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضور ﷺ کے فیضان صحبت سے صحابہ کرامؓ کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لئے صحبت کے ساتھ ذکروفکر کی کثرت کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔(ص ر ۳۲۵)

حقیقت ذکر: فرمایا کہ ذکرلسانی صرف ایک ذریعہ ہے،مقصود نہیں ہے، مقصود محض یاد ہے اگر یاد نصیب ہو جائے تو ذکرلسانی چھڑا دیا جاتا ہے مگر بقا کے بعد بھی ترقی عبادات ہی سے ہے یعنی قرآن پاک کا پڑھنا،ذکر الٰہی کرنا،اس سے ہی ترقی ہے،خاموش بیٹھنے اور محض تدبر سے نہیں۔

فرمایا:تصوف ایک عشق ہے،ایک طریقہ ہے،جو الہام الٰہی سے اولیاء اللہ پر اپنے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق منکشف ہوتا ہے،اس طریق پر چلنے سے انسان کو یقین نصیب ہو جاتا ہے اور خداوند تعالی کی دائمی یاد نصیب ہو جاتی ہے،راستہ میں بہت سی کیفیات اور بہت سے اسٹیشن آتے ہیں لیکن اصل مقصد یہی یاد ہے،یہی تعلق مع اللہ ہے جس کو آپ نسبت کہہ دیں یا کچھ اور نام دے دیں، درحقیقت یہی یاد ہے جو کہ مقصود ہے اور تمام تصوف کا خلاصہ ہے،یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ کرامات کو اتنا وقیع اور اہم نہیں سمجھتے جتنا کہ تعلق مع اللہ اور اہتمام شریعت کو،اصل چیز تعلق مع اللہ کا دوام ہے،اس کے ساتھ اتباعِ شریعت از خود آجاتی

ہے، شریعت پر چلنے میں آسانی ہو جاتی ہے، کیونکہ شریعت پر چلنے کے محرکات پیدا ہو چکے ہوتے ہیں، تعلق مع اللہ کے بعد یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔ (ص ر ۳۲۹)

ایک موقع پر فرمایا: اگر قوت ہو تو ذکر بالجہر کرنا چاہئے، اثر جلدی ہوتا ہے، لیکن اگر طبیعت کمزور ہو تو ہرگز زیادہ جہر سے نہیں کرنا چاہئے، ورنہ طبیعت مختل ہو جائے گی اور دماغ خراب ہو جائے گا۔ (ص ر ۳۳۱)

محض ذکر کافی نہیں بلکہ اصلاح اخلاق ضروری ہے

حضرت العلامہ مولانا سید ابوالحسن ندوی اپنی تصنیف لطیف ''تزکیہ واحسان'' میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ ''آپ کے نزدیک ذکر و شغل، صحبت مشائخ اور مجاہدات وریاضات کا بڑا مقصد اور ثمرہ اخلاق کی اصلاح، صفات رذیلہ کا ازالہ، اور صحیح معنی میں تزکیۂ نفس ہے، محض ذکر و اذکار کافی نہیں، اخلاق کی اصلاح ضروری ہے،'' ایک روز ایک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے جو ایک موقع پر مغلوب الغضب ہو گئے تھے، فرمایا کہ اصلاح کے لئے فقط ذکر کافی نہیں ہے، اخلاق کی درستگی کرنی چاہئے، اور مشائخ سے اخلاقِ ذمیمہ کا علاج کرانا چاہئے، اسی واسطے زندہ مشائخ سے بیعت ہوتے ہیں کہ وہ اصلاح کرتے ہیں، مثلاً غصہ ہے یہ بہت بُرا مرض ہے، حدیثوں میں اس کی بہت مذمّت فرمائی گئی ہے، لیکن جب تک شیخ سے علاج نہیں ہوتا یہ مرض نہیں جاتا۔

ف: افسوس کہ اس کی طرف عموماً التفات نہیں ہے تو پھر کیسے اصلاح نفس ہو جو فرض عین ہے۔ (مرتب)

لطائف ستہ

لطائف ستہ کے انوار و آثار کا ذکر کرتے ہوئے ایک روز فرمایا: ان لطائف کے جاری ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ قلب حرکت کرے یا انوار نظر آئیں بلکہ جاری ہونے کے معنی یہ ہے کہ ان کے علوم منکشف ہو جائیں مثلاً قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالی کی طرف خیال رہے، دل سے دنیا اور ہر چیز کی قیمت نکل جائے، اسی طرح لطیفہ نفس جاری ہونے کے معنی یہ ہے کہ رذائل وصفاتِ رذیلہ نکل جائیں اور صفات حمیدہ پیدا ہو جائیں اور انکساری وعاجزی پیدا ہو جائے، اپنے آپ کو سب سے حقیر سمجھے، جب یہ حالت ہو تو سمجھے کہ کچھ چل پڑا ہے، اسی طرح دوسرے لطائف، اس میں انوار کا نظر آنا کوئی ضروری نہیں یہ تو محنت وریاضت سے غیر مسلموں کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

نیز ارشاد فرمایا: میرے خیال میں اصل مقصود تو ہر شخص کو اپنے نفس کی اصلاح ہے، فرائض وواجبات وعبادات ادا کرتا رہے، اور اللہ اللہ کرتا رہے، اگر اللہ کو اس سے کوئی کام لینا مقصود ہوتا ہے تو خود اس کی طبیعت کو اس طرف متوجہ کر دیتے ہیں اور بطریق الہام بحکم شیخ اس کے کوئی کام سپرد کر دیا جاتا ہے، اس وقت اس کے لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ جو کام اس کے ذمہ لگایا گیا ہے، اسے انجام دے اور جب تک یہ ہو اس وقت تک انفرادی طور پر اللہ اللہ کرتے رہنا اور عبادات ادا کرتے رہنا ہی اس کے لئے بہتر ہے، اسی سے ان شاء اللہ اس کی نجات ہو جائے گی۔

فرمایا: دیکھو! سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَزکی نفس (زیادہ پاک) ہیں مگر آپ کو بھی جب تک مامور من اللہ نہیں کیا گیا آپ غارِ حرا میں تشریف لے جا کر

انفرادی طور پر اللہ کی عبادت ہی کرتے رہتے تھے، حالانکہ قوم کی بے اعتدالیاں، بت پرستی، ظلم اور زیادتیاں بہت دیکھتے رہتے تھے مگر کسی سے تعرض نہیں کیا اور غاروں میں اکیلے جا کر خدا کی یاد میں لگے رہتے تھے، لیکن آخر جب فرشتہ نازل ہوا اور فرمایا: **"بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ"** پہونچایئے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ تو آپ غار حرا کو چھوڑ کر کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے، اور اس فرض کو ادا کیا۔

بہر حال دیگر حضرات کا جو خیال بھی ہو؛ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا، میرا تو یہی خیال ہے کہ پہلے انفرادی طور پر اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور اپنی ہی فکر کرنی چاہیئے، اللہ تعالیٰ کو اگر اس سے کوئی کام لینا منظور ہوگا تو خود اس کو اس کی طرف متوجہ کر دیں گے پھر اس کے لئے وہی بہتر ہے، اور تبلیغ میں بھی اپنی اصلاح مقصود ہونی چاہیئے۔

ف: ماشاء اللہ خوب فیصلہ فرمایا، اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین (مرتب)

ایک دفعہ ذکر کی ترقی اور ذکر کی استقامت کا ذکر کرتے ہوئے اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے ارشاد فرمایا، پوچھا گیا کہ ذکر کی آخر کوئی انتہا بھی ہے؟ فرمایا کہ یہاں تک ذکر کرے کہ روح ذاکر ہو جائے، پوچھا گیا کہ روح کے ذاکر ہونے کے کیا معنی ہے؟ فرمایا: دھیان ہر وقت اسی کی طرف لگا رہے، خواہ دنیا کے کام کر رہا ہو، تجارت کرتا ہو، کھیتی کرتا ہو، مگر خیال ہر وقت اسی طرف رہے، جیسا کہ کسی کو سر کا درد یا پیٹ کا درد ہو تو اگر چہ باتیں بھی کرتا رہتا ہے، کام بھی کرتا رہتا ہے، لیکن دھیان درد کی طرف رہتا ہے، پوچھا گیا کہ استقامت کے کیا معنی ہیں؟

فرمایا: اس قدر پختگی حاصل ہو جائے کہ جب تک ذکر پورا نہ کرے، سکون نہ ہو، بے چینی و بے قراری سی رہے اور ذکر پورا کر لے تو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے، طبیعت میں فرحت و سرور محسوس ہو، فرمایا: جب اس درجہ تک پہونچ جائے تو اس کا تمام وجود ہی تبلیغ بن جاتا ہے اور اس سے پہلے مجاہدہ ہوتا ہے، فرمایا: یہاں پہونچ کر اللہ تعالی کو اس سے جو کام لینا ہوتا ہے اس کی طرف اس کو متوجہ کر دیتے ہیں، تبلیغ یا تدریس یا تصنیف جس کام کی طرف اس کی طبیعت کا رجحان ہوتا ہے وہی خدمت اس سے لیتے ہیں، بعض اوقات الہام کے ذریعہ سے حکم دیا جاتا ہے، بعض اوقات شیخ حکم دیتا ہے اور کبھی خود بخود طبیعت متوجہ ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی یوں رقمطراز ہیں:

اس اصلاحِ باطن اور اخلاص کی دولت کے حصول کے بعد اسکی دینی خدمتوں اور دینی و علمی اشغال کا عالم دوسرا ہوتا ہے، خود امام غزالیؒ نے اس کا اظہار فرمایا ہے کہ حصول یقین و اخلاص کے بعد کے، اور اس کے پیشتر کے مشاغل و خدمات میں زمین و آسمان کا فرق تھا، پہلے وہ کام تقاضائے نفس یا ضابطہ کی تکمیل کے لئے کرتے تھے اب حکم الہی سے۔ (تزکیہ و احسان: ص ر ۱۴۲ تا ۱۵۱)

ف: ماشاء اللہ تعالی! حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے اپنے اس ارشاد میں ایک اہم حقیقت کا انکشاف فرمایا جو دین کا کام کرنے والی ہر جماعت بلکہ ہر شخص کو مستحضر رکھنے کے لائق ہے تاکہ ایک دوسرے کی تنقیص کا کلمہ تو کیا دل میں وسوسہ بھی پیدا نہ ہو، کیونکہ دین کا ہر کام ضروری ہے، اس لئے ہر کام کے لئے اس کے مناسب افراد اللہ تعالی منتخب فرماتے ہیں، اور ان کے قلوب میں اس کا داعیہ

وجذبہ پیدا فرماتے ہیں پس اگر وہ دوسرے کام میں لگیں تو شاید اس قدر کامیاب نہ ہوں، ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ (مرتب)

لاہور کا قیام: ۲۵/ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ، یکم مئی ۱۹۶۲ء کو آپ لاہور پہنچے، خاموشی معمول سے زیادہ لیکن تلقین وتربیت علی حالہ قائم تھی، رقت سے طبیعت بھرپور تھی، اس سے پیشتر زمانہ میں آپ پر جب کبھی رقت ہوتی تو آپ ضبط فرماتے اور آنسو نکل نہ پاتے، لیکن اس مرتبہ رقت سے بے اختیار ہو جاتے اور آنسو بہ پڑتے، آنکھیں اکثر پُرنم رہتیں۔

وفات: وفات سے بیس روز بیشتر غنودگی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی، اور کئی گھنٹہ تک رہی، بعد میں افاقہ ہوگیا تو طبیعت مبارک پر بشاشت معمول سے زیادہ ہوگئی، آپ نے بعض دوستوں کو بلایا اور ذکر کی بابت دریافت فرمایا کہ کتنا ذکر کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا، تو حضرتؒ نے زور سے فرمایا "**لاحول ولاقوۃ الا باللہ**" محفل پر سناٹا طاری ہوگیا پھر فرمایا: بہت سے لوگ ہیں جو اپنے کو کامل سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ کچھ بھی نہیں۔ (ص/۲۱۶)

آخر ۱۶/اگست ۱۹۶۲ء مطابق ۱۳۸۲ھ بروز جمعرات یوم موعود آپہونچا اور روح قفص عنصری سے دار آخرت کی طرف پرواز کرگئی۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن**۔ مدفن ڈھڈیان ضلع سرگودھا پاکستان میں ہے۔ **نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ**۔

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ المتوفی ۱۳۸۲ھ

نام ونسب وولادت: آپ ۱۳۱۸ھ میں سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے اور آپ کا نام "معزالدین" رکھا گیا اور مستقبل نے ثابت کر دیا کہ آپ واقعی اسم بامسمی تھے، حفظ الرحمن آپ کا تاریخی نام ہے جب کہ اس کو حفظ الرحمن یعنی رحمان کے الف کے ساتھ لکھا جائے، آپ کے والد ماجد مولوی شمس الدین صدّیقی اپنے قصبہ کے معززمتدیّنن اور عالم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا فضل رحمنؒ گنج مرادآبادیؒ سے بیعت تھے۔

تعلیم: آپ کی والدہ ماجدہ کی درخواست پر آپ کے والد ماجد نے آپ کو سیوہارہ کے عربی مدرسہ میں داخل کر دیا اس مدرسہ کا نام فیض عام تھا، آپ نے کچھ کتابیں مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد میں بھی پڑھیں لیکن درس نظامی کی اکثر کُتب کی تکمیل سیوہارہ کے فیض عام مدرسہ ہی میں کی۔

سیوہارہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ایشیا کی مشہور علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں آپ کو حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی اور میاں اصغر حسین صاحب جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ وشیوخ سے استفادہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور دارالعلوم دیوبند کی اس تعلیم وتربیت نے آپ کی قابلیت میں چار چاند لگا دیے۔

سیاسی سرگرمیوں کا آغاز: ۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کی تاریخ کا اہم سال ہے، اس سال کانگریس نے ستیہ گرہ کا آغاز کیا، اسی سال جمعیۃ العلماء ہند کا قیام عمل میں لایا گیا، اور اسی سال جلیانوالہ باغ کا وہ خونی حادثہ پیش آیا جس میں سیکڑوں بے خطا افراد کو فرنگی استعمار نے گولیوں کا نشانہ بنایا۔ امرتسر میں ان دنوں تحریک خلافت کا زور تھا، اگر اس سال کو ہندوستان کی تحریک آزادی کی صبح آزادی کہا جائے تو بجا ہوگا، مولانا حفظ الرحمن صاحب اس دور میں اپنے قصبہ سے تعلیم مکمل کر چکے تھے ملکی حالات کا تقاضا دیکھا تو بلا تامل سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا ۱۹۲۲ء میں آپ کی گرفتاری ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ: ۱۹۲۲ء میں جب خلافت کا بحران ختم ہوا اور آپ کی قید پوری ہوئی تو علوم وفنون کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے، اور وہاں پہونچتے ہی اپنا مقام پیدا کر لیا، چنانچہ آپ میں قدرتی وفطری صلاحیتوں کا اندازہ کر کے حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مشورہ سے آپ دارالعلوم میں معین المدرسین کے طور پر کام کرنے لگے۔

پھر مدراس سے ایک فرمائش پر حضرت علامہ کشمیریؒ نے آپ کو وہاں بھیج دیا اور آپ پیرامیٹ میں کم وبیش سال بھر تدریس وتبلیغ میں مصروف رہے اور وہیں سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا، چنانچہ آپ نے دو مختصر رسالے "حفظ الرحمن لمذہب النعمان" اور "مالابار میں اسلام" تحریر کئے، چنانچہ اس سے وہاں اتنی آمدنی ہوگئی کہ حج وزیارت سے بہرہ ور ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند میں کسی تحریک کی بناء پر حضرت انور شاہ صاحب کشمیریؒ،

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا سید محمد بدر عالم صاحب مہاجر مدنیؒ ڈابھیل، ضلع بلساڑ صوبہ گجرات تشریف لے گئے ،اور وہاں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین میں سب حضرات کام کرنے لگے تو مولانا حفظ الرحمن صاحب بھی اپنے ساتھیوں اور اپنے مشفق و مربی استاذ کے ساتھ ڈابھیل آگئے، پھر اس کے بعد سیاست میں دوبارہ داخل ہوئے جس کی تفصیل ''بیس بڑے مسلمان'' میں درج ہے، ملاحظہ فرمالیا جائے۔

ہم صرف ۱۹۴۷ء میں آزادیٔ ہند کے بعد کے دردناک حالات میں مولانا کی اہم خدمات کو نہایت اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں۔و باللہ التوفیق۔

مولانا حفظ الرحمن ۱۹۴۷ء میں: ۱۴؍اگست کو قیام پاکستان عمل میں آیا اور ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا، اسی شب کو ۱۲؍بجے نئی دہلی میں انتقال اختیارات کا منشور پڑھا گیا، اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں ایک پُرشکوہ تقریب منعقد ہوئی اور آزادی کی رسم پوری ہوگئی، آزاد ہندوستان کے جھنڈے لہرانے لگے ،آزادی کے ترانوں سے فضائیں گونج اُٹھیں یہ سب کچھ ہوا مگر تھوڑی دیر کے لئے ،اس کے بعد یکا یک ایک سنّاٹا ،گھٹاٹوپ اندھیرا،ایک ہیبت ناک منظر اور جان لیوا دہشت ،گویا بھارت کی دھرتی پر بلاؤں کا دیوتا اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھ برس ہی پڑا ہو،تاریخ کو شاید ایک ایسے وقت کا انتظار تھا جو ۱۵؍اگست کی خوشیاں بھلادے۔

۱۸۵۷ء کے پورے نوّے سال اسی (۸۰) دن بعد دلّی کے کوچہ و بازار پھر خون سے رنگین ہونا شروع ہوئے مگر افسوس صد افسوس کہ اس کی اور اُس کی

نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا، خدا نہ کرے وہ دن پھر آئے۔

۷ ستمبر سے ۲۷ گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا، پورے شہر میں موت کا سنّاٹا چھایا ہوا تھا، کوئی آواز تھی تو گولیوں کی یا بے بس مسلمان مظلوموں کی چیخ پکار کی، بے باک لیڈروں کی گویا حکومت قائم ہوگئی تھی، ایک اندازہ کے مطابق چالیس ہزار کے قریب بے گناہ مسلمان تین یا چار روز کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**۔ اس بھیانک اور ہیبت ناک فضا میں جب کہ بڑے بڑے لیڈروں کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے مگر ایک مولانا حفظ الرحمن صاحب کا دم تھا جو سر سے کفن باندھ کر اُٹھے اور بنامِ خدا ان کی ہمت نے کچھ ساتھی بھی تلاش کر لئے، جمعیۃ کا دفتر ریلیف کیمپ بن گیا، حالات انتہائی سنگین تھے مگر مولانا مرحوم کی ہمت اور جوش ان سے کچھ سوا تھا، انہوں نے فوراً مقامی ایڈمنسٹریشن کو للکارا، جمعیۃ اور کانگریس کے باہمت کارکنوں کو جمع کیا اور اصلاح حال کی موثر کوشش اور تدبیر شروع کی۔

مجاہد ملت فرمایا کرتے تھے: ۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مسجد فتح پوری میں گولا پھینکا گیا وہ دلّی میں قیامت خیز طوفان کا آغاز تھا، اسی وقت اپنے اور اپنے خدا کے درمیان یہ عہد کر لیا تھا کہ مخالفت و موافقت کے تمام قصّے ختم ہو گئے، اب ہر مظلوم، ہر پریشان حال، ہر مصیبت زدہ کی امداد فرض ہے خواہ اس کا سابق کردار کچھ رہا ہو۔ انتہیٰ

اس عہد کو مجاہد ملت نے جس طرح پورا کیا، بعد کے دردناک واقعات سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ برادران وطن کی اکثریت نے اپنے دوش بدوش کام کرنے والی اقلیت کو کس بے دردی سے تہ تیغ کیا اور خون کی ندی

بہادی، ہم اپنے قلبی درد والم کی بناء پر اپنے قلم سے لکھنے کی ہمت وطاقت نہیں پاتے۔ العیاذ باللہ تعالی۔

مجاہد ملت کے تین صفات: مجاہد ملت کو اللہ تبارک وتعالی نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے جنہوں نے مجاہد ملت کو ملک وملت کا بہترین رہنما بنادیا اور جن کی وجہ سے نہ صرف ان کی شخصیت اُبھری بلکہ ہندوستانی مسلمانوں نے حیات تازہ کا پیام پایا، ورنہ ہندوستان میں ان کی حیثیت غلامانہ ہوگئی تھی۔ مولانا کے یہ تین جوہر، تدبّر، جرأت، اور خطابت تھے، تدبّر سے تقاضائے وقت سمجھ کر جرأت سے عملی قدم اُٹھاتے اور قوت بیان سے سمجھاتے تھے۔

جدو جہد کی مختلف صورتیں: مجاہد ملت نے کارپردازان حکومت کے دروازوں پر دستک دے کر ان کو آرام گاہوں سے نکالا، لیڈروں کو جھنجھوڑا اور ان سب کی بے نیازی و بے اعتنائی ختم کر کے ان کو مسلمانوں کی امداد واعانت پر آمادہ کیا۔ بے شمار خاندان متفرق محلّوں میں موت کے منہ میں پھنس گئے تھے، ان کو انہیں بے نیاز ممبروں کے ذریعہ تباہی سے بچایا۔

مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت کے لئے مجاہد ملت نے اپنے مذہبی مسلک وعقیدہ کو معیار نہیں بنایا کسی جگہ سنت و بدعت کا سوال نہیں تھا، بلکہ سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کے شہری حقوق بحال کئے جائیں، ان میں تعزیئے کی رسمیں، عرس وغیرہ بھی آتے تھے بلکہ بعض جگہ عرسوں پر نہ صرف خود گئے بلکہ گاندھی جی کو بھی ساتھ لے گئے، حکومت نے اہتمام کیا کہ حسب سابق تعزیئے بنائے جائیں اور باقاعدہ جلوس نکلیں۔

تعزیوں اور عرسوں کے متعلق مسلک دیوبند ڈھکا چھپا نہیں ہے لیکن مجاہد ملت ان دنوں تمام مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے، ہندوستان کی تمام درسگاہوں اور خانقاہوں کی حفاظت کا انتظام کروایا، اجمیر، سرہند، نظام الدین بستی، قطب شریف، (یعنی درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) تمام جگہوں کے متعلق مخلصانہ کوششیں کیں۔

دلّی کے علاوہ پانی پت، میوات کے مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت کے لئے خود متعدد بار تشریف لے گئے دوسرے بڑے لیڈروں کو ان علاقوں کا دَورہ کرایا، صوبہ یوپی کے علاقوں سے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔

(ماخوذ ازبیس بڑے مسلمان: ص/ ۶۲۹)

ف: ان خدمات جلیلہ کے سامنے آنے کے بعد آپ کی عظمت و بزرگی بلکہ آپ کے خیر الناس ہونے میں کسی کو کیا شک رہ جاتا ہے اس لئے کہ اس کی شہادت پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: کی مہر ثبت ہے چنانچہ ارشاد پاک ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الخلقُ عَيالُ اللّٰه فاَحَبُّ الخلَق اِلَى اللّٰهِ مَن احسن اِلٰى عَيَالِه (مشکوۃ/۴۲۵)

ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال ہے، لہٰذا مخلوق میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو ان کے عیال کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔

اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰن اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ۔ (مشکوۃ شریف: ۴۲۳)

رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے، تم زمین پر بسنے والوں پر رحم کرو تو تم پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا جو آسمان پر ہے۔

ان ارشادات کے علاوہ اپنے بھائیوں کی عیادت، اعانت، شفاعت بلکہ عام انسانوں کی نصرت وخدمت کی فضیلت کے سلسلہ میں اتنی احادیث مبارکہ منقول ہیں جن کا احصاء نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (مرتب)

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کا ارشاد: چنانچہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نوراللہ مرقدہ نے ایک مجلس میں (جو سیوہارہ میں مفتی جمیل الرحمن صاحب نائب مفتی دارالعلوم دیوبند کے مکان پر ہوئی) مولانا حفظ الرحمن صاحب کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ”فسادات کے زمانہ میں دہلی کے اندر مسلمانوں کے بچانے کے سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمن صاحب نے جو خدمات دی ہیں، میں ان کے بدلے میں اپنی پوری عمر کے اذکار واشغال نثار کرنے کو تیار ہوں“۔

(روایت مفتی جمیل الرحمن صاحب نائب مفتی دارالعلوم دیوبند) (بیس بڑے مسلمان: ص ر ۶۴۳)

شیرازہ بندی: مجاہد ملت کا منتہائے نظر صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہو جائیں بلکہ آپکا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے وطن میں مساویانہ حیثیت سے باعزت شہری بن کر رہیں یعنی جس طرح وہ اپنے جان ومال، عزت وآبرو کی طرف سے مطمئن ہوں اسیطرح ان کو اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنے مذہبی مراسم کی طرف سے اطمینان ہو کہ یہ سب محفوظ ہیں، اور ان کو آزادی ہے کہ جس کام کو وہ مذہبی کام سمجھتے ہیں ان کو آزادی سے کرتے رہیں جس طرح پہلے کیا کرتے تھے۔

چنانچہ فرمایا:

”ہمیں یہیں (ہندوستان میں) رہنا ہے، اور باعزت طور پر ان

تمام حقوق کے ساتھ رہنا ہے جو ایک باعزت شہری کو حاصل ہوسکتے ہیں بیشک ہم مظلوم ہوسکتے ہیں مگر غلام نہیں بن سکتے، اگر ہم نے برطانیہ کی غلامی برداشت نہیں کی تو ہم اکثریت کی غلامی بھی برداشت نہیں کرسکتے، ہم آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہیں گے اور نہ صرف حفظ الرحمن، ابوالکلام، نہ صرف قوم پرور مسلمان، بلکہ وہ کڑوروں مسلمان جو ہندیونین میں ہیں سب باعزت شہری کی حیثیت سے رہیں گے۔ پاکستان بن چکا اس کی حمایت اور مخالفت کا سوال ختم ہوچکا۔ اب ہندیونین کے تمام مسلمان ایک کشتی کے سوار ہیں، ایک کی تکلیف سب کی تکلیف، ایک کی ذلت سب کی ذلت“۔

یہ تھے وہ تصورات اور جذبات جن کو مجاہد ملت نے اپنایا اور جن کے لئے اپنی تمام کوششوں کو صرف فرمایا۔ الخ۔ (بیس بڑے مسلمان: ص ر ۹۲۹)

آزاد کانفرنس لکھنؤ: یہ کانفرنس ۲۷، ۲۸ ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو لکھنؤ میں کی گئی، سہمے ہوئے مسلمانوں نے اس کانفرنس کو پیغام زندگی تصور کیا اور ملک کے تمام گوشوں سے سفر کرکے اس کانفرنس میں شریک ہوئے، یہ مسلمانوں کا بہت بڑا اجتماع تھا۔

مجاہد ملت کی تقریر: کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمعیۃ العلماء ہند کے ترجمان مجاہد ملتؒ نے کانفرنس کی کارگذاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ولولہ انگیز اور تاریخی تقریر فرمائی، مسلمانان ہند کے ایک لاکھ نمائندوں

نے جب تقریریں سنیں اور کانفرنس کے دوروزکی کارگذاری کامشاہدہ کیا تو وہی شخص خوف زدہ اور ہراساں رہ گیا جو بُز دل تھا، جمعیۃ العلماء ہند کے ارکان نے پورے ملک میں دورے کرکے کانفرنس کے حیات بخش فیصلوں کو ہر سننے والے کے کان تک پہونچایااوران کڑوروں مسلمانوں کو جو مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے اطمینان بخش روشنی سے آشنا کیا۔

ف:۔ یقیناً اللہ تعالی پر ایمان کامل اور اعتماد کے بغیر یہ باتیں کوئی کہہ نہیں سکتا تھا، حدیث پاک: **افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر** کی رو سے بجاطور پر آپ کو مجاہد ملت کا لقب زیب دیتا ہے۔(مرتب)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضری:

آپ مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں بھی تشریف لائے، حضرت والا نے بہت ہی احترام واکرام کا معاملہ فرمایا اورآپ نے بہت خلوص سے دعاؤں کی درخواست پیش کی کہ حضرت والا ہم لوگ ظاہری کام تو کر رہے ہیں مگر باطنی طور سے آپ کی دعاوتوجہ کی سخت ضرورت ہے۔

اس کے بعد ہی آپ کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوگیا، آپ برابر حضرت مصلح الامتؒ کی خدمت میں دُعا کے لئے خط تحریر فرماتے تھے، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولانا نے جواب کے لئے لفافہ رکھ دیا تھا تو حضرت والا نے تحریر فرمایا کہ آں جناب کو جواب کے لئے لفافہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ برابر اپنے حالات سے مطلع فرماتے رہیں، میں جواب دیتا رہوں گا اور اتنے ہی پر بس نہیں فرمایا بلکہ اپنے لفافہ میں مولانا کا بھیجا ہوا لفافہ رکھ کر واپس فرمادیا چنانچہ اخیر تک

مکاتبت کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ (تذکرہ مصلح الامت حصہ دوم ص ۱۳۴)

ف: اس سے معلوم ہوا کہ جواب کیلئے لفافہ کے رکھنے کا ضابطہ ان لوگوں کیلئے تھا، جو اصلاحی تعلق کی بناء پر خط وکتابت کرتے تھے اور وہ لوگ جو دوستانہ ومساویانہ تعلق رکھتے تھے، ان کیلئے یہ ضابطہ نہیں تھا، بلکہ ان کے ساتھ رابطہ کا معاملہ فرماتے تھے، اور یہی معمول حضرت حکیم الامت ؒ کا بھی تھا۔ چنانچہ کبھی فرماتے تھے کہ ”لوگوں نے حضرت مولانا تھانویؒ کے ضابطہ کو تو دیکھا مگر رابطہ کو نہیں دیکھا کہ وہ کتنی محبت ورعایت فرماتے تھے“ (مرتب)

وفات: یکم ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۲/ اگست ۱۹۶۲ء کو فجر سے پہلے آپ کی پاکیزہ روح نے اس دارفانی کو خیرباد کہا **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ**۔ صبح ہوتے ہی یہ اندوہناک خبر ہندوستان میں پھیل گئی، دن میں گیارہ بجے آپ کے خدام نے اپنے مخدوم مجاہد ملت کو غسل دیا اور دہلی دروازہ کے بیرونی میدان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور مغرب کے وقت ملک وملت کا یہ سرمایہ عزیز قبرستان مہدیان (دہلی) میں سپرد خاک کردیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانیؒ متوفی ۱۳۸۲ھ

نام ونسب: نام مفتی عتیق الرحمن، والد کا نام حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی (مفتی دار العلوم دیوبند) ہے آپ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھتیجے ہیں آپ ایسے اہم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

ولادت: آپ کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: انہوں نے جس وقت آنکھیں کھولیں اس وقت برصغیر علم وفن کے ماہرین اور اکابر رجال سے کف گل فروش بنا ہوا تھا۔ تقریباً تمام مذہبی وسیاسی نامور ہستیوں کو دیکھنے کا ان کو موقعہ ملا، ان کے نامور اساتذہ میں والد اور چچا کے علاوہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے اور آخر عمر تک انہوں نے اپنے آپ کو علمی حیثیت سے ان کا ہی مرہون منت سمجھا اور ان کے وفاکیش رہے۔ ذکاوت وذہانت تو ان کا خاندانی جوہر تھا۔ چنانچہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں رہے کچھ عرصہ دینی وعلمی کام کرنے کے بعد اپنے آپ کو سیاسی اور سماجی کاموں کیلئے وقف کر دیا۔ انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری، عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد وغیرہ کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ صحیح طور پر ان کے جانشین تھے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ سے بھی ان کا قریبی رشتہ رہا۔ اس لئے ان کی

ذات میں پورے ایک عہد کا خلاصہ جمع ہو گیا تھا اور ان کی شخصیت بڑی متوازن بن گئی تھی۔ انہوں نے اپنے زمانہ میں برپا ہونے والی تحریکات اور اشخاص کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا تھا اس لئے ان کی رائے بڑی وقیع اور باوزن ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے جن نامور شخصیتوں کو دیکھا اور برتا تھا اور جن سے کسب فیض کیا تھا ان کا طبعی اثر ان کے مزاج پر یہ تھا کہ ان میں بے پناہ وسعت صدر، اور ہمہ نوازی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا ان کی ذات سراپا انجمن تھی۔

فضل وکمال: وہ ایک عالم دین، ایک مفکر، ایک سیاسی قائد اور ایک انسان کی حیثیت سے ایک پوری دنیا اپنے اندر بسائے ہوئے تھے۔ ان کی فقہی یا سیاسی آراء سے اتفاق ہو یا اختلاف ان کا اخلاص ہر شک وشبہ سے بالاتر تھا۔ مہم جوئی یا انقلاب انگیزی ان کی طبیعت میں نہ تھی، ان میں تحمل، نرم خوئی اور مشکلات کے بے ضرر اور سنجیدہ حل تلاش کرنے کا رجحان غالب تھا۔ اس لئے ان کی باتوں سے پر جوش لوگوں کو شکایت ہوتی تھی یا ان کے بارے میں سرد مہری کا خیال ہوتا تھا لیکن حالات کی تلخیوں نے انہیں بجائے اشتعال پیدا کرنے کے ان میں سمندر کی گہرائی اور سکون پیدا کر دیا تھا۔ خالص دینی اور قدیم طرز کی تعلیم کے باوجود ان کا میل جول چونکہ ہمیشہ نئے پڑھے لکھے طبقہ کے ساتھ بھی اسی طرح رہا جس طرح قدیم دینی حلقوں کے ساتھ، اس لئے وہ نئی تبدیلیوں سے بھی بہت زیادہ آگاہ رہے۔ اس لئے بعض فقہی مسائل میں بھی انکے یہاں توسع پسندی زیادہ تھی گرچہ ان کی ذاتی زندگی خالص اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر رہی۔

سیاسی میدان میں ان کا رشتہ مختلف رجحانات کے لوگوں سے رہا جس کی وجہ

سے وسیع المشربی آجانا ایک طبعی بات تھی اور آزادی کے بعد خاص طور پر ہندوستان کے حالات بھی ایسے ہی رہے۔ کسی ایک رخ پر زیادہ سختی سے جمنے کا موقعہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

سیاسی و اجتماعی کاموں میں الجھاؤ کے باوجود علمی و ادبی کاموں سے کبھی کنارہ کش نہیں ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے عظیم علمی و ثقافتی ادارہ ''ندوۃ المصنفین'' قریب جامع مسجد دہلی کی اپنی چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بنیاد رکھی تھی۔ جس میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا نام قابل ذکر ہے۔ انہوں نے علمی ماہنامہ ''برہان'' کا بھی اجراء کیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مفتی صاحب کو قدرت نے اردو نثر لکھنے کا جتنا پاکیزہ ذوق دیا تھا، اور علمی حیثیت سے وہ جس پایہ کے آدمی تھے اس کے بالکل برعکس انہوں نے ہمیشہ دوسروں کو بڑھانے اور خود کو انشاء پردازی کے میدان میں پیچھے رکھنے کی سعی کی اور شاذونادر ہی اور انتہائی مجبورکن حالات ہی میں کچھ لکھا۔

آپ کے اخلاق: خود مفتی صاحب کا اپنا حال تھا کہ گالیاں سن رہے ہیں اذیتیں سہہ رہے ہیں، نقصانات برداشت کر رہے ہیں لیکن اف تک زبان پر نہیں ہے۔ لیکن اس درجہ کے تحمل کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے۔ خاص طور پر رفقاء و احباب کی بے وفائیوں کو سہنا تو بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے لیکن مفتی صاحب انتہائی حساس دل اور غیر معمولی ذکاوت رکھنے کے باوجود برداشت کی غیر معمولی قوت بھی رکھتے تھے۔

ان کی ایک عجیب وغریب ادا ان کی بے انتہاء تواضع تھی۔ اپنے چھوٹوں کے

سامنے بھی وہ اس طرح بچھ جاتے تھے کہ شرمندگی ہوتی تھی ۔ بڑی محبت سے ہر ایک سے ملتے ، سب کا دکھ درد سنتے اپنی استطاعت کی حد تک پریشانی دور کرنے میں کوشاں ہوتے ۔ گھر میں ہوں یا کسی اجتماع میں یا سرراہ ان کی وضعداری اور محبت میں کبھی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا یہ ان کی شخصیت کا بڑا کمال تھا۔ ان کے یہاں اپنے اور غیر کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ساری دنیا ان کی اپنی تھی غیر کوئی نہیں تھا۔

خدا نے ان کو جتنا زرخیز دماغ ، جیسی دور اندیشی اور حکمت ، بولنے اور لکھنے کی جیسی صلاحیت اور لوگوں میں جس طرح کی مقبولیت دی تھی اور خود اپنے والد اور دوسرے بزرگوں کے ماننے والوں کا جیسا حلقہ دیا تھا ، اگر وہ چاہتے تو اپنے لئے دینوی عیش و راحت کا بہت کچھ سامان کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ اسے ایک فروتر بات سمجھی۔

مفتی صاحب کا ایک بڑا وصف ان کی غیر معمولی امانت داری تھی ۔ صرف انہیں کی ذات ہم نے ایسی دیکھی کہ بڑی سے بڑی رقمیں بطور امانت رکھنے کے بعد سالہا سال گذرنے پر بھی اگر واپس کی جاتیں تو وہی رکھے ہوئے نوٹ اور اسی لفافہ میں سب کی امانتیں نام بنام الگ الگ ۔ اس زمانہ میں یقیناً یہ ایک غیر معمولی بات تھی ۔

ف : اخلاق کے سلسلہ میں جو باتیں لکھی گئیں وہ اس زمانہ میں عنقاء ہے ، مگر ہم متعلقین و منتسبینکو ان پر عمل پیرا ہونا اپنی سعادت اور کرامت کی علامت ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے ۔ آمین (مرتب)

وفات : آپ کی وفات ۱۳۸۲ھ میں ہوئی رحمہ اللہ تعالیٰ ۔

(چند نامور علماء و مشائخ ص ۴۰)

حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوری رحمہ اللہ[1] متوفی ۱۳۸۲ھ

نام ونسب: نام احمد میاں اور تاریخی نام مرغوب احمد ہے اور آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام سلیمان بن یوسف ہے۔آپ کے پوتے مولانا مرغوب احمد لاجپوری مقیم حال ڈیوزبری ہیں جو ذکر صالحین کے مؤلف ہیں اسی کتاب سے یہ مضمون ماخوذ ہے۔

ولادت: آپ کی ولادت ۳/ذیقعدہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۳/ستمبر ۱۸۸۳ء بروز جمعرات بوقت صبح صادق لاجپور میں ہوئی۔ لاجپور ضلع سورت کا ایک اہم قصبہ ہے جہاں ارباب علم وفن کی ایک جماعت پیدا ہوئی۔ اور حضرت مولانا لیاقت علی الہ آبادی مجاھد آزادی نے انقلاب کے زمانہ میں عرصہ تک یہیں رہ کر لوگوں کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہے۔(ذکر صالحین صفحہ:۳۹۴ جلد:۳)

تعلیم: ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے مدرسہ اسلامیہ میں حاصل کی سات سال کی عمر میں اردو اسکول لاجپور میں داخلہ لیا۔ اردو اور گجراتی کی تعلیم اسکول میں پانچ سال تک حاصل کی۔ مدرسہ میں ناظرۂ قرآن مجید کا سلسلہ جاری تھا۔حافظ احمد صاحب لاجپوریؒ سے ناظرہ ختم کر کے حفظ قرآن کی ابتدا کی اور پانچ پارے مکمل کر لئے، اس کے بعد شہر سورت میں حافظ محمد عمر فاضل صاحبؒ کی خدمت میں

---

[1] آپ کے حالات آپ کے پوتے حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوری مقیم حال ڈیوزبری نے اپنی کتاب ''ذکر صالحین'' میں درج فرمایا ہے اسی سے یہ اقتباس پیش خدمت ہے۔(مرتب)۔

رہ کر مزید چھ پارے حفظ کیئے ، اس طرح گیارہ پارے حفظ کے بعد صحت کی کمزوری کے باعث حفظ قرآن کا سلسلہ ملتوی کر دیا۔ تعلیم کا یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ شوال میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔

بخاری شریف حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے عاشق زار تلمیذ حضرت مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھیؒ سے پڑھی اور ۱۳۲۳ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ زبدۃ العارفین حضرت شاہ ابوالخیر صاحب مجددی دہلویؒ کے دست بابرکت سے سند حدیث حاصل کی۔

سالانہ جلسہ میں حضرت مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھیؒ کے حکم پر مجمع عام میں تقریر کا موقع بھی آپ کو ملا۔

فراغت کے بعد فن تجوید کے حصول کے لئے حضرت قاری عبدالرحمن صاحب الہ آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر ہفتہ بھی نہ گذرا کہ برادر معظم کا طلبی کا تار موصول ہوا اس لئے بادل ناخواستہ تعلیمی سلسلہ منقطع فرما کر لاجپور تشریف لے آئے۔

تدریسی خدمات اور تلامذہ: حضرت مفتی صاحبؒ نے تدریسی خدمت صرف رنگون میں انجام دی۔ ۱۹۱۵ء میں مدرسہ تعلیم الدین معلمیہ رنگون میں تقریباً چار سال تک تدریسی مشغلہ رہا۔ درجات علیا کی کتب کے علاوہ چند مہینہ ’’بخاری شریف‘‘ کا درس بھی دیا۔

اوصاف وکمالات: اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحبؒ کو گونا گوں خصوصیت سے نوازا تھا ان میں ایک خصوصیت تفقہ فی الدین بھی تھی۔

جس کے شاہد آپ کے وہ فتاویٰ ہیں جو آپ نے رنگون میں خدمت دار الافتاء کے موقع پر تحریر فرمائے تھے۔

دینی علوم میں دستگاہ کے ساتھ ساتھ فقہ وفتاویٰ پر آپ کی نظر بہت گہری تھی۔ آپ کے فتاویٰ مدلل اور فقہی بصیرت کے حامل ہوتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ انتہائی مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ علماء کرام اور مدارس سے متعلق جو کوئی بھی لاجپور آجائے وہ مفتی صاحب ہی کا مہمان ہوتا۔ آپ پوری بشاشت سے انکی ضیافت فرماتے تھے۔

صلہ رحمی کا آپ کو بڑا اہتمام تھا۔ اہل حاجت کی مدد خوب فرماتے، خصوصاً اعزہ کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ اکثر صبح ناشتہ کے بعد دوست و احباب و رشتہ داروں کی خبر گیری کے لئے تشریف لے جاتے۔

آپ کی سخاوت وفیاضی ضرب المثل تھی۔ دست مبارک بہت کشادہ تھا۔ علماء ومدارس کے سفراء کی بھی خوب مدد فرماتے اور دوسروں کو بھی امداد کی ترغیب دیتے۔

بیعت وخلافت: علوم ظاہرہ سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی فرنگی محلیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا اعظم حسین صاحب صدیقی مہاجر مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت ہوئے اور دو ماہ مستقل قیام فرمایا۔ اوراد ووظائف کی تعلیم کے ساتھ مراقبہ ومحاسبہ کی تعلیم بھی حاصل کی اور بڑی سخت شرطوں کے ساتھ ہفتہ بھر کا چلہ کروایا۔ موصوف کی وفات کے بعد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے۔

حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرت شاہ غلام محمد مجددیؒ سے جو سلسلہ نقشبندیہ کے ایک عارف اور اہل دل بزرگوں میں تھے رجوع فرمایا۔ شیخ نے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی۔

اتباع سنت: حضرتؒ کو طالب علمی کے زمانہ ہی سے اتباع سنت کا التزام تھا۔ چھوٹی چھوٹی سنتوں پر بھی پابندی سے عمل فرماتے۔ اتباع سنت کی وجہ سے وہ اذکار جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں ان کا خوب اہتمام فرماتے۔ اسلئے بعد نماز فجر و مغرب اس کلمہ کو پڑھنے کا اہتمام کرتے جیسا کہ حدیث پاک میں ہے فجر اور مغرب کے بعد قعدہ کی ہیئت پر بیٹھے ہوئے جو شخص **"لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد بیدہ الخیر یحیی ویمیت وھو علی کل شئی قدیر"** دس مرتبہ پڑھے تو ہر مرتبہ پڑھنے پر اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور یہ کلمات اس کے لئے ہر بری چیز سے امان اور شیطان مردود سے پناہ بنتے ہیں اور سوائے شرک کے کوئی گناہ اس کو ہلاک نہیں کرے گا اور عمل کے اعتبار سے وہ شخص تمام لوگوں میں افضل ہوگا البتہ وہ شخص جو اس سے افضل کلمات کہے۔ (مشکوۃ صفحہ: ۹۰، باب الذکر بعد الصلوۃ)

ذکر اللہ کا اہتمام: حضرت مفتی صاحبؒ کو ذکر کا خوب اہتمام تھا۔ مطالعہ وغیرہ سے جو وقت فارغ ہوتا ہاتھ میں تسبیح ضرور ہوتی اور زبان یاد الٰہی میں مشغول رہتی۔ بقول مولانا اسمٰعیل حاجی واڑی صاحب لاجپوری مدظلہ کے کہ میں نے اپنے بزرگوں میں جنہیں ذاکر و شاغل یعنی ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف دیکھا ان میں مفتی مرغوب احمد صاحبؒ کا کوئی ثانی نہیں۔ ذکر اللہ میں درود

شریف بہت کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

نماز باجماعت کا اہتمام: مفتی صاحبؒ جماعت کی نماز کا بے حد اہتمام فرماتے۔ صحت تک جماعت کے پابند رہے۔ حالت مرض میں جب مسجد کی حاضری سے معذور ہو گئے تو اس پر اظہار افسوس فرمایا کرتے تھے۔ علماء سے دعا کی درخواست فرماتے۔

رقت قلبی: مفتی صاحبؒ بڑے رقیق القلب واقع ہوئے تھے۔ تلاوت کلام پاک کے وقت آیت تعذیب پر اکثر گریہ طاری ہو جاتا۔

ایک مرتبہ نماز فجر کے وقت امام صاحب کی عدم موجودگی میں مولانا عبدالقدوس صاحب اور ان کے والد محترم حضرت مولانا محمد بن یوسف صاحبؒ وغیرہ موجود تھے، چونکہ مفتی صاحبؒ قرآن پاک ایک خاص لہجہ میں بڑے درد سے پڑھتے تھے۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے آپ سے درخواست کی کہ حضرت نماز پڑھا دیجئے! آپ نے نماز پڑھائی اور سورۂ نبا پڑھی، جب آیت شریفہ {**اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا**} (بے شک دوزخ ایک گھاٹ کی جگہ ہے) پر پہنچے تو گریہ وبکا کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مصلی حضرات بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت مولانا عبدالحیٔ حکیم صاحبؒ کی وفات پر پیش آیا، موصوف کی وفات شب جمعہ ہوئی، اس دن فجر کی نماز مفتی صاحبؒ نے پڑھائی اور اس میں {**يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ**} تلاوت فرماتے ہوئے جب {**اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ**} پر پہنچے تو گریہ طاری ہو گیا۔

ف: سبحان اللہ! نماز میں قرآن پاک کے تلاوت کے وقت اس کیفیت کا ہونا مبارک حال ہے ایک دفعہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ پر بھی **ان جھنم کانت مرصادا** پر فجر کی نماز میں ایسا تاثر ہوا کہ چیخ نکل گئی۔ (مرتب)

صدقۂ جاریہ: ایک حدیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ انسان کی وفات سے اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے۔ ایک صدقہ جاریہ۔ دوسرا وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ تیسرا نیک اولاد۔

الحمدللہ حق تعالیٰ نے یہ تینوں نعمتیں آپ کو عطا فرمائی تھیں۔ مرحوم نے اپنے پیچھے لاجپور کی جامع مسجد اور مفید تالیفات اور ولد صالح میں راقم (مولانا مرغوب صاحب) کے والد ماجد کو چھوڑا جو الحمدللہ "**الولد سر لابیہ**" کے صحیح مصداق ہیں، صدقہ جاریہ چھوڑے ہیں۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کسی عربی شاعر کا یہ شعر مفتی صاحب کے حال کی صحیح ترجمانی کررہا ہے ؎

موت التقی حیاۃ لانفاد لھا　　قدمات قوم وھم فی الناس احیاء

کسی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

شہیدانِ محبت کو کبھی مرتے نہیں دیکھا
حیات جاودانی ملتی ہے ان کو فنا ہو کر

تصنیفات: چار مفید تصنیفات چھوڑیں:

(۱) سادات کے مناقب وفضائل میں "سفینۃ النجات فی ذکر مناقب السادات"۔

(۲) عقائد میں ''توحید الاسلام''۔

(۳) بچوں کیلئے فقہ شافعی میں ''تعلیم الاسلام'' کے طرز پر ''ارکان اربعہ''۔

(۴) حدیث میں ''جمع الاربعین فی تعلیم الدین''۔

ان تصنیفات کا مفصل تعارف اور منتخب اقتباسات دیکھنا ہو تو ''تذکرۃ المرغوب'' کا مطالعہ فرمائیں۔

مرض و وفات: حضرت مفتی صاحبؒ کی عمر تقریباً ۷۷ سال کی تھی کہ ۲۹ / دسمبر ۱۹۵۷ء مطابق ۱۳۷۷ھ کو فالج کا حملہ ہوا اور یہ مرض ' مرض وفات ثابت ہوا۔ علاج معالجہ کروایا، مگر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا، اس مرض نے مفتی صاحبؒ کو صاحب فراش بنا دیا۔ زبان میں بھی لکنت پیدا ہو گئی تھی، مگر آپ نے یہ پورا زمانہ صبر استقامت کے ساتھ گذارا۔

بالآخر یکم محرم الحرام ۱۳۸۲ھ مطابق ۵ / جون ۱۹۶۲ء بروز منگل بعد نماز ظہر اپنے مولی کی آغوش رحمت میں منتقل ہو گئے، **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

بعد نماز عشا حسب وصیت حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ صاحب فتاوی رحیمیہ نے اہل قریہ کے علاوہ علماء اور طلبہ کی بڑی جماعت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھائی اور لاجپور کے پرانے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔**

(ذکر صالحین صفحہ: ۳)

حضرت ڈاکٹر مصطفی السباعی دمشقی متوفی ۱۳۸۲ھ

عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت

نام ونسب: نام مصطفی سباعی والد کا نام حسنی سباعی ہے۔

ولادت: ڈاکٹر صاحب ۱۹۱۵ء میں شام کے ایک مردم خیز اور شاداب شہر حمص میں پیدا ہوئے، جسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی آخری خوابگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مرحوم کا گھرانہ سینکڑوں برس سے علم وفضل کا گہوارہ تھا اور ان کے آباء واجداد ہمیشہ سے حمص کی جامع مسجد کے امام اور خطیب تھے، اس وجہ سے شہر میں بڑے احترام وعقیدت مندانہ نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور علم وفضل اور تقوی میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے، معاصر علماء سے بڑا گہرا ربط وتعلق تھا اور باہم بحث ومباحثہ اور مذاکرہ کی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی جن میں شیخ اپنے نوعمر بچے کو شریک کیا کرتے تھے۔

تعلیم وتربیت: ذہانت، جرأت، علم کا شوق اور انہماک آبائی ترکہ تھا۔ اس کے ساتھ جلیل القدر عالم اور فاضل باپ کی تربیت ونگہداشت نے چار چاند لگادیئے، ابتدائی تعلیم گھر اور مکتب میں حاصل کرنے کے بعد ''معہد شریعہ'' سے سند حاصل کر کے جامع ازہر کے کلیۃ الشریعہ میں داخلہ لے کر فقہ اسلامی کی طرف خاص توجہ کی اور اس میں دستگاہ اور خاصا رسوخ اور تعمق حاصل کیا۔

ایک مرتبہ دوران درس اپنے ازہر کے تعلیمی دور کا واقعہ بیان کیا کہ مجھے

ابتداء ہی سے فقہ سے ذوق وانہماک تھا، اگرچہ حنفی مسلک سے وابستہ تھا، لیکن خواہش رہتی تھی کہ دوسرے مسالک کے دلائل سے اچھی طرح واقف ہوجاؤں اور حنفی مسلک کے بھی سارے دلائل سے باخبر ہوتا جاؤں اس لئے اپنے فقہ کے ازہری استاذ سے بحث ومباحثے کیا کرتا تھا، اکثر اپنے کو شافعی یا مالکی ظاہر کرتا اور حنفی مسلک کے خلاف دلائل پیش کیا کرتا تھا جس کے جوابات استاذ قوت سے دیتے تھے لیکن میں اپنے سوالات اور بحث کو جاری رکھتا تھا، اس پر کبھی کبھی استاذ سخت ناراض ہوجایا کرتے تھے اور مجھے ان سے معذرت کرنی پڑتی تھی۔ غرض بڑی جانفشانی، بے پناہ محنت اور بیدار مغزی کے ساتھ ازہر کی تعلیم مکمل کی مصر اور ازہر میں صرف ایک طالب علم ہی نہیں رہے بلکہ وہاں کی دینی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کا بھی انہوں نے بغور مطالعہ کیا اور اس پر ناقدانہ نظر ڈالی، وہاں کی اہم شخصیتوں ادیبوں، انشا پردازوں، علماء اور دینی رہنماؤں سے ربط وتعلق پیدا کیا اور تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ فرانسیسی سامراج کے خلاف شام اور انگریز سامراج کے خلاف مصر کی تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ اور کئی بار جیل بھیجے گئے۔

جماعت ''شباب دارارقم'' سے تعلق: شیخ عبدالرحمن الکواکبی شام کے مشہور اور زرخیز شہر حلب کے چشم و چراغ تھے ان کے اثر سے وہاں نسبتاً دینی جذبات وعزائم بیدار تھے اور ایک جماعت ''شباب دارالارقم'' کے نام سے کچھ اصلاحی اور دینی کام کررہی تھی، دیندار اور اصلاح پسند نوجوان اس سے وابستہ ہوگئے تھے مصطفی السباعی بھی اس جماعت سے متعارف اور اپنے آپ کو اس کا ایک ادنی رکن سمجھتے تھے، لیکن مصر سے وہ ایک نیا جذبہ، نیا حوصلہ نیا جوش، پختہ

عزم، راسخ عقیدہ اور تازہ ایمان لے کر واپس ہوئے تھے امام حسن البناء کی سیمابی نگاہوں نے ان کو ایک بلند فکر، نئی امنگ، اجتہادی شان، اور دوراندیش نگاہ سے مالا مال کر کے شام جیسے گل گلزار ملک کی طرف بھیجا تھا، مصطفی السباعی کی صلاحیتوں اور اصلاحی کارناموں سے حمص وحلب اور دمشق وحماۃ کی سرزمین خوب آشنا تھی ''شباب دار الارقم'' کے دوش بدوش اس پر جوش داعی اور شعلہ بار نوجوان کی آہ سحر گاہی سے خوابیدہ انسان بیدار ہو گئے، پژمردہ کلیاں اور مرجھائے ہوئے پھول کھل گئے اور سارے ملک میں بہار آ گئی۔

مدرسہ کا قیام: ڈاکٹر مصطفی السباعی کے زور خطابت، شیریں بیانی، شگفتہ خیالات ستھرے اور پاکیزہ افکار، اخلاص واخلاقی کردار نے نوجوانوں اور عام مسلمانوں کو اپنا فریفتہ اور گرویدہ بنالیا، چند ماہ اپنے شہر حمص میں درس وتدریس اور اصلاح کا کام کرتے رہے، لیکن ان کے عزائم اور بلند حوصلوں کے لئے وہ زمین تنگ نظر آئی تو دمشق منتقل ہو گئے، اور وہاں ایک مثالی مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس میں تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کا خاص اہتمام کیا، اس مدرسہ کا نام **"المعهد الاسلامي العربي"** تجویز کیا، اب تک وہ دمشق میں قائم ہے اور اس کے تعلیم یافتہ طلباء اپنی دینداری اور داعیانہ جذبات وجوش میں ممتاز ہیں۔ اس کے وہ پہلے پرنسپل منتخب کئے گئے۔

دمشق یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعہ کا قیام: شامی پارلیمنٹ نے ملک کے دستور میں جو ستمبر ۱۹۵۰ء میں صادر ہوا یہ تصریح کی کہ قانون کا اصل سرچشمہ فقہ اسلامی ہے اس کی شدید ضرورت محسوس کی جانے لگی، کہ کوئی مستقل ایسا شعبہ یا ادارہ قایم کیا جائے جس میں ایسے علماء اور فقہاء تیار کئے جائیں جو تفسیر وحدیث

اور فقہ اسلامی اور اس کے مسائل و احکام میں، دستگاہ و عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یورپی قانون اور ملکوں کے نشیب و فراز، قوموں کے رجحانات و افکار، زمانہ کے مزاج و تقاضے اور اسلام کی روح و میلان سے خوب اچھی طرح واقف اور شناسا ہوں تاکہ وہ قانونی اور دستوری ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں چنانچہ اس مجاہد اسلام اور امت مسلمہ کے مایہ ناز فرزند نے اس کی تحریک کی اور دمشق یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعہ کے نام سے مستقل ایک شعبہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ منظوری دے دی گئی اور ۲۷ رمضان ۱۳۷۱ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۹۵۲ء کو شامی پارلیمنٹ نے دمشق یونیورسٹی میں ایک نئی فیکلٹی کلیۃ الشریعہ کے قیام کا قانون پاس کیا جس کی نظیر عالم اسلام کی کسی یونیورسٹی میں نہیں پائی جاتی ہے۔

حادثہ فلسطین: عالم اسلام کے لئے فلسطین کا حادثہ ایک زبردست المیہ ہے جو شرمناک بھی ہے اور افسوسناک بھی، اس خطرناک حادثہ کا احساس دنیائے عرب و اسلام دونوں کو بہت پہلے سے ہوگیا تھا لیکن اس کی غفلت اور تن آسانی کی وجہ سے دنیا کی سب سے بدطینت قوم سرزمین فلسطین کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرسکی، اس المیہ کی طرف قوم و ملک کے روشن ضمیر اور پاکیزہ افراد نے توجہ مبذول کرائی لیکن ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ان میں عالم عربی کے ہوش مند، بے لوث اور حق وحریت کی طالب جماعت اخوان المسلمین پیش پیش تھی۔ شام میں اخوان کے سربراہ مراقب عام ڈاکٹر مصطفی السباعی پوری مستعدی اور قوت سے قوم کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلا رہے تھے۔

صحافت اور تصنیف کا مقصد حقیقی: اس کا صحیح مقصد انسان کی زندگی میں

انقلاب برپا کرنا تھا سباعی صاحب ایک پر جوش داعی و مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مصنف مضمون نگار اور ادیب و شاعر بھی تھے۔ اگر چہ ان کے اصلاحی کاموں نے شعر و ادب کے لئے موقع بہت کم دیا۔اور ان کا شعر و ادب بھی دین واسلام کی خدمت کے لئے تھا، وہ کیف وسرور اور جذب پیدا کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں لکھتے تھے، بلکہ ان کی ساری فکر و عمل کا مقصد انسان کی زندگی میں ایک دینی وعملی انقلاب برپا کرنا تھا، اللہ تعالی نے ان کے وقت میں بڑی برکت دی تھی اس کوانہوں نے بہت کارآمد بنایا اور مختلف موضوعات سے متعلق گرانقدر کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد ۲۵۔۳۰ کے قریب ہے ان میں سے بعض کئی کئی سوصفحات پر مشتمل ہیں۔

اخلاق وتزکیہ نفس : سیکڑوں سال سے سباعی صاحب کا گھرانہ علم ودین کا گہوارہ تھا ان کے والد حسنی السباعی صاحب مرحوم ایک عالم دین اور خدارسیدہ بزرگ تھے۔ اس دور کے صلحاء و عارفین سے گہرا ربط رکھتے تھے اور بیشتر اوقات انہیں کی مفید اور بافیض مجلسوں میں رہتے اور دنیا و نفس کی گندگیوں سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتے، ڈاکٹر سباعی صاحب کی بھی ان کے والد نے اسی طرح کی تربیت کی اس لئے بچپن سے ان کا رجحان اخلاق وسلوک کی طرف تھا، وہ نیک وصالح بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، اور فیض یاب ہوتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت سباعی صاحب کو اسلام پر بڑا گہرا اور پختہ عقیدہ ویقین حاصل تھا، اس کے لئے ہر وقت جاں بازی وسرفروشی کے لئے تیار رہتے اور زندگی کے کسی لمحہ میں اس سے غافل نہیں ہوئے بڑے بلند اخلاق اور پاکیزہ کردار کے حامل تھے، ہر شخص سے بڑی محبت وتعلق کا برتاؤ کرتے تھے اور ہمیشہ مسکراتے

ہوئے ملتے تھے، دوست و دشمن سبھی ان کے اخلاق کے گرویدہ اور مداح تھے کسی طالب علم یا اخوانی کا چہرہ اترا ہوا، غمزدہ و غمگیں دیکھتے تو کوئی پر لطف قصہ یا واقعہ سنا کر اسے خوش کرتے اور کئی ایسے طالب علم تھے جن کا خرچ سباعی صاحب خود برداشت کرتے تھے یا ان کا کوئی بہتر و معقول انتظام کر دیتے تھے۔

ف: حق پرست علماء کے اخلاق و کردار اسی طرح بلند ہونے چاہئے اللہ تعالی ہم سب کے اندر ایسے ہی اخلاق حمیدہ اور صفات حسنہ پیدا فرمائے (مرتب)

اسلام اخلاقی نظام ہے[1]**:** روحانیت و تقوی کی طرف قلبی میلان تھا اور اس سلسلہ میں کئی مضامین لکھے، ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔۔۔

''اسلام ایک قانونی و اخلاقی نظام ہے، جب دور اول کے مسلمان نظام شریعت کو نافذ کرتے تھے اور اسلامی اخلاق کے حامل تھے اس وقت ان کی سوسائٹی تھی اور وہ لوگ بہت بلند اخلاق و کردار سے آراستہ اور اس کے حامل تھے، اسلام کے اہم اخلاق و کردار میں سے ''محبت' درگزر کرنا، تعلق مع اللہ اور حضوری قلب، محاسبہ نفس، دنیا سے استغنا و بے نیازی، دنیاوی منافع اور اس کی خوبیوں کو برتنے اور استفادہ کرنے میں ان کا بڑا مقام تھا۔

بیعت: ڈاکٹر سباعی صاحب شام کے ایک عارف باللہ، داعی و مصلح شیخ احمد الحارون الحجار سے بیعت تھے، اور ان کی روحانیت، صفاء قلب اور زہد و تقوی

---

[1] سبحان اللہ! اب تک تصوف کو اخلاقی نظام کہا جاتا تھا مگر اب اسلام کو اخلاقی نظام فرمایا جو عین حق و صواب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اسلامی نظام کو اختیار کرنے اور امن کی راہ پر چل کر سعادت دارین حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین (مرتب)

سے بہت متاثر تھے، ان سے اس سلسلہ میں بہت فیض حاصل کیا، اکثر ان کی مجلسوں میں جاتے تھے اور خاصا وقت گزارتے تھے، بسا اوقات اپنے دعوتی کام اور علمی و اجتماعی اصلاحات کے سلسلہ میں شیخ سے مشورہ طلب کرتے تھے۔ شیخ ان کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے تھے جو حضرت سباعی صاحبؒ کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے تھے۔

اطلاع حال: ڈاکٹر سباعی صاحب نے بیان کیا تھا کہ ایک زمانہ میں اپنے کاموں اور سیاسی پیچیدگیوں اور الجھنوں میں ایسا منہمک ہوا کہ بہت سے معمولات میں کوتاہی ہونے لگی، شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ۔۔۔

''مجھے بڑا دکھ اور رنج ہے کہ ان دنوں مجھے وقت نہیں ملتا جس میں کچھ نفل اور تہجد ادا کرسکوں یا خلوت نصیب ہو جائے جس میں اللہ کو یاد کرلیا کروں، یا غور و فکر سے قرآن شریف کی تلاوت کرسکوں، میں اصلاحی، سماجی و سیاسی کام اور عبادت و طاعت الٰہی دونوں کیسے کروں، اس سلسلے میں میرے لئے کوئی راہ نکال دیں۔ شیخ نے بلا تامل ارشاد فرمایا۔۔۔تو کیا اس کام کا ثواب جو تم کر رہے ہو عبادت، تہجد اور خلوت کے ثواب سے کم ہے؟ بیشک جو تم کر رہے ہو وہ عبادت ہے بلکہ بہت سی عبادتوں کے ثواب سے زیادہ اس میں ثواب و اجر ہے، اپنے اس کام پر افسوس و شرمندگی نہ محسوس کرو''۔

وفات: ۲۷ جمادی الاولی ۱۳۸۲ھ مطابق ۳/ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو آپ کا انتقال دمشق میں ہوا **انا للہ و انا الیہ راجعون**۔ جنازے میں لاکھوں آدمی شریک ہوئے اور گھر سے قبرستان تک ہتھیلیوں اور بازووں پر جنازہ لے گئے اس وقت ان کی زبانوں

پر مندرجہ ذیل کلمات تھے۔

الی جنۃ اللہ یا سباعی، الی رحمۃ اللہ یا سباعی، نحن علی العھد یا سباعی۔

خدا کی جنت کی طرف اے سباعی، اللہ کی رحمت کی طرف اے سباعی، ہم اپنے عہد و پیماں پر قائم ہیں اے سباعی۔

اللھم انا نشھد ان السباعی ادی الامانۃ و بلغ الرسالۃ و انا عنہ راضون۔ اللھم فارض عنہ (اے اللہ بے شک ہم گواہی دیتے ہیں کہ سباعی نے امانت پوری کی۔ اور پیغام پہنچا دیا اور ہم ان سے راضی ہیں، اے اللہ تو بھی ان سے راضی ہو۔)

انہیں فلک شگاف نعروں کے ساتھ لاکھوں کا مجمع جنازہ لے کر جامع بنی امیہ پہنچا۔ وہاں نماز جنازہ ہوئی اور دمشق کے قدیم قبرستان جس میں بہت صحابہ کرام کی قبریں ہیں۔ تدفین ہوئی۔ نور اللہ مراقدہم اللہ تبارک وتعالیٰ اس مرد مجاہد اور پر جوش و مخلص داعی اسلام اور اسلام کے سچے و جاں نثار خادم کی مغفرت فرمائے اور ان کو انبیاء و صالحین و صدیقین و شہداء کے زمرے میں داخل فرمائے (آمین) اور ان کی قبر کو **روضۃ من ریاض الجنہ** بنائے۔ آمین۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔۔۔ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اظہار حقیقت: یقیناً یہ حضرات موفق من اللہ تھے اسلئے ان کے اثر انگیز اور بصیرت افروز تذکروں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے تا کہ ہم کو نصیحت و عزت حاصل ہو اور عمل کا داعیہ وجذبہ پیدا ہو۔ یقیناً ہم نام کے خدام دین نے وہ جاں نثاری و جانبازی نہ کی جوان حضرات علماء کرام نے کی۔ پس اے اللہ ہم جن علماء کرام کے کارناموں کو پڑھ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں قبول فرما۔ اور ان حضرات کے زمرہ میں محشور فرما۔ آمین (مرتب)

حضرت علامہ شیخ ناصر احمد صاحب الزبیری عراقی متوفی ۱۳۸۲ھ

نسب و ولادت: حضرت علامہ شیخ ناصر احمد کی ولادت ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں بمقام الزبیر میں ہوئی۔ نجد کے علاقے ''القویم'' سے ان کا تعلق تھا ان کے والد نے الزبیر آ کر یہیں شادی کر لی۔ چھ برس کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا پھر اپنے چچا عبدالرحمن احمد کے گھر پرورش پائی۔

فضل و کمال: آپ کے اندر رعب و وقار، بشاشت اور حسن اخلاق تھا۔ چہرے سے نور ایمان کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ کاموں سے سنجیدگی اور دانائی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ آپ کو بہت سے علوم میں مہارت حاصل تھی، جیسے تفسیر، حدیث، سیرت، تراجم، فقہ اور خصوصاً فرائض، ریاضیات، فن لائبریری، فلکیات، جغرافیہ، علم نباتات و حیوانات وغیرہ۔ وہ حقیقت میں قدیم و جدید، بنیادی اور عصری علوم کے انسائیکلو پیڈیا تھے۔

اخلاق حسنہ: وہ متقی و پرہیز گار عالم تھے۔ ان کے چہرے پر نور جھلکتا تھا۔ وہ بڑی محبت و عزت کے ساتھ ملتے، ملنے والے کا استقبال کرتے، مجلس میں اس کے لیے کشادگی پیدا فرماتے، ملاقاتیوں کا استقبال کرتے، ہمہ تن گوش ہو کر متکلم کی بات سنتے، اپنی گفتگو سے سامع کو اسیر کر لیتے، اپنی شفقت سے ہر ملاقاتی کو ڈھانپ لیتے اپنی مجلس میں اکثر یہ بات دہراتے تھے کہ زمانے کا فساد، لوگوں کی ذلت، دشمنوں کے سامنے ان کی کمزوری اور مادیت میں ڈوب جانے کا صرف

اور صرف یہی علاج ہے کہ دین کی طرف لوٹا جائے اور اس درست نہج کو اختیار کیا جائے، جو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ وباللہ التوفیق

تواضع اور بردباری: وہ بڑے کشادہ ظرف تھے اور جاہلوں کے سلسلے میں بردبار تھے، ان کے ساتھ مل جل کر رہتے، ان کے مسائل پر پوری طرح سے توجہ دیتے، ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے، ان کی سمجھ کے مطابق ان سے گفتگو کرتے، جو مسائل اور مشکلات ان کے سامنے پیش آتے، ان کا احاطہ کرتے اور حل بیان کرتے، جس کی اللہ انہیں توفیق دیتا اور جس کو وہ خود مناسب سمجھتے تھے، چھوٹے بڑے، امیر وغریب سب کے ساتھ تواضع سے پیش آتے، بڑوں کے تحفے تحائف سے بچتے۔ ان کی مجلسوں میں شرکت سے پرہیز کرتے، البتہ ان میں صالحین، اہل خیر اور احسان کرنے والوں کی مجلسوں میں بیٹھنے سے پرہیز نہ کرتے، جو اپنے مالوں میں اللہ کے حق کو پہچانتے اور تمام لوگوں کے لئے اپنا پہلو جھکا دیتے ہیں۔

وہ بڑے ظریف تھے، اسلامی ادب وتہذیب موصل اور بغداد کے علماء اور مختلف علاقوں کے شرعی قاضی مشکل مسائل میراث میں ان ہی سے رجوع کر تے تھے۔ وہ خطابت جمعہ وامامت سے گھبراتے تھے بلکہ پرہیزگاری اور زہد کی شدت کی وجہ سے امامت اور خطابت میں اپنے تلامذہ یا شاگردوں کے شاگرد کو آگے بڑھاتے تھے۔ حتی کہ وفور علمی کے باوجود ان کی کوئی کتاب شائع نہ ہوئی صرف حج کے متعلق ایک کتابچہ شائع ہوا کیونکہ مساجد میں لوگوں کی امامت اور جمعہ کے خطبہ سے اجتناب کی طرح تالیف اور تصنیف سے بھی دور رہتے تھے۔

ان کی تمام تر توجہ کا مرکز مدرسہ النجاۃ کے طلباء تھے تاکہ وہ علمی واخلاقی اور دینی پہلو سے ہراول دستہ بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آرزو پوری کردی۔

چنانچہ الحمدللہ ان کی اکثریت ایسی ہی تھی جنھوں نے اپنے ذمے داریوں کو نبھایا۔ محنت، صبر اور سچائی کے ذریعے زندگی کے مختلف میدانوں میں سربراہی کے منصب پر قبضہ جمالیا۔ اور اس کے ذریعے امت، دین اور وطن کی خدمت کی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ

علم وزہد: بلاشبہ استاذ شیخ ناصر احمد، الزبیر کے بالاتفاق شیخ العلماء تھے۔ وہ اس چیز کی تابناک اور روشن تصویر تھے، جو علماء میں ہونی چاہیے۔ یعنی وسیع معلومات، علمی تجربہ اور موجودہ زندگی کے حالات میں جو نئے مسائل آرہے ہیں ان سے نپٹنے کی صلاحیت سے وہ متصف تھے۔

وفات: ۲۵ / جولائی ۱۹۶۲ء مطابق ۱۳۸۲ھ کو بصرہ کے اپنے باغ میں چہل قدمی کررہے تھے کہ دماغ کے رگ میں خون جم گیا اور وفات ہوگئی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**۔ جنازے میں شرکت کرنے والوں کی بھیڑ کی وجہ سے عیدگاہ میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس صدی کی آخری دہائیوں میں یہ سب سے بڑا جنازہ تھا۔ قبرستان الزبیر بن عوام میں ان کی تدفین ہوئی۔ نوراللہ مرقدہ۔

ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ شیخ علامہ ناصر احمد کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے، کشادہ جنتوں میں ٹھکانا عطا کرے اور انبیاء، صدیقین اور شہدا کی بہترین معیت سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

(عالم اسلام کی عالمی شخصیات صفحہ ۴۱۸)

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی[1] صاحب پھولپوری اعظم گڈھی م: ۱۳۸۳ھ

نام ونسب وولادت: آپ نہایت صاحب حال بزرگ تھے، آپ کی ولادت ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ والد محترم کا اسم گرامی شیخ عبدالوہاب تھا اگرچہ آپ کا اصلی وطن موضع چھاؤں ضلع اعظم گڈھ تھا جو قصبہ پھولپور سے تقریباً ۷ ارکیلومیٹر پر واقع ہے مگر چونکہ زیادہ تر پھولپور قیام رہا اس لئے پھولپوری مشہور ہو گئے۔

تعلیم: تعلیم کے لئے گاؤں کے کسی پرائمری اسکول میں اردو پڑھنے کے لئے بھیجے گئے مگر ابھی دو تین دن ہی گذرے تھے کہ آپ کے دادا صاحب مرحوم نے جو صاحب نسبت بزرگ تھے آپ کی والدہ محترمہ کو خواب میں ہدایت کی کہ ''عبدالوہاب'' سے کہہ دو کہ اس بچے کو علمِ دین کی تعلیم دلوائیں۔

چنانچہ آپ کے والد محترم نے آپ کو عربی کی تعلیم کے لئے جونپور مولانا ابوالخیر محمد مکی صاحب کی خدمت میں بھیجا جو مولانا سخاوت علی صاحبؒ کے صاحبزادے تھے، جو حضرت مجدد سید احمد شہید رائے بریلویؒ کے خلیفہ تھے، مولانا محمد مکیؒ سے شرح جامی، شرح تہذیب تک تعلیم حاصل کر کے تقریباً دو سال کے

---

[1] حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب خلیفہ حضرت محی السنہ مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ نے آپ کے اہم ملفوظات جمع فرمائے ہیں جو ''معرفت الٰہیہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے شروع میں حضرت حکیم صاحبؒ نے آپ کی مختصر سوانح مع کرامات ومبشرات کے تحریر فرمایا ہے، اسی کو سامنے رکھ کر کسی قدر حالات اور چند ملفوظات درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ (مرتب)

لئے مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادیؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے، اس کے بعد جامع العلوم کانپور میں مشکوۃ شریف تک تعلیم حاصل کی۔ معقولات کی تکمیل کے لئے مدرسہ عالیہ رامپور تشریف لے گئے، وہاں سے درس نظامی کی سند حاصل کر کے حدیث پڑھنے کے لئے حضرت مولانا ماجد علی صاحب جونپوریؒ کی خدمت میں گئے، جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ کے ساتھ دو سال میں دورۂ حدیث کی تکمیل فرمائی تھی، حضرت مولانا گنگوہیؒ کی ساری تقریریں رات کو قلمبند فرماتے تھے، حتی کہ بعض رات لکھتے لکھتے فجر کی اذان ہو جاتی تھی۔

ف: سبحان اللہ! یہ تھی زمانۂ طالب علمی کی محنت و مشقت، جس کی وجہ سے یہ حضرات صاحب استعداد ہوئے اور تدریس و تعلیم کی خدمت بخوبی انجام دیا۔ (مرتب)

درس و تدریس: کچھ دنوں آپ نے سیتاپور کے مدرسہ اسلامیہ میں پڑھایا۔ مگر وہاں کے لوگوں کے اعتقاد میں اختلاف کی بناء پر استعفاء دے دیا، پھر مولانا ابوبکر صاحب ابن مولانا محمد مکی صاحبؒ کے مدرسہ میں پانچ سال بحیثیت صدر مدرس درس دیتے رہے۔

بیعت: اثنائے قیام جونپور میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جونپور تشریف لائے، پھر اعظم گڈھ کے قصبہ سرائے میر جانے لگے تو آپ بھی ساتھ ہو لئے، وہاں کی عیدگاہ میں حضرت حکیم الامتؒ کا نہایت موثر وعظ ہوا، مولانا پھولپوریؒ بہت متاثر ہوئے، اور بیعت کی درخواست کی، آخر اسی عیدگاہ کے محراب کے اندر دوشنبہ کے دن یکم ربیع الاول ۱۳۲۸ھ کو حضرت

حکیم الامتؒ نے بیعت فرمالیا، اور اذکار و اشغال کی تلقین فرمائی، چنانچہ آپ نہایت پابندی کے ساتھ ان کی ادائیگی میں مشغول رہے، آخر مرشد کامل حضرت حکیم الامتؒ نے دوشنبہ کے دن یکم ربیع الاول ۱۳۳۲ھ کو خلافت و بیعت کی اجازت سے مشرف فرمایا۔

مدرسہ روضۃ العلوم: ۱۳۳۳ھ میں حضرت حکیم الامتؒ کے مشورہ سے پھولپور میں ایک دینی مدرسہ قائم فرمایا جس کی بنیاد حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے دست مبارک سے رکھی اور پھولپور کی مناسبت سے اس کا نام روضۃ العلوم رکھا، اس لئے کہ روضہ کے معنی کیاری کے آتے ہیں۔

مدرسہ بیت العلوم: ۱۳۴۹ھ میں حضرت پھولپوریؒ نے قصبہ سرائے میر میں متصل عیدگاہ ایک عربی و دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کی سرپرستی حضرت حکیم الامتؒ نے قبول فرمائی، اور اس کا نام ''بیت العلوم'' رکھا اور ارشاد فرمایا کہ ''سرائے میر'' کی مناسبت سے اس کا نام بیت العلوم یا دارالعلوم رکھنا چاہتا ہوں لیکن بیت العلوم میں انکسار زیادہ ہے اس لئے اس کا نام ''بیت العلوم'' رکھتا ہوں۔ ع ''ہر کجا پستیست آب آنجا رود'' اللہ تعالیٰ اس کو دارالعلوم بنادیں۔

اس مدرسہ بیت العلوم کے متعلق حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا جو والا نامہ صادر ہوا تھا وہ درج ذیل ہے۔

مشفقی و مخلصی مولانا شاہ عبدالغنی صاحب سلمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے ضرورت محسوس کر کے ایسا

مدرسہ قائم کیا، میں ایسے مدرسہ کی سخت ضرورت محسوس کرتا ہوں اور اس کے قائم ہونے سے بہت مسرور ہوں، اور اس کے استحکام اور ناصر دین حق ہونے کی دعا کرتا ہوں، اور اس کی اعانت کو واجب سمجھتا ہوں اور اعانت کی تحریک کو دلالت علی الخیر سمجھتا ہوں۔ اور معینین ومحرکین کے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔

مگر چونکہ میں کل سفیروں کو جانتا نہیں ہوں، نیز ممکن ہے کہ وہ بدلتے بھی رہیں، ان کی تصدیق کا یہ انتظام کافی سمجھتا ہوں کہ جس سفیر کے پاس آپ کا دستخطی اعلان ہو اس کو میرا بھی معتمد سمجھا جائے، اور اس سے باضابطہ رسید لے کر عطیہ مدرسہ بیت العلوم کے لئے دیدیا جائے، واللہ الموفق والسلام۔

اشرف علی تھانوی عفی عنہ

۵؍شعبان؍ ۱۳۵۲ھ

ف: سبحان اللہ! حضرت حکیم الامتؒ نے مدرسہ کی ضرورت کو کتنی اہمیت سے تحریر فرمایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کی مزید ضرورت ہے کہ احکام شرعی اور آدابِ اسلامی سے عوام کو روشناس کرایا جائے، اس کے لئے جگہ جگہ مکاتب ومدارس کے قیام کی اشد ضرورت ہے جو اب عوام وخواص کسی پر مخفی نہیں ہے۔

دوسری بات حضرت حکیم الامتؒ کی تحریر سے یہ عیاں ہوتی ہے کہ قابل اعتماد مدارس کی اعانت کے لئے زبان وقلم سے تحریک وترغیب نہ خلاف شرع ہے اور نہ خلاف طریق، ہاں جیسے ہر امرِ دین میں اعتدال ضروری ہے اس میں بھی اس کا لحاظ لازم ہے، جس میں اولاً یہ کہ چندہ کے لئے مکروفریب تو دور کی بات ہے کہ اُمراء کے روبرو الحاح وخوشامد جیسی صورت اختیار نہ کرنی چاہئے، واللہ الموفق۔ مرتب

آپ کی للّٰہیت : مدرسہ بیت العلوم کے اہتمام اور انتظام کے لئے حضرت مولانا پھولپوری قصبہ سرائے میر اکثر تشریف لے جاتے تھے جو پھولپور سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ہے، کبھی اگر پورا دن وہاں ٹھہرنا ہوتا تو گھر سے آٹا نمک گھی لے جاتے اور کچھ بازار سے خرید کر علیحدہ پکوا لیتے اور تناول فرماتے، آپ نے کبھی مدرسہ سے اہتمام کی تنخواہ قبول نہ فرمایا۔

حضرت والا کی سادگی : آپ کی سادگی کے متعلق حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نے فرمایا کہ ''مولوی عبد الغنی صاحب ماشاء اللہ سپاہی آدمی ہیں، بڑے مستعد ہیں، پہلوان آدمی ہیں، پھر علمی و عملی کمال جدا، مگر وضع سے مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کچھ بھی ہیں یہ ذکر کا اثر ہے۔ ذکر عجیب چیز ہے، سب اصلاحیں اس سے ہو جاتی ہیں۔''

ف : سبحان اللہ! ذکر کی کیسی تاثیر ارشاد فرمائی، اللہ ہم سب کو ذکر کثیر کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین (مرتب)

چنانچہ ہمیشہ کرتا و تہبند میں ملبوس رہتے تھے، کبھی کبھی پاجامہ استعمال فرماتے تھے، اکثر حضرت کے پاس ایک ہی کرتا رہتا تھا جس کو حضرت والا کے بعض خدام دھو دھو کر پہناتے رہتے تھے۔

تلاوت کا انداز : آپ کی تلاوت کا خاص انداز تھا وہ یہ کہ ۹ یا ۱۰ آیتوں کی تلاوت کے بعد زور سے آہ فرماتے تھے ''یا اللہ'' فرماتے تھے، اسوقت ایسی کیفیت ہوتی تھی کہ سننے والے کا دل حرکت میں آجاتا تھا۔

شوق جہاد : آپ کو اوائل عمر سے ہی راہِ خدا میں جان قربان کرنے کا جذبہ بے

چین رکھتا تھا، چنانچہ اکثر حضرت مولانا امیر علی شاہ صاحب شہیدؒ کا یہ مصرع جوش میں رو کر پڑھا کرتے تھے۔ ع

سرِ میدان کفن بر دوش دارم

اور فرماتے تھے کہ جب یہ مصرع ''اجودھیا'' کی جنگ میں حضرت مولانا امیر علی شاہ صاحب پڑھتے تھے تو آسمان سے یہ آواز آتی تھی۔ ع

بیا مظلوم اکنوں در کنارم

ف: افسوس کہ اجودھیا کی بابری مسجد جس کے لئے حضرت مولانا امیر علی شاہؒ بہت پہلے شہید ہو چکے تھے اس کو ۶؍ دسمبر ۱۹۹۲ء کو حکومت ہند کی سازش سے شرپسندوں نے شہید کر ڈالا، اور اس ملک کے جمہوری دستور کو دفن کر دیا، جس کی وجہ سے مسلمانان ہند ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ عالم کے قلوب مجروح ہوئے، اور جب پُرسکون مظاہرہ کیا گیا تو مختلف شہروں میں ان کو نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا، ان کے مکانوں، دوکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا نیز بعض دیگر مساجد کے شہید کرنے کا ناپاک عزم ظاہر کیا جاتا ہے، اس لئے اس دعا کی سخت ضرورت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ۔

اے اللہ! بے شک ہم تجھ کو ان کے سامنے (مقابلہ میں) سپر بناتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ لیتے ہیں۔ (مرتب)

اب آپ کے چند ارشادات مجموعۂ ملفوظات مسمّٰی بہ ''معرفت الٰہیہ'' سے درج کئے جاتے ہیں، جن کو ناظرین کرام ان شاء اللہ موثر و مفید پائیں گے۔

ارشادات

صحیح علم کی تعریف: صحیح علم کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ تک پہونچا دے۔ ''علمے کے رہ بحق نہ نماید جہالت است'' جو علم کہ حق تعالیٰ تک نہ پہونچائے وہ جہالت ہے اور اس کا نام صنعت وحرفت ہے۔ علم اس کا نام ہی نہیں۔

علم حقیقی کی دولت جس کو عطا ہو جاتی ہے اس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے دونوں جہاں کی نعمتوں میں سے کسی نعمت کو خیر کثیر نہیں فرمایا مگر دین کی خوش فہمی کو خیر کثیر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کی فہم مل جائے اس کو بڑی خیر مل گئی۔ (بیان القرآن)

''خیر'' اسم تفضیل ہے، پس اس آیت سے علم دین کا تمام نعمتوں سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو زوال اور فنا ہے لیکن دین کی خوش فہمی سے حق تعالیٰ کی عظمت اور معرفت جو نصیب ہوگی اور اس معرفت سے جو عبادات ہوں گی ان کے انوار ہمیشہ باقی رہیں گے اور جنت میں یہی انوار ابد الآباد کی نعمتوں تک پہونچا دیں گے۔

رنگِ صدق ورنگ تقویٰ ویقین   تا ابد باقی بود بر عابدیں

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ صدق کا رنگ: اسی طرح تقوی اور یقین کا رنگ ہمیشہ ہمیش عابدوں پر باقی رہنے والا ہے۔

تمام علوم کا حاصل: پس تمام علوم کی روح یہی ہے کہ آدمی کی عاقبت اور آخرت کی زندگی درست ہو جائے۔

جان جملہ علمہا ایں ست ایں　　　　که بداند من کیم در یومِ دیں

مولانا رومیؒ ارشاد فرمارہے ہیں کہ تمام علوم کی جان صرف یہی ہے کہ آدمی اپنے متعلق جان لے کہ ہم آخرت کے بازار میں کس بھاؤ بکیں گے؟ دنیاوالوں کی واہ واہ سے کچھ کام نہ چلے گا، معاملہ تو اللہ میاں سے ہے، اور وہ آنکھوں کی چوری اور سینوں کے اندر کی خیانتوں سے باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **"يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ"**۔ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے، اور ان باتوں کو بھی جو سینوں میں پوشیدہ ہیں۔

ف: ۔اس آیت کا استحضار ومراقبہ قلب ونگاہ کی حفاظت کیلئے مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔ (مرتب)

قارون کے زمانہ کا واقعہ: قارون کے زمانہ میں جو طبقہ ترقی پسند اور تعلیم یافتہ کہا جاتا تھا اس نے قارون کے خزانہ کو اور اس کی ظاہری شوکت وجاہ کو دیکھ کر یہ کہا تھا: **'يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ'** اے کاش ایسا ہی خزانہ ہم کو بھی مل جاتا جو قارون کو دیا گیا ہے، اور جو طبقہ اللہ والوں کا تھا ان کو دینی سمجھ اور علم صحیح کے انوار سے اس خزانۂ قارون کی صحیح حقیقت کا پتہ چل گیا تھا، دین کو خوش فہمی سے انہوں نے خزانۂ قارون پر اللہ کے غضب اور قہر کو دیکھ لیا، انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اللہ کی نافرمانیوں کے ساتھ یہ مال و دولت اور ظاہری شان وشوکت سب سانپ اور بچھو ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ بہت سخت ہے، معلوم نہیں کب اللہ تعالیٰ کی قہاریت اور غضب کا ظہور ہو جائے، اس لئے اللہ والوں نے قارون کی ظاہری آرائش کی طرف راغب ہونے والے طبقہ کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ:

وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا۔ اے نادانو! ہلاکت ہو تم پر اللہ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے جو ایمان والوں کو ملتا ہے، یہ کہنے والے کون لوگ تھے؟ یہ اہل علم کی جماعت تھی۔

یہ عنوان بتاتا ہے کہ صفتِ علم کا مقتضا یہی تھا جو انہوں نے کہا، اور کس عنوان سے کہا '' **وَيْلَكُمْ** '' ناس ہو تمہارا، پس یہ عنوان بتاتا ہے کہ علم کا اثر اور نور ان کے دلوں میں ایسا پیوست اور راسخ تھا جس نے قارون کی ترقی کو ان کے دلوں میں (اس کی نافرمانی حق کے سبب) مبغوض کر دیا تھا۔

جب قارون پر خدا کا قہر نازل ہوا اور وہ مع اپنے خزانہ کے زمین میں دھنسا دیا گیا اس وقت جس ترقی پسند طبقہ نے اس کے مال پر رال ٹپکائی تھی اس کو اپنی جہالت کا علم ہوا اور علم دین کی نعمت کی قدر معلوم ہوئی۔
پس معلوم ہوا کہ جو عالم علم کی نعمت کو دنیا کی نعمتوں کے عوض میں فروخت کرتا پھرے اس کو حقیقی علم نہیں عطا ہوا ہے۔ (معرفت الٰہیہ: ص ر ۱۰۲)

اشراف نفس: فرمایا: سچے عالم تو اشراف نفس سے بھی بچتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو چیز اشراف نفس یعنی انتظار نفس کے بعد ملے اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہ دے۔

اشراف نفس کی حقیقت کے متعلق ہمارے حضرت مولانا تھانوی ؒ یہ فرماتے تھے کہ کسی چیز پر نظر کا اس طرح گڑ جانا کہ اس کے نہ ملنے پر دل میں ناگواری پیدا ہو، یہ اشراف نفس ہے، اور اگر دل راغب ہو الیکن اس کے نہ ملنے پر کوئی ناگواری نہ ہوئی تو یہ اشرافِ نفس نہیں ہے، بزرگوں نے ایسی چیزوں

سے سخت اہتمام کے ساتھ پرہیز کیا ہے کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بددعا جس چیز میں شامل ہو وہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ (مرتب) (معرفت الٰہیہ: ص ر ۱۰۳)

نماز میں حصول خشوع کا طریقہ: جو شخص خارج نماز میں اپنے اعضا کی جس قدر حفاظت کرتا ہے اور گناہوں کی گندگی سے پاک رکھتا ہے اسی قدر داخل نماز میں اس کو اللہ تعالی کے ساتھ ایک خاص حضوری اور خشوع میسّر ہوتا ہے، یہی وہ بندے ہیں کہ نماز میں بھی غلامی کا تاج ان کے سروں پر ہے اور خارج نماز میں بھی غلامی کا تاج ان کے سروں پر ہے۔ (معرفت الٰہیہ: ج ر ۱ ص ر ۱۲۰)

اطمینان قلب: فرمایا: اطمینان قلب بدون ذکر اللہ کے میسّر نہیں ہوتا۔ کیونکہ دل کے خالق نے اس کی غذا صرف اپنی یاد رکھی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں: **اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ** خوب غور سے سن لو! کہ دلوں کو اطمینان صرف میری ہی یاد سے میسّر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص گوشۂ مسجد میں مست اور شاد ہے، حالانکہ بظاہر مسجد میں کوئی سامان عیش موجود نہیں اور ایک شخص باغ میں تُرش رو اور نامراد غمگین بیٹھا ہوا ہے۔ (جب کہ وہاں خوشی کے اسباب موجود ہیں)

اس کی وجہ یہی ہے کہ پہلے شخص کے قلب میں کسی خوشی کا خیال ہے، اور دوسرے شخص کے قلب میں کسی غم کا خیال ہے، چنانچہ بڑے بڑے سلاطین کو افکارِ سلطنت سے نیند نہیں آتی، اس مقصد کے لئے تنخواہ دار قصہ گو رکھتے ہیں، تاکہ قصوں سے خیالات یکسو ہوں اور نیند آجائے۔

ف: اب اس مقصد کے لئے خواب آور گولیاں استعمال کرتے ہیں تب سکون ملتا ہے اور نیند آتی ہے، توبہ توبہ، یہ بھی کوئی زندگی ہے؟! (مرتب)

اور ایک بوریہ نشین، اللہ والا چین اور اطمینان کے ساتھ پاکیزہ زندگی گزارتا ہے، کیونکہ اللہ والا صرف اللہ کی محبت کا لذیذ غم اپنے دل میں رکھتا ہے اور زبان حال سے یہ کہتا ہے۔ ؎

اب تو میں ہوں اور شغل یادِ دوست
سارے جھگڑوں سے فراغت ہوگئی

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ اختیار کرتا ہے تو اس کو ہم ایک صاف ستھری زندگی عطا فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔** **(النحل: ۹۷)** جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اس کو یقیناً بالطف زندگی دیں گے۔

حیات طیبہ کی تعریف: حیات طیبہ یعنی سُتھری زندگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پلاؤ قورمہ کھانے کو ملتا رہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ میری یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گذرتی ہے، اور میری یاد سے اس کا دل چین وسکون میں رہتا ہے، اگرچہ بظاہر اسباب تکلیف ہی کے کیوں نہ ہوں۔ (حوالہ بالا: ص ر ۱۳۸)

ف: سبحان اللہ! حیات طیبہ کی تعریف کتنی عمدہ فرمائی جو مسلمانوں کو ضرور بالضرور مستحضر رکھنا چاہئے، تاکہ باوجود ایمان وعمل صالح کے اگر کوئی کلفت واذیت کی چیز پیش آئے تو ضیق وتنگی محسوس نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر شک وشبہ کے شکار نہ ہوں۔ **اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ سُوْءِ الظَّنِّ وَالْاِعْتِقَادِ۔**

دین سراپا رحمت ونعمت ہے: فرمایا: دین سراپا رحمت اور سراپا نعمت

ہے، دین کا ہر قانون محبت کی حلاوت رکھتا ہے،لیکن دین کی حلاوت اور مٹھاس کو ان سے پوچھو جن کے دل میں دین کی حلاوت ہے، جنہوں نے اپنے اللہ کو پہچان لیا ہے یعنی اپنا بندہ ہونا جان لیا ہے اور حق تعالی کا معبود ہونا سمجھ گئے ہیں، دین انعامِ الٰہی ہے اور انعام کی قدر اسی کو معلوم ہوتی ہے جو انعام سے نوازا جاتا ہے ،بس انعام والے بندوں کی صحبت اختیار کرنے سے دین کی اور اللہ کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

خِيَارُكُمْ مَنْ ذَكَّرَكُمْ بِاللهِ رُؤْيَتُهٗ وَزَادَ فِيْ عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهٗ وَ رَغَّبَكُمْ فِيْ الْاٰخِرَةِ عَمَلُهٗ (التشرف: ج:۴)	تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے کہ اس کی طرف دیکھنا تم کو اللہ تعالی کی یاد دلائے اور اس کی گفتگو تمہارے علم میں ترقی دے اور اس کا عمل تم کو آخرت کی رغبت دلائے۔

ایک متکبّر کی حکایت: ایک بزرگ نے کسی متکبر سے فرمایا کہ غرور سے مت چل ،اس نے کہا: تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں؟ فرمایا: ہاں میں جانتا ہوں، آپ پیدائش کے وقت ایک نجس پانی یعنی منی تھے، پھر مرنے کے بعد ایک گندہ مردار ہوں گے اور اس وقت تین چار سیر پائخانہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے چل رہے ہیں۔ (حوالہ بالا : ج ۱/ص ۲۳۵)

ف: سبحان اللہ! کیا ہی خوب جواب دیا، جو عین حقیقت تو ہے ہی مزید متکبرین کے تکبر کو پاش پاش کرنے والا بھی ہے، کاش کہ ہم کو اپنی اصل حقیقت مستحضر رہتی تو تکبر کے قریب نہ جاتے ،اللہ تعالی نے قرآن پاک میں یاد دلایا ہے کہ انسان کو ہم نے

نطفہ ناپاک سے پیدا کیا ہے، جب بھی ہم سے کھلی عداوت رکھتا ہے چنانچہ ارشاد پاک ہے: **اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۔**

ترجمہ:۔ کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا، سو وہ علانیہ اعتراض کرنے لگا۔ (مرتب)

معافی کا غلط طریقہ: متکبرین کا بھی عجیب حال ہے، یہ اپنے قصور کا اعتراف بھی کرتے ہیں تو اس میں بھی متکبرانہ انداز ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، استغفر اللہ! یہ الفاظ واپس لینے کا طریقہ خوب نکالا ہے۔ سوئی چبھو کر کوئی یہ کہے کہ اچھا صاحب ناراض کیوں ہوتے ہیں، میں اپنی سوئی نکالے لیتا ہوں۔ (حوالہ بالا: ج۱/ص۲۳۵)

ف:۔ بزرگان دین ایسے رسمی الفاظ کو پسند نہیں فرماتے جو حقیقت سے کوسوں دور رہتے ہیں، اس لئے اہل رسوم بھی ان حضرات سے متوحش اور دور ہی دور رہتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ لوگ رسوم ہی کے چکر میں زندگی گذار دیتے ہیں اور حقائق سے ذرہ برابر آشنا نہیں ہوتے۔ (مرتب)

طلبہ کے لئے حضرت حکیم الامت ؒ کا ارشاد: فرمایا: کہ ہمارے حضرت مرشدی فرمایا کرتے تھے کہ طلبہ کو چاہئے کہ جب مدارس سے فارغ ہوں تو کم از کم چھ ماہ کسی اللہ والے کی صحبت میں رہ پڑیں تاکہ جو کچھ مدرسہ میں حاصل کیا ہے اس پر عمل کرنے کی ہمت اور رقت قلب میں پیدا ہو جائے اس لئے کہ دین فقط کتابوں کے نقوش کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ معانی بھی ہیں۔

نیز حضرت حکیم الامت ؒ فرمایا کرتے تھے کہ حدیث پڑھنے کا مطلب تو جب

ہی ہے کہ شاگرد بھی صاحبِ نسبت ہو اور استاذ بھی صاحبِ نسبت ہو، طلباء میں جو عملی کوتاہیاں بڑھتی جارہی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اس زمانہ میں طلباء صرف علم نبوت مدارس میں حاصل کرلیتے ہیں اور نورِ نبوت کو کسی صاحب نسبت بزرگ سے حاصل نہیں کرتے پس کیوں نہ دین ادھورا رہے۔ (حوالہ بالا: ج ر ا ص ر ۲۸۴)

ف: مگر افسوس کہ اس کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ رہ گئی ہے، جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ علم تو کسی قدر ہے بھی مگر عمل واصلاح سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ (مرتب)

حضرت آدم علیہ السلام کے نسیان کو عصیان سے تعبیر کا عجیب نکتہ:

فرمایا: نسیان آدم علیہ السلام کو عصیان سے تعبیر فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کا ذکر فرمایا ہے: **وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ** اور آدم علیہ السلام سے اپنے رب کا قصور ہوگیا، یہاں رب فرما کر یہ بتادیا کہ نسیان کو عصیان کے عنوان سے تعبیر فرمانے میں حضرت آدم علیہ السلام کی تربیت مقصود ہے، چنانچہ عصیان میں جو شانِ عتاب ہے اس کے استحضار سے حضرت آدمؑ کے قلب مبارک پر ایسی ندامت اور شکستگی طاری ہوئی کہ آپ اس حزن وندامت کی راہ سے عبدیت کے اس عالی مرتبہ پر فائز ہوئے جس مرتبہ پر عِلمِ الٰہی میں آپ کو تاجِ خلافت عطا ہونا تجویز ہوا تھا، غلبۂ حزن اور ندامت سے آپ کی عبدیت کے بیج کو پختہ کرنا تھا تا کہ عبدیتِ آدم علیہ السلام خلافتِ الٰہیہ کا بار اُٹھا سکے۔ (حوالہ بالا: ج ر ۲، ص ر ۲۸۶)

اس راہ میں حُزن موجب ترقّی ہے: فرمایا: حضرت مرشدی فرمایا کرتے تھے کہ صاحب الحزن بہت جلد حق تعالیٰ کے راستہ کو قطع کرتا ہے اور جب کسی سالک کا خط آتا کہ حضرت آج کل قبض باطن سے دل غمگین رہتا ہے تو تحریر

فرما دیتے کہ دلگیر نہ ہوں، یہ حالتِ قبض منجملہ حالات رفیعہ کے ہے، اگر ہمیشہ بسط کی حالت طاری رہے تو انسان عُجب اور پندار میں مبتلا ہو جائے۔

تربیت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ نسیان کو عصیان سے تعبیر فرمایا جائے، کیونکہ وہ رب بھی ہیں اور حکیم مطلق بھی ہیں، ان کی تربیت حکمت کے ساتھ ہوتی ہے، تربیت کہتے ہیں کسی شئے کو تدریجاً اُس درجۂ کمال کو پہونچا دینا جو علم الٰہی میں بر بناء حکمت الٰہیہ اس شئے کے لئے تجویز ہو چکا ہے۔

"**وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ**" میں ربوبیت ہے اسی شان ربوبیت کو حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے قلب مبارک پر منکشف فرما دیا: **فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ** بعد ازاں حاصل کر لئے آدمؑ نے اپنے رب سے چند الفاظ اور عرض کئے: **رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (البقرہ)**

اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا، اگر آپ ہماری مغفرت نہ فرمائیں گے اور رحم پر رحم نہ فرمائیں گے تو ہم بڑے ٹوٹے میں پڑ جائیں گے۔

اس دعا میں بھی صفت ربوبیت کی تلقین فرمائی گئی، پھر حق تعالیٰ نے صفت ربوبیت کے ساتھ ارشاد فرمایا: **ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى**۔ پھر ان کے رب نے مقبول بنالیا سو ان پر توجہ فرمائی اور راہ پر قائم رکھا۔

ربوبیت الٰہیہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ندامت وزاری کی راہ سے آپ کے شایانِ شان مرتبۂ عبدیت پر پہونچا کر خلافت کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا۔

اتنے مراحل سے گذر کر **خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ** کی پگڑی باندھی گئی تھی پس جس کو وہ مقتداء بناتے ہیں اس کو خوب پختہ کر کے بناتے ہیں، تب دوسروں کی

رہبری اسے سپرد فرماتے ہیں۔ (معرفت الٰہیہ: ج ر ۲، ص ر ۲۸۷)

ف: خلافت کی جب یہ شان ہے تو پھر مشائخ کو بھی چاہئے کہ خلافت کے دینے میں علاوہ نماز وتلاوت اور ذکر وشغل کے اس بات کا بھی لحاظ رکھیں کہ خلیفہ کم از کم دعوائے کمال اور پندارِ یافت سے پاک ہو، تاکہ اس کی صحبت اور تعلیم وتربیت سے دوسروں کو بھی بجائے کبر وانانیت کے شکستگی اور دردِ نایافت کی دولت نصیب ہو۔

اس درد وحزن کے پیدا کرنے کے لئے مصلحین امت بعض دفعہ ایسی بات سالکین راہ کو کہتے ہیں اور ایسی صورت اختیار فرماتے ہیں کہ ان کے اندر حزن وغم کا حال پیدا ہو بلکہ اس کا مقام حاصل ہو تاکہ وہ باطنی ترقی سے ہمکنار ہوں۔

چنانچہ بعض عارفین نے فرمایا ہے:

وَقِيلَ الْفِكْرَةُ تُذْهِبُ الْغَفْلَةَ وَ تُحْدِثُ لِلْقَلْبِ الْخَشْيَةَ كَمَا يُحْدِثُ الْمَاءُ لِلزَّرْعِ النَّبَاتَ وَمَا جُلِيَتِ الْقُلُوْبُ بِمِثْلِ الْأَحْزَانِ وَ لَا اسْتَنَارَتْ بِمِثْلِ الْفِكْرَةِ۔

فکر غفلت کو دور کرتا ہے اور قلب میں خشیت پیدا کرتا ہے جیسا کہ پانی کھیت میں پودوں کو اُگاتا ہے اور دلوں کو حزن سے بڑھ کر کوئی چیز جلا بخش نہیں ہے اور نہ فکر سے زیادہ قلوب کو نورانیت بخشنے والی کوئی اور شئی ہے۔

(دلیل الفالحین شرح ریاض الصالحین للنووی: ج ر ۱، ص ر ۱۷)

مندرجہ بالا عبارت حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کو بہت

پسند تھی اس لئے گاہے گاہے اس کو اہل مجلس کو سناتے بھی تھے، اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مصلح الامتؒ کا طریقۂ اصلاح کچھ اسی قسم کا تھا، اس لئے کہ دیکھا جاتا تھا کہ بعض طالب مخلص کو ایسی بات فرما دیتے تھے جو اس کے لئے بظاہر ناگواری کی ہوتی تھی اور پھر ذوقی طور سے اس کا اندازہ لگاتے تھے کہ اس کا کیا اثر ہوا پس اس کو اس طرح حزین وغمگین کر کے غفلت سے بیدار اور قلبی نورانیت سے مستنیر فرماتے تھے، ورنہ تو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ خانقاہوں میں رہنے اور بزرگوں سے منسلک ہو جانے کے باوجود غافل کے غافل ہی رہ جاتے ہیں، احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کہاں اور کیوں ہیں؟ واللہ الموفق ۔ (مرتب)

سعادت: اپنی یہ سعادت ہے کہ ایسے بزرگ کی زیارت کا تین مرتبہ موقع نصیب ہوا، پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۴۰ء میں حضرت مصلح الامتؒ کے وطن قدیم موضع فتح پور تال نرجا میں جبکہ آپ کے وعظ کا نظام تھا، تو ہمارے دادا محمد نذیر خاں اپنی بستی کاری ساتھ سے وعظ سننے اس حقیر کو لے کر گئے تھے، دوسری مرتبہ غالباً ۱۹۴۸ء میں جبکہ قصبہ مئو کے کسی محلہ میں آپ تشریف لائے تھے، تو آپ کی مجلس میں شرکت کا موقع نصیب ہوا، جبکہ یہ حقیر مدرسہ دارالعلوم مئو میں فارسی کا متعلم تھا، اسی موقع پر آپ سے مولانا روم کا یہ شعر سنا ؎

علم چوں بر تن زنی مارے بود   علم چوں بر دل زنی یارے بود

یعنی علم کو جب تم صرف ظاہر تک محدود رکھو گے تو وہ مضر مثل سانپ کے ثابت ہوگا اور اگر علم کو قلب کی درستگی کا ذریعہ بناؤ گے تو وہ تمہارے لئے مفید ثابت ہوگا۔

تیسری مرتبہ الہ آباد میں غالباً ۱۹۶۲ء میں حضرت مصلح الامت کے قیام گاہ پر، اخیر عمر میں آپ پاکستان سے تشریف لائے تھے، دیکھا کہ حضرت مصلح الامت نے آپ کی ضیافت کا خاص اہتمام فرمایااور نہایت ادب واحترام کا معاملہ فرمایا۔

اللہ تعالی ہم سب کو اپنے اکابر کی سیرت کو اختیار کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اوران کے فیوض وبرکات سے بہرہ ورفرمائیں۔آمین۔(مرتب)

وفات: وفات سے کچھ دنوں پہلے آپ پاکستان تشریف لے گئے،اور وہیں کراچی شہر میں ۲۱/ربیع الاول ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۲/اگست ۱۹۶۳ء کو آپ کی روح مبارک دنیائے فانی سے رحلت فرما کرواصل بحق ہوگئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت مفتی مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ نے اپنی خاص نگرانی میں سنت کے مطابق تجہیز وتکفین کی خدمت انجام دیا،بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مرشد شیخ کے جسد مبارک کوغسل دیا۔چند معاونین بھی ساتھ تھے۔

نماز جنازہ حضرت الحاج ڈاکٹر عبدالحی صاحب خلیفہ حضرت حکیم الامت نے پڑھائی، اور پاپوش نگر کے قبرستان میں بوقت بارہ بجے دن نعش مبارک کو دفن کیا گیا۔نوراللہ مرقدہ۔

حضرت خواجہ عبدالحی فاروقی لاہوریؒ متوفی ۱۳۸۴ھ

نام وولادت: خواجہ عبدالحی فاروقی بن خواجہ عبدالرحیم ۱۸۸۷ء مطابق ۱۳۰۴ھ یا ۱۳۰۵ھ میں تحصیل گڑھ شنکر ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔

تعلیم: انہوں نے ابتدائی تعلیم گورمنٹ ہائی اسکول گورداسپور میں حاصل کی۔ دینی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند گئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے بطور خاص استفادہ کیا۔

تدریس: خواجہ عبدالحی دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے تو میرٹھ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا سندھی نے مسجد فتح پوری دہلی کے شمالی کمروں میں ''نظارت المعارف القرآنیہ'' قائم کیا۔ خواجہ صاحب اُن کے درس قرآن سے استفادہ کے لئے ہر شنبہ کی شام دہلی آجاتے اور پیر کے روز میرٹھ واپس جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کے افغانستان روانہ ہونے سے بند ہوا۔

کلکتہ روانگی: خواجہ عبدالحی میرٹھ کالج کی پروفیسری سے سبکدوش ہوکر کلکتہ آگئے اور ''دارالارشاد'' میں مولانا آزادؒ سے اکتسابِ فیض کرنے لگے تھے۔ مولانا آزادؒ کے درس قرآن کے بارے میں خواجہ صاحب نے اپنا تاثر ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے کہ:

''(مولانا آزاد) ایک عجیب ودلفریب ایمانی کیفیت قلوب واذہان میں پیدا کرتے تھے''۔

تحریک ریشمی رومال میں شمولیت: اس زمانے میں حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقاء حصولِ آزادی کی ایک اسکیم پر عمل کر رہے تھے جو تاریخ میں ''تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ۱۹۱۶ء کے اوائل میں اس تحریک کے کارکنان اور ہمدردوں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ مولانا آزاد کو حکومت نے رانچی میں نظر بند کر دیا اور ''دارالارشاد'' کی بساط لپیٹ دی گئی۔ جس کی وجہ سے خواجہ صاحب کلکتہ سے لاہور چلے آئے۔

فضل وکمال: خواجہ عبدالحیؒ مرحوم نہایت متین اور کم گو تھے۔ ہمیشہ پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے۔ سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں چھڑی ہوتی تھی۔ راہ چلتے کبھی ادھر اُدھر نہ دیکھتے اور حمد وثناء میں مصروف سیدھے چلے جاتے تھے۔ آخری عمر میں بھی اپنا کام خود کرتے تھے۔ حلال وحرام میں حد درجہ تمیز کرتے تھے۔ کسی چیز کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک گذرتا تو اسے استعمال میں نہ لاتے۔ کم گو ہونے کے باوجود خوش طبع اور زندہ دل تھے۔ ان کے احباب کی رائے ہے کہ انہیں کبھی پریشان نہ دیکھا گیا۔ مشکلات اور مصائب میں بھی ان کے وقار اور سنجیدگی میں فرق نہ پڑتا تھا۔ وہ ایسے صاحب علم تھے جنہیں اپنے علم وفضل پر فخر نہ تھا۔ انہوں نے کبھی اپنی رائے کو ''علمیّت'' کی بنیاد پر نہ منوایا بلکہ رائے دیتے ہوئے عجز وانکساری سے رائے قائم کرنے کے اسباب بیان کر دیتے تھے۔

خواجہ صاحب، مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگرد تھے اور قرآن فہمی میں اُن کا ''اندازِ تفسیر'' پیش نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کی متفرق سورتوں کی تفسیر لکھی۔ جس کی تفصیل اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

شاعری: آپ کو شعر و شاعری سے بھی کافی رغبت تھی ان کی ایک نظم ''پیغام عمل'' پیش ہے۔ جو ماشاء اللہ جذبۂ عمل پیدا کرنے کے لئے مفید ہے۔ اس کو وظیفہ [1] میں شامل کرلیا جائے تو مناسب ہے۔

کچھ مقصد لے کر آتا ہے اس دنیا میں جو آتا ہے!
محروم عمل جو رہتا ہے وہ جیتے جی مرجاتا ہے!
اس مزرع عالم کو سینچو تم جدو جہد کی بارش سے!
جو بیج عمل کا بوتا ہے وہ پھل درخت کا پاتا ہے!
رستے کی صعوبت سہ کر ہی منزل پہ پہنچنا ممکن ہے!
آگاہ حقیقتِ غم ہے جو وہ لذت وعیش اڑاتا ہے!
ہر ایک مصیبت دنیا میں پیغام خوشی کا لاتی ہے!
گلشن میں خزاں کا آنا ہی اُمید بہار دلاتا ہے!
دریا کی طرح جو چلتا ہے اور پھر چلتا ہی رہتا ہے!
کہساروں کو میدانوں کو خاطر میں وہ کب لاتا ہے!
ہر رات [1] کے پچھلے حصے میں کچھ دولت لٹتی ہوتی ہے!
جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے جو جاگتا ہے وہ پاتا ہے!

وفات: ۷ / جنوری ۱۹۶۵ء کو ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ دوسرے دن ۸ / جنوری ۱۹۶۵ء / ۵ / رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ کو جان، جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ قبرستان میانی صاحب لاہور پاکستان میں ابدی نیند سورہے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔ (تذکرہ علماء پنجاب، مؤلفہ مکرم محمد اختر راہی صاحب: ۲۶۵)

---

[1] ماشاء اللہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب پسند فرماتے تھے، اور برابر پڑھتے تھے۔ (مرتب)

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوری م ۱۳۸۵ھ

نام ونسب وولادت: بہبودی ضلع کیمبل پور (مغربی پنجاب، پاکستان) میں ۲۷/اگست ۱۸۸۳ء مطابق ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے، والد کا نام حکیم گل احمد ہے۔

تعلیم: فارسی اور ابتدائی عربی تا کافیہ اپنے وطن میں مولانا فضل حق شمس آبادی (شاگرد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی) سے پڑھی، پھر مختلف علوم وفنون کی تعلیم مولانا قاضی عبدالرحمن صاحبؒ، مولانا عبدالرؤف صاحبؒ، مولانا حسن الدین صاحبؒ اور مولانا عبدالکریم صاحبؒ وغیرہم سے حاصل کی۔ مظاہر علوم سہارنپور میں ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں دورۂ حدیث شریف پڑھا۔ آپ نے بیضاوی شریف، توضیح تلویح، ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف اور بخاری شریف حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ، سے ابوداود شریف، نسائی شریف اور ابن ماجہ شریف حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ سے اور بقیہ کتب اور اساتذہ سے پڑھیں۔ حضرت مولانا شبیر علی صاحبؒ تھانوی اور حضرت مولانا محمد حیات صاحبؒ سنبھلی آپ کے مخصوص رفقاء میں سے ہیں، دورۂ حدیث کے امتحان سالانہ میں آپ پوری جماعت میں اول نمبر سے کامیاب ہوئے تھے، ۱۳۳۲ھ میں آپ نے کتب فنون، سبعہ معلقہ، مقامات حریری، حماسہ، شرح چغمینی، تحریر اقلیدس، تصریح، صدرا، دیوان متنبی، مسلم الثبوت، خلاصۃ الحساب، سبع شداد، شمس بازغہ پڑھیں اور اس مرتبہ بھی امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے، پھر ایک سال دارالعلوم دیوبند میں گذارا، اور حضرت شیخ الہندؒ کے

درس حدیث میں شریک ہوئے۔

تدریسی خدمات: ۱۳۳۳ھ میں دیوبند سے واپسی پر آپ کو مدرسہ مظاہر علوم میں پندرہ روپے مشاہرہ پر مدرس مقرر کیا گیا، تھوڑے ہی عرصہ میں مدرس دوم قرار دیئے گئے، اور ۱۳۴۴ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے حجاز مقدس کو روانگی کے وقت حضرت مولانا کو صدر مدرس اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ سید عبداللطیف صاحب کو ناظم اعلیٰ تجویز فرمادیا۔ یہ انتظامات گو عارضی تھے لیکن حجاز پہنچ کر حضرت سہارنپوری نے جب ہجرت کی نیت فرمالی اور مدینہ پاک کا قیام مستقل ہو گیا تو وہاں سے تحریر فرمایا کہ:

''جو انتظامات عارضی طور پر کئے گئے تھے ان سب کو مستقل کردیا جائے''۔

چنانچہ آپ اس عہدۂ صدارت پر آزادئ ہند تک فائز رہے، آپ کے زمانۂ صدارت میں انضباط تعلیم کا نقشہ بھی مرتب کیا گیا اور حضرت مولانا کو اس کا نگراں قرار دیا گیا، آپ نگرانی فرماتے اور ماہانہ نقشہ جات خواندگی مدرسین سے پُر کرا کر جانچ پڑتال اور فروگزاشتوں پر تنبیہات فرماتے۔ ان کے بعد والے صدور بھی تاہنوز اسی طرز پر اس کی انجام دہی کرتے ہیں، حضرت مولانا نے کل ۳۵ سال مدرسہ میں کتب حدیث اور کتب فنون پڑھائیں، ان میں ۲۳ رسال صدر مدرس کی حیثیت سے رہے، آپ اردو، فارسی، عربی اور بنگالی زبانوں میں مہارت و عبور رکھتے تھے، آپ کا درس ترمذی بہت مسلم اور مشہور رہا ہے۔

بیعت وارشاد: آپ کا روحانی و اصلاحی تعلق حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری سے تھا، آپ کی فطری صلاحیتوں اور کمالات و محاسن کی وجہ سے

حضرت آپ پر خصوصی شفقتیں اور توجہات فرماتے تھے، حضرت سہارنپوری ؒ کی وفات کے بعد حضرت تھانوی ؒ کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے، آپ نے حضرت تھانوی ؒ کو پہلا خط ۳۰ رجمادی الثانی ۱۳۴۴ھ میں تحریر فرمایا تھا کہ:

"احقر کا ارادہ حضرت کے سلسلہ میں داخل ہو کر ذکر واذکار کرنے کا حسب تجویز اقدس ہے"۔

حضرت تھانوی ؒ نے جواباً تحریر فرمایا کہ:۔

"گو میں حضرات اہل کمال کی خدمت کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن تاہم خدمت سے عذر نہیں"۔

پھر آپ معاملات سلوک ومسائل مشکلہ میں مسلسل مراسلت رکھتے۔ ان کے مکاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ تمام جواہر پارے اس راہ کے سالکین کے لئے مشعل راہ قرار دے کر حضرت تھانوی ؒ کی سوانح اشرف السوانح کا جزو بنا دیئے گئے۔

حضرت مولانا تھانوی ؒ فرمایا کرتے تھے:۔

"مولانا کامل پوری نہیں، کامل پورے ہیں"۔

جس زمانہ میں آپ مظاہر علوم میں صدارت کے منصب پر فائز تھے حضرت اقدس تھانوی ؒ نے از خود مولانا کو مجاز بیعت بنا دیا، اس پر آپ نے معذرت نامہ پر لکھا کہ میں نے تو ابھی تک بیعت بھی نہیں کی پھر خلافت کا استحقاق کیسا؟

اس پر حضرت تھانوی ؒ نے جواباً تحریر فرمایا کہ:

"میرے نزدیک اہلیت شرط ہے بیعت شرط نہیں"۔

ف: سبحان اللہ! کیسی حقیقت واضح فرمائی جو حضرت حکیم الامت ؒ کے علم وحکمت کا ثمرہ ہے۔ (مرتب)

حضرت تھانوی ؒ، بیعت ہونے والے اکثر علماء وفضلاء کو تربیت کے لئے مولانا ہی کے حوالے فرماتے۔ آپ کی ذات بابرکات مجموعۂ کمالات وحسنات تھی، آپ سے خلق اللہ کو بہت فیض ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات سے قبل رمضان المبارک کی تعطیلات میں آپ اپنے وطن بہبودی تشریف لے گئے تھے، ادھر ملک تقسیم ہوگیا، راستے مسدود ہوگئے، آپ کا واپس آنا مشکل ہوگیا، ادھر پاکستان میں بھی تیزی سے مدارس کا قیام عمل میں آیا، اس لئے آپ وہیں خدمتِ دین واشاعتِ علوم نبویہ میں مشغول ہوگئے، چنانچہ پہلی بار ۱۳۶۷ھ سے ۱۳۶۹ھ تک مدرسہ خیر المدارس ملتان میں رہے۔ اس دوسالہ مدت میں ۱۰۸ ر طلبہ نے آپ سے علوم حدیث کی سند حاصل کی۔ ۱۳۶۹ھ سے ۱۳۷۲ھ تک دار العلوم ٹنڈو الہ یار حیدرآباد میں شیخ الحدیث رہے، اس کے بعد چار سال جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک کی مسند حدیث پر جلوہ افروز رہے اور شیخ الحدیث ہی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔

وفات: ۲۷ ر شعبان ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۱ ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو پنڈی (پاکستان) میں یہ علم وعمل، زہد وتقویٰ کا روشن مینار آسودۂ خاک ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(حیات اسعدؒ: ص ر ۱۴۶، مرتبہ مولانا نسیم احمد صاحب غازی، مظاہری)

حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالنپوریؒ المتوفی ۱۳۸۵ھ

وطن، ولادت وتعلیم: مولانا کا آبائی وطن کشمیر تھا، آپ کے دادا حکیم محمد اکبر صاحب بارادہ حج سورت جاتے وقت پالن پور تشریف لائے، یہاں آنے پر طبیعت ناساز ہوئی جس کی وجہ سے یہیں سکونت پذیر ہوگئے اور ایک عالی خاندان میں نکاح فرمالیا، جن سے سات فرزند اور دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔

حضرت مولانا محمد نذیر صاحب کے والد محترم کا اسم گرامی مولانا عبدالقادر صاحب تھا، حضرت مولانا محمد نذیر صاحب کی ولادت پالن پور میں یکم رمضان المبارک ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کنز الدقائق وشرح تہذیب تک اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی، اس کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور حضرت مولانا عبدالعلی صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی، مگر آپ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں تنگی کی وجہ سے اکثر وبیشتر فاقہ کشی کرتے تھے جس کا علم اساتذہ اور طلبہ تک کو نہ ہونے دیتے تھے، نہایت سادہ زندگی بسر کرتے اور زہد وقناعت اور تقویٰ وپرہیز گاری سے رہتے تھے۔

سن فراغت: مولانا محمد نذیر صاحب نے ۱۳۱۲ھ میں تکمیل علم سے فراغت حاصل کی جبکہ آپ کی عمر ۲۱ سال کی تھی، اس کے بعد دلّی سے معقولات وعلم طب حاصل کرنے کے لئے مقام ٹونک مولانا برکات احمد ٹونکیؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ اس سے فراغت کے بعد پالن پور واپس تشریف لائے۔

علاقہ پالن پور کے مختصر حالات: پالن پور اور اس کے گردونواح کے لوگ بس نام کے مسلمان تھے۔ دین سے بالکل نا آشنا تھے، کلمۂ طیبہ کا تلفظ تک صحیح نہ تھا، پیروں کا دور دورہ تھا، ان کو اپنے تابع کئے ہوئے تھے، اپنی پیری کے چلانے وچمکانے اور ہدایہ و نذرانہ وصول کرنے کے لئے بہت سی خلاف شریعت باتیں بتلاتے اور جو وہ کہتے وہی قوم کرتی، چنانچہ پیر صاحب کے آنے تک میت کی تدفین موقوف رہتی تھی، بعض اوقات پیر صاحب کی غیر موجودگی کے باعث میت کئی کئی روز تک پڑی رہ جاتی، بلا معاوضہ نماز جنازہ ناجائز قرار دی جاتی۔ اور نماز کے بھی کئی درجات مقرر کئے تھے، مثلاً پچیس روپیہ کی نماز یا پچاس روپیہ کی نماز، اور مالدار کی نماز اس کی حیثیت کے مطابق زیادہ قیمتی ہوتی اور یہ بات کہی جاتی کہ جتنی قیمتی نماز ہوگی اتنی ہی جلدی مغفرت ہوگی۔

تدفین کا بھی نہایت جاہلانہ ڈھنگ تھا، اس کے علاوہ قوم میں قسم قسم کے رسومات و بدعات رائج تھیں جس سے قوم معاشی اعتبار سے بھی تباہ و برباد ہو چکی تھی، مکان وزیور، زمین، جائداد حتی کہ ضروری اشیاء تک گروی رکھ کر رسم و رواج کے لامتناہی سلسلے کی تکمیل کی جاتی تھیں۔

قرآن و حدیث کے بجائے پیروں نے جو کتابیں عوام الناس کے مزاج کے مطابق گجراتی زبان میں لکھدی تھی وہ کسی خوشی وغمی کے جلسہ میں تبرک کے طور پر پڑھ دی جاتیں۔

پیر پرستی، قبر پرستی اور عرس وقوالی میں گویا سارا دین سمٹ کر آگیا تھا۔ اسی طرح چراغ کے لئے ایک طاق ہوتا اس میں چراغ جلایا جاتا اور اس کی پوجا

کی جاتی۔ العیاذ باللہ تعالی۔

حال تو یہ تھا اب جبکہ مولانا محمد نذیر صاحبؒ نے یہاں آ کر قوم کی اصلاح اور دین کی اشاعت کو اپنا مشغلہ بنایا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے علم کو بلند فرمایا تو قوم مخالفت پر آمادہ ہوگئی، اس لئے کہ یہ بات ان کے لئے بالکل نئی تھی، وہ ایک بات بھی آبائی طریقہ کے خلاف سننا نہیں چاہتی تھی مگر مولانا نے بڑی استقامت اور مستقل مزاجی، تحمل اور بردباری سے اس کام کو جاری رکھا۔

مولانا وہ کتاب منگواتے جس کو پیر نے تصنیف کی تھی، مولانا ان لوگوں سے اس کو پڑھواتے اور مطلب پوچھتے، جب کچھ بتلاتے تو مولانا اس پر روشنی ڈالتے اور اس طرح دین کی باتیں ان کے سامنے پیش فرماتے اور ان کو دین پر عمل کی رغبت دلاتے، تبلیغی کام کے لئے مولانا نے ایک اونٹ خرید لیا اور اونٹ پر سوار ہوکر کئی کئی دن گذارتے اور تبلیغی کام انجام دیتے، شروع میں بہت سی روٹیاں گھر سے ہمراہ لے لیتے۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے روٹیاں کھا کر پانی پی لیتے، اس طرح لوگوں کے کھانے پینے سے بے نیاز ہوکر تبلیغی کام انجام دیتے۔

شروع میں مولانا جب بازار سے گذرتے تو لوگ نام لے کر گالیاں دیتے مگر مولانا اس کا جواب نہ دیتے، اگر مولانا کا کوئی حامی ومددگار جواب دینا چاہتا تھا تو اس کو سختی سے روک دیتے، مولانا اگر کسی مسجد میں تشریف لے جاتے تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر مسجد سے باہر کر دیتے اور مسجد کو دھلواتے اور مولانا کے ہم خیال بننے والوں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے، دیہات میں کوئی شخص مولانا کا ہم خیال ہوجاتا تو پورے گاؤں والے اس کو زدوکوب کرتے اور اس کا بائیکاٹ

کرتے اور سخت سے سخت سزا دیتے، مولانا صاحب ان کو صبر کی تلقین فرماتے اور صحابہ کی مصیبتوں کو یاد دلا کر تسلی دیتے اور استقامت پر لاتے مگر آزردہ خاطر اور مایوس نہ ہوتے۔ ہر موقع پر ہر حال میں اپنے عزم راسخ کے ساتھ دین کے کاموں میں سرگرم عمل رہے۔

مدرسہ کی بنیاد: سب سے پہلے مولانا نے ایک مدرسہ اسلامیہ عربیہ کے نام سے ۱۳۲۱ھ میں قائم کیا، جس میں مقامی طلبہ کے علاوہ بیرونی طلبہ کے طعام وقیام کا انتظام فرمایا، جو اس وقت سے اب تک بفضلہٖ تعالی بلا کسی طلب وامداد کے چل رہا ہے جس میں سورت، ڈابھیل، راندیر وغیرہ کے طلبہ سینکڑوں کی تعداد میں کتاب وسنت کے علوم سے فیضیاب ہوئے۔

آخر رفتہ رفتہ حالات سازگار ہوئے اور لوگوں کی اصلاح ہوتی گئی حتی کہ جو حضرات اصلاح پذیر ہوئے وہ آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، اور آج انہیں دیہاتوں کے ہر ہر گھر میں ایک ایک نہیں کئی کئی عالم وفاضل، حافظ وقاری پائے جاتے ہیں، گویا یہ خطہ رشد وہدایت کا سرچشمہ ہوگیا۔

مولاناؒ نے اطراف میں بھی مدارس کی بنیادیں ڈالیں بلکہ ہر ہر گاؤں میں مدارس قائم فرمائے، اور مساجد آباد کیں اور ہدایت کی راہیں کھولیں، جن سے لوگ آئندہ فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ تعالی۔

مولاناؒ کی چند صفات

تبلیغ کے لئے ایک جماعت کی فکر: حضرت مولانا محمد نذیر صاحب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والی ایک جماعت کی تشکیل کرنے کی فکر میں

تھے جس کا کام مختلف مقامات پر گشت کرنا اور دین کی تبلیغ کرنا ہو اسی فکر میں تھے اور اس کے لئے آپ نے ابتدائی کام بھی شروع فرمایا تھا جس کے لئے سب سے پہلے ایسی جماعت کی تشکیل کی تھی جو خود ہر اعتبار سے پابند شریعت تھی۔

ف: یقیناً اس امر کی خاص ضرورت ہے کہ جو جماعت دعوت وتبلیغ کا کام کرے اس کو بھی احکامِ شریعت کا پابند ہونا چاہئے، یعنی وہ جماعت اعمال کی صحت، اخلاق کی درستگی اور معاملات کی صفائی کا خاص خیال رکھتی ہو تا کہ اس کی بات سنی جائے اور اقتداء کی جائے۔ (مرتب)

حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے ملاقات: حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ فروری ۱۹۶۴ء کے اواخر میں چھاپی کے اجتماع میں تشریف لائے تھے اور وہاں سے حضرت مولانا نذیر صاحبؒ کی خدمت میں مخصوص ملاقات کے لئے بھی پالن پور تشریف لائے تھے، اس وقت مولانا نے حضرت جیؒ کو بہت زور دے کر خاص طور سے یہ بات فرمائی تھی کہ جماعت کے لوگوں کو تاکید فرمادی جائے کہ مدارس اور علم کی طرف لوگوں کو رغبت دلائی جائے اور لوگوں کو علم پڑھنے کی طرف راغب کیا جائے، اس وقت حضرت جیؒ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کی نصیحت کے مطابق ضرور عمل کیا جائے گا اور حضرت مولاناؒ نے فرمایا تھا کہ جماعت کے لوگوں کو یہ بھی تاکید کی جائے کہ ان کی عورتیں غیر محرم مردوں کے ساتھ سفر نہ کریں اور پردہ کا اہتمام کریں، اس پر حضرت جیؒ نے فرمایا تھا کہ کہہ دیا جائے گا۔

حضرت جی مولانا یوسف صاحبؒ نے حضرت مولانا نذیر صاحبؒ سے

درخواست کی کہ یہ لوگ آپ کی خدمت میں خاص دعاء کے لئے حاضر ہوئے ہیں لہذا ہمارے لئے دعا فرما دیجئے، مولانا نے اس وقت دعاء فرمائی تھی۔

(سوانح مولانا)

مولانا کو قرآن پاک سے خاص تعلق تھا: جو طلبہ قرآن پاک عمدہ اور اچھا پڑھتے تھے ان کو انعام بھی دیتے، بعض دفعہ صحیح قرآن پاک پڑھنے والوں کو پیسے بھی دیتے اور قرآن پاک صحیح پڑھنے والے طالب علم سے بہت خوش ہوتے۔

ف: یہ سب حوصلہ افزائی کے لئے تھا جو مطلوب ومحمود ہے۔ اس لئے مکاتب ومدارس میں ایسا ہونا مناسب ہے۔ (مرتب)

آپ تمام ذکر واذکار سے قرآن مجید کی تلاوت کو افضل جانتے تھے اور تلاوت قرآن پاک کا التزام آپ کا معمول تھا، کبھی بھی آپ اس میں غفلت اور سستی نہیں کرتے تھے بلا ناغہ ہمیشہ تلاوت قرآن پاک سفر اور حضر میں کیا کرتے، باوجود ضعف بصارت کے رمضان المبارک میں کئی قرآن پاک ختم فرمایا کرتے تھے، گھر کے بچوں میں سے جب کوئی بچہ پارہ عم ختم کر کے قرآن پاک شروع کرتا تو حضرت مولانا اس بچہ کو اپنے پاس بلا کر بہت ہی خوشی کا اظہار فرماتے اور اس کو قرآن پاک اپنے ہاتھ سے عنایت فرماتے اور بہت سی مرتبہ کچھ شیرینی بھی گھر میں تقسیم فرماتے اور بچوں کو خوش کرتے اور قرآن پاک شروع فرماتے ہوئے انتہائی خوشی کا اظہار فرماتے۔

ف: یہ سب قرآن پاک سے آپ کی الفت ومحبت کی بناء پر تھا جو کمال دین وایمان کی علامت ہے۔ اللہم وفقنا۔ (مرتب)

نماز میں تلاوت قرآن پاک: حضرت مولانا اکثر صبح کی نماز میں امامت

کیا کرتے، آپ کا نماز میں قرآن کا پڑھنا عجیب فضا قائم کرتا۔ آپ کی آواز سن کر لوگ دوڑ آتے، آپ کی قراءت میں عجیب کشش تھی اور بے انتہا سوز وگداز ہوا کرتا اور تمام نمازی ہمہ تن گوش ہو جاتے اور نمازی اپنے اندر ایک قسم کا سرور محسوس فرماتے اور ایک قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی اور ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے قرآن پاک کا نزول ہو رہا ہے، اور لوگ ہمہ تن متوجہ ہیں اور نمازیوں کے قلوب آپ کی قراءت کی برکت سے حق تعالی کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے اور نماز میں خشوع وخضوع پیدا ہو جاتا، ایک عجیب وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ؎

ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

یعنی اس مے کا مزہ بغیر چکھے ہوئے تمہیں معلوم نہیں ہو سکتا۔ (مرتب)

ایثار وقربانی، جود وسخا: حضرت مولانا بہت فیاض تھے لیکن بہت ہی پوشیدہ معاملہ کیا کرتے، آپ نے بہت سی مرتبہ خود سے تکلیفیں برداشت کی مگر غرباء کا اور عزیزوں کا بڑا خیال کیا۔

ف: یہ تھی خلق اللہ کے ساتھ ہمدردی وغمخواری جس کا درجہ قیامت میں بہت اونچا ہے اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔۔۔ (مرتب)

اپنے گھر میں زندگی بڑی سادگی سے گذاری اور بہت سے غرباء اور مساکین کو آپ پوشیدہ رقوم پہونچایا کرتے، بہت سی مرتبہ کوئی محتاج اور حاجت مند آپ کے پاس آتا اور لوگوں کا ہجوم ہوتا تو آپ اس کو اس وقت خالی جانے دیتے اور بعد میں اس کا پورا پورا خیال فرما کر اس کی اعانت فرماتے اور اس کے گھر رقم پہونچا دیتے، فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

ف: ماشاء اللہ! یہ تھا اخفائے صدقہ کا اہتمام جس کی حدیث میں بڑی فضیلت وارد ہے۔ (مرتب)

اب ہم چاہتے ہیں کہ ''ارمغان اجلاسِ صد سالہ جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیو بند'' جس میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیو بند نے علمائے دار العلوم دیو بند کے اوصاف وکمالات کو منظوم فرمایا ہے۔ ان میں سے چند اشعار جو مولانا نذیر میاں پالن پوری کی مدح میں ارقام فرمائے ہیں ان کو درج کریں۔ جو یقیناً مولانا کے حال وکمال کی صحیح ترجمانی ہے۔

زہے شیخ نذیر احمد بگجرات ۔۔۔ کہ پالن پُر تھا جن کا موطنِ ذات

علاقہ پر تھا چھایا شرک و بدعت ۔۔۔ دروں ظلمت بروں جہل و ضلالت

نمایاں شد نذیر از عزم وہمت ۔۔۔ بعزمِ صادق وباحسن نیت

کہ خود تنہا تھے اور اعداء بکثرت ۔۔۔ ہوئی آخر نمایاں حق کو قوّت

جہالت کے جہاں پھیلے تھے ریلے ۔۔۔ مدارس کے وہاں ہیں جال پھیلے

ہیں صد ہا آج علمِ حق کے خادم ۔۔۔ ہوئے بدعت پسند مغلوب ونادم

حضرت مولاناؒ کے تذکرہ کی کتابت سے فراغت ہو چکی تھی کہ یکا یک مکرم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب پالنپوریؒ خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا عنایت نامہ جنوبی افریقہ سے لکھا ہوا آج ۳۰ / ربیع الاول ۱۴۱۸ھ مطابق ۵ / اگست ۱۹۹۷ء کو موصول ہوا جو مولاناؒ کے تذکرہ طیبہ کیلئے مناسب اور عوام وخواص کے لئے موثر ومفید معلوم ہوا، اس لئے اس کو نقل کرتا ہوں:

مکتوب گرامی حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب پالن پوریؒ

باسمہ سبحانہ

گرچہ دوریم بیادتو قدح می نوشیم

بُعدمنزل نہ بود درسفرِ روحانی

بگرامی خدمت رفیق محترم مولانا قمرالزماں صاحب، زید مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بعد اشتیاق ملاقات جناب والا کا پیام (بذریعہ فون) پورٹ شپسٹون کے حاجی عبدالوہاب ملاں[1]، حافظ ایوب کڑوا (جو حقیقت میں میٹھا ہیں) کے توسط سے موصول ہوا، کہ آپ احقر کے پھوپھاجان مولانا نذیر احمد صاحب پالنپوری کے بکھرے ہوئے موتی ایک ہی لڑی میں پرو رہے ہیں۔ بے حد خوشی ہوئی، دفعۃً ناکارہ کو حضرت مرحوم کا ملفوظ یاد پڑ گیا، فرمایا کرتے تھے کہ "میں جب کنزالدقائق پڑھتا تھا، قرآن پاک کی آیت **لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا** تلاوت کرتے ہوئے یہ عہد کیا تھا کہ علم پر معاوضہ نہیں لوں گا"۔ واقعی حضرت مرحوم نے اس پر عمل کر کے اسلاف کا نمونہ پیش کیا۔ بہت ہی سادگی سے داعیانہ زندگی گزار دی ۔

انوکھی وضع تھی ان کی زمانے سے نرالے تھے

یہ داعی کون سی بستی کے یارب رہنے والے تھے

---

(۱) یہ دونوں حضرات اور مولانا علی آدم صاحب کنتھاریہ والے اس حقیر کے خاص احباب میں سے ہیں جنہوں نے صفر ۱۴۱۶ھ مطابق جولائی ۱۹۹۵ء میں اولاً جنوبی افریقہ کیلئے دعوت دی تھی۔ فزاہم اللہ تعالی۔ (مرتب) س

احقر کی والدہ مرحومہ نے ”شانِ نذیر“ کے عنوان سے کہا تھا ؎

آن والے مولوی اور شان والے مولوی
مولوی احمـــد نذیر عرفان والے مولوی

آپ ہی کے پیچھے پیچھے آپ ہی کے ساتھ ساتھ
جائیں گے جنت میں سب گجرات والے مولوی

وہ فدا ہیں جان و دل سے دین ہی کے کام پر
سیم و زر صدقہ کیا بس دین ہی کے نام پر

فقط والسلام

حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب پالنپوری

بقلم مسعود الرحمن۔

وفات: حضرت مولانا عرصہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے تاہم اخیر وقت تک صاحبِ فراش ہونے کے باوجود دورۂ حدیث وتفسیرِ قرآن کا درس دیتے رہے۔ آخر مولانا ۲۰؍رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۳؍جنوری ۱۹۶۶ء کو اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ**۔ اور پالن پور ہی میں مدفون ہوئے۔ **نَوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهٗ**۔

الحمد للہ آپ کی قبر کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ (مرتب)

حضرت الشیخ محمد البشیر صاحب الابراہیمیؒ المتوفی ۱۳۸۵ھ

نام ولادت وتعلیم : شیخ محمد بشیر ابراہیمی الجزائر کے شہر ''ہطیف'' میں ۱۳ رجنوری ۱۸۸۹ء مطابق ۱۳۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے شہر ہی میں قرآن پاک حفظ کیا ابتدائی تعلیم حاصل کی اور فقہ کی کچھ کتابیں اور عربی زبان پڑھی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ۱۹۱۱ء میں مشرق عربی کا رخ کیا قاہرہ میں قیام کیا اور جامع ازہر وہاں کے علماء شعراء اور مفکرین سے تعارف حاصل کیا۔ استفادہ کیا اور اس کے تین ماہ کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اور وہاں قیام کرکے اسلامی علوم وعربی زبان وادب کے اساتذہ سے مختلف متداول کتابیں پڑھیں، مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں بیٹھ کر قدیم وجدید کتابوں کے سرچشمہ سے سیراب ہوئے ان کے آنے کے دو برس کے بعد ۱۹۱۳ء میں الجزائر سے شیخ عبدالحمید بن بادیس مدینہ منورہ آئے تو ان سے تعارف اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، کچھ عرصہ کے بعد شیخ ابن بادیس تو الجزائر واپس ہوگئے۔

اسلامی دعوت : شیخ ابراہیمی ۱۹۱۶ء میں دمشق چلے گئے اور وہاں اسلامی دعوت کا کام بڑی مستعدی اور سرگرمی سے انجام دیا ۱۹۲۰ء کے آخر میں ملک الجزائر اب غفلت سے بیدار ہوکر غلامی کے جوئے کو اٹھا پھینکنے کے لئے تیار ہو رہا تھا، شیخ عبدالحمید بن بادیس ایک معلم کی حیثیت سے نوجوانوں کو تیار کررہے تھے، شیخ ابراہیمی ان کی اس تحریک میں شامل ہوگئے اور تدریس کا فریضہ سنبھالا،

مدینہ منورہ میں دونوں کے مابین مستحکم اور پائدار تعلقات اور اخوت وصداقت قائم ہو چکی تھی، اب ملک کی آزادی، الجزائر میں اسلام اور عربی زبان کے بقاء وتحفظ کے لئے تن من دھن کی بازی لگادی۔

آپ کا خطاب: انہوں نے ایک بار انتہائی جرات سے کہا کہ ’’ہم علماء ہیں‘ سیاست داں ہیں اور ہم ہر وہ چیز بننا چاہتے ہیں جس سے ہماری قوم کا تحفظ ہو، ہمارا دین محفوظ رہے اور ہماری زبان زندہ ومتحرک رہے‘‘ شیخ ابراہیمی نے جزائر سے باہر پڑھنے والے طلباء کو مخاطب کر کے کہا کہ ’’اب تم اپنے مدرسوں میں رہ کر اس کی کوشش کرو کہ تم میں سے ہر ایک میدان کارزار کا جانباز سپاہی بنے، ہم سب سے پہلے سونے والوں میں تھے اور سب سے آخر میں بیدار ہونے والوں میں ہیں، ہمارے لئے اب ضروری ہے کہ ہم متحد ہو کر ملبے کو ہٹا کر صاف کریں اور پھر تعمیر کریں۔

مزید کہا کہ ’’میں تمہارے لئے خدا اور اس کے بعد شرف علم کی پناہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے وطن واپس لوٹو اور تم آدھے پڑھے، چوتھائی یا علم کا دسواں حصہ ہی لے کر واپس آؤ، اس قوم کی جو خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس کا گہرا مطالعہ کرے اسی طرح جیسا کہ کتاب کا مطالعہ کرتا ہے یا جیسا کہ علمی حقائق پر غور وخوض کرتا ہے، جب اس کو اپنے علم پر اطمینان ہو جائے گا تو کامیابی اس کے قدم چومے گی میں نے تجربہ حاصل کیا ہے اور پڑھا ہے، میں نے اس امت کا مطالعہ کیا ہے اور اسے سمجھا ہے سویا ہوا شخص معذور قرار دیا جاسکتا ہے لیکن جاگے ہوئے انسان کو معاف نہیں کیا جاسکتا ہے، امت بڑی طویل اور گہری نیند سوئی

ہے، جزائری قوم بیدار تو ہوئی مگر ابھی پورے طور پر بیداری حاصل نہیں کرسکی، وجہ اس کی یہ ہے اسے ان چیزوں نے سلایا تھا جس میں کچھ نشہ آور اشیاء ملی ہوئی تھی۔

شیخ ابراہیمی الجزائر کے مسئلہ کے ساتھ ساتھ عالم عرب و اسلام کے مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور اس کے لئے بھی جدوجہد میں شریک ہوتے تھے، ان حالات نے انہیں بوڑھا اور بیمار بنادیا تھا۔

وفات: چنانچہ ۱۹ رمئی ۱۹۶۵ء مطابق ۱۳۸۵ھ میں حکم الہی آپہونچا اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے، لیکن جدوجہد، حوصلہ، ہمت اور اولوالعزمی کی ایک ایسی مثال قائم کر گئے جو قوموں اور امتوں کے لئے مشعل راہ بنی رہے گی۔ **رحمہ اللہ تعالی۔** (تاریخ فکر اسلامی ص ۲۷۳)

محدِّث کبیر حضرت مولانا بدرعالم صاحب[1] مہاجر مدنی المتوفی ۱۳۸۵ھ

ولادت: مولانا کی ولادت ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں ہندوستان کے شہر بدایوں میں ہوئی، والد محترم پولیس آفیسر تھے، مگر نہایت دیندار و متقی تھے، چنانچہ پولیس کے محکمہ میں ہوتے ہوئے بھی کبھی رشوت نہ لی اور نہ جھوٹ بولے، سولہ سال کی عمر میں سفر حضر میں کبھی تہجد ناغہ نہ ہوا، اخیر عمر میں ذکر اللہ تعالیٰ اسّی اسّی ہزار بار یومیہ فرماتے تھے، سات حج کئے تھے، پہلے سلسلۂ چشتیہ کے کسی بزرگ سے بیعت تھے، بعد میں حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب نقشبندیؒ سے تجدید بیعت فرمائی تھی۔

مولانا کی تعلیم: پہلے قرآن پاک کی تعلیم ہوئی، پھر انگریزی اسکول میں داخل ہوئے اور تقریباً میٹرک تک پڑھا مگر اسی اثناء میں الہ آباد کی کسی مسجد میں

---

[1] مولانا کی مختصر سوانح مولانا ہی کے خلف الرشید مولانا آفتاب عالم صاحب نے شہرۂ آفاق تصنیف ''ترجمان السنہ'' کی جلد چہارم کے شروع میں تحریر فرمائی ہے، اس کو سامنے رکھ کر کچھ حالات پیش خدمت ہیں، اور مولانا کے رسالہ ''نصیحت نامہ'' سے کچھ نصیحتیں اور حضرت علامہ خالد محمود صاحب کا آپ کی خدمات جلیلہ پر قیمتی مضمون کا اقتباس درج کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ناظرین کے لئے مفید بنائے۔ خوش نصیبی سے ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۹۹۶ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تو مدینہ منورہ میں ان کے صاحبزادے کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، اس سے قبل ۱۹۷۸ء میں بھی حج کے دوران ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا دونوں ہی مرتبہ مولانا کی محبت وعنایت وضیافت اور ان کی باتوں سے دل خوش ہوا۔ فجزاہم اللہ تعالیٰ۔ (مرتب)

(غالباً مسجد شیخ عبداللہ، مدرسہ احیاء العلوم، مرکز دعوت و تبلیغ رہی ہوگی) تشریف لے گئے، وہاں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرّہ کا وعظ تھا اس کو سن کر مولانا نے جب کہ آپ کی عمر گیارہ سال کی تھی یہ فیصلہ کیا کہ اب انگریزی تعلیم کا سلسلہ ترک کردوں گا، اس کا اظہار حضرت والد محترم کے سامنے کردیا، اس پر حضرت والد محترم نے سختی بھی کی تاہم آپ اپنے فیصلہ پر قائم رہے تو حضرت والد محترم نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی خدمت میں خط لکھا اور مِن وعَن پورا واقعہ نقل فرمایا، مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے تحریر فرمایا کہ اس سعادت کے حصول میں کیوں حائل ہو رہے ہیں۔ آپ کو تو اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور خوشی اور مسرت کے ساتھ اس کی اجازت دینی چاہیے، چنانچہ مولانا اپنے والد سے جدا ہو کر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور پہونچ گئے، اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی مسجد کے حجرے میں قیام پذیر ہوئے، اور آٹھ سال رہ کر تعلیم مکمل فرمائی اور اُنیس سال کی عمر میں مظاہر علوم ہی میں مدرّس ہو گئے، دو سال تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے مشہور محدث حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چار مرتبہ بخاری شریف سبقاً سبقاً حضرت شاہ صاحبؒ سے طالب علموں کی صف میں بیٹھ کر پڑھا، مولاناؒ اپنے استاذ حضرت شاہ صاحبؒ کا بے حد ادب و احترام فرماتے تھے، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اپنے فاضل تلمیذ کی بہت قدر فرمائی اور اپنے دست مبارک سے ایسی سند تحریر فرمائی جو ایک محدث کے لئے بجا طور پر قابل فخر ہے۔ **ذَلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔**

پھر حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ جامعہ ڈابھیل گجرات جانا ہوا اور وہاں

سترہ ۱۷ سال حدیث کا درس دیا۔ پھر وہاں سے بھاول نگر (بھاولپور، پاکستان) تشریف لے گئے، یہاں ایک مدرسہ تھا جو صرف دو کمروں پر مشتمل تھا اس کو بڑھایا جو اب شاندار مدرسہ کی صورت میں موجود ہے۔ بھاولنگر سے دہلی تشریف لائے۔

ترجمان السنۃ: اور ندوۃ المصنفین جس کو حضرت والاؒ کے قدیم رُفقاء مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی نے قائم فرمایا تھا اسی کی ایک کڑی بن گئے اور ترجمان السنہ جیسی اہم تصنیف کا کام شروع فرمادیا۔ مگر ابھی اس کی ایک ہی جلد طبع ہوئی تھی کہ تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا اور آپ نے پاکستان ہجرت فرمائی تاہم ترجمان السنہ کے اہم علمی کام کو جاری رکھا، مزید آپ نے پاکستان میں ایک بڑے دارالعلوم کی ضرورت محسوس کر کے جامعہ اسلامیہ کی بنیاد ٹنڈو الہ یار میں رکھی جو الحمدللہ تعالی اب بھی دینی وعلمی خدمات بخوبی انجام دے رہا ہے، جو مولاناؒ کے لئے صدقات جاریہ ہیں، ان شاء اللہ تعالی۔

مدینہ منورہ کو ہجرت: اخیر عمر میں پاکستان سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ لیکن تالیف کی طرف توجہ برابر مبذول رہی۔ الحمدللہ تعالی ترجمان السنہ کی تیسری جلد ان کی حیات میں شائع ہوگئی، مگر چوتھی جلد جس میں معجزات پر نہایت محققانہ وعالمانہ سیر حاصل بحث فرمائی ہے وہ آپ کی وفات کے بعد حلیہ طبع سے آراستہ ہوئی، الحمدللہ اس کی چاروں ہی جلدیں نہایت محقق ہیں اس لئے یہ حقیر اپنے لڑکوں سے کہتا ہے کہ اس کا اور قصص القرآن مؤلفہ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی کا ضرور مطالعہ کریں اس لئے کہ یہ دونوں ہی کتابیں اردو زبان میں نہایت ہی مفید اور بصیرت افروز ہیں۔ و باللہ التوفیق۔

الحمدللہ اس حقیر نے "ترجمان السنۃ" کی چاروں جلدوں کی تلخیص دو جلدوں میں بنام "ریاض السنہ ملقب بہ فتوحات مدنیہ" کیا ہے جو طبع ہو چکی ہے، جس کو ارباب علم و فضل نے پسند فرمایا، چنانچہ حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ استاذ دارالعلوم دیوبند "آب حیات" کے عنوان سے اپنا تاثر لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ تلخیص کیا ہے گرما سرما، ہر موسم میں استعمال ہونے والا عطر، ہر طبقہ کیلئے آب حیات، ہر مریض کیلئے ماء اللحم، ہر عالم کیلئے خمیرہ ابریشم، پڑھئے اور ایمان کو تازہ کیجئے، انتہیٰ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسن ظن کے مطابق اس کتاب کو عام و خاص سب کیلئے مفید بنادے، آمین۔

فیض الباری: حضرت مولانا نے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تقریر بخاری کے دقیق مضامین و معارف کو نہایت سلاست و جامعیت کے ساتھ "فیض الباری" کی چار جلدوں میں درج فرمایا ہے جو علماء کے لئے گراں قدر تحفہ ہے۔

فجزاهم الله احسن الجزاء۔

سلسلۂ بیعت: اولاً آپ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے مگر اثنائے سلوک ہی میں حضرت مفتی صاحب رحلت فرماگئے، پھر انہیں کے خلیفہ حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر تجدید بیعت کی اور مقامات سلوک طے فرمائے۔ انہوں نے خلافت خاصہ کے ساتھ مشرف فرمایا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے رسالہ "نصیحت نامہ" سے چندن نصیحتیں نقل کروں۔

چند نصیحتیں

(۱) حدیث شریف میں ارشاد ہے: **الدين النصيحة** یعنی دین کا خلاصہ خیر

خواہی کرنا ہے۔ اس لئے میں اپنے سب برادران کو نصیحت کرتا ہوں اور اسی کو میری وصیت سمجھنا چاہئے کہ جتنے میرے احباب ہیں وہ حسب اپنی طاقت کے ذکر الٰہی میں مشغول رہیں اور اس میں ہرگز غفلت اور کوتاہی نہ کریں۔

ذکر کُن ذکر تا ترا جان است　　پاکئ دل از ذکر رحمٰن است

(جب تک جان ہے اس وقت تک اللہ کا ذکر کرتے رہو، اس لئے کہ دل کی پاکی رحمٰن کے ذکر سے حاصل ہوگی۔)

(۲) دوسری نصیحت یہ ہے، میرے جملہ احباب ہر سنت کا پورا پورا اہتمام رکھیں اور کسی سنت کو خواہ وہ کتنی چھوٹی سی ہو معمولی نہ سمجھیں کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر سنت اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

(۳) سب احباب کو یہ نصیحت اور وصیت ہے کہ وہ کسی مسلمان کو کسی وجہ سے حقیر و ذلیل نہ سمجھیں، حدیث شریف میں آیا ہے: **كفى بالمرء اثما ان يحقر مُسلما او كما قال** ۔ ترجمہ: مسلمان کے گنہگار ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ کسی دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھے)

بات یہ ہے کہ اسلام اتنی بڑی نعمت ہے کہ جس کو یہ نصیب ہوگئی اس کو سب نصیب ہوگیا، اس لئے گناہ خواہ کتنا ہی ذلیل چیز ہو لیکن گنہگار ایمان دار ہو تو اپنے ایمان کی وجہ سے وہ پھر بھی محترم ہے اور ایک نہ ایک دن جنت میں جا کر رہے گا۔

(۴) اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ حسن ظن رکھے اور اس کے سامنے اور اس کے پیچھے اس کی تعریف میں زیادہ مبالغہ بھی نہ کرے، اس لئے احباب سے التماس ہے کہ وہ میرے بعد میری تعریف میں مبالغہ نہ کریں بلکہ

اخلاص وتضرع کے ساتھ میری مغفرت کی ہمیشہ دعا مانگا کریں۔

(۵) جس طرح حق تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ اس کی ذات وصفات میں کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے، نہ کسی بزرگ، نہ کسی ولی کو، اور اس کی کتاب یعنی قرآن کریم کا حق یہ ہے کہ اس کے حکموں کو مانا جائے اور ان پر عمل کیا جائے اور اس کی تلاوت کی جائے، اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور یقین رکھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اور کوئی نبی پیدا نہ ہوگا، جان ودل سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کا اتباع کرے اور بدعت سے کامل احتراز کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے اوقات میں سے ایک حصہ بصد ذوق وشوق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے کے لئے وقف کرے، اس لئے احباب کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ ذکر اللہ سے جس طرح ان کی تعلیم دیا گیا ہے غفلت نہ کریں اور زبان سے بھی ایک تسبیح کلمہ طیبہ کی پڑھ لیا کریں کیونکہ حدیث شریف میں اسی کلمہ کو افضل الذکر کہا گیا ہے اور کچھ نہ کچھ قرآن کریم کی روزمرہ تلاوت کریں اور درود شریف پڑھنا بھی حسب استطاعت ووقت اپنے ذمہ لازم سمجھیں۔ (نصیحت نامہ: ص/۲)

حضرت مولاناؒ کے چند مفید ارشادات

توحید کی اہمیت: مسلمانوں کی جماعت حق جلّ وعلیٰ کی توحید پر بنی ہے اس لئے اس کو اپنا یہ امتیاز ہر عمل میں قائم رکھنا گویا اپنی ہستی کا قائم رکھنا ہے اور اس کو فنا کرنا گویا اپنی ہستی کو فنا کر ڈالنا ہے، اس لئے میں احباب کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ اسباب کے پیچھے اس طرح نہ پڑیں کہ دیکھنے والا ان کو بندگان خدا کے بجائے بندگان اسباب سمجھنے لگے۔

بے شک اللہ تعالی نے اسباب میں تاثیر رکھی ہے اور اسی لئے ہم کو ہر کام کے اسباب اور اس کی تدبیر کا حکم بھی دیا ہے لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ ہم اس تاثیر کے پیدا کرنے والے کو اعتقاداً اور عملاً بھلا بیٹھیں۔

اسلامی معاشرت یہ ہے کہ ہم ہر ہر عمل میں فاعل حقیقی حق سبحانہٗ تعالی کو یقین کریں اور اسباب کو صرف مشیّت ایزدی کا مظہر تصوّر کریں اور اپنے ہر نفع وضرر کو مالک حقیقی کی طرف سے سمجھیں یعنی علاج سے اگر فائدہ ہے تو زبان سے یہ بھی کہیں کہ اللہ تعالی کے فضل سے دوا نے فائدہ دیا، تجارت میں اگر نفع ہو تو یہ کہیں کہ اللہ تعالی کی رحمت سے اس سال ہم کو بہت نفع ہوا ہے، اسی طرح اگر ملک آرام میں ہے تو یہ کہیں کہ اللہ تعالی نے اپنی رحمت سے ایک عادل اور مہربان حاکم عطا فرمایا، یہاں یہ عُذر ہر گز نہ کریں کہ ہمارے سب کے دلوں میں یہی بات ہوتی ہے لیکن ہم صرف زبانی طور پر اس نسبت کو استعمال نہیں کرتے، میں اپنے احباب کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ زبانی طور پر اسی نسبت کو اپنی معاشرت کا جزو بنالیں تاکہ جو قوم ایک اللہ تعالی وحدہ لاشریک لہ کے نام پر بنی ہے وہ اپنے جملہ خصائص میں ممتاز نظر آئے اور ایمانی غیرت اور اللہ تعالی کی حق شناسی کا تقاضا بھی یہی ہے، قدیم مسلمانوں میں اس گہری حقیقت کی عادت اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ ان کی زبانوں پر دن بھر میں بے گنتی **الحمدللہ، ماشاء اللہ اور ان شاء اللہ اور لاحول ولاقوۃ الاباللہ اور حسبنا اللہ** اور **انا للہ** اور بفضلہٖ تعالی کے مبارک کلمات جاری رہتے تھے، درحقیقت یہ کلمات اور اسلامی عادات اسی عقیدے کی تذکیر اور تازگی کے لئے سکھائے گئے تھے، اس لئے میں اپنے احباب کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ اپنی معاشرت میں تاامکان

ان کلمات کو اسی تصور کے ساتھ زیادہ سے زیادہ استعمال میں لائیں اور بے وقوفوں کے بہکانے سے ان عادات کو معمولی نہ سمجھیں۔

ف: ۔نہایت اہم نصیحت ہے جو واجب العمل ہے، مگر افسوس کہ اب اس امر میں عوام تو عوام؛ پڑھے لکھے لوگوں سے بھی کوتاہی ہو رہی ہے۔العیاذ باللہ۔(مرتب)

تعدیہ امراض: اسی طرح امراض کا ایک دوسرے کو لگ جانے کا خیال بھی ہماری اسباب پرستی کا نتیجہ ہے، موجودہ تحقیقات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن شرعی تحقیقات یہ ہے کہ جس نے پہلے شخص کو مرض میں مبتلا کیا اُسی نے دوسرے کو بھی مبتلا کیا ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ بعض مرتبہ گھر میں وہ مرض دوسروں کو بھی پیدا ہوجائے لیکن اگر قادرِ مطلق پر نظر رہے تو کیا پھر اس مرض کے پیدا ہونے کو اسباب کے بجائے مشیت الٰہی کے سپرد کر دینا بہتر نہیں ہے؟ کیا اس کی مشیت اور اس کا ارادہ اسباب کے برابر بھی تاثیر نہیں رکھتا؟ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

ف: سبحان اللہ! کیا ہی ایمانی بات فرمائی جو حرزِ جان بنانے کے لائق ہے۔(مرتب)

بات یہ ہے کہ ہر شخص جو ضعیف الاعتقاد ہو وہ اپنی اسباب پرستی کی تاویل کرنے کے لئے یہ کہہ دیا کرتا ہے کہ میں خدا کی قدرت کا منکر نہیں لیکن قدرت کی عادت یہی ہے کہ جب ایک متعدی مرض گھر میں گُھستا ہے تو وہ دوسروں کو بھی لگ جاتا ہے، مسلمان کی توحید کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے منسوب کرے اور جب یہ ہوگا تو پھر اسباب ان کی نظروں میں بے وقعت ہو کر رہ جائیں گے اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کی قدرت پر اعتماد اگر

نصیب ہو گیا تو یہ ہوگا کہ پھر اسباب کی تاثیر کا راز فاش ہو کر رہ جائے گا۔

ف: ماشاء اللہ تعالیٰ! اس مسئلہ کی خوب توضیح فرمادی جو پیش نظر رکھنے کے لائق ہے۔ (مرتب)

شکر نعمت کی تاکید اور کفران نعمت سے احتراز

ہر نعمت پر ہم شکر کی عادت ڈال لیں خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، قدیم مسلمانوں کا طریقہ تھا کہ وہ ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرتے تھے خواہ وہ کھانا ہو یا پینا، اوڑھنا ہو یا پہننا اور یہی بسم اللہ ان کے اعمال میں نیت کے قائم مقام بن جاتی تھی، اسی طرح ان کی زبانوں پر الحمد للہ جیسے شُکر کے کلمات چڑھے ہوئے تھے، اب ہماری معاشرت میں بسم اللہ اور الحمد للہ کے مُبارک کلمات گُم ہوتے چلے جارہے ہیں، اس لئے اس آسان بات کو اپنی زندگی میں پھر داخل کرنا چاہئے اور کثرت سے اس کی عادت ڈالنی چاہئے کہ ارادہ اور بے ارادہ یہ کلمات زبان پر جاری ہو جائیں تاکہ ''عبادُ اللہ'' عبادِ دُنیا سے ہر وقت محسوس طور پر ممتاز نظر آئیں اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہمارے گردو پیش میں چھا جائیں۔ قرآن کریم میں ہے: **لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ** یعنی اگر تم شکر ادا کرتے رہو گے تو میں اپنی نعمتیں تم کو اور زیادہ دوں گا۔ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ نعمتوں کی شکرگذاری صرف اس کا نام نہیں ہے کہ کلماتِ شکر زبان سے ادا کئے جائیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ نعمتوں پر عبادتوں کی کثرت ہو اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں ان کو اس طرح پر صرف کیا جائے جو حق سبحانہ تعالیٰ کی رضا کا موجب ہو مثلاً اگر کسی تاجر کو اللہ تعالیٰ نفع دیتا ہے تو شکر یہ نہیں ہے کہ زبان سے الحمد للہ کہہ کر اس کو خلاف شرع مقامات پر خرچ کردے بلکہ یہ شکر ہے کہ وہیں خرچ کرے جہاں جہاں

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں خرچ کرنی چاہئے، تاکہ ان کے برمحل صرف ہونے سے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نازل ہوں اور دن دونی برکتیں اُتریں۔

حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جب یہ دیکھا کہ راتوں کو کھڑے کھڑے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروں پر وَرم آگیا تو عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ اتنی محنت کیوں برداشت فرماتے ہیں؟ جب کہ آپ کے رب نے آپ کی اگلی پچھلی خطائیں سب بخش دی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی جواب دیا: **اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا** کیا میں اس کا شُکر گذار بندہ نہ بنوں؟

یعنی نعمت کا شکر یہ ہے کہ نعمت جتنی بڑھتی جائے شکرگذاری اتنی ہی اور دونی ہوتی چلی جائے۔

اس کے ساتھ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ناشکری سے حددرجہ پرہیز کیا جائے، صرف زبان سے نہیں بلکہ اس طرح بھی کہ ''خدائے تعالیٰ کی نعمتوں سے لاپرواہی نہ برتی جائے اور نہ ان کو کم یا گھٹیا درجہ کی سمجھی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مختلف قسم کے انسان پیدا کئے ہیں، کسی کو امیر بنایا ہے اور کسی کو غریب۔ یہاں غریب کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی امیر کو دیکھ کر یہ کہے کہ یہ نعمتیں مجھ کو کیوں نہیں دیں؟ اسی طرح امیروں میں بھی کسی کو بڑا بنایا ہے کسی کو چھوٹا، یہاں بھی چھوٹے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: مجھ کو اس جیسا بڑا امیر کیوں نہیں بنایا؟ بلکہ غریب کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ غریب کو دیکھے اور چھوٹے امیر کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے سے کم حیثیت امیر کی طرف نظر کرے اور یہ دونوں خدا کی نعمت کی شکرگذاری اس طرح کریں کہ اگر وہ کسی سے کم ہے تو بہتوں سے زیادہ بھی

ہے، خدانہ کردہ اگرکم وبیش کی بحث میں پڑ کر اللہ تعالی کی ناشکری کی عادت پڑگئی تو پھر اندیشہ ہے کہ جونعمتیں دے دی گئی ہیں کہیں وہ بھی نہ چھین لی جائیں۔ العیاذ باللہ۔ اسی لئے فرمایا ہے: **لَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ** یعنی تم میری ناشکری کروگے تو یادرکھنا میراعذاب بھی سخت ہے۔

اس لئے میں یہ تاکید کرتا ہوں کہ خدائے تعالی کے شکرگذار بندوں میں شامل ہونے کی بے انتہاکوشش کریں اورناشکروں میں داخل ہونے سے پناہ مانگیں۔حق تعالی کا ارشاد ہے : **وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ** یعنی میرے ایسے بندے کم ہیں جوہمیشہ میرے شکرگذارر ہیں۔جب ایسے بندے کم ہیں تو پورے شکر گذار بن کراپنی قدربڑھاویں۔(نصیحت نامہ:ص ر ۳۳)

ف: سبحان اللہ! کیسی مفید نصیحتیں ہیں جوحرز جان بنانے کے لائق ہیں، اللہ تعالی عمل کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین۔(مرتب)

علمی خدمات: حضرت ڈاکٹر علامہ خالدمحمود صاحب مدظلہ ڈائرکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر نے آپکی علمی خدمات جلیلہ پرسیر حاصل بحث کی ہے۔جس کومولانا عبدالرشید ارشد صاحب نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ’’بیس مردان حق‘‘ میں درج کیا ہے۔بغرض استفادہ اختصار کے ساتھ نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں،فجزاھم اللہ تعالی۔(مرتب)

حضرت مولانا بدرعالم مرحوم دیوبند کی تیسری صف کے فضلاء میں سے ہیں اورآپ کے درس حدیث کے حلقے مظاہرالعلوم سہارنپور، دارالعلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، جامعہ اسلامیہ ٹنڈووالہ یارسندھ، اورمدینہ منورہ میں ایسی

آب وتاب سے لگے کہ تاریخ نے ان کی شہادت محفوظ کر لی اور پھر پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی پہلی صف کے فضلاء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن حضرت مولانا خلیل محدث سہارنپوری حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ سرفہرست ہیں۔دوسری صف کے فضلاء میں امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ ،حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ محدث دہلوی،حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ،حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ،حضرت علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنیؒ زیادہ معروف ہیں۔تیسری صف کے فضلاء میں سے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ مفتی محمد شفیع صاحبؒ ،حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ ،حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ محدث کبیر حضرت مولانا سید محمد بدر عالمؒ ،مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ ،مولانا شمس الحق افغانیؒ مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا مفتی محمودؒ نے زیادہ شہرت پائی ہے۔اس صف کے فضلاء حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کے علوم کے حامل اور امین سمجھے جاتے ہیں تاہم ان میں اگر کسی کو صحیح طور پر حضرت شاہ صاحب کا جانشین سمجھا جاسکتا ہے تو وہ حضرت مولانا سید محمد بدر عالمؒ ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد بدر عالم کی خدمت حدیث :

(۱) فیض الباری بشرح صحیح البخاری (چار جلد)۔آپ نے حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کے درس بخاری کو فیض الباری کے نام سے عربی میں چار ضخیم

جلدوں میں جمع کیا۔فیض الباری مصر میں شائع ہوئی ،آپ نے اس پر ایک حاشیہ بھی تحریر فرمایا جس کا نام البدر الساری الی فیض الباری ہے۔

(۲) ترجمان السنہ (چار جلد)۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات مبارکہ اور آپ کی سنت مطہرہ کی یہ نئی تدوین ہے عام فہم اسلوب بیان میں یہ خدمت حدیث اپنی جگہ بے نظیر ہے۔اس میں جہاں دور حاضر کے فتنوں پر کڑی گرفت کی گئی ہے اور قرآن وسنت کی رو سے ایک ایک فتنے کا تعاقب کیا گیا ہے تو ساتھ ہی حدیث پاک کی عام فہم تشریح بھی ہے جس سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(۳) جواہر الحکم (چار حصے) یہ آپ کی آخری تالیف ہے۔حکم کا لفظ اس کے لئے کافی تھا مگر آپ نے اسے ان حکمتوں کے بھی جواہر کہا ہے اور یہ ہے بھی اسم با مسمی ۔جواہر الحکم کا زیادہ موضوع وہ روایات ہیں جو ایک آدمی کو صحیح انسان بنانے کے لئے عقل وفکر کے بعد اس میں قلب کی پوری اصلاح کا بھی سامان رکھتی ہیں۔ حضرت عام طور پر اپنے مریدین کو یہ کتاب حرز جان بنانے کے لئے دیتے تھے۔

حدیث کی تدوین جدید کی ضرورت: علم حدیث ایک ناپیدا کنار دریا ہے یہ صرف فقہاء ہی ہیں جو اس کے اندر غوطے لگاتے ہیں۔محدثین اس دریا میں تیرتے ہیں اور کوئی نہیں کہتا کہ میں نے اس دریا کو عبور کرلیا ہے۔قرون اولیٰ میں محدثین نے حدیث کی تدوین کی اور اسے علیحدہ علیحدہ کتابوں اور ابواب میں تقسیم کیا اور فقہاء نے علم کے ان ذخیروں میں سنت کی تلاش کی۔علماء کتاب و سنت سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہے اور عوام علماء کی پیروی میں ان سے جہاں تک ہوسکا دین میں لگے رہے اور ائمہ اربعہ نے محدثین سے بھی پہلے

احادیث سے مسائل کا استخراج واستنباط کیا۔

یورپ میں تحریک احیاء علوم اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے سائنس کے جدید اکتشافات نے دنیا کے اطوار و آداب بدل دیئے اب دنیا میں ایک نئی تہذیب قائم ہوئی ہے ایک نیا معاشرہ بنا اور مادی علوم روحانی تعلیمات پر چھا گئے۔ حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت ہے کہ ان نئے حالات اور نئی ضرورتوں میں حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ کے اس موڑ پر حدیث کی تدوین جدید کی ضرورت تھی۔

حضرت مولانا سید محمد بدر عالم اسی احساس کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

احادیث نبویہ پہلی صدی کے آخر سے تیسری صدی تک مختلف مقاصد کے پیش نظر مختلف حیثیتوں اور ترتیبوں کے ساتھ باضابطہ جمع ہوئی رہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر زمانہ کے نئے نئے تقاضے اور نئی نئی ضرورتیں ہوتی ہیں اس لئے اس جمود کی اور جمود پر اصرار کی کوئی ضرورت نہیں کہ اب کسی تالیف وتصنیف کی جانب جدید اسلوب کے ساتھ قدم اٹھانا جرم سمجھا جائے (ترجمان السنہ ج ا ص ۹)

اتباع سلف یہ ہے کہ جس طرح امام بخاری نے اپنے وقت کے فتنوں کے مقابلہ کے لئے ''کتاب الرد علی الجھمیہ'' حجیت اخبار آحاد، صفات باری اور شئون باری پر مناسب عنوانات قائم کئے ان کے قدم بقدم چل کر ہم بھی وقتی مسائل کے لئے مناسب عنوانات قائم کریں (ایضا ص ۱۱)

سلف کی خدمت کے پورے اعتراف کے ساتھ صورت حال کو اس نظر سے دیکھا جائے تو خدمت حدیث کا یہ گوشہ مجموعی طور پر خالی نظر آتا ہے اور

بلاشبہ وقت کی شدید ترین ضروریات میں یہ اہم ترین ضرورت باقی ہے کہ اس وقت احادیث نبویہ پر اس نقطہ نظر سے دوبارہ نظر ڈالی جائے کہ بین الاقوامی اور اجتماعی مسائل میں دین کامل کی ہدایات کیا ہیں اور فرمودات نبویہ میں وقت کے نئے نئے تقاضوں اور الجھنوں کا کیا حل پیش کیا گیا ہے۔ کسی زمانہ میں عدم اہمیت کی وجہ سے اگر ترتیب وتدوین احادیث کا یہ طریقہ بروئے کار نہیں لایا گیا تو اس دور کی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے چھپے اور دبے ہوئے عنوانات ابھارے جائیں ان کو اسلوب جدید کے سانچے میں ڈھالا جائے اور ایک جامع اور مرتب متن حدیث سامنے لایا جائے۔ (ترجمان السنہ ص ۱۱:)

حضرت مولانا سید محمد بدر عالم مرحوم کی اپنے وقت کے بدلے حالات پر گہری نظر تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ حدیث ان نئے عصری تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے مدون کی جائے۔ علماء دیوبند نے مسلمانان ہند کے دینی تحفظ کے لئے جہاں اور بہت سے محاذوں پر پڑاؤ ڈالے وہاں اس نئی ضرورت کا احساس بھی پہلے ان کے دلوں میں ابھرا اور ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا مرحوم اس احساس ضرورت میں خود امام العصر ہیں۔ آپ کے بعد ڈاکٹر اقبال مرحوم ہیں جنہوں نے فقہ کی تدوین جدید کی ضرورت محسوس کی اور آپ نے اسی احساس کو امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے سامنے پیش کیا افسوس کہ حضرت شاہ صاحب ڈاکٹر اقبالؒ کو وقت نہ دے سکے نہ آپ نے لاہور قیام کرنے کی تجویز سے اتفاق فرمایا اور اس طرح ڈاکٹر صاحب کے اس خواب کی تعبیر نہ نکل سکی۔ اس وقت مسلمانوں کے خلاف ہندوستان میں نئے نئے فتنے اٹھ رہے تھے۔ سرسید کے پیروں کا اسلام اس اسلام

سے بہت مختلف تھا۔جس کی نشر واشاعت میں علماء لگے ہوئے تھے۔قادیانی مبلغین مرزا غلام احمد کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے قرآن وسنت پر نہایت ظالمانہ تیز پنجے گاڑے ہوئے تھے۔انکارحدیث ایک مستقل مکتب فکر کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ فقہ کے انکار سے نئی نبوت کی ضرورت کا احساس ابھارا جارہا تھا اور خاکسار تحریک پرانے اسلام کو مولوی کے مذہب کا نام دے رہی تھی الحاد کی اس یلغار کے خلاف حضرت مولانا سید محمد بدر عالمؒ نے حدیث کے کتاب الایمان کو نئے سرے سے مرتب کیا اور وقت کے تمام فتنوں پر نظر کرکے حدیث کی ''کتاب الایمان'' کو ایک نئی جلاء بخشی۔آپ کی ''ترجمان السنہ'' اس دور کی انقلابی صدا ہے۔

آپ کے ہم عصر علماء کی گراں قدر آراء: محقق العصر حضرت مولانا یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ ان ممتاز علماء میں سے تھے جن کی بدولت علم دین کی ساکھ قائم ہے جن سے مدرسے آباد ہیں۔منبر بارونق ہیں موصوف قابل مدرس فاضل مقرر کامیاب ومقبول مصنف تھے۔اردو اور عربی کے ادیب اور شاعر تھے موثر اسلوب،شگفتہ طرز ادا کے مالک تھے عام گفتگو میں الفاظ کیا ہوتے موتی کی پروئی ہوئی لڑیاں ہوتی تھیں جو ان کی نوک زبان سے بکھرتی تھیں۔موثر تعبیر، دل نشین طرز ادا ان کی خصوصیت تھی۔صدق وصفا کے مجسمہ تھے۔ورع وتقویٰ اور استغناء کے پیکر تھے۔نصیحت وخیر خواہی اور حق گوئی میں ممتاز تھے،نہایت زیرک ومدبر تھے،اور سب بالاتر یہ کہ آخری لمحات حیات میں مرشد کامل تھے۔پاک وہند اور جنوبی ومشرقی افریقہ کے سیکڑوں بندگان خدا آپ کی تربیت وتزکیہ اور بیعت

وارشاد سے فیض یاب ہوئے اور شریعت کی پابندی واستقامت ان کو نصیب ہوئی۔ ذکی عالم تھے۔ صاحب فراست بزرگ تھے۔ مدینہ طیبہ کی سیزدہ سالہ بابرکت زندگی ان کی سرشت وطبیعت میں بہت کارگر اور موثر ثابت ہوئی، مدینہ کے انوارات وبرکات نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ان کی فطری جوہر کھلے۔ کرم گستری، مہمان نوازی، مروت، جواں مردی اور اپنے مخلصین سے مخلصانہ ادائیں وہ سب سے زیادہ حیرت انگیز جوہر تھے، جو نمودار ہوئے۔ ابتدائی دور طالب علمی میں مظاہر العلوم سہارنپور کے برکات سے بہرہ اندوز ہوئے اور سب قطب الارشاد حضرت مولانا سید رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے ارشد خلفاء عارف باللہ فقیہ ومحدث اور صوفی باصفا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی کے مرکز تو جہات والطاف رہے اور ان کے آغوش شفقت میں تربیت نصیب ہوئی۔ درمیانی عمر میں آیہ من آیات اللہ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ قدس سرہ سے شرف بیعت کی سعادت نصیب ہوئی۔

مولانا سیّد محمد بدر عالم ایک مفسر کی حیثیت میں: پاکستان بننے کے بعد ضرورت تھی کہ ریڈیو پاکستان پر روزانہ درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جائے اس کے لئے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے حکومت سے مولانا سید محمد بدر عالمؒ کی سفارش کی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کو تفسیر قرآن اور انداز بیان میں ان پر بڑا اعتماد تھا آپ نے استاذ کے حکم کی تعمیل میں چند دن درس دیا مگر آپ نے جب دیکھا کہ آپ کے جانے کے بعد پھر اسی ریڈیو اسٹیشن سے گانوں کی نشریات ہوتی ہیں تو آپ نے نامناسب جانا کہ ایک جگہ سے یہ دو طرح کے

پروگرام نشر ہوں آپ کے تقویٰ کی شان دیکھیں کہ دینوی آسائش کی کتنی بڑی پیشکش ٹھکرادی۔ پھر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے کچھ عرصہ ریڈیو پر درس قرآن دیا، یہی تفسیری خدمت پھر تفسیر معارف القرآن کی صورت میں سامنے آئی۔

اوراز اں بعد یہ خدمت حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے سپرد ہوئی۔

مولانا بدر عالم ایک ادیب کی حیثیت سے: آپ عربی اور اردو کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب اپنی جگہ عربی ادب کے امام تھے۔ قرآن کے اعجاز بلاغت کو سمجھنے میں آپ کو علامہ زمخشری اور سید شریف جرجانی کے بعد تیسرے نمبر پر سمجھتے تھے۔ آپ کی اس علمی تربیت کا نتیجہ تھا کہ آپ کے تلامذہ میں شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ، شیخ التفسیر مولانا ادریس کاندھلویؒ، محدث کبیر مولانا سید بدر عالمؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا سید یوسف کامل پوریؒ، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ تھے، ادب عربی میں اونچے درجے کے نثر نگار اور شاعر تھے۔ ان حضرات کی عربی نظمیں ان کے تذکروں میں موجود ہیں۔ فیض الباری عربی (چار جلدوں میں) مولانا بدر عالم کے عربی ذوق کی ترجمان ہے یہ کتاب مصر میں چھپی افسوس کہ الفاظ کمپوز ہونے کے بعد مولانا خود اس کی پروف ریڈنگ نہ کر سکے اور بعض مقامات پر غلطیاں رہ گئیں۔ اردو ادب میں آپ کی تحریرات میں وہ چاشنی ملتی ہے جو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تحریرات میں ہے۔ علماء دیوبند کے ادیب نثر نگاروں میں مولانا شبیر احمدؒ، مولانا سید بدر عالمؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نمایاں ہیں۔

مولانا سید محمد بدر عالم نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے جب ترجمان السنہ

لکھنے کا رادہ کیا تو ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتابوں کو بالاستیعاب پڑھا اس سے اردو ادب کا ملکہ پیدا کرنا مقصود تھا جو عصر حاضر کے نوجوانوں کو علم حدیث میں حق کے قریب ہونے کے زیادہ سے مواقع دے۔ میں نے اس ارادے سے مولانا آزاد کی تحریرات کو دیکھا۔آپ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے براہ راست شاگرد تھے اور ان کے اسلوب بیان کی بھی آپ پر گہری چھاپ تھی۔آپ کی ایک اردو تحریر بطور نمونہ ملاحظہ کریں:

> اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہوسکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود خدا ہوسکتا ہے کہ ہیکل انسانی میں جلوہ نما ہو۔رسول کے متعلق خدائی کا یہ تصور عیسائیت کا راستہ ہے اور خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ رسولوں کی صورت میں بروز کرتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بے مصداق ناممکن اور محال ہیں۔ عام حیوانات کو دیکھئے قدرت نے ان میں بھی ہر ہر نوع کی جدا جدا خصوصیات اور صورتیں بنائی ہیں اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع اپنے ان ہی قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے اس عالم کا نظام قائم ہے۔
>
> ’’**لا الشمس ینبغی لها ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النهار کل فی فلک یسبحون**‘‘۔ (پارہ ۲۳ یٰس)

نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے ہر چیز چکر میں پڑی گردش کھا رہی ہے۔ جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرے سے ترقی کر کے اس کی حد میں قدم رکھ سکتا ہے سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے اور کوئی اتصال ثابت نہیں ہوتا اس لئے رسول کا تصور اسلام میں بلا کسی ادنی شائبہ تنقیص کے یہ ہے کہ وہ ایک انسان کامل ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتب قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اور اس لئے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے۔ جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کرسکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی کرنا بھی نہیں جانتا اور جو فطرت انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کرسکتا اسی لئے قرآن کریم نے جا بجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ (ترجمان السنہ ج۱ص۴۵۶)

مولانا سید محمد بدر عالم شیخ طریقت کی حیثیت سے: علماء دیوبند طریقت میں زیادہ تر چشتی صابری سلسلہ میں منسلک ہیں شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ عموماً اسی سلسلہ میں بیعت کرتے تھے۔ تاہم ان حضرات میں

ایک لائن نقشبندی سلسلہ کی بھی رہی ہے۔ یہ لائن حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی کی نسبت سے معروف ہوئی۔ دیوبند کے پہلے مہتمم عارف باللہ مولانا رفیع الدین نقشبندی سلسلہ کے تھے۔ آپ سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن نے خرقہ خلافت پایا۔ مولانا سید محمد بدر عالم ان سے دیوبند میں بیعت ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب کے خلفاء میں میرٹھ میں حضرت مولانا قاری محمد اسحاق قیام فرماتے تھے۔ مولانا سید محمد بدر عالم نے ان سے خلافت پائی۔ چشتی صابری سلسلہ میں آپ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری سے بیعت تھے۔ ان علمی اور عرفانی نسبتوں نے حضرت مولانا سید محمد بدر عالم کو یہ روحانی جذب بخشا کہ آخر عمر میں بس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوار میں مدینہ منورہ کے ہی ہو کر رہ گئے۔

آپ ہر وارد و صادر سے دعا کراتے کہ اب کسی اور طرف جانا نہ ہو ندوہ کے سابق شیخ الحدیث مولانا تقی الدین بیان کرتے ہیں کہ اس ناچیز کو ۱۳۸۴ھ میں حرمین شریفین کی زیارت کا شرف حاصل ہوا عرصہ سے ایک تمنا تھی کہ وہاں حضرت مولانا سید محمد بدر عالم کی بھی زیارت کریں۔ چنانچہ ایک روز حاضر ہوا سلام و مصافحہ کے بعد دعا کی درخواست کی آپ نے فرمایا دعاء آپ لوگ کریں کہ جوار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایمان پر خاتمہ ہو۔ آپ لوگ محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مہمان ہیں۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۷۲ء)

آپ کے اس بیان سے آپ کے عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی وضاحت ہوئی کہ آپ مدینہ منورہ آنے والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مہمان سمجھتے تھے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسد اطہر روضۂ پاک میں ایک بے جان پتھر کی طرح

محفوظ رکھا ہوتو وہاں سلام عرض کرنے کے لئے کون جائے گا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہاں سعودی سفیر بھی حاضر ہوتا ہےتو وہ بھی ان الفاظ میں سلام عرض کرتا ہے۔

علیک سلام اللہ یاسید الوری و من قدرہ عند اللہ عظیم

مولانا سید محمد بدر عالم محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آئینہ میں:

علماء دیوبند کس قدر عشق رسول میں سرشار رہے۔یہ اہل علم اور اہل محبت سے مخفی نہیں ۔حضرت مولانا سید محمد بدر عالم بھی عشاق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قافلے میں رواں دواں ملتے ہیں ۔آپ کا یہ بیان دیکھیں۔جو شخص خدا کی محبت کا مدعی ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ومحبت پوری طرح نہیں کرتا۔یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا دم بھرتا ہے مگر خدا کی عظمت ومحبت سے خالی ہے وہ سراسر دھوکے میں ہے۔(ترجمان السنہ ج ا ص ۳۵۳)

پھر فرماتے ہیں:

اصل یہ ہے کہ محبت میں خدا تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان تفریق نہیں ہوسکتی ۔ایک کا محب دوسرے کا محب ہے اور ایک کا محبوب دوسرے کا محبوب بنکر رہتا ہے ۔**یریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسولہ اولئک ھم الکافرون حقا**۔(پ ۶ المائدہ۔ترجمان السنہ ص ۳۵۷)

خاتم النبین تمام علوم ہدایت کا مورد تھے: علماء دیوبند کے بارے میں بے ادبوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علمی شان تسلیم نہیں کرتے۔مولانا سید محمد بدر عالم کے یہ الفاظ اس سلسلہ میں یاد رکھئے۔جس مقصد کے لئے نبی کو بھیجا جاتا ہے وہ مخلوق کی ہدایت ہے اس لئے تمام علوم ہدایت

اس کو مرحمت فرمائے جاتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس سب سے زیادہ کامل تر ہے اس لئے آپ کو یہ علوم بھی کامل تر ملے۔ (ترجمان السنہ ج ۱ ص ۴۳۹)

یہی بات حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید نے ان الفاظ میں کہی تھی۔ دین کی سب باتیں اللہ نے اپنے رسول کو بتادیں اور سب کو اپنی تابعداری کا حکم دیا۔

ضروری ہے کہ آپ کا ہر عمل ہماری نظروں میں محبوب ہو

مولانا سید محمد بدر عالم لکھتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت یہ ہے کہ آپ کے تمام اوضاع واطوار نظروں میں محبوب ہو جائیں۔ عبادت کرنا ہر انسان کا فرض ہے اس میں آپ کی اتباع کرنا ہر مسلمان اپنا فرض سمجھتا ہے، لیکن حدیث پاک میں محبت کا یک بلند معیار بتلایا گیا ہے کہ عبادت کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عادات ونفسیات وطبعیات بھی نظروں میں قابل اتباع بن جائیں بلکہ وہ غیر اختیاری جذبات جو اپنے مخالف کے لئے قلب میں موجزن ہوتے ہیں اس لئے قلب میں جمنے نہ پائیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے خلاف ہیں یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ آپ کی محبت رگ رگ میں سرایت کر چکی ہو۔ ؎

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن کائینہ ہر چہ دید فراموش می کند

فتنہ قادیانیت کے استیصال کی جدو جہد: فخر المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ نے اپنے ممتاز تلامذہ کو یہ حدیث سنا کر قادیانیت کے استیصال پر لگادیا تھا۔

سیکون فی آخر هذه الامة قوم لهم مثل اجر اولهم یامرون

بالمعروف وینھون عن المنکر ویقاتلون اھل الفتن۔

ترجمہ: اسی امت کے آخری حصہ میں کچھ ایسے لوگ اٹھیں گے جنہیں اپنے دینی کاموں کا اجر پہلے لوگوں کے اجر کے مطابق ملے گا وہ نیکی کا امر کریں گے اور اہل فتن سے مقابلہ کریں گے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرق باطلہ کے خلاف علمی اور قلمی جہاد کرنے والے صحابہ کرام کے اجور میں حصہ پائیں گے۔حضرت شاہ صاحب کا موضوع علم حدیث تھا اور آپ ہمیشہ اسی کی گہرائیوں میں اترتے رہے۔لیکن آپ کے ہاتھ وقت کی نبض پر بھی پڑا رہا، جو چیز دین کے لئے ضرر رساں ہوتی آپ کا دل اس پر تڑپ اٹھتا۔مولانا سید محمد بدر عالم لکھتے ہیں:

جو شخص استاد مرحوم کے جلوت وخلوت کا شریک رہا ہو وہی جان سکتا ہے کہ یہ محدث جو امت میں امام بخاری کی طرح فن حدیث میں شہرت رکھتا تھا وہ امت کی اصلاح کے لئے کتنی دلسوزی رکھتا ہے اور اس کی دردمندی کے لئے کتنا مضطرب تھا۔

قادیانیت کے خلاف آپ کا قلمی جہاد: مولانا مرحوم نے اپنی مایہ ناز تالیف ترجمان السنہ کے جلد اول میں صفحہ ۳۹۰ سے لیکر صفحہ ۴۱۸ تک ختم نبوت پر بڑی بصیرت افروز بحث کی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع اور نزول پر صفحہ ۵۲۱ تک مفصل بحث کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث پڑھاتے ہوئے بھی آپ کی ان مذاہب باطلہ پر کتنی گہری نظر ہوتی تھی۔ پھر آپ نے ان دونوں موضوعات پر مستقل رسائل بھی تصنیف فرمائے ہیں۔ **المسک الختام فی ختم النبوہ لخیر الانام ۔۔۔ الکامل الفصیح فی نزول المسیح** نزول

عیسی بن مریم پر یہ بڑی دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔قادیانیوں کے خلاف مولانا کی زبردست جدو جہد کا ثمرہ تھا کہ آپ کے حلقہ درس کے طالب علم مولانا منظور احمد چنیوٹی فتنہ قادیانیت پر تیغ براں بن کرلہرائے اور ان سے مباحثہ ومناظرہ کی جملہ حدود پار کر کے مرزا محمود نے دم توڑا۔مرزا ناصر اپنے انجام کو پہنچا اور اب مولانا چنیوٹی مرزا طاہر کے مقابل ختم نبوت کی جدو جہد میں پیش پیش ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس تمام کار خیر کا ثواب حضرت مولانا سید محمد بدر عالم کے نام لکھا جارہا ہے۔

مولانا سید محمد بدر عالم کا سیاسی مسلک: آپ اپنے استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے زیر اثر مسلم لیگ کے حامی تھے۔آپ نے تحریک پاکستان میں ڈٹ کر بریلویوں کا مقابلہ کیا جو فتوے دے رہے تھے کہ مسلم لیگ کی اعانت کرنا اور اسے چندہ دینا حرام ہے۔یہ صحیح ہے کہ آپ نے عام سیاست دانوں کی طرح عملی سیاست میں حصہ نہ لیا لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ آپ حالات پیش آمدہ پر گہری تنقیدی نظر رکھتے تھے۔

ایک شیخ طریقت کا فیض عالمتاب: اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے علمی اور عملی کمالات سے نوازا تھا پر آپ کی جو ادا آپ کی پوری زندگی پر چھا گئی وہ آپ کا زہد وتقویٰ اور آپ کا مقالات ولادیت میں سرمدی استغراق تھا آپ کی یہ ادا عمر کی آخری حصہ کی پیداوار نہیں، جب آپ حضرت شاہ صاحب کے درس میں حاضری دیتے تو تو جہاں ارباب معرفت کی کوئی بات آجاتی آپ اس پر استاذ محترم سے مزید دریافت چاہتے۔فیض الباری کے حاشیہ پر آپ کے کئی

ایسے سوال درج ہیں جو پتہ دیتے ہیں کہ مولانا مرحوم بحر طریقت کے گہرے شناور تھے۔ آپ نے آخری عمر میں اپنے احباب کو جو وصیت کی ہم اس پر آج کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ آپ فرماتیں ہیں :۔

عزیزوں کو مجھے اک راز کی ہے اب خبر کرنا — کہ عافیت اگر چاہو تو طیبہ میں گزر کرنا
جہاں اب پھنسنے والا ہے فتن میں دین و ایماں کے — بہت مشکل ہیں مومن کو کہیں باہر بسر کرنا
دعائیں مانگتے رہنا اسی کی کہ جو عمر باقی ہے — خدا تم کو عطا کردے مدینہ میں بسر کرنا
یہ مرکز ہے مہاجر مسلمانوں کا اول سے — پہنچ جاؤ مقدر سے تو پھر اس کی قدر کرنا
تجارت کے ارادے سے نہ آنا اس طرف ہرگز — قناعت سے یہاں رہنا شرافت سے بسر کرنا
حرم میں خوب جا جا کر مزہ لینا عبادت کا — اسی میں آپڑے رہنا یہیں شام و سحر کرنا
تمہیں سنت سے الفت ہو تو چلنا اسی طریقہ پر — کوئی چاہے نہ چاہے تم عمل اس پر مگر کرنا
وصیت ہے میری بس اپنے سب عزیزوں کو — مدینہ میں آکر بس جانا یہیں آکر گذر کرنا

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(بیس مردان حق صفحہ: ۸۷۷، مؤلفہ مکرم عبدالرشید ارشد)

وفات : بیماری کا سلسلہ کچھ دنوں پہلے سے چل رہا تھا، بالآخر ۵؍رجب المرجب ۱۳۸۵ھ ۱۲؍اکتوبر ۱۹۶۵ء کو دار آخرت کی طرف رحلت فرمایا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

جمعہ کی نماز کے بعد حرم نبوی ﷺ میں نماز جنازہ ادا ہوئی اور جنت البقیع میں اُمہات المومنین کے عین قدموں میں مدفون ہوئے جس کی ان کو بہت تمنا تھی۔ نوّر اللہ مرقدہ۔

حضرت مولانا عبدالجبار صاحب بنارسیؒ متوفی ۱۳۸۶ھ

نام ونسب وولادت: مولانا الحاج عبدالجبار بن حاجی عبدالعزیز بن حافظ عبدالقادر بن حافظ جان محمد بن خدابخش بن الٰہی بخش بنارسی محلہ مدنپورہ شہر بنارس میں تقریباً ۱۳۲۴ھ میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان دینداری اور تمول میں مشہور ومعروف تھا۔ آپ کے دادا حاجی حافظ عبدالقادر نہایت متقی، پرہیزگار، صاف گو، اور صاف ذہن انسان تھے۔ توکل واستغناء، بے تکلفی اور سادگی ان کی فطرت تھی۔ محلہ کے بڑے تاجروں میں ان کا شمار تھا۔ اپنی خوش معاملگی اور راست بازی کی بناء پروہ ''التاجر الصدوق'' کے صحیح مصداق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دس بچیوں سے نوازا تھا۔ جب فریضۂ حج کیلئے حرمین شریفین تشریف لے گئے تو لڑکے کی پیدائش کے لئے دعاء کی۔ حق تعالیٰ نے دعاء قبول فرمائی اور سفر حج سے واپس آنے کے بعد صاحبزادہ عبدالعزیز بعدہ عبدالغنی پیدا ہوئے۔ ان دونوں صاحبزادوں کی ولادت کے بعد بطور شکرانہ دوبارہ زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

حافظ عبدالقادر دنیا سے زیادہ فکر آخرت کی دعوت دیتے تھے۔ اپنے بچوں اور بھائیوں سے برابر کہا کرتے تھے ''تجارت میں عبادت سے کم وقت صرف کرنا چاہئے'' ان کی اس خداترسی اور آخرت کوشی کا رنگ پورے گھرانے پر چھایا ہوا تھا۔ حافظ عبدالقادر کے لڑکے عبدالعزیز، تقویٰ وطہارت، توکل واستغناء میں اپنے

والد کے قدم بہ قدم چلے، مولانا عبدالجبار صاحب آپ ہی کے صاحبزادے تھے۔

تعلیم وتربیت: ایسے دینی اور علمی گھرانے میں مولانا عبدالجبار بنارسی نے آنکھ کھولی اور نشوونما پائی۔ابتدائی تعلیم کیلئے ''محمود المدارس (جامعہ اسلامیہ) مدنپورہ میں داخل کئے گئے، جہاں حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں مولانا احمد اللہ بنارسی مرحوم اور مولانا مصطفیٰ خاں بنارسیؒ مرحوم منصب تدریس پر فائز تھے، انھیں حضرات سے فارسی وعربی کی تعلیم، کافیہ، قدوری وغیرہ تک حاصل کی، اسی کے ساتھ استاذ القراء مولانا قاری حمید الدین سنبھلیؒ سے تجوید کی کتابوں میں ''ضیاء القراۃ'' ''جمال القرآن'' ''فوائد مکیہ'' ''تحفۃ الاطفال'' اور مقدمہ جزریہ وغیرہ پڑھیں اور قرأت حفص کی تکمیل کی۔ اور اسی مدرسہ محمود المدارس سے سند فراغ حاصل کی۔مولانا کی سند پر وقت کے مشہور ومعروف قراء اور علماء کی دستخط ثبت ہیں۔جن میں قاری عبدالرحمٰن مکیؒ، قاری محمد عبداللہ تھانویؒ، قاری ضیاء الدین الہ آبادی، قاری محب الدین الہ آبادیؒ، قاری مستجاب الدین الہ آبادیؒ ہیں۔

اس کے بعد مولانا عبدالجبار بنارسی نے ۲۰ رشوال ۱۳۴۴ھ کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا وہاں شرح وقایہ اور ھدایہ اولین وغیرہ کتابوں کو پڑھا اور لوٹ آئے۔مولانا کے صاحبزادے مولانا عبدالمتین صاحب قاسمی کا خیال ہے کہ دیوبند سے واپس آنے کے بعد دوبارہ ''محمود المدارس میں داخل ہوکر بعض کتابیں پڑھی۔

مولانا عبدالجبار بنارسی اگر چہ مروجہ طریق تعلیم کے مطابق کسی درسگاہ کے فارغ التحصیل تو نہ تھے مگر کثرتِ مطالعہ، وسعت معلومات اور دقت نظر کی بناء

پر کسی فاضل درس نظامیہ سے کم علم نہ رکھتے تھے۔

جامعہ اسلامیہ بنارس کی صدارت: مولانا مرحوم تقریباً چھبیس ۲۶ سال تک جمیعۃ علماء بنارس کے صدر رہے اور تیئیس ۲۳ سال تک جامعہ اسلامیہ بنارس کے ناظم اعلیٰ رہے۔ موصوف اپنی تجارتی مصروفیتوں کے باوجود جمیعۃ علماء کے کام اور مدرسہ کی ترقی وتوسیع کیلئے بیحد کوشاں رہتے۔ صدر جامعہ اسلامیہ مولانا حکیم عبدالغفار بنارسی کے وصال کے بعد ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۴ء میں موصوف **جامعہ اسلامیہ** کے صدر منتخب ہوئے۔ اور تقریباً دو سال جامعہ کے منصبِ صدارت پر فائز رہے۔

آپ کے معمولات ومحامد: آپ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے بیعت تھے اسلئے اپنے پیر مرشد کے بتائے ہوئے اوراد ووظائف کے نہایت پابند تھے، اس تعلق وارادت کو زندگی بھر انتہائی پابندی سے نبھاتے رہے۔ نماز باجماعت کا حد درجہ اہتمام فرماتے تھے۔ اذان ہوتے ہی دنیاوی مصروفیات ترک کر کے مسجد چلے جاتے تھے۔ تواضع وانکساری وسادگی، وملنساری میں بھی بے نظیر تھے۔ مولانا سلطان الحق صاحب موصوف کے زمانہ طالبعلمی کی بات نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''وہ نہایت سنجیدہ مزاج، نفاست پسند، مہمان نواز تھے، ان کے دل میں تکبر اور بڑائی کا ذرہ برابر شائبہ نہ تھا اپنے غریب ساتھیوں سے نہایت خندہ پیشانی اور بشاشت قلبی سے ملتے۔ اپنے کو سب کے برابر رکھتے، کسی سے ملتے تو ایسا لگتا کہ بھائی سے ملاقات کر رہے ہیں''

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو انیس اولاد سے نوازا تھا۔ جن میں چھ لڑکیاں اور تیرہ صاحبزادے ہیں ان میں سے دو صاحبزادے حافظ قرآن ہیں۔ اور دو صاحبزادے اور ایک پوتا فاضل دیوبند ہیں۔ بنارس کے مشہور ادارہ **جامعہ اسلامیہ** اور اس سے متعلق ذیلی اداروں کو اس خاندان کی سرپرستی حاصل ہے۔ قومی وملی کاموں میں مولانا مرحوم کی اولاد پیش پیش رہتی ہے۔

وفات: بالآخر ۳؍رجب المرجب ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۸؍اکتوبر ۱۹۶۶ء کو پیام اجل آپہنچا اور آپ نے جاں جاں آفریں کے سپرد کردی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

(تذکرہ علماء بنارس صفحہ ۱۲۹ مؤلفہ مولانا مفتی وسیم احمد صاحب)

حضرت مولانا عبدالصمد صاحب کوپا گنجی مئویؒ المتوفی ۱۳۸۶ھ

نام ونسب: مولانا عبدالصمد بن مولوی دین محمد کوپا گنجی اعظمی اپنے دیار کے مشاہیر علماء میں تھے، اپنی ٹھوس علمی صلاحیت واستعداد کی بناء پر بڑے مولانا کے لقب سے مشہور تھے۔

ولادت وتعلیم: ولادت ۱۳۰۵ھ میں قصبہ کوپا گنج ضلع مئو میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی دین محمد سے حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں مولانا منیر احمد سے پڑھا، پھر یہاں سے میڈھو کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور وہاں ہندوستان کے مشہور اور نامور معقولی عالم اور محدث حضرت مولانا ماجد علی جونپوری سے جملہ علوم کی تکمیل کر کے سند فراغت حاصل کی۔

تدریسی خدمت: تعلیم وتحصیل سے فراغت کے بعد قصبہ اندارا ضلع مئو کے کسی مدرسہ میں مدرس ہوئے، لیکن ایک ہی ماہ میں یہاں سے علیحدہ ہوکر اہل وطن کی خواہش اور طلب پر مدرسہ مصباح العلوم کوپا گنج چلے آئے جہاں پہلے سے آپ کے والد تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، مولانا نے اپنی پوری زندگی مدرسہ مصباح العلوم میں گذاردی، آپ کی ذات سے مدرسہ مذکور کو خوب ترقی ہوئی اور قرب وجوار کے بے شمار طلبہ نے آپ سے اکتساب فیض کیا، جن میں مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مولانا اسلام الحق کوپا گنجی، مولانا محمد ایوب مئوی شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل، مولانا عبدالستار ندوی اور مولانا عظیم اللہ کوپا گنجی اپنے اپنے

وقت میں علمی حلقوں میں بڑی شہرت ومقبولیت کے مالک ہوئے۔

تدریسی خوبی: مولانا کا طریقۂ درس اتنا عمدہ اور دلکش تھا کہ بدشوق سے بدشوق طالب علم کو چند ہفتوں کے اندر علمی اشتیاق پیدا ہوجاتا تھا، طلبہ سے نہایت شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آتے اور ان کی تعلیم وتربیت سے کبھی بھی غافل نہ ہوتے تھے۔

اخلاق حمیدہ: علم کے ساتھ قدرت نے صفات حسنہ سے بھی حصہ وافر عطا کیا تھا، ہر چھوٹے بڑے سے نہایت تواضع اور انکساری کا معاملہ فرماتے تھے، تدریس میں انہماک کی وجہ سے تالیف وتصنیف کی جانب توجہ نہ ہوسکی۔

ف: مجھے یاد ہے کہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے آپ خاص ربط رکھتے تھے اور مثنوی کے درس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے میں نے خود مولانا کو دیکھا ہے جس کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔(مرتب)

وفات: ۸۱ برس کی عمر پاکر ۱۳۸۶ھ مطابق ۶/جنوری ۱۹۶۶ء میں اپنے آبائی وطن کوپاگنج میں وفات ہوئی اور وہیں اپنے بزرگوں کے جوار میں دفن ہوئے۔ **نور اللہ مرقدہ۔** (تذکرہ علماء اعظم گڈھ صفحہ:۲۱۳)

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب سیتا مڑھی رح المتوفی ۱۳۸۶ھ

نام ونسب: مولانا عبدالعزیز کا اصلی نام بابو جان تھا، آپ کے والد کا نام شیخ صمدانی تھا، ضلع سیتا مڑھی کے ایک مشہور گاؤں بیرار کے رہنے والے تھے۔

تعلیم: شیخ صمدانی خود تو تعلیم یافتہ نہیں تھے، مگر علم کے قدرداں تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم کی جانب توجہ دی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمود عالم رح انہیں دنوں دارالعلوم سے فارغ ہوکر مکان آئے ہوئے تھے، شیخ صمدانی نے ان سے درخواست کی کہ وہ بابو جان کو دینی تعلیم دیں، مولانا محمود عالم رح نے بابو جان کو محنتی وذہین دیکھ کر اپنی شاگردی میں لے لیا، اور ابتدائی تعلیم دی، اس کے بعد اس وقت کے مشہور مدرسہ امدایہ دربھنگہ میں بھیجا، جہاں بابو جان کی قابلیت اور اہلیت کو دیکھ کر سارے اساتذہ خوش اور محبت کی نظر سے دیکھنے لگے، اور بابو جان کا عرفی نام ختم کر کے عبدالعزیز تجویز کردیا، مدرسہ امدادیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ اسلامیہ امروہہ آئے، اور وہاں سند حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا علامہ ابراہیم بلیاوی رح، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری رح وغیرہ آپ کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں۔

تدریسی خدمت: مولانا مفتی عبدالعزیز تینوں بڑے اداروں سے فارغ ہوکر وطن پہنچے، تو والدین دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اپنے دالان میں درس

وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ تین سال تک بغیر کسی معاوضہ وتنخواہ کے محض اخلاص وللّٰہیت کی بنیاد پر تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دیا، اور بستی وعلاقہ کے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

حضرت مولانا کے علمی صلاحیت کا دور دور تک شہرہ ہونے لگا، عام لوگ اپنے دینی مسائل کی گتھی سلجھانے کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں آنے لگے۔ مدرسہ اشرف العلوم کنہواں بلایا گیا، وہاں ۶؍سال تک تدریسی خدمت انجام دیں، اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں مدرسہ احمدیہ مدھوبنی بلائے گئے، وہاں بھی ۶؍سال تک تدریسی خدمات انجام دئے، اس کے بعد حضرت مولانا عبدالوہاب دربھنگویؒ اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ اور دیگر اساتذہ کے حکم سے ۱۹۳۰ء میں بمبئی تشریف لے گئے، مولانا حکیم مسعود احمد وبرادران معروف بہ حکیم اجمیری کھڑک، بمبئی کو پڑھانا شروع کیا، پھر کھوکھا بازار مسجد کی امامت وخطابت بھی آپ کے حصہ میں آئی، اس وقت بمبئی جہالت اور بدعات کا گڑھ تھا۔ مولانا نے وہاں اہم خدمات انجام دئے۔

ف: مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے اثنائے قیام بمبئی حضرت کی مجلس میں نہایت عقیدت سے برابر شریک ہوتے تھے۔ (مرتب)

مولانا ایک علمی صلاحیت کے آدمی تھے، آپ کی نظر درس وتدریس کی طرف ہمیشہ رہی، چنانچہ جامع مسجد بمبئی کے مدرسہ محمدیہ میں صدر مدرس کے منصب جلیلہ پر فائز کئے گئے۔ پھر کچھ بزرگوں کے مشورہ سے نمازی منزل

دوٹانگی پر دارالعلوم امدادیہ کی بنیاد رکھی۔ اور اس مدرسہ میں صدر مدرس اور مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا بمبئی میں مفتی مہاراشٹر اور مولانا بہاری کے لقب سے مشہور تھے۔ جمیعۃ علماء مہاراشٹر کی بنیاد بھی مولانا بہاری ہی نے رکھی تھی، اور زندگی بھر اس کی خدمت کرتے تھے۔ مولانا نے علماء کے لئے بمبئی کی فضا ہموار کی، شاہ سعود کی خدمت میں جمیعۃ علماء مہاراشٹر کی جانب سے استقبالیہ پیش کیا، اس موقع پر شاہ سعود نے تمغہ اور تلوار سے ان کی ہمت افزائی فرمائی۔

آپ کے نام میرا روڈ بمبئی میں مدرسہ عزیزیہ قائم ہے، مولانا بہاری نے بیرار میں بھی مدرسہ تعلیم الدین کو قائم کیا۔

وفات: مولانا کی وفات ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں موضع بیشی میں ہوئی، اور اپنے آبائی گاؤں موضع بیرار ضلع سیتامڑھی میں مدفون ہوئے۔ **نور اللہ مرقدہٗ**۔ (تذکرہ علماء بہار صفحہ:۱۷۹)

مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب[1] نقشبندی بنارسی متوفی ۱۳۸۶ھ

نام ونسب : آپکا نام محمد ابراہیم جبکہ تاریخی نام محمد فضل الکریم ہے۔ والد کا نام الحاج منشی لعل محمد ہے۔ جو بڑے عابد و زاہد و مرتاض تھے اور حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے۔ آپ کے جد امجد شیخ امام الدین ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اعظم گڑھ سے بنارس آ گئے تھے۔

ولادت: آپ کا ننھال شہر غازی پور کے محلہ شیخ ضیاء الدین پیر میں واقع تھا۔ آپ کی ولادت ۲۴ رشعبان بروز شنبہ ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ خاندان ہی کے ایک بزرگ حافظ عبداللہ صاحب نے محمد ابراہیم نام رکھا۔

(تذکرہ مشائخ بنارس ۲۲۳)

تعلیم وتربیت : آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں ہوئی۔ اس وقت یہ مشہور تھا کہ یہ ہونہار بچہ اپنے وقت کا قطب ہوگا اور ایک زمانے میں آفتاب ومہتاب بن کر چمکے گا۔

بالا ے سرش ز ہوش مند ی می تافت ستارۂ بلندی

مولوی محمد اسماعیل میرٹھیؒ کی اردو کی کتابیں بڑے شوق سے وہیں پڑھیں۔

---

[1] آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالسلام نعمانی نے آپ کے حالات اپنی کتاب تذکرہ مشائخ بنارس میں درج فرمائے ہیں نیز آپ کے پوتے مفتی عبدالباطن نعمانی نے قیمتی حواشی سے مزین کیا ہے یہ تذکرہ اسی سے ماخوذ ہے (مرتب)

پھر بنارس واپس ہوئے اور دادا صاحبؒ کے سایہ عاطفت میں آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی۔سب سے پہلے آپ نے حضرت مولانا محمد صادق صاحب سہسرامی کے دولت کدہ واقع محلہ نرہر پورہ حاضر ہوکرعربی کی ابتدائی تعلیم حاصل فرمائی۔اسی زمانے میں بنارس کے ایک مشہور طبیب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب بنارسیؒ نے محلہ کدئی چوکی میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا تھا،وہاں کابل کے ایک جید عالم ملا محمود سادنبیریؒ صاحب مسند تدریس پر فائز تھے۔آپ نے ان کی خدمت میں رہ کرصرف ونحو کی کتابیں ''شرح جامی تک پڑھیں۔

ملامحمود صاحب بڑے ذی استعداد عالم تھے،شرح جامی ان کو پوری ازبر تھی،اکثر ایسا ہوتا کہ آپ اس کتاب کے خطبہ کے شروع کلمہ **الحمدلولیه** سے شروع فرماتے اور آخیر تک پڑھ جاتے تھے،درس نظامی کی اکثر کتابیں نوک زبان پر تھیں اسی زمانے میں حافظ عبد اللہ بنارسیؒ نے محلہ کٹیہر متصل زیر پزایہ مسجد میں ایک عربی مدرسہ قائم کیا جس کی داغ بیل ۱۳۱۶ھ میں ملامحمود صاحبؒ نے ڈالی اور اس کا نام 'اشاعۃ السنہ' رکھا،جو اب مدرسہ مظہر العلوم کے نام سے مشہور ہے۔اس مدرسہ میں اول اول تین طلبہ داخل ہوئے (۱) والد ماجد مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحبؒ (۲) مولوی سردار حفیظ اللہ صاحبؒ (۳) مولوی عبد الغنی صاحب،جن کا زمانہ طالب علمی میں ہی انتقال ہوگیا تھا گویا حضرت والد ماجدؒ اس درس گاہ میں **السابقون الاولون**،میں سے تھے۔

یہ درس گاہ جامعہ مظہر العلوم اس وقت ہندوستان کے جید علماء ومشائخ کا مرکز تھی جہاں مولانا عبد الحئی فرنگی محلیؒ متوفی ۱۳۰۴ھ کے حلقہ درس کے فیض یافتہ

ایک مشہور عالم ، جامع معقول و منقول حضرت مولانا امان اللہ صاحب مئوی (متوفی ۱۳۴۹ھ) حضرت مولانا حکیم عبد الحمید صاحب مئوی ، حضرت مولانا عبد العلیم غازی پوریؒ اور مولانا حسین احمد مبارک پوریؒ جیسے فضلاء مسند درس پر فائز تھے۔

ان حضرات سے آپ نے تفسیر و حدیث و فقہ و دیگر علوم متداولہ کی تکمیل فرمائی اور مورخہ ۲۰ رشعبان ۱۳۲۲ھ میں بڑے اعزاز کے ساتھ جلسہ عام میں دستار بندی ہوئی ۔ یہ جلسہ کچی باغ کے بڑے میدان (آزاد پارک) میں ہوا۔ یہاں سے فراغت کے بعد معقولات کی مزید تکمیل کے لئے مدرسہ حنفیہ جونپور تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوریؒ کی خدمت میں رہ کر ایک عرصہ تک آپ سے اکتساب فیض کیا۔

بیعت : علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ علم باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۴ رجمای الآخر ۱۳۲۵ھ میں حضرت شیخ المشائخ مولانا شاہ عبد اللطیف ستھنویؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلہ عالیہ ، چشتیہ ، نظامیہ میں بیعت کا شرف حاصل فرمایا۔ حضرت قبلہ کی عمر اس وقت ۱۱۰ رسال تھی جب کہ ۱۳۰ رسال کی عمر میں ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ میں انتقال فرمایا اور ستھن شریف ضلع سلطان پور میں مدفون ہوئے ۔ حضرت قبلہ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا شاہ ضیاء الدین حسن صاحب بھوپالی کی ذات گرامی کا انتخاب فرمایا۔ چنانچہ ۱۳۴۵ھ میں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں داخل ہوئے۔

زیارت حرمین : شوال ۱۳۲۹ھ میں حضرت والد ماجد زیارت حرمین

کے لئے تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں شیخ الدلائل مولانا شاہ عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکیؒ کی خدمت میں رہ کر صحاح ستہ کی اجازت وقرأت، اور مسلسل بالاولیہ، مصافحہ نبوی و مدنبوی کی سند بھی حاصل فرمائی۔ اسی طرح الحزب الاعظم ودلائل الخیرات شریف کی قرأت فرما کر اس کی بھی اجازت حاصل فرمائی، جس کا سلسلہ براہ راست مصنف امام شیخ جزولی تک پہنچتا ہے اور اپنے دستخط خاص سے مزین فرما کر دلائل الخیرات کا ایک نسخہ عنایت فرمایا۔

فتاویٰ مظہریہ: تحصیل علم کے بعد آپ نے کئی سال تک جامعہ مظہر العلوم بنارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ساتھ ہی فتویٰ نویسی بھی فرماتے رہے۔ اس دور میں آپ کے فتاویٰ کی تین ضخیم جلدیں مرتب ہوئیں جن کا نام آپ نے فتاویٰ مظہریہ رکھا۔ اس سے آپ کے تبحر علمی، فقاہت اور غیر معمولی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

وعظ وتذکیر: ۱۳۲۰ھ میں جب کہ آپ کی طالب علمی کا دور تھا بڑی مسجد محلہ چھتہ تلے، متصل دالمنڈی آپ امام جمعہ مقرر ہوئے اور ۱۶؍سال تک یہ خدمت انجام دی، نیز ہر جمعہ کو وعظ کا سلسلہ شروع فرمایا۔ پھر ۱۳۳۶ھ میں جامعہ مظہر العلوم کی مسجد میں امامت جمعہ شروع فرمائی جس کا سلسلہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء تک رہا۔ اسی سال حضرت مولانا حافظ محمد اکرام خاں خطیب وامام شاہی جامع مسجد گیان واپی کا انتقال ہوا تو ان کے بعد قرعہ امام آپ ہی کے نام نکلا جو اخیر عمر تک قائم رہا۔ پوری عمر کے ابتدائی حصے سے لے کر تا دم واپسیں برابر اپنے مواعظ اور فرائض تبلیغ میں مصروف رہے۔ بنارس شہر اور ضلع کا کوئی

گوشہ آپ کے وعظ سے خالی نہ تھا۔ پیرانہ سالی اور آنکھوں کی بینائی کے رخصت ہونے کے باوجود آپ کی مشغولیات اس درجہ تھیں کہ بیک وقت دو جگہ درس قرآن پاک دیتے رہے جس کی شکل یہ تھی کہ روزانہ بعد نماز فجر مسجد کوئلہا ڑہ ناگ کنواں پر اور بعد نماز عشاء مسجد کوتوالی چوک میں، دونوں جگہ ایک ایک قرآن پاک ختم ہوا۔ یہ سلسلہ ۱۳۶۲ھ لغایت ۱۳۶۷ھ جاری رہا۔

۱۳۲۹ھ میں جب زیارت حرمین شریفین سے واپسی ہوئی تو اپنے دولت کدہ خاص پر آپ نے ہر پنجشنبہ کو بعد نماز مغرب درود خوانی کا سلسلہ قائم فرمایا پھر کچھ عرصہ کے بعد درود خوانی کے ساتھ ساتھ ایک رکوع ترجمہ قرآن مع تفسیر بیان کرنے کا بھی سلسلہ شروع فرمایا، یہ سلسلہ بحمدہ تعالیٰ اب تک آپ کے وصال کے بعد بھی جاری ہے جیسا کہ پہلے لکھا گیا کہ آپ نے تعلیم باطن کے لئے شیخ المشائخ مولانا عبد اللطیف ستھنویؒ کا انتخاب فرمایا تھا لیکن بیعت کے بعد آپ کے تبلیغی مشاغل نے اس کی تکمیل کا موقع نہیں دیا اور چونکہ آپ کے اندر مجددی رنگ غالب تھا، اتباع سنت کے لئے ساری زندگی کوشاں رہے۔

(تذکرہ مشائخ بنارس صفحہ ۲۲۳)

معمولات: آپ صحیح العقیدہ سنی حنفی مسلک کے حامل اور مسلک اہل سنت کے دلدادہ تھے۔ قدیم علماء ومشائخ کی روش کے پابند تھے۔ کبر، حسد، نخوت، تفاخر، ریا سے پاک اور اختلافات سے ہمیشہ دور رہے۔ خاکسار (مولانا عبدالباسط) کی نظر سے آپ کی عمر کا آخری تیس سالہ دور گزرا ہے۔ اس دور کے یومیہ معمولات جو دیکھنے میں آئے وہ یوں تھے کہ روزانہ مسجد سے نماز فجر ادا

فرما کر گھر واپس تشریف لاتے اور تا اشراق مصروف ذکر واذکار ہوتے عمر کے آخری دس سالہ دور میں بعد نماز فجر حلقہ ختم خواجگان بھی جاری رہا۔ اشراق کے بعد سے ظہر کے وقت تک لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہتا جس میں خاکسار کو درس بھی دیتے اور مسائل کی تلقین وافتاء کا سلسلہ بھی جاری رہتا، پھر نماز ظہر کے بعد قدرے قیلولہ فرماتے اور عصر کے وقت تک ذکر واذکار میں مصروف رہتے، بعد نماز عصر ختم خواجگان فرماتے اور بعد مغرب عموماً کھانے سے فراغت فرما کر تا عشاء مصروف اذکار رہتے، بعد نماز عشاء استراحت فرماتے، پھر آخر شب بیدار ہو کر مصروف تہجد ہوتے، اور فجر باجماعت ادا فرماتے۔

وفات: آپ کی وفات ۲۳/صفر ۱۳۸۶ھ مطابق ۳/جون ۱۹۶۶ء بروز دوشنبہ ۱۰/ بجے دن ہوئی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**۔ حضرت مولانا عبد الحیٔ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین دھنسرہ تالاب کے شمال مغرب گوشے کی طرف بنارس میں ہوئی **رحمہ اللہ تعالیٰ**۔

(تذکرہ مشائخ بنارس صفحہ ۲۲۳ مؤلفہ مفتی عبد السلام نعمانی)

اپنی سعادت: الحمد اللہ حضرت مولانا ابراہیم صاحبؒ کی زیارت کا شرف نصیب ہوا ہے، جبکہ آپ حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں تشریف لائے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے فیوض وبرکات سے بہرور فرمائے۔ اور طریق کو جاری رکھنے کی توفیق دے آمین، ماشاء اللہ اس وقت آپ کے پوتے مفتی عبد الباطن سلمہ احقر سے تعلق رکھتے ہیں آنے جانے کا سلسلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین (مرتب)۔

حضرت علامہ سید قطب شہید[1] مصری المتوفی ۱۳۸۶ھ

نام ونسب وولادت: سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ اسیوط کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، والد کا نام قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا، سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے فرزند تھے، چھوٹے بھائی کا نام محمد قطب ہے، سید قطب ہی کی طرح یہ بھی بہت ہی اہم اور مقبول عام کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی دونوں بہنیں حمیدہ قطب اور امینہ قطب بھی دین کی سرگرم کارکن اور نامور انشاء پرداز ہیں، والدہ بھی بڑی نیک اور دیندار خاتون تھیں، قرآن کریم سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتی تھیں، ان کی تمنا تھی کہ سید قطب پہلے حافظ قرآن ہوں، خدا رسیدہ ماں کی آرزو برآئی، چنانچہ سید قطب نہ صرف یہ کہ حافظ قرآن ہوئے بلکہ قرآن کریم کے علوم ومعارف سے بھی خوب واقف ہوئے، اور پھر بیس جلدوں میں ایک نئے طرز کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے نام سے لکھ دی۔

تعلیم: سید قطبؒ کی ابتدائی تعلیم قاہرہ کے ثانوی مدرسہ تجہیزیہ دارالعلوم میں ہوئی، وہاں سے فارغ ہوتے ہی ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم قاہرہ (قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لے لیا، اور ۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی۔اے۔کی ڈگری حاصل کیا، سید قطب کی پیشانی پر بچپن ہی سے اقبال مندی کا ستارہ چمک رہا تھا، تعلیم سے فراغت ہوئی تو وزارت تعلیم

---

[1] آپ کی مشہور تصنیف ''معالم فی الطریق'' کے ترجمہ ''نقوش راہ'' سے آپ کے حالات تحریر کرتا ہوں۔(مرتب)

میں آ گئے اور انسپکٹر آف اسکول کی حیثیت سے ایک عرصہ تک کام کرتے رہے۔

تصانیف: اسی دوران ان کے قلم سے ''التصویر الفنی فی القرآن'' اور مشاہد القیام فی القرآن'' کے نام سے تحریر ہوئیں سنہ ۱۹۴۶ء میں موصوف نے ''العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کیا، اس کے بعد موصوف کو دو سال کیلئے امریکا جانے کا موقع ملا، اس سفر میں انہوں نے امریکا اور یورپ کے تمام تعلیمی اور تہذیبی مراکز کو قریب سے دیکھا اور مغرب کی شیشہ گری اور اس کی مادی تہذیب کا بغور مطالعہ کیا، جس سے اسلام کی عظمت اور قدر و منزلت علم الیقین کے درجہ میں حاصل ہوئی، اور یہ یقین کامل حاصل ہوا کہ تنہا اسلام ہی وہ دین فطرت ہے جو دنیا کو تہذیبی بحران سے نکال کر متوازن نظام حیات دے سکتا ہے، اور شقاوت و بدبختی کی ہولناک تیرگی کو ختم کر کے صبح سعادت کی دلکشا ساعت لا سکتا ہے۔

چنانچہ امریکا سے واپس آ کر انہوں نے ''الامریکا التی رأیت'' نامی کتاب کی شکل میں اپنے تاثرات پیش کئے، چونکہ اس وقت دوسرے عربی اور اسلامی ممالک کی طرح مصر بھی مغرب کی مادی دوڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا اور مغرب کی اندھی تقلید میں ہی اپنے لئے فخر محسوس کر رہا تھا اس لئے سید صاحبؒ نے مغربی نظاموں کی خوب قلعی کھولی اور ان کی طرف سے قوم کو بیزار کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اسی دوران سید صاحب کی دلچسپی ''الاخوان المسلمون'' سے قائم ہوگئی اور وہ اخوانی رسائل و اخبارات میں کثرت سے مضامین لکھنے لگے، یہاں تک کہ ''الدعوۃ'' کا ہر شمارہ ان کے رشحات قلم سے مزین ہونے لگا، ''الاخوان المسلمون'' کے نام سے ہفت روزہ نکالنے کا فیصلہ جب تحریک کی جانب سے ہوا تو سید صاحب کو ہی اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔

اب جی چاہتا ہے کہ ''نقوش راہ ترجمہ معالم فی الطریق'' سے نہایت مفید وبصیرت افروز مضمون نقل کروں جو پوری کتاب کا گویا خلاصہ ہے، اللہ تعالی ہم کو اس کے سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

بصیرت افروز مضمون

آج سارے ہی عالم کے نظامہائے زندگی کا سرچشمہ جاہلیت ہے، وہ جاہلیت جس کی ہلاکت سامانیوں میں محو حیرت کردینے والی مادی سہولتوں اور عروج کے نقطۂ کمال کو چھونے والی مادی ترقیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس جاہلیت کی بنیاد ہی یہ ہے: زمین میں خدا کی بادشاہت اور الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت یعنی حاکمیت پر زیادتی و دراز دستی۔ یہ جاہلیت حاکمیت کا حق انسان کو دیتی ہے، یہ کچھ انسانوں کو کچھ انسانوں کا خدا قرار دیتی ہے۔

چنانچہ خدا کی بادشاہت کے سلسلہ میں دراز دستی کا نتیجہ بندوں پر زیادتی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، آج کلیت پسندانہ نظاموں میں انسان کی تذلیل وتحقیر اور سرمایہ وسامراج کے تسلط سے افراد اور رعایا پر ظلم وزیادتی ہو رہی ہے۔

اس معاملہ میں اسلامی نظام بالکل منفرد ہے، کیونکہ نظام اسلامی کے علاوہ ہر نظام میں کسی نہ کسی شکل میں انسان انسان کی پرستش کر رہا ہے، تنہا نظام اسلامی ہی وہ نظام ہے جس میں سارے انسان آزاد ہیں نہ کوئی کسی کا بندہ ہے نہ معبود، یہاں تو صرف اللہ کی عبادت کرنی ہے، اور اللہ ہی کے آگے جھکنا ہے اور اللہ ہی کے احکام پر چلنا ہے۔

یہی دوراہہ ہے جہاں سے یہ راستہ اور راستوں سے ممتاز ہوجاتا ہے، اور یہی وہ نیا تصور ہے جو اس وقت ہم انسانیت کے سامنے پیش کرسکتے ہیں، کیوں

کہ یہی وہ بے بہا اثاثہ ہے جس سے انسانیت کی جھولی خالی ہے، اس لئے کہ یہ نہ تہذیب مغرب کی پیداوار ہے اور نہ یورپ کی عبقریت کا ثمرہ۔

بلاشبہ ہم ایک ایسی جدید اور عمدہ ترین چیز کے مالک ہیں جس سے انسانیت بالکل نا آشنا ہے اور اس کے بس میں نہیں ہے کہ اسے تیار کر سکے۔

لیکن یہ ضروری ہے (جیسا کہ پہلے مذکور ہوا) کہ یہ عملی دنیا میں محسوس پیکر بنکر نظر آئے، اور یہ ضروری ہے کہ کوئی امت اس کا بولتا ہوا نمونہ بن کر سامنے آئے۔

لہذا اس کے لئے ہمیں اسلامی دنیا میں پائیدار بیداری کی مہم چلانی ہوگی اور یہی بیداری کی وہ مہم ہے جس کے بعد دیر سویر انسانیت کی قیادت صالحہ ہاتھ میں آسکے گی۔ (نقوش راہ: ص/ ۳۰)

دعوت دین کا کام کرنے والوں کیلئے ہدایت

قصہ اخدود پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالی کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ إِلَّآ أَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (البروج)

اور انہیں ان کی صرف یہ بات بری لگی کہ وہ اللہ پر ایمان لائے جو غلبہ کا مالک اور حمد و ستائش کا سزاوار ہے۔

اس سے ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس قابل ہے کہ دعوت دین کا کام کرنے والے مومنین اس پر غور کریں، خواہ کسی بھی دور یا کسی بھی سرزمین میں کام کر رہے ہوں۔

اہل ایمان اور دشمنان اسلام کے درمیان جنگ دراصل عقیدے کی جنگ ہے، یہ دشمنان اسلام اہل ایمان سے صرف عقیدے کی وجہ سے چڑھتے

اور محض ایمان کی وجہ سے ان کو دکھ اور آزار پہنچاتے ہیں۔

یہ کوئی سیاسی یا اقتصادی جنگ نہیں نسلی اور قومی جنگ بھی نہیں، اگر ایسی کوئی جنگ ہوتی تو اس کا ختم ہو جانا آسان تھا، مگر یہ تو عقیدے کی جنگ ہے کہ یا تو کفر ہوگا یا ایمان۔ جاہلیت ہوگی یا اسلام۔ اشراف قریش نے رسول اللہ ﷺ کو مال و دولت کے انبار، حکومت کے تخت وتاج اور لذتِ سامان وغیرہ ساری چیزیں پیش کی تھی، کیوں؟ صرف ایک بات کے لئے، یہ کہ آپ عقیدے کی جنگ لڑنے سے باز آجائیں اور اس معاملے میں نرمی اور رواداری سے کام لیں، اور اگر حاشا وکلا ان میں سے کسی چیز پر بھی آپ راضی ہو گئے ہوتے تو آپ سے ان کی کوئی جنگ نہ رہتی۔

یاد رہے! یہ دراصل عقیدے کا مسئلہ اور عقیدے کی جنگ ہے، اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ جب بھی کسی دشمن کے مقابلے میں صف بستہ ہوں ان کے ذہن و دماغ میں یہ حقیقت پوری طرح مستحضر رہے، کیونکہ عداوت کی بنیاد صرف عقیدہ ہے، یعنی یہ بات کہ وہ خدائے عزیز وحمید پر ایمان رکھتے اور صرف اسی کے آگے جھکتے اور اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ (نقوش راہ: ص/۳۰۶)

گرفتاری: جدید مصری فرعونیت کے زمانہ میں ”تحریک اخوان“ خلاف قانون قرار دی گئی تو سید قطب کو بھی گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا، جہاں انہیں مختلف قسم کی اذیت ناک سزائیں دی گئیں۔ ۱۳/جولائی ۱۹۵۵ء میں سید قطب کو ۱۵/سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، ابھی سزا کو ایک سال ہی گزرا تھا کہ جمال عبدالناصر کی طرف سے ایک نمائندہ سید صاحب کے پاس جیل بھیجا گیا کہ اگر چند سطریں آپ معافی کی لکھ دیں جنہیں اخبارات میں شائع کیا جاسکے تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا، اس پیشکش کے

جواب میں سید صاحب نے جو جواب دیا وہ تاریخ کا اہم باب ہے۔انہوں نے کہا:

مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو مظلوم کو کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے، خدا کی قسم! اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دلا سکتے ہوں تب بھی میں کہنے کیلئے تیار نہ ہوں گا اور اپنے رب کے حضور اس حال میں پیش ہونا پسند کروں گا کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے خوش ہو۔ (الشہید سید قطب: ص ۵۰،۵۱)

جیل میں قیام کے دوران انہوں نے اپنی کتابوں پر نظرثانی کیا اور اپنی تفسیر ”فی ظلال القرآن“ کی تکمیل بھی جیل ہی میں کی ،سید صاحب پر طرح طرح کے الزامات لگا کر شرمناک مظالم کے پہاڑ توڑے گئے ،مگر سید صاحب اور ان کے بے گناہ ساتھی صبر واستقامت کا پیکر بنے رہے اور باطل کی تیز وتند اور بھیانک آندھیوں کے مقابلہ میں آہنی چٹان اور سیسہ پلائی دیوار کے مانند ڈٹے رہے۔

شہادت: بالآخر ۲۹ راگست ۱۹۶۶ء مطابق ۱۳۸۶ھ کی درمیانی شب میں جدید عصری فرعونیت کے بے رحم ہاتھوں نے امت مسلمہ کو اس کی اس عظیم دولت سے محروم کر دیا اور سید قطب یعنی آسمان علم ویقین کا قطب تارہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ تختۂ دار کا خندہ جبینی سے استقبال کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملا۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔**

انتباہ: الحمد للہ رب العالمین وارحم الراحمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین کہ آج بتاریخ ۲۴ رجمادی الاولی ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۱ رجنوری ۲۰۲۰ء اقوال سلف کی جلد نہم مکمل ہوگئی ،جس کا خیر ختام علامہ سید قطب شہید مصری ؒ پر ہوا۔

اب جلد دہم بفضلہ تعالیٰ پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا ،جس کا مبارک افتتاح حضرت مصلح الامت مرشدی وسیدی مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ سے ہوگا۔ فللّٰہ الحمد والمنہ

مراجع ومصادر

قرآن مجید	کلام اللہ تعالیٰ
بیان القرآن	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
مشکوٰۃ شریف	شیخ ولی الدین خطیب تبریزیؒ
بیس بڑے مسلمان	مولانا عبدالرشید ارشد صاحب پاکستان
مکتوبات امدادیہ	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
بصائر	حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ پاکستان
اصلاح المسلمین	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
یادرفتگان	حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ
ضیاء البدر	حضرت مولانا سید عبدالغفار صاحب ندوی
جنۃ الانوار	حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی
تذکرہ علماء پنجاب	مکرم محمد اختر راہی صاحب
کشکول نوادر	حضرت مولانا رضی الدین صاحب قاسمی
سرودزندگی	مجموعہ کلام شاعر اصغر گونڈوی
تذکرہ علماء بنارس	مولانا مفتی وسیم احمد صاحب بنارس
اقبال کامل	مولانا عبدالسلام صاحب ندوی
نقوش اقبال	شاعر اسلام علامہ اقبالؒ
تذکرہ علمائے اعظمگڈھ	مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

بیس مردانِ حق	مولانا عبدالرشید ارشد صاحب پاکستان
الابداع فی مضار الابتداع	حضرت السید الشیخ علی محفوظ مصریؒ
احیاء العلوم	حجۃ الاسلام امام غزالیؒ
تذکرہ علمائے مبارکپور	حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ
رسالہ ''برہان''	مولانا عبدالحی صاحب فاروقی
قطعات مجذوب	مولانا سید نجم الحسن صاحب تھانوی
تذکرہ علمائے بہار	مولانا ابوالکلام صاحب قاسمی شمسی پور بہار
بزم اشرف کے چراغ	پروفیسر احمد سعید صاحب
تاریخ دارالعلوم دیوبند	حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ
مظاہر حق	مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری
ذکر صالحین	مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوری گجرات
تاریخ فکر اسلامی	مولانا سید محمد اجتباء ندویؒ
تذکرہ علمائے سلف	مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی
فتح الرحمٰن فی خلاصۃ البیان	مکرم قاری محمد صدیق صاحب سانسرودی
نقش دوام	حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ
ماہنامہ معارف	دار المصنفین اعظم گڈھ
صفحات من صبر العلماء	شیخ عبدالفتاح ابوغدہ شامیؒ
لالہ وگل	حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ
رسالہ صدق جدید	مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

سلوک سلیمانی	پروفیسر مولانا محمد اشرف خاں صاحب سلیمانی
پرانے چراغ	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ
عالم اسلام کی عالمی شخصیات	شیخ عبداللہ العقیل صاحب
ترجمہ: من اعلام الحرکۃ الاسلامیہ	
تاریخ قضاۃ ومفتیان بھوپال	مولانا سید عابد علی وجدی حسینی
کلیات سہیل	مکرم عارف رفیع صاحب اعظم گڈھ
نظام صلاح واصلاح	مولانا عبداللہ عباس ندوی
معارف وحقائق	مولانا سید رشید الدین صاحبؒ
مآثر شیخ الاسلام	حضرت مولانا اسیر ادروی
چند روشن ستارے برما ملک میں	مولانا محمد یونس صاحب سورتی
تاریخ ریاست بھوپال	علامہ سید عابد علی صاحب وجدی حسینی
مرد مومن	مولانا عبدالحمید خان صاحب
عہد رفتہ کے نامور علماء ومشائخ	پروفیسر عبدالحی فاروقی صاحب
کتابچہ ''پیغام''	حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ
تذکرہ شیخ ہالیجویؒ	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ
حیات عبدالرشید	مولانا مسعود عزیزی ندوی
سوانح شاہ عبدالقادر صاحبؒ	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ
معرفت الٰہیہ	حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ
حیات اسعد	مولانا نسیم احمد صاحب غازی مظاہری

ترجمان السنہ	حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنیؒ
نصیحت نامہ	// // // //
تذکرہ مشائخ بنارس	مولانا عبدالسلام نعمانی صاحب
نقوش راہ ترجمہ ''معالم فی الطریق	مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی
بیس بڑے اولیاء	حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب پاکستان
فرشتہ صفت انسان	حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ
تزکیہ واحسان	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ
دلیل الفالحین ترجمہ ریاض الصالحین	امام محمد علی بن محمد العلان البکری
انفاس عیسیٰ	حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ
حکیم الامتؒ	حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل	مفتی محمد خالد سیف اللہ صاحب رحمانی
کشکول مجذوب	مولانا انعام الرحمٰن صاحب تھانوی
سوانح حیات مولانا ثناء اللہ امرتسری	مولانا فضل الرحمٰن ابن محمد میاں صاحب
مشائخ چشت	پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب
تذکرہ علماء سلف	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شیروانی
شریعت وطریقت	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ
حالات مولانا احمد سعید دہلوی	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری
ماہنامہ ''الرشاد''	جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ